سررشتۂ تعلیم پنجاب کا سب سے پرانا اور بہترین خدمت گزار

رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

جلد ۲۹

نمبر ۱-۲

علمی، ادبی، اخلاقی، طبی، تاریخی، زراعتی اور صنعتی مضامین کا ماہوار مجموعہ

زیر سرپرستی تاج الشعراء فصیح العصر ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی جانشین داغ

مدیر (اعزازی)

مسٹر لچھمی چند ودیارتھی بی۔ اے۔ بی ٹی۔ ایم۔ او۔ جی۔ اے (لندن)

معاونین (اعزازی)

لالہ آگیا رام سچدیو منشی فاضل — جناب جوش ملسیانی

طالب کاشمیری ایم۔ اے۔ ایم او ایل منشی فاضل ادیب فاضل

ماسٹر جگت سنگھ مینیجنگ پروپرائیٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور (رام گلی) بلڈنگ ۱۵۱۰

سالانہ چندہ چار روپے (للعہ) — ششماہی تین روپے (سعہ) — فی پرچہ دو روپے

مُرقع ادبِ جمیل
Checked 1965
کے
جملہ ناظرین اور تمام قارئین کرام کو
نیا سال
نئی خوشیوں اور نئی اُمنگوں
کے ساتھ
مُبارک ہو
خاکسار جگت سنگھ

مُرقعِ ادبِ جمیل

یعنی

افسانہ نمبر

مُرتّبہ

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

فہرست مضامین

تعطیلات عدالتہائے دیوانی صوبہ پنجاب بابت ۱۹۳۴ء

نام تیوہار	تاریخ انگریزی	تاریخ ہندی	دن	تعداد تعطیلات
نیو ایرز ڈے	یکم جنوری	۱۸ پوہ	سوموار	۱
لوہڑی	۱۲ جنوری	۲۹ پوہ	جمعہ	۱
جمعۃ الوداع	۱۲ جنوری	۲۹ پوہ	جمعہ	۱
عید الفطر	۱۸ جنوری	۶ ماگھ	جمعرات	۱
بسنت پنچمی	۲۰ جنوری	۸ ماگھ	ہفتہ	۱
شیوراتری	۱۲ فروری	ابھاگن	سوموار	۱
سورج گرہن	۱۳ فروری	۲ ...	منگلوار	۱
ہولی	۲۷ تا یکم مارچ	۱۶ تا ۱۸ پھاگن	منگلوار تا جمعرات	۳
درگا اشٹمی	۲۳ مارچ	۱۰ چیت	جمعہ	۱
عید الضحےٰ	۲۶ مارچ	۱۳ چیت	سوموار	۱
بیساکھی	۱۳ اپریل	یکم بیساکھ	جمعہ	۱
محرم	۲۲ تا ۲۵ اپریل	۱۰ تا ۱۳ بیساکھ	اتوار تا بدھوار	۴
ایمپائر ڈے	۲۴ مئی	۱۱ جیٹھ	جمعرات	۱

ایسٹر ہالیڈیز بموجب گزٹ

نام تیوہار	تاریخ انگریزی	تاریخ ہندی	دن	تعداد تعطیلات
سالگرہ بادشاہ سلامت	۳ جون	۲۱ جیٹھ	اتوار	۱
سوماوتی اماوس	۱۱ جون	۲۹ جیٹھ	سوموار	۱
آخری چہار شنبہ	۱۳ جون	۳۱ جیٹھ	بدھوار	۱

نام تیوہار	تاریخ انگریزی	تاریخ ہندی	دن	تعداد تعطیلات
نرجلا ایکادشی	۲۳ جون	۱۰ ہاڑ	ہفتہ	۱
بارہ وفات	۲۵ جون	۱۲ ہاڑ	سوموار	۱
بینک ہالیڈے	۳۰ جون	۱۷ ہاڑ	ہفتہ	۱
بیاس پوجا	۲۶ جولائی	۱۱ ساون	جمعرات	۱
چاند گرہن	۲۶ جولائی	۱۱ ساون	جمعرات	۱
رکھڑی	۲۴ اگست	۹ بھادوں	جمعہ	۱
جنم اشٹمی	یکم ستمبر	۱۷ بھادوں	ہفتہ	۱
اننت چودس	۲۲ ستمبر	۱۷ اسوج	ہفتہ	۱
سوماوتی اماوس	۸ اکتوبر	۲۳ اسوج	سوموار	۱
درگا اشٹمی	۱۶ اکتوبر	۳۱ اسوج	منگلوار	۱
دسہرہ	۱۵ تا ۱۷ اکتوبر	۳۰ تا یکم کاتک	سوموار تا بدھوار	۳
دیوالی	۶ نومبر	۲۱ کاتک	منگلوار	۰
بھیا دوج	۹ نومبر	۲۴ کاتک	جمعہ	
دیوتھان ایکادشی	۱۷ نومبر	۲ مگھر	ہفتہ	
گرو پرب	۲۱ نومبر	۶ مگھر	بدھوار	
شب برات	۲۲ نومبر	۷ مگھر	جمعرات	۱
کرسمس ڈے	۲۴ تا ۳۱ دسمبر	۱۰ تا ۱۷ پوہ	سوموار تا سوموار	۸

مقامی تعطیلات لاہور

نام تیوہار	تاریخ انگریزی	تاریخ ہندی	دن	تعداد تعطیلات
ہولا	۲ مارچ	۹ پھاگن	جمعہ	۱
میلہ بھدر کالی	۷ جون	۱۰ جیٹھ	جمعرات	۱
میلہ جوڑ میل	۱۶ جون	۳ ہاڑ	ہفتہ	۱
عرس داتا گنج بخش	۴ جون	۲۲ جیٹھ	سوموار	۱

Risala "Rahnuma-i-Talim"

Ramgali, LAHORE.

پنڈت لبھو رام صاحب جوشؔ ملیانی منشی فاضل ادیب فاضل

گذارشِ احوال

پچھلے سال کے شعبہ ادبیات پر ایک اجمالی نظر

گزشتہ تین سال سے اقتصادی بدحالی نے ہر قسم کے تمدنی کاروبار میں جو انحطاط پیدا کیا ہے۔ اس کے تباہ کُن اثر سے اخباروں اور رسالوں کی زندگی کسی طرح محفوظ نہ رہ سکی تھی .... خاصکر ہندوستان میں جہاں گنتی کے چند اخباروں کو چھوڑ کر باقی سب کی مالی حالت پہلے ہی ناقابلِ اطمینان تھی۔ اور ان کی بری بھلی زندگی کا انحصار محض ان کی اشاعت پر تھا جس میں روز بروز کمی ہونی شروع ہو گئی۔ رہنمائے تعلیم بھی اس سیلاب کی زد میں آ گیا۔ اور اسکی اشاعت میں بھی ایک حد تک کمی واقع ہوئی۔ مگر مرگِ انبوہ جشنے دارد کا مقولہ مدِنظر رکھکر وہ اپنی خاص سرگرمیوں میں بدستور سابق مصروفِ کار رہا۔ اور اپنی خودداری اور وضع میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ اس کی ضخامت ہمیشہ ایک سو بیس صفحات کے قریب رہی۔ اسکی کتابت و طباعت میں اب بھی وہی شان موجود ہے۔ جو اس بدحالی سے پیشتر نظر آتی تھی۔ اسکے علمی مضامین کی نوعیت میں اب بھی وہی جامعیت نمایاں ہے۔ جو ہمیشہ اس کے لئے طرۂ امتیاز رہی ہے ؎

شعبۂ ادبیات میں وہ پہلے سے بھی زیادہ سرگرمِ عمل رہنے کا مدعی ہے۔ اس نے سال گزشتہ میں دس گیارہ مبسوط تنقیدی مضامین شائع کئے ہیں۔ جن میں کوئی تنقید بھی ایسی نہیں کہ اس میں نئی آرڈر کا نام پر کرنے کی کوشش کیگئی ہو۔ جہاں تک ہماری نگاہ کام کرتی ہے۔ اردو زبان کا کوئی مجلہ سال بھر میں اس شان کے اتنے تنقیدی مضامین شائع کرنے کا دعوے نہیں کرسکتا۔ ان تمام مضامین میں اپنی شان اور حق گوئی کے جلوے جابجا روشن نظر آتے ہیں۔ ان کے انتخاب میں نقد کی زبان کا متین اور معتدل لہجہ اس کا منصفانہ اندازِ بیان ہمیشہ مقدم سمجھا گیا ہے۔ اور اگر کسی مضمون میں جنگجویانہ زبان پائی گئی ہے۔ تو اسکی اشاعت بلالحاظ شخصیت روک دی گئی ہے

رنگِ قدیم میں جسے غزل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اردو زبان کے بڑے بڑے نامور اساتذہ مثلاً حضرت جلیل۔ حضرت نوح ناروی۔ حضرت ریاض خیرآبادی۔ حضرت بیخود دہلوی۔ مرزا یاس چنگیزی۔ حضرت جگر مرادآبادی۔ حضرت قمر۔ نواب عزیز۔ حضرت دل شاہجہانپوری ہمارے عنوان بیان رہے ہیں اور

ان کا پاکیزہ کلام ہمیشہ اس رسالہ کی زینت رہا ہے۔

ان اصحاب کے علاوہ جناب عابد شاہجہانپوری۔ جناب درد شاہجہانپوری۔ جناب کوکب شاہجہانپوری حضرت گوہر رامپوری۔ جناب مضطر نعمانی۔ جناب اظہر۔ جناب سلیم ہمیشہ اپنے نوادرِ افکار کے لئے اسی رسالہ کو مخاطب صحیح خیال فرماتے رہے ہیں۔ اور ان تمام مشاہیر کا کلام فصاحت نظام ناظرین رسالہ ہذا کے لئے فردوس نظر رہا ہے۔ اس سال کے نمبروں میں بہت سی غزلیات ایسی شائع ہوئی ہیں۔ جنہیں زمانہ حال کے حُسن تغزل کا بہترین نمونہ کہنا چاہیئے۔ مثلاً حضرت درد شاہجہانپوری اور حضرت عابد شاہجہانپوری کی دو معرکتہ الآرا غزلیں جو گریباں ہیرا" "داماں ہیرا" کی زمین میں تھیں۔ وغیرہ وغیرہ

حضرت نوح ناروی کے شاگردانِ عزیز مثلاً جناب عابد مسیح۔ جناب دعا۔ جناب انور۔ جناب شمسی۔ جناب الضاف۔ جناب مفتوں۔ جناب شاکر۔ جناب بسمل اپنے تازہ افکار سے اس رسالہ کو خاص طور سے ممنون فرماتے رہے ہیں۔ اور ان کی عنایات والتفات کا یہ سلسلہ نامتناہی نظر آتا ہے۔

نظم گوئی کے گلزار میں رسالہ ہذا کا دامنِ مراد تمام گذشتہ سالوں سے زیادہ مالا مال دکھائی دے رہا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اس کا کامیاب مدعا ہونا تمام ہمعصروں کے لئے باعثِ رشک نہیں تو کم سے کم ایک نمونہ ضرور ہے۔ بہت سی گرانقدر نظمیں اس سال کے دوران میں شائع ہوئی ہیں۔ مثلاً سردار کرپال سنگھ صاحب بیدار کی تین نظمیں (دوست کی یاد۔ دیہات کی صبح۔ شامِ زندگی) پنڈت شیوناتھ صاحب کول کی متعدد نظمیں جن میں ہولی اور برسات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ صفی لکھنوی کی ایک مرصع نظم "تاروں بھری رات" کے عنوان سے پنڈت اندرجیت صاحب شرما کی نظم موسوم بہ "صبحِ وطن" نسیم صاحب کی ایک نظم (یادِ ایامِ گذشتہ) حضرت احمر زنگوفی کی نظم (فلسفی و شاعر) مائل دہلوی کی نظم (سہانی صبح) وغیرہ سالگذشتہ کے مجموعے میں رسالہ ہذا کے لئے فخر و مباہات کا سرمایہ ہیں۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے۔ کہ مشاہیر یکہ تازانِ سخن اپنی خاص جولاں گاہ (غزل) کے علاوہ اس میدان میں بھی شہسواری کے جوہر دکھائیں۔ تاکہ نظم گوئی کا میدان بھی ان کی غزل کی طرح گلستانِ پُر بہار بن جائے ؛

اس مختصر جائزہ کے بعد ہماری متجسس نگاہیں شعبۂ ادبیات کے اس حصے میں تماشائی بن کر رہ جاتی ہیں

جن میں نثر کے خالص ادبی مضامین تحقیق و تدقیق کے خارزاروں میں بہارِ بے خزاں کا جلوہ دکھا رہے ہیں اور جہاں بہت سے نازک نگار ہاتھوں نے اپنی صناعی اور چابکدستی کا کمال دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں مولینا محمد حسین صاحب آدیب ایم اے۔ بی۔ ای۔ ڈی۔ حضرت عابد مسیح۔ مولوی عبد الغفار صاحب سروری ایم اے۔ مولوی محمد عبد اللہ صاحب کامل ایم اے۔ حکیم عیش امروہوی۔ خاص طور سے قابل ذکر ہیں جن کی ادبی نکتہ نوازیوں سے اردو زبان اور فن شاعری کا دامن دامنِ گلچیں بن گیا ہے۔ اس شاندار صحبت میں محققِ فن رستم الشعرا حضرت صابر الہ آبادی نے جن کی ہنگامہ آرا تحقیق اور ناطق فیصلہ جات نے تمام دنیائے ادب کو متزلزل کر دیا ہے۔ نکتہ رانی و نکتہ دانی کی تکمیل فرمائی ہے۔

ان وجوہ سے جو اوپر عرض کیگئی ہیں۔ "رہنمائے تعلیم" تمام ارباب نظر کے لئے جاذب شوق ہو چکا ہے۔ اور ان کے نوادرِ افکار اس کی ضروریات سے بھی زیادہ مقداریں موصول ہو رہے ہیں۔ مضمون نگار اصحاب کی نوازشات روز افزوں ہو رہی ہیں بعض کرم فرما تو اس کے لئے کئی مضامین یکدم بغرض اشاعت بھیج دیتے ہیں۔ مثلاً حضرت انصاف نے سالِ رواں میں شائع ہونے کے لئے اتنا مجموعہ ارزانی فرمایا ہے۔ کہ وہ سالِ رواں کے اختتام تک بالاقساط شائع ہونے میں کفایت کرے گا۔

لیکن رسالہ ہذا کی یہ شان اور اسمیں مزید ترقی کی گنجائش اسی صورت میں قابل اعتماد ہو سکتی ہے جب یہ کساد بازاری کی بلا اس کے سر سے ٹل جائے۔ اور اسکی اشاعت زیادہ نہیں تو کم از کم اپنی سابقہ تعداد ہی تک پہنچ جائے مگر افسوس کہ آثارِ زمانہ ابھی بدستور ناموافق اور حوصلہ شکن ہیں۔ اور سود و بہبود کی تمام امیدیں موہوم!

جوبلی نمبر کی اشاعت میں زر کثیر کا نقصان برداشت کرنے کے بعد اقتصادی بدحالی کے مسلسل دَور میں یہ خیال محض خیال تھا کہ اس کا افسانہ نمبر بھی اسی دھوم دھام سے اشاعت پذیر ہو گا۔ اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے نقشِ ثانی کہے جانے کا مستحق سمجھا جائیگا مگر مالک رسالہ کی یہ اولوالعزمی قابل داد ہے کہ انکا یہ عزم بالجزم ان مخالف حالات میں بھی متزلزل نہیں ہوا۔ مقام مسرت ہے کہ اب یہ نمبر معزز ناظرین کے سامنے ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اسے حسن قبول حاصل ہو اور اربابِ ذوق کی نظروں میں وہی جگہ پائے جس کا یہ مستحق ہے اس تازہ اولوالعزمی کا نتیجہ نفع کا سامان ہو یا نقصان کا موجب۔ یہ اپنا اپنا مقسوم اور مقدر ہے۔ سردست ہم اسی خیال کو لے کر مطمئن ہوتے جاتے ہیں کہ ہم نے ایک اچھی چیز مہیا کرنے میں مقدور بھر کوشش کی ہے۔ اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ مردانہ وار جد و جہد مالک رسالہ کیلئے بھی مشکور ہو اور جوبلی نمبر کے نقصان کی تلافی کر سکے۔

(جوش ملسیانی)

رسالوں اور اخباروں کی روز افزوں بہتات کے ساتھ ہی خاص نمبر نکالنے کی رسم اب اسقدر عام ہو چکی ہے کہ بطور پیشے کے اختیار کر لیگئی ہے۔ اور شاید ہی کوئی بدنصیب پرچہ ملک میں ایسا ہوگا جس نے سال میں دو تین خاص الخاص نمبروں کے نکالنے اور شائع کرنے کا بڑے طمطراق سے اعلان نہ کر رکھا ہو۔ ان خاص نمبروں میں کیا ہوتا ہے۔ بد نقش اور عریاں تصویریں۔ فحش افسانے۔ بیہودہ غزلیں اور ادنیٰ درجہ کے مضامین جنکو پڑھکر مذاق سلیم کو گھن آئے اور جنہیں دیکھکر صحیح الدماغ انسان انہیں پھینک دینے پر مجبور ہو۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ من اولہ الی آخرہ سارے ہی پرچے خرافات۔ واہیات۔ لغویات اور لہویات کی پوٹ ہوتے ہیں۔ مگر اس سچ میں کیا جھوٹ ہے کہ بیشتر تعداد آجکل ایسے ہی پرچوں کی شائع ہو رہی ہے۔ جو ادنیٰ درجہ کا مذاق رکھتے اور اشاعت فحش کے ٹھیکیدار ہیں۔ آزادی رائے اور آزادی خیال کا زمانہ ہے۔ لوگ پیغمبری چھوڑ خدائی کا دعوے کر رہے ہیں۔ اور کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں۔ تو پھر نوجوان اور ناتجربہ کار ایڈیٹروں اور فحش نویس مضمون نگاروں کو کون پوچھے؟ پبلک کا مذاق ہمیشہ ہی سے بگڑا ہوا ہے۔ اس بدمذاقی کو دیکھتے ہوئے ایڈیٹروں کی آنکھیں روپہلی سنہری ٹکلیوں کی چکاچوند سے ایسی خیرہ ہوئیں۔ کہ صاف اور سیدھی راہ عمل سے بھٹک کر فحش اور ادنیٰ درجہ کے مذاق کی پرپیچ پگڈنڈی پر ہو لئے۔ اور آنکھیں بند کئے ہوئے جا رہے ہیں۔ یقین ہے کہ عنقریب بدنامی و رسوائی اور ذلت و بدنصیبی کے اس عمیق گڑھے میں گر پڑیں گے۔ جو پگڈنڈی کے انجام پر کھدا ہوا ان کا انتظار کر رہا ہے۔

رہنمائے تعلیم بھی دوسرے رسائل کی مانند ایک رسالہ ہے۔ اسکو بھی ایسی ہی ضروریات درپیش ہیں۔ جیسی دیگر رسائل کو۔ اسکو بھی اپنے بقا و قیام کے لئے اس چیز کی جسے پیسہ کہتے ہیں۔ ایسی ہی حاجت ہے جیسی اسکے ہم پیشہ دوسرے پرچوں کو۔ وہ بھی اگر چاہتا۔ تو بازاری اشتہارات جمع کر کے بہت ساری دولت اکٹھی کر سکتا تھا۔ ادنیٰ مذاق کے بیہودہ مضامین شائع کر کے پبلک کی توجہ اپنی طرف منعطف کرا سکتا تھا۔ عریاں اور فحش تصاویر چھاپ کر لوگوں کو اپنا دلدادہ بنا سکتا تھا۔ مگر اس کے ناظرین دیکھ رہے ہیں۔ کہ اس نے اٹھائیس انتیس سال سے نہایت سلامت روی۔ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ لٹریچر کے ساتھ اپنے ناظرین کی ضیافت کی ہے۔ اور کبھی جادہ مستقیم سے اسکا قدم نہیں ڈگمگایا۔ اگرچہ

حوادث کی آندھیاں اس پر چلیں۔ مصائب کے طوفان اُس پر آئے مگر وہ سمندر میں مستحکم چٹان کی طرح ثابت قدم رہا۔ اور ہمیشہ ادنے درجہ کا لٹریچر چھاپنے سے اُس نے پرہیز کیا۔

لیکن مشکلات کے اس بحرِ بے پایاں میں زمانہ کی موجودہ ترقیات کے ساتھ ساتھ رواں رہنے میں اُس نے کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ اور مجھے بلا خوفِ تردید یہ کہنے دیجئے کہ اس کوشش میں وہ ہندوستان بھر کے تمام رسائل میں اوّل درجہ پر کامیاب رہا۔ چنانچہ جس وقت ملک میں خاص نمبروں کی رَو چلی۔ اور ہر طرف سے رنگ برنگ کے خاص نمبر نکلنے لگے۔ تو "رہنمائے تعلیم" نے بھی ارادہ کیا۔ کہ اپنا ایک "خاص نمبر" نکالے مگر اس شان کے ساتھ کہ اُردو صحافت کی تمام گذشتہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز رہ جائے اور آئندہ بھی کسی ایرے غیرے کو اُس بلندی تک پہنچنے کی ہمت نہ ہو۔ چنانچہ دنیا نے حیرت اور استعجاب کے ساتھ دیکھا کہ ساڑھے سات سو صفحے کی یہ ضخیم سائیکلوپیڈیا ادبی عجائبات کی ایک سیرگاہ تھی۔ ہر مضمون معلومات کا خزینہ اور ہر مقالہ مفید امور کا ایک گنجینہ تھا۔ مکرمی سردار جگت سنگھ صاحب کی یہ اولوالعزمانہ جسارت بلاشبہ اس قابل تھی کہ "جوبلی نمبر" ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ اور آج لوگ اُسے ڈھونڈتے پھرتے اور نہ پاتے لیکن بدمذاقی کی انتہا دیکھیے کہ اسقدر مفید اسقدر عظیم الشان اور ایسی نایاب چیز کی یہ قدر پبلک نے کی۔ کہ اسکی تقریباً ڈیڑھ ہزار کاپیاں دفتر میں پڑی گاہکوں کا انتظار کر رہی ہیں۔ اور بے چارہ مالک اپنے آٹھ ہزار روپے کے اس گرانقدر نقصان کا ماتم کر رہا ہے۔ جو اس نے اس نمبر کی تیاری میں پانی کی طرح سے بہا دیا۔ "جوبلی نمبر" میں گلستانِ ادب کے وُہ سدابہار پھول کھلے ہوئے ہیں جن کی بھینی بھینی نزہت ہمیشہ ہی مشامِ جان کو معطر رکھے گی۔ نہ کبھی وہ باسی ہوں گے اور نہ مرجھائیں گے۔ خوش نصیب ہوں گے وہ اہلِ ذوق بزرگ جو اب بھی عـ۴ بھیجکر ادب و شعر۔ تاریخ و سیر طب و سائنس تعلیم و اخلاق تنظیم و کوآپریشن کے اس لاثانی مجموعہ کو منگائیں۔ اور اپنی لائبریری کی زینت بنائیں۔ یقیناً عـ۴ روپے میں بڑے سائز کے ساڑھے سات سو صفحے۔ پھر رنگین و خوشنما چھپے ہوئے اعلیٰ کاغذ اور بہترین لکھائی کے ساتھ کوڑیوں کے مول ہیں۔ اسپر مزید یہ کہ ملک کے سربرآوردہ اور چوٹی کے ادیبوں اور انشاپردازوں کی ایک سو کے قریب تصاویر سے جو آرٹ پیپر پر چھاپی گئی ہیں۔ رسالہ کے اوراق کہکشاں بنے ہوئے ہیں۔

اس شاندار "جوبلی نمبر" پر بے دریغ روپیہ اور بے انتہا محنت صرف کرنے کے بعد پبلک کی طرف سے اسقدر سرد مہری ایسا برتاؤ نہ تھا۔ کہ اُس سے سبق حاصل کرکے سردار جگت سنگھ صاحب کوئی دوسرا خاص نمبر نکالنے کی کبھی جرأت کرتے۔ سردار صاحب کی بجائے کوئی دوسرا ہوتا۔ تو یہ صدمہ اُسے یقیناً لے بیٹھتا۔ اور دوسرا خاص نمبر تو نکالنا رہا درکنار خود رسالہ کی ہستی ہی سنبھالنی اسکے لیئے ناممکن ہو جاتی۔ چنانچہ وہ لوگ جنہوں نے "جوبلی نمبر" سے نصف ضخامت کے خاص نمبر نکالنے کی جرأت کی تھی۔ نقصان کو برداشت نہ کرتے ہوئے آج کنجِ لحد میں

سو رہے ہیں۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے خود مجھے یقین نہیں تھا کہ سردار صاحب آئندہ کوئی خاص نمبر شائع کرنے کا ارادہ کرینگے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب پچھلے اگست میں جھنگ جاتے ہوئے مجھے ایک ٹرین سے سردار صاحب نے لاہور ٹھیرالیا۔ اور کہا کہ "ایک افسانہ نمبر نکالنا ہے"۔ میں تعجب سے ان کا منہ تکنے لگا۔ اور میں نے کہا "کیا جوبلی نمبر کی ساری کاپیاں نکل گئیں؟" کہنے لگے "وہ سامنے کیا انبار لگا ہوا ہے۔ دیکھ لیں"۔ میں نے کہا "میں کیا دیکھوں۔ آپ دیکھیں۔ اس بھاری پتھر کو اپنے سینے پر سے ہٹانے کی بجائے آپ چاہتے ہیں۔ کہ چار من کا ایک اور پتھر اپنے سینے پر رکھ لیں"! مسکرا کر کہنے لگے "میاں! این ہم بر بالائے علم۔ پیسے کا نہ کبھی مجھے پہلے خیال ہوا۔ نہ اب ہے۔ صرف یہ چاہتا ہوں۔ کہ چیز اچھی اور غذا مزے کی ہو"۔ میں نے کہا۔ "کام بھی آسان نہیں۔ اعلیٰ پایہ کا افسانہ نمبر نکالنا ایسا ہی مشکل ہے۔ جیسا ہندوستانی رسائل کے لئے "جوبلی نمبر" کا مقابلہ کرنا جس کے وہ آئندہ پچاس برس تک بھی قابل نہ ہوسکیں گے"۔ کہنے لگے "کچھ بھی ہو۔ پرچہ ایسی شان کا نکالنا ہے کہ حریف شرمندہ ہوکر رہ جائیں اور دعویداران ادب کی کمر ٹوٹ کر رہ جائے۔ شائقین کہیں واہ۔ حاسدین کہیں آہ"! میں نے جواب دیا۔ "خیر یونہی سہی۔ آپ کو اپنا روپیہ اس سٹہ بازی میں برباد کرنا ہے۔ کر دیجئے۔ مگر خدا کے لئے کام کا ارادہ کیا ہے۔ تو اس کے لئے کسی بہتر آدمی کو انتخاب کیجئے۔ مجھ میں اس کام کی نہ اہلیت ہے نہ قابلیت۔ لوگ ہنسیں گے۔ اور میرا اور آپ کا دونوں کا مذاق اڑائیں گے۔ مجھے تو خیر جانتا ہی کون ہے۔ مگر آپ کی مفت میں بدنامی ہوگی"۔ سردار صاحب نے کہا "خیر یہ بھی ایک تجربہ سہی۔ اللہ کا نام لیکر کام شروع کردو۔ اور ضرور شروع کردو"۔ میں نے کہا "الامر فوق الادب۔ مگر یہ پیشگی کہے دیتا ہوں۔ کہ اس انتخاب سے آپ بعد میں پچھتائینگے"۔ بات ختم ہوگئی اور میں "عروج" کی ایڈیٹری کے لئے جھنگ چلا گیا۔ بعد میں بھی دو ایک مرتبہ کام کی اہمیت اور اپنی نااہلیت کو دیکھتے ہوئے میں نے رسیاں تڑانے کی کوشش کی۔ مگر سردار صاحب کا اصرار میرے انکار پر غالب رہا۔ چنانچہ میں کام میں لگ گیا۔ اور جیسا برا بھلا ہوسکا۔ مرتب کرکے "افسانہ نمبر" ناظرین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اگر باذوق اور صاحب ذوق قارئین کرام اسمیں خاطر خواہ دلچسپی۔ ندرت اور دلکشی کا سامان نہ پائیں۔ تو الزام مجھے نہیں۔ بلکہ سردار صاحب موصوف کو دیں۔ جنہوں نے اس کام کے لئے ایسے شخص کو چنا۔ جو واقعی طور پر اس کا اہل نہ تھا۔ اور اگر میری خوش قسمتی سے یہ نمبر ناظرین کو پسند آئے تو تعریف کے مستحق وہ ادیب اور سحر نگار ہیں۔ جن کے افسانے اس نمبر کو زینت دے رہے ہیں۔ اگرچہ میری آرزو یہی ہے کہ ناظرین اس نمبر کو دیکھکر ناک بھوں نہ چڑھائیں۔ تاکہ میری محنت اور سردار صاحب کا روپیہ ضائع نہ جائے۔

(خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی)

سالِ نَو

"افسانہ نمبر" اور "جوبلی نمبر"

(پنڈت اندر جیت شرما ماچھرہ ضلع میرٹھ)

لایا پیامِ تازگیٔ روح سالِ نو
جس سے ملی چمن کو نویدِ بہار آج

ہیں فرطِ انبساط سے غنچے کھلے ہوئے
بُلبل ترانہ سنج ہے مستانہ وار آج

بدلا ہوا ہے دہر کی تہذیب کا نظام
کہتا ہے کون بدلے ہیں لیل و نہار آج

محفل نئی ہے بیٹھے ہیں میکش نئے نئے
ساقی عطا ہو جام کوئی خوشگوار آج

گلدستۂ ادب میں فسانوں کے پھول ہیں
کس درجہ دلفریب ہیں نقش و نگار آج

اک شاہدِ خیال نے حیراں بنا دیا
دل کو کروں نثار کہ جاں کو نثار آج

جس شان جس ادا سے منائی تھی جوبلی
ہے سامنے نظر کے وہی یادگار آج

افلاک پر ادب کے وُہ خورشید ایک ہے
باغِ ادب میں یہ گلِ اُمّید ایک ہے

(شرما)

فسانہ نمبر کی خصوصیات

ایک بڑی خصوصیت

یہ ہے۔ کہ

اُس میں ایک نہایت عجیب اور جدید مضمون شائع ہُوا ہے

جس کا عنوان ہے

"فسانہ نویسی کا فسانہ"

یہ مضمون مختصر فسانہ نویسی کی ایک نہایت جامع اور تفصیلی تاریخ ہے جس میں قدیم سے لیکر اسوقت تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ہر ملک اور قوم کی فسانہ نویسی کی تاریخ لکھی گئی ہے اردو فسانہ نویسی کو چار دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور پھر ہر دَور سے علیحدہ علیحدہ بحث کیگئی ہے۔ اس کے بعد بے انتہا تلاش سے موجودہ فسانہ نگاروں کی سینکڑوں تصانیف کی تفصیل بیان کیگئی ہے۔ آخر میں دو سو کے قریب اُن ادیبوں اور انشا پردازوں کے نام دیئے گئے ہیں۔ جو عام طور پر فسانے لکھتے رہتے ہیں۔

یہ سب سے پہلا مضمون ہے۔ جو اس جامعیت اور اس تفصیل کے ساتھ مختصر فسانہ نگاری کی تاریخ پر اردو زبان میں لکھا گیا ہے؛

آجتک ہندوستان کے کسی پرچہ میں فسانہ نگاری کی تاریخ پر ایسا مضمون شائع نہیں ہوا۔ اکیلا یہ مضمون دیگر رسائل کے پچاس مضامین سے زیادہ قیمتی ہے ——— !!

مضمون کی قدر و قیمت صرف ملاحظہ کے بعد معلوم ہو سکتی ہے۔

فسانہ نمبر کی چند اور موٹی موٹی خصوصیات

(۱)

ملک میں آئے دن مختلف اخبارات و رسائل کے "فسانہ نمبر" شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر تقریباً پانچ سو صفحے کا طول طویل اور ضخیم فسانہ نمبر آج تک کوئی شائع نہیں ہوا

(۲)

جتنے حسین و جمیل جتنے دلکش و دلچسپ۔ جتنے متین و سنجیدہ۔ جتنے مزاقیہ و مزاحیہ جتنے اخلاقی و علمی۔ جتنے مفید و کارآمد فسانے اس فسانہ نمبر میں درج میں۔ ویسے ہندوستان کے کسی دوسرے پرچے میں نظر نہیں آئیں گے۔

(۳)

"فسانہ نمبر" کا حصہ نظم نہایت کیف آور۔ وجد آفریں۔ سحر کن اور ادبی رنگ میں ڈوبی ہوئی نظموں سے مزین ہے

(۴)

ہر فسانہ کا عنوان نہایت خوبصورت پھول بوٹوں اور نازک نقش و نگار سے سجایا گیا ہے!!

(۵)

اکثر صفحات رنگین چھاپے گئے ہیں۔ جو پکار پکار کر اپنے حسن اور اپنی لطافت کو ظاہر کر رہے ہیں۔

(۶)

ادبی نظموں کے علاوہ بڑی محنت کے ساتھ فسانہ نمبر کیلئے تاریخی نظمیں باکمال شعراء سے لکھوائی گئی ہیں۔

(۷)

[ہر] قسم کے دلکش فسانوں سے رسالہ کو زینت دی گئی ہے۔ مثلاً ادبی۔ علمی۔ معاشرتی۔ اخلاقی۔ اصلاحی۔ تاریخی۔ جاسوسی۔ نسوانی وغیرہ

(۸)

بھرتی کے رذیل اور عشقیہ فسانوں سے رسالہ کو پاک رکھا گیا ہے۔

غرض فسانہ نمبر ادبی عجائبات کا مجموعہ

اور

[بہتر]ین فسانوں کی ایک دلچسپ اور مزیدار سائیکلو پیڈیا ہے۔ باوجود ان خوبیوں کے قیمت صرف ۱۲ؔ فی کاپی ہے!

ایک دردناک اپیل درد مند اصحاب کی خدمت میں

گذارشِ احوال حقیقت کے لباس میں

میں نے گذشتہ رہنمائے تعلیم کا "جوبلی نمبر" نکال کر اپنی لباط۔ اپنے مقدور اور اپنے حوصلہ سے بہت زیادہ ہمت کے ساتھ آپ صاحبان کے سامنے ایک ایسی چیز پیش کی تھی جس کا جواب اردو لٹریچر کی تاریخ میں نہ تھا۔ اور نہ اسوقت تک صحافتی دنیا ایسا عظیم الشان۔ اتنا ضخیم اور اسقدر مفید پرچہ شائع کر سکی ہے ....۔ اسکے شائع ہوتے ہی تعریفی بیانات اور تنقیدی تحریروں کا ڈھیر لگ گیا۔ تمام سربرآوردہ اخباروں۔ سارے چوٹی کے ادیبوں۔ تمام اعلیٰ درجہ کے انشاپردازوں اور سب اہل ذوق اصحاب نے انتہائی حوصلہ افزا الفاظ میں اسکی تعریف کی۔ اُسے ادبی سائیکلو پیڈیا۔ اور علوم کا مخزن بتایا۔ ایک مشہور ادیب نے جو ایم اے ہیں۔ اس پر ۱۶ صفحے کی زبردست اور شاندار تقریظ لکھی۔ یہ سب کچھ ہوا۔ مگر میری حد سے زیادہ دماغی محنت اور میری آٹھ ہزار روپے کی گرانقدر رقم۔ دن کا چین اور رات کا آرام اور ہندوستان بھر کے مشہور مشہور ادیبوں اور انشاپردازوں کی محنت و کاوش سب بیکار گئی اور میں مالی لحاظ سے تہی دست ہو کر بیٹھ گیا۔ "جوبلی نمبر" کی ڈیڑھ ہزار کے قریب کاپیاں دفتر میں پڑی ہوئی شائقین کا انتظار کر رہی ہیں۔ اور میری جان انہیں دیکھ دیکھ کر سوکھ رہی ہے۔ حالانکہ اگر ہمدرد اور اہل ذوق اصحاب ذرا بھی کوشش فرماتے اور کچھ نہیں صرف ایک ہی ایک خریدار ہر صاحب اپنے حلقہ اثر میں سے جوبلی نمبر کا مہیا فرما دیتے۔ تو یقیناً میں اس مالی زیرباری اور عظیم الشان بوجھ کے نیچے دبنے سے بچ جاتا جس کی وجہ سے میرا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ ہمت نے جواب دیدیا۔ اور اُمنگ رخصت ہو گئی۔ یہی شکر ہے کہ آپ صاحبان کی خدمت کے لئے ابھی تک زندہ ہوں۔

اگر آپ صاحبان کو رہنمائے تعلیم کی بقا اور اپنی خدمت کے لئے میری حیات کی ضرورت ہے۔ اگر مجھے مشکلات کے بھنور اور مصائب کے طوفان سے نجات دلانی منظور ہے۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں۔ کہ رہنمائے تعلیم بیش از پیش اولوالعزمیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ آپ کی خدمت پر مستعد رہے۔ تو اسکی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ جس طرح بھی ہو اس ڈیڑھ ہزار من کے بھاری پتھر کو میرے کمزور سینے پر سے ہٹانے میں رہنمائے تعلیم کے سارے معاونین۔ سرپرست۔ خریدار۔ ہمدرد اور مضمون نگار اصحاب متفقہ طور پر کوشش فرمائیں اور ہر شخص جس کو میری مصیبت اور مشکلات و تکالیف کا ذرا سا بھی احساس ہے۔ وہ کم از کم ایک ایک

خریدار ضرور ہی جوبلی نمبر" اور "فسانہ نمبر" کا مہیا کرے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کے لئے اپنے حلقہ اثر میں سے صرف ایک خریدار پیدا کر دینا ہرگز کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ بلکہ بہت آسانی کے ساتھ ممکن ہے ؛

یہ نہ سمجھیں۔ کہ جوبلی نمبر" ایک پرانی چیز ہو گیا ہے۔ اور اب اسمیں وہ خوشبو و شگفتگی باقی نہ رہی ہوگی۔ جو تازہ گلاب میں ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جوبلی نمبر کا ہر مضمون ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اور پرانا ہونے سے اسکے مفید اور پُر از معلومات ہونے میں کچھ بھی فرق نہیں پڑ سکتا۔ یہ علوم۔ ادب۔ تاریخ اور اخلاق کی ایک مختصر سائیکلوپیڈیا ہے۔ اور ہمیشہ ہی جب اسے استعمال کیا جائے "تازہ اور جدید معلوم ہوگی۔ "فسانہ نمبر" جیبی تقطیع۔ اعلیٰ کاغذ نفیس لکھائی بہترین چھپائی۔ اکثر صفحات رنگین۔ ساڑھے سات سو صفحات کا ضخیم۔ ایک سو فوٹوؤں اور آرٹ پیپر کی تصاویر سے مزین۔ بہترین مضامین سے آراستہ۔ اور قیمت صرف ڈھائی روپے۔

آپ ہی فرمائیں۔ اس قدر قیمت۔ اس شان اور اس حیثیت کا بے نظیر اور لاجواب پرچہ کیا ڈھائی روپے میں مہنگا ہے؟ آپ منگائیں۔ دیکھیں اور پڑھیں اور اگر ذرا بھی ناپسند یا خلاف طبیعت پائیں تو فوراً بلا تامل واپس فرمائیں۔ آپ کی قیمت بلا حیل و حجت واپس کر دی جائیگی ؛

مجھے امید ہے کہ میری یہ دردناک اپیل ضائع نہ جائیگی۔ اور میرے محسن اپنے احباب سے "جوبلی نمبر" اور "فسانہ نمبر" کی فرمائشیں بھجوا کر مجھے شکر گذار ہونے کا موقع دینگے۔ میں ایسے مخلص اور ہمدرد بزرگوں کے اسمہائے گرامی برابر رہنمائے تعلیم میں شائع کرتا رہونگا۔ اور ان کا اس عنایت کے لئے نہایت درجہ ممنون ہونگا۔

(نوٹ) جو اصحاب "جوبلی نمبر" اور "فسانہ نمبر" دونوں اکٹھے منگائیں گے۔ ان سے بجائے ساڑھے چار روپے کے صرف چار روپے لئے جائیں گے۔ اور جو دونوں نمبر خریدنے کے ساتھ رسالہ "رہنمائے تعلیم" کے بھی سالانہ خریدار ہوں گے۔ ان سے للعہ - للعہ ۔ عیہ کی بجائے صرف سات روپے لئے جائیں گے۔ یہ انتہائی رعایت ہے۔ جو میں کر سکتا ہوں۔ ہاں اگر سکولوں کے طلباء اکٹھے ملکر فسانہ نمبر کی دس دس بیس بیس کاپیاں یکمشت طلب کریں۔ تو ہیڈ ماسٹر صاحب کی تصدیق پر اُن سے صرف عہ فی کاپی لے لی جائیگی۔ وہ رقم اکٹھی کرکے بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں۔ یہاں سے بذریعہ سواری گاڑی فسانہ نمبر کی مطلوبہ کاپیاں اُنہیں بھیجدی جائیں گی ؛

خادم
جگت سنگھ۔ مینجنگ پروپرائٹر رسالہ "رہنمائے تعلیم"
رام گلی۔ لاہور

(شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی)

(ماسٹر جگت سنگھ پنجاب پروپرائیٹر

رہنمائے تعلیم کے معزز ناظرین کو سال ۱۹۳۴ء مبارک ہو!

سال ۱۹۳۳ء کا خاتمہ اور سال ۱۹۳۴ء کی آمد

رہنمائے تعلیم کی انتیسویں سالگرہ

قارئین کرام!

سال ۱۹۳۴ء کے آغاز کے ساتھ آپ کا اپنا رہنمائے تعلیم اپنی خدمتگذاری کی اٹھائیسویں منزل کو طے کر کے انتیسویں منزل میں قدم رکھتا ہے۔ اسکی درازیٔ عمر اس امر کی شہادت ہے کہ جس فرقہ کا وہ آرگن ہے۔ وہ اس کا وجود مغتنمات سے مانتے ہیں۔ اور اسکی ہستی ان کے لئے ضروری ہے۔ ورنہ خدانخواستہ اس کا بھی وہی حشر ہوتا۔ جو اس کے کئی ہمعصروں کا ہو چکا ہے۔ جو بڑے چاؤ سے عالمِ وجود میں آئے۔ مگر جلدی ہی نامساعد حالات کا شکار ہو کر یہ کہتے ہوئے دُنیا سے رخصت ہو گئے ؎

ابھی جامِ عمر بھرا نہ تھا کفِ دستِ ساقی چھلک پڑا ۔ رہیں دل کی دل ہی میں حسرتیں کہ نشاں قضا نے مٹا دیا

اس میں شک نہیں کہ مہذب ممالک میں ہر فرقہ اپنے آرگن پر نازاں اور اسکی ہستی اپنے لئے لازم و ملزوم مانتا ہے کاش کہ یہ جذبہ ہمارے ہاں بھی پورے زور سے جلوہ گر ہوتا۔ اور ہر آرگن اپنے اپنے فرقہ کی نمایندگی کرتا ہوا اس امر کا بھول کر بھی خیال نہ کرتا کہ اس کا مستقبل خطرے میں ہے یا اسے اپنی شکم پری کا خطرہ رہ رہ کر ستا رہا ہے۔ مگر یہاں ہنوز دہلی دور است کا نقشہ دکھائی دے رہا ہے۔ کیونکہ ہمارے مشاہدہ میں آرہا ہے۔ کہ حالات حاضرہ میں رہنمائے تعلیم کے کئی کرمفرما اسکی سرپرستی سے محض اس عذر لنگ پر چشم پوشی کئے ہوئے ہیں۔ کہ ان کی تنخواہ پر تخفیف کا کلہاڑا چل گیا ہے۔ اور ان کی مالی حالت انہیں اجازت نہیں دیتی۔ کہ وہ اس کی سرپرستی کر سکیں۔ حالانکہ جائز تھا کہ مدرسین کا یہ آرگن اس فخر کو لئے ہوتا۔ کہ اس کے سرپرست کسی حالت میں بھی اسکی جدائی گوارا نہیں کر سکتے۔ اور تخفیف کے باوجود جسطرح دیگر ضروری مصارف کو سرانجام دے رہے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے آرگن کو ضروری خرچ مان کر اسے بدستور اپنائے رہتے۔ اور اسے کس مپرسی کی شکایت کا موقعہ نہ دیتے۔ عجب نہیں کہ یہ محض میرا خیال ہو اور وہ کسی اور مصلحت کے ماتحت ایسا کئے ہوں۔ اور وقت آنے پر پھر بدستور اسکے یار غار ہو جائیں۔

سال ۱۹۳۳ء مالی مشکلات کا خاص سال تھا۔ مگر رہنمائے تعلیم کی خوش قسمتی ہے۔ کہ اسی سال میں جناب ڈپٹی

انسپکٹر اصحاب لاہور جالندھر وانبالہ نے اپنے خاص سرکلرات سے اسکی ہمت بندھائی اور اپنے اپنے ڈویژن کے ذمہ دار افسران کی توجہ رہنمائے تعلیم اور اس کے شہرہ آفاق "جوبلی نمبر" پہ دلائی۔ چنانچہ ایسے ہی بزرگواروں کے صدقے جوبلی نمبر کی متعدد کاپیاں لائبریریوں کے لئے خریدی گئیں۔ اور رہنمائے تعلیم کی خریداری کے جاری رکھنے میں جو رکاوٹیں یا شکوک سدِ راہ ہوگئے تھے۔ وہ بہت حد تک دور ہو گئے۔ میں ہر سہ بزرگواروں کا دل سے ممنون ہوں کہ ان کی توجہ فیض ہوجہ "رہنمائے تعلیم" کے آڑے آئی۔ اور مجھے توقع ہے کہ سالِ نو میں اُنکی حوصلہ افزائی از سرِ نو اپنے جوبن پر آجائیگی۔ اور سررشتۂ تعلیم کا یہ قدیمی خادم اپنے فرائض کو باحسن وجوہ سرانجام دیتا رہے گا۔ اس موقعہ پر مجھے جناب ڈویژنل انسپکٹر اصحاب ملتان اور راولپنڈی سے بھی یقین ہے کہ وہ اپنے خادم کو بھولے نہ ہونگے۔ بلکہ نئے سال میں اپنے اپنے ڈویژنوں میں اسکی حوصلہ افزائی کے لئے خاص سرکلرات سے اسکی سرافرازی کا موجب ہوں گے

حضرات! یہ امر میرے منصب سے بالاتر ہے کہ میں رہنمائے تعلیم کے محاسن جتلاؤں اور اسکی خدمتگزاریوں پر روشنی ڈالوں۔ کیونکہ عیاں راچہ بیاں۔ اس کا جذبۂ خدمتگذاری ہی ہے جو آپ کے دلوں کو اپیل کرتا ہے۔ اور آپ کی توجہ اسکے شاملِ حال ہے۔ لہذا اسے آپکے پوتر ہاتھوں میں محفوظ دیکھکر آپ کی عنایات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور باقی امورات کی طرف آپ کی توجہ دلاتا ہوں۔

اڈیٹوریل سٹاف بدستور سابق انہی اصحاب کا مجموعہ ہے۔ سال ۱۹۳۲ء میں جناب وزیارتھی صاحب خانگی مصروفیات کی وجہ سے اپنے رہنمائے تعلیم کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے۔ شکر ہے کہ اب آپ فارغ ہیں اور طمانیت قلب سے تازہ دم ہوکر اسکی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ جناب جوش ملسیانی کا نام نامی ہی رسالہ کی عمدگی اور خوبی کی کافی سے زیادہ ضمانت ہے۔ رسالہ کی خوش قسمتی قابل صد رشک ہے۔ جسکی عنانِ ادارت آپ ایسے قابل بزرگوار کے ہاتھوں میں ہے۔ میرے عزیز بھائی مسٹر ہیدیا ابھی رسالہ کی خدمتگذاری میں بدستور سابق منہمک ہیں اور اپنی جگہ پر رسالہ کی خوبیوں کو چار چاند لگانے کا موجب ہو رہے ہیں۔ پروفیسر طالب کاشمیری مسافت بعیدہ پر ہیں اسلئے خاص وقت نہیں دیسکتے۔ مگر پھر بھی دل سے اسکی خیرخواہی کا دم بھرتے ہیں۔ اور موقع مناسب پر خدمتگذاری کے میدان میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

تعلیم جو رسالہ کے اجرا کا حقیقی مقصد ہے۔ اسکے متعلق سال کے دوران میں رہنمائے تعلیم نے متعدد قابل قدر مضامین شایع کئے۔ نظم و نسق مدرسہ پر مکرمی سید اشفاق حسین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی کے خطوط کا سلسلہ بلاشبہ نہایت مفید اور غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ علاوہ ازیں ابتدائی طریقہ تعلیم پر صمدانی صاحب اور باوا برکت سنگھ صاحب کے مضامین بیش بہا نصائح کا مجموعہ ہیں۔ عام معلومات کو بڑھانے والے مضامین میں سب سے زیادہ دلچسپ اُن خطوط کا سلسلہ ہے۔ جو مخدومی شیخ محمد بدرالاسلام صاحب نے جاپان سے اپنے ایک دوست کو بھیجے۔ اور

اُنہوں نے شائع کرنے کے لئے ہمیں بھیجدیئے۔

دُنیا کی فلک بوس عمارتوں کے متعلق مورخ صاحب کا مضمون۔ نظامِ شمسی پر لالہ کرشن چندر کا مقالہ۔ اور جرمنی کے صحت افزا مقامات پر لالہ کشن چند کا مضمون یقین ہے۔ بڑی دلچسپی سے پڑھے گئے ہونگے۔ سال کے دوران میں تاریخی مضمون بھی اچھے اچھے شائع کیے گئے۔ تذکرہ خواتین مورخ صاحب کا۔ جوناگڈھ کی تاریخ منشی انور خاں صاحب کی۔ اور کھیلوں کی تاریخ عزیز احمد صاحب کی۔ ان میں سے ہر مضمون بجائے خود پڑھنے کی چیز ہے۔ مزاحیہ مضامین میں "مضمون نگاری کی شرط پر ایک لطیف تنقید"۔ تو واقعی ایسے پیرائے میں قلم بند ہوا۔ کہ لوگوں نے اُسے بڑے مزے لے لے کر پڑھا۔ اور جن صاحب کے متعلق وہ "تنقید" تھی۔ وہ تو ایسے خاموش ہوئے کہ گوئی مردہ اند۔ حفظانِ صحت اور زمیندارں کی اصلاح و ترقی کے متعلق بھی بعض مضامین جو درحقیقت مفید معلومات پر حاوی تھے۔ سال کے دوران میں شائع ہوئے ہیں ان کے لئے ہم ڈاکٹر شیاما چرن ورما صاحب منشر میڈیکل آفیسر کے ممنون ہیں۔

سب سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ آجکل فسانے پڑھے جاتے ہیں۔ مگر عام طور پر ملک کے رسائل میں جو فسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ بھدے۔ چھچھورے اور عشقیہ ہوتے ہیں۔ اخلاقی فسانوں کو کوئی نہیں پڑھتا۔ مگر رہنمائے تعلیم کو یہ فخر حاصل ہے۔ کہ اس میں شائع شدہ فسانے بڑی ہی دلچسپی اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ سیر بھر چاول۔ ایمان کا پھل۔ اور ایثار کا دیوتا جو سال کے دوران میں رسالہ میں شائع ہوئے۔ اُن کو لوگوں نے بار بار پڑھا۔ ادبی مضامین پر جناب جوش ملسیانی صاحب نے نہایت موزوں اور مناسب الفاظ کے ساتھ مختصر تنقید فرما دی ہے۔ لہذا اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ ہم نہایت تہ دل سے اپنے ان تمام قلمی معاونین اور ہمدردوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں۔ کہ اُن کی قلمی عنایات کا سلسلہ رہنمائے تعلیم کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے گا۔

رہنمائے تعلیم گورنمنٹ گزٹ۔ ضروری سرکلرات محکمہ اور پنجاب یونیورسٹی کی تمام خبروں کا نچوڑ بہتر سے بہتر طریق میں پیش کئے ہیں۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب کے سرکلرات۔ انجمن معلمین کے خاص اجلاس تحصیلی کانفرنسوں اور ڈویژنل تعلیمی کانفرنسوں کو من و عن پیش کر کے مدرسین کی خاص رہنمائی و آگہی کا موجب ہو رہا ہے۔ اس کا

گلدستۂ اطفال

ذہین اور ہوشیار طالب علموں کی حوصلہ افزائی کا موجب ہو رہا ہے۔ ان کے مضامین لطیفے۔ رہنمائے ریاضی کی ذیل میں عمدہ عمدہ سوالات کا حل اور معمے ایسے ان کی گوناگوں دلچسپیوں کا موجب بنائے ہوئے ہیں۔ غرض اس میں اس قسم کا ذخیرہ دیا جاتا ہے۔ کہ اگر زیر تعلیم بچے اُس کا باقاعدہ مطالعہ کریں۔ تو ان کی معلومات میں خاص اضافہ ہو کر ان کی تعلیمی بنیاد پورے طور سے پختہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شائقین کی تعداد آئے دن بڑھ رہی ہے۔ اور اس کی ہستی ان کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہو رہی ہے۔

رہنمائے تعلیم کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسکے گلدستہ اطفال کے مسلسل اور پُرشوق مطالعہ کی وجہ سے اکثر ہونہار بچے مضمون لکھنے لگے۔ اور اگر اُن کا شوق برابر قائم رہا۔ تو وُہ دِن دُور نہیں۔ جب وہ اعلیٰ پایہ کے مضمون نگار بنجائینگے

اس سلسلہ میں ہم یہاں اپنے ننھے مضمون نگاروں میں سے چند کے نام لکھتے ہیں:۔

طاہر غلام ناصر خاں۔ محمد شریف۔ عزیز احمد قریشی۔ کرتار سنگھ پاسبخ۔ محمد بشیر حسن خاں شاہجہانپوری۔ نور محمد کشمیری لال پوری۔ پرشوتم لال۔ چرن ادھار باوجہ۔ صابر غلام ناصر خاں۔ بالکشن داس۔ رتن پرکاش شرما۔ گوربخش سنگھ گوہر۔ عبدالحی حیدرآبادی۔ لکشمی نرائن وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو نظرِ بد سے بچائے اور ان کے علمی شوق کو دن دونا اور رات چوگنا کرے۔

افسانہ نمبر کی مصروفیت مانع ہے۔ اسلئے اس مختصر بیان کے ساتھ سال گذشتہ کے کارناموں کو ختم کرتا ہوں۔ اور رسالہ کے تمام عنایت فرماؤں کا ان کی سرپرستی۔ اسکی اشاعت میں امداد اور مضامین کی ترسیل وغیرہ ...... کے لئے صدق دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خدائے پاک کے فضل وکرم سے ۱۹۲۳ء جیسا مالی مشکلات کا انتہائی سال بخیر وخوبی سرانجام ہوا۔ آپ کی توجہات اگر رسالہ کے شاملِ حال رہیں۔ تو یہ توقع کرنا ہرگز بےجا نہ ہوگا۔ کہ اس کا نیا سال گذشتہ سال سے بہتر حالات لئے ہوئے ہوگا؛

جناب آنریبل وزیر تعلیم پنجاب ـــــ جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب۔ جناب ڈائرکٹر صاحب محکمہ اطلاعات پنجاب۔ معزز ممبران وسیکرٹری صاحب پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی۔ تمام افسرانِ معائنہ ـــــ (ڈویژنل۔ ڈسٹرکٹ واسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحبان) ہیڈ ماسٹر صاحبان ہائی۔ اپر مڈل۔ لوئر مڈل وپرائمری مدارس کے شکریہ پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

عنایات کا شاکر

خاکسار جگت سنگھ مینجنگ پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم۔ رام گلی لاہور

نواب مرزا داغ دہلوی مرحوم
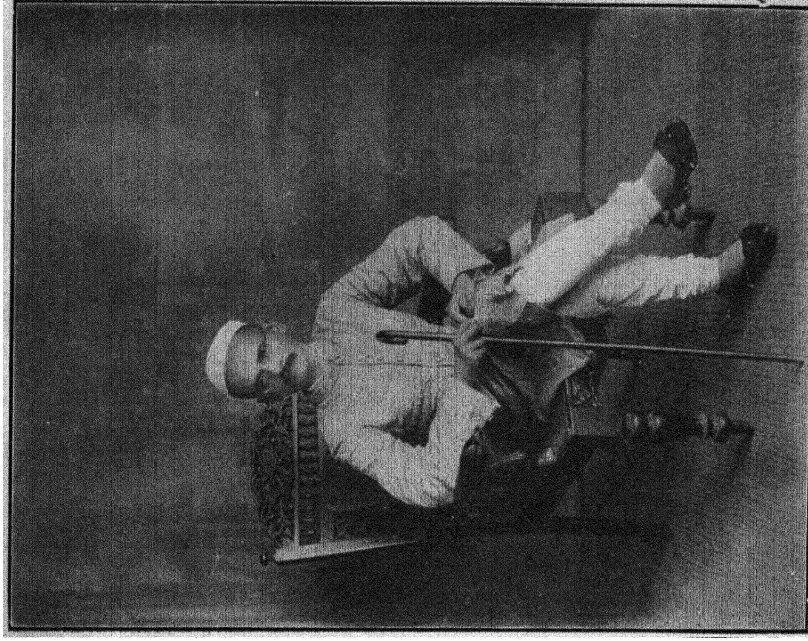
RISALA RAHNUMA-I-TALIM RAM GALI, LAHORE.

A TEA PARTY IN HONOUR OF

Nawab 'SAIL' of DELHI, S. 'ZARIF' of Lucknow and Hazrat 'Bismil' of Allahabad, at the residence of Hon'ble Sir Abdul Qadir, Temple Road, LAHORE.
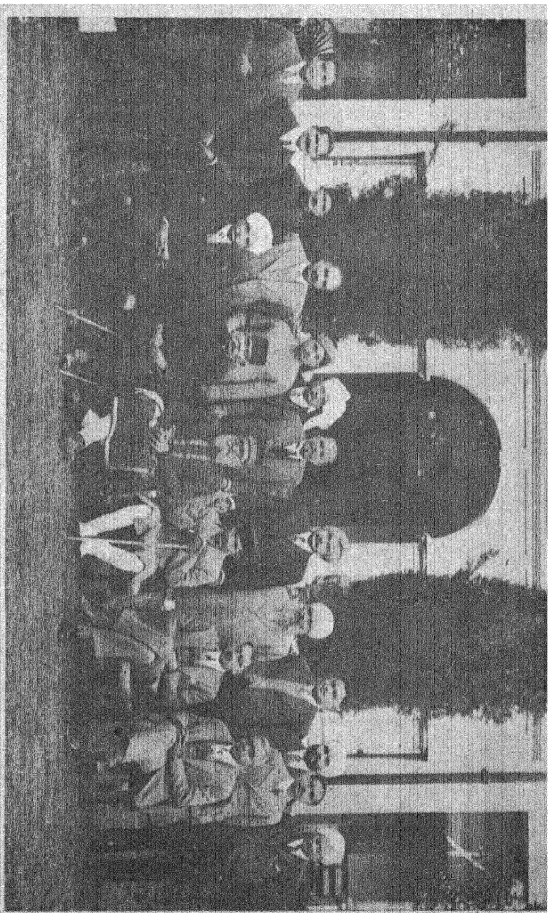
LEFT TO RIGHT CHAIRS:—
Hon'ble Justice Jai Lal; Sd. Maqbul Hussain 'Zarif' of Lucknow; Nawab Saraj-ud-Din Ahmed 'Sail' of Delhi; Munshi Sukhdev Parshad 'Bismal' of Allahabad; Hon'ble Sir Sikandar Hayat Khan Revenue Member Govt. Punjab; Hon'ble Justi[ce] Rangi Lal

STANDING:—
Mr. Mohd. Bashir Assist. Registrar Punjab University; Dr. Nand Lal Bar-at-Law; Professor Abdul Latif M.A. 'Tapish'; Dr. Khalifa Shuja-ud-Din M. A. Bar-at-Law; Hakim Mohd. Abdulla; K. B. Nawab Muzaff[ar] Khan Joint Secretar[y] Transferred Deptt

Hon'ble Justice Sir Abdul Qadir; R. B. Kanwar Sain Bar-at-Law; Master Jagat Singh Prop. Rahnuma-i-Talim; M. Abdul Hay Advocate; Dr. Harcharn Singh; M. Bashir Ahmad (*Oxon*) Bar-at-Law; L. Ishar Dass M. A. Registrar Pb. University

اور اصلاحی مضامین پر ظریفانہ نکتہ چینی ایسی خوبی سے کرتے ہیں کہ سننے والے پھڑک جاتے ہیں۔ اُن کا اپنا پڑھنے کا انداز بھی خاص ہے۔ اُنہوں نے اس مشاعرے میں لکھنؤ کے ایک میونسپل انتخاب کی کیفیت نظم میں اسطرح بیان کی۔ کہ لوگوں کے ذاتی تجربے اور مشاہدے گواہی دے رہے تھے۔ کہ شاعر اُن پر گذرے ہوئے واقعات بیان کر رہا ہے لکھنؤ کی زبان خواہ وہ خواص کی ہو یا عوام کی۔ ظریف صاحب کو ایسی قدرت حاصل ہے۔ کہ وہ بیساختہ پورے جملے اور محاورے نظم میں کھپا سکتے ہیں بسمل صاحب حضرت نوح ناروی کے شاگرد ہیں۔ اور وہ حضرت داغ دہلوی مرحوم کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں۔ بسمل صاحب اپنے اُستاد کے انداز کلام کے معتقد ہیں۔ اور اُن کا تتبع کرتے ہیں ان کے کلام میں تصوف اور فلسفے کا رنگ اور اُس پر اُن کا سحر آمیز ترنم۔ اُن کے کلام کو نہایت پُرلطف بنا دیتا ہے۔

یونیورسٹی جوبلی کے مشاعرے میں ان حضرات سے بار بار فرمائش ہوتی۔ اور لوگ ان کے کلام سے محظوظ ہوئے مگر اس سے دوسرے دن ایک بزم مختصر میں ان کا کلام پھر سننے میں آیا۔ جس کی آواز ابتک کانوں میں گونج رہی ہے۔ یہ حضرات دوسرے دن تشریف لیجانے کو تھے۔ مگر میں نے یہ دیکھکر کہ بعض احباب مشتاق ہیں کہ ہو سکے تو پھر ان تینوں باکمال اصحاب کا کلام سنیں۔ اُن سے درخواست کی۔ کہ وہ ۷ دسمبر کی شام کو میرے ہاں تشریف لائیں۔ اُنہوں نے ازراہ عنایت منظور کر لیا۔ میں نے اُن سے ملنے کے لئے چند احباب کو مدعو کیا اور دو گھنٹے ایسے لطف سے گذرے۔ کہ عرصہ تک یاد رہیں گے۔ اُسوقت سردار جگت سنگھ صاحب ایڈیٹر رسالہ "رہنمائے تعلیم" نے یہ اہتمام کیا۔ کہ ایک مصور کو لے آئے۔ اور ایک عکسی تصویر لیگئی۔ جس میں تینوں معزز مہمان۔ دیگر شرکاء بزم کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ یہ اس مختصر ادبی صحبت کی ایک یادگار ہے۔ اس میں مرکز میں حضرت سائل تشریف فرما ہیں۔ اور ان کے ساتھ حضرت ظریف ایک طرف اور حضرت بسمل دوسری طرف۔ ان کے ساتھ جو صاحبان کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ وہ آنریبل سر سکندر حیات خاں ریونیو ممبر پنجاب۔ آنریبل جسٹس جے لال۔ اور آنریبل جسٹس رنگی لال ججان ہائیکورٹ ہیں۔ دوسرے احباب جو ان مہمانوں کے پیچھے کھڑے ہیں۔ ان سب کے نام تصویر کے نیچے لکھ دیئے گئے ہیں۔ یہ تصویر زیب "افسانہ نمبر" ہے۔ رسالہ "رہنمائے تعلیم" عرصہ دراز سے تعلیم کی، اور ادب اُردو کی خدمت کر رہا ہے۔ اسلئے اس تصویر کو اس رسالہ سے خاص مناسبت ہے۔ اس ضمن میں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس رسالہ کی پچیس سالہ جوبلی ۱۹۳۱ء میں منائی گئی تھی۔ اُس موقع پر ایک ضخیم رسالہ بنام "جوبلی نمبر" شائع ہوا تھا۔ وہ رسالہ کیا تھا۔ ساڑھے سات سو صفحہ کی ایک بڑی موٹی کتاب تھی جس کا نام بجا طور پر "گل صد رنگ" رکھا گیا ہے۔ اس میں رنگا رنگ کے علمی اور ادبی مضامین جگہ جگہ سے جمع کئے گئے تھے۔ اور ملک کے ماہران نظم و نثر سے ان کے کلام کے بہترین نمونے حاصل کئے گئے تھے کیا ہندو، کیا مسلمان کیا سکھ کیا عیسائی۔ جو شخص تعلیم سے تعلق رکھتا ہے۔ یا ادب کا خادم ہے۔ سب کو "جوبلی نمبر" میں یکجا جمع

شکریۂ احباب

جس شوق کے ساتھ معزز مضمون نگاروں اور مخلص ہمدردوں نے اس "فسانہ نمبر" کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا ہے، میرے پاس الفاظ نہیں کہ ان سب بزرگوں کی عنایات کا شکریہ ادا کرسکوں۔ قریباً پانچ سو صفحے کا ضخیم اور طول طویل پرچہ میرے جیسے انسان کے لئے مرتب کرنا قطعاً ناممکن ہوتا۔ اگر ملک بھر کے لائق اور قابل ادیب اس مہتم بالشان کام میں میری امداد نہ فرماتے۔ کام نہایت عظیم الشان تھا۔ اس سے پہلے فسانوی دنیا میں آجتک اتنا موٹا فسانہ نمبر کبھی ہفتہ وار اخبار یا ماہوار رسالہ کا شائع نہیں ہوا تھا۔ اور میں سخت کشمکش و پیچ میں تھا کہ کام کس طرح انجام کو پہنچیگا۔ اور رسالہ کس طرح مرتب ہوسکیگا۔ مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اسقدر کثرت کے ساتھ مضامین آگئے کہ سخت مجبور ہوکر اکثر فسانوں کی لکھی لکھائی کاپیاں ملتوی کرنی پڑیں۔ کیونکہ اگر سارے آمدہ فسانوں کو شائع کیا جاتا۔ تو بلا مبالغہ ایکہزار صفحے کی کتاب تیار ہوجاتی۔ ابھی پرس نہیں۔ فسانے اب تک آرہے ہیں۔ اور فسانہ نمبر نے چھپنے کا انتظار ہر طرف سے کیا جا رہا ہے۔ بڑے بڑے قابل ادیب آپ کو اس بزم میں نظر آئیں گے۔ اور بڑے بڑے لائق انشاء پردازوں کے افسانے آپ اس نمبر میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ یوں سمجھئے کہ ہندوستان کے چوٹی کے لکھنے والے "فسانہ نمبر" میں جمع ہوگئے ہیں۔ ہر فسانہ اپنی جگہ ایک نئی چیز اور ہر قصہ اپنی جگہ ایک عجیب شے ہے۔ یہ "فسانہ نمبر" ادب جمیل کا ایک حسین اور دلکش مرقع ہے کہ دیکھے جاؤ اور دل نہیں بھرے گا۔ جو فسانہ ہے دلچسپ ہے جو کہانی ہے۔ مزیدار ہے۔ ہاتھ میں لینے کی دیر ہے پھر بغیر ختم کئے ہاتھ سے رکھدیں۔ تو ہمارا ذمہ۔ آجتک اس شان کا "فسانہ نمبر" کوئی شائع نہیں ہوا۔ اور غالباً آئندہ بھی عرصہ تک ہندوستانی رسائل اس سے زیادہ ضخیم پرچہ شائع نہیں کرسکیں گے ادب لطیف کے اس پربہار باغ میں ہر قسم کے اور ہر طرز کے پودے ہیں۔ ادبی۔ علمی۔ معاشرتی۔ اخلاقی۔ اصلاحی۔ تاریخی۔ سیاسی۔ نسوانی۔ غرض ہر قسم کے فسانے جمع کرنے کی کوشش کیگئی ہے۔ اگر "فسانہ نمبر" کو "فسانوں کی انسائیکلوپیڈیا" کہیں۔ تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ ہم نے اپنی طرف سے محنت اور کوشش کرنے میں سعی کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ اب قدردانی اور حوصلہ افزائی یا خدا کے اختیار میں ہے یا ناظرین کے ہاتھ میں۔

فسانہ نمبر میں کیا کیا ہے؟ اس کا بہت ہی ہلکا اور دھندلا سا خاکہ ذیل میں کھینچا جاتا ہے۔ اس سے کچھ کچھ آپ کو اسکی اہمیت کا اندازہ ہوسکیگا۔

"رہنمائے تعلیم" کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ اس کے فسانہ نمبر کے لئے باوجود سخت عدیم الفرصتی اور انہماک کے

آنریبل خان بہادر سر عبدالقادر بالقابہ جج ہائیکورٹ لاہور نے ایک مضمون مرحمت فرمایا۔ جو لوگ "مخزن" کے دورِ اوّل کو پڑھتے رہے ہیں۔ وہ آنریبل ممدوح کے قلم کی گلکاریوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ نہ زیادہ کہنے کی ضرورت ہے۔ نہ موصوف ہمارے تعارف کے محتاج ہیں۔

"افسانوی پلاٹ کی تعمیر" ادیبِ شہیر مولوی محمد حسین صاحب ایم اے کے قلم کا رہینِ منت اور ہمارے فسانہ نگاروں کے خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ فسانہ نمبر میں اشد ضرورت تھی اس امر کی کہ بتایا جائے کہ فسانے کس طرح لکھنے چاہئیں۔ مولوی صاحب نے نہایت احسن طریقہ پر اس فرض کو انجام دیا ہے۔

"زعفران زار" جناب جوش ملسیانی کا نہایت پُرمذاق فسانہ ہے۔ جس میں آپ نے آجکل کے عام شاعروں کی نہایت اچھی طرح خبر لی ہے۔ اس زمانہ میں شاعری کا وہ طوفان برپا ہے۔ کہ کچھ کہی نہیں جاتی۔ ہر شخص شاعرِ غرّا بنا بیٹھا ہے اور اپنے آپ کو سحبانِ وائل سے کم نہیں سمجھتا۔ یہ فسانہ اس ٹائپ کے جملہ شعرا کیلئے تازیانہ عبرت ثابت ہوگا۔

"ٹوٹے ہوئے کھلونے" جناب مظہر انصاری کا نہایت ہی پُرلطف فسانہ ہے۔ گھریلو زندگی کی جیسی صحیح تصویر آپ نے کھینچی ہے مشکل سے کسی اور نے کھینچی ہوگی۔ چھوٹے بچے کے معصوم جذبات بیان کرنے میں آپ نے کمال کر دیا۔

"عصو" کا شاہکار جناب امین سلونوی کا نہایت دردانگیز فسانہ ہے اور صبر و ضبط کی حیرت انگیز مثال پیش کرتا ہے۔

"نشہ" دولت اور حکومت کا نشہ کسقدر گمراہ کن ہے۔ اس مسئلہ کو منشی پریم چند کے قلم معجز رقم نے بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ پریم چند کے فسانے اردو لٹریچر کی جان ہوتے ہیں۔ اور حسبِ معمول یہ فسانہ بھی اپنے اندر بہت سی خوبیاں لئے ہوئے ہے۔

"طلسمی کتب خانہ" شاہ دل میمن کا بڑا مزے کا خواب ہے۔ آپ پڑھیں گے تو خوب ہنسیں گے مگر اس میں شبہ نہیں کہ سینکڑوں مصنفین آجکل یا تو مُردوں کی ہڈیوں پر گزارہ کر رہے ہیں۔ یا پھر اس کا مال مار لیا۔ اسکی چیز اٹھا لی۔ اسی پر انکی بقا منحصر ہے۔ شاہ صاحب نے بات بہت حد تک سچی کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اسے مذاق میں اڑا دیں یا مُرا مان جائیں۔

"عہدِ استوار" جناب زہیر کا فسانہ ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کی اچھی تصویر اس فسانہ کے ذریعہ آپ نے پبلک کے سامنے پیش کی ہے۔ کاش! ہم حقیقت میں بھی ایسے ہی بنجائیں اور باہمی اتحاد پر ہندوستان کی بقا منحصر سمجھیں۔

"کوثر چاند پوری" مشہور فسانہ نگار ہیں۔ "عزم بالجزم" آپ کا فسانہ اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ جس میں "سیلف ہیلپ" کے مسئلہ کو فسانوی رنگ میں غوطہ دیا گیا ہے۔ پڑھنے کی چیز ہے۔

"معشوقہ من کیست" مسٹر سیاح کا تنہا فارسی فسانہ ہے۔ جو شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔ فارسی بھی آسان اور سلیس ہے۔ اور فسانہ بھی دلچسپ اور مزیدار ہے۔

"دشمن کی بھبک" پنڈت اندر جیت شرما کا فسانہ ہے۔ جسمیں آپنے اولوالعزمی اور خودداری کا ایک اچھا سبق پیش کیا ہے

"ایک راجہ تھا" ٹیگور کا ایک بڑا ہی دلچسپ فسانہ ہے۔ جس میں ایک چھوٹے بچے کے جذبات ایسی عمدگی سے بیان کیئے گئے ہیں۔ کہ اس سے بڑھکر ناممکن ہے۔ محمد نقی صاحب نے اس فسانہ کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

"الٹی آنتیں گلے میں" جناب عشرت رحمانی کا ایک بڑا مزے کا مزاحیہ فسانہ ہے۔ خدا نہ کرے کہ آپ کو کبھی ایسا سابقہ پڑے۔ لیکن اگر خدانخواستہ اتفاق ہوجائے تو دلیری کے ساتھ انکار کردینا۔ اور چاہے کچھ ہوجائے۔ ہرگز انسپکٹر کے ساتھ تانگے میں مت بیٹھنا۔ ورنہ مفت میں پھنس جاؤگے۔

"پانچ روپے" جناب پریم سپالوی کے بھیجے ہوئے ہیں نصیحت کی نصیحت اور مذاق کا مذاق۔ خوب فسانہ ہے۔

"مینا کی ٹانگیں" علامہ عیش امروہوی کا حد درجہ دردانگیز اور رقت خیز فسانہ ہے۔ پڑھیئے اور رویئے۔

"اکبر کے ظریفانہ اشعار" اکبر الہ آبادی دورِ حاضرہ کے نہایت باکمال شاعر ہیں۔ مذاق مذاق میں ایسے پتے کی اور چبھتی ہوئی بات کہہ جاتے ہیں۔ کہ دوسرا صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالنے پر بھی ادا نہیں کرسکتا۔ میں نے ناظرین کی دلچسپی کے لئے آپ کے کچھ اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ یقین ہے قارئین کرام کو ضرور محظوظ کرے گا۔

"اب پتی بیوی" عورت کی وفا اور مرد کی بیوفائی کا نقشہ میرے محترم دوست سید اشفاق حسین ایم اے نے اس فسانہ میں بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔ آپ کا ایک دوسرا نہایت دلچسپ اور تاریخی فسانہ "خونی مہمان" بھی فسانہ نمبر کی زینت ہے۔

"عالم باعمل" آجکل کے گندم نما جو فروش لیڈروں کی حقیقت منوہر لعل صاحب کے اس فسانہ سے خوب اچھی طرح ذہن نشین ہوجاتی ہے۔

"کرموں کا پھل" مسٹر سری کرشن کول کا نہایت نصیحت آمیز فسانہ ہے۔ اور خاص طور سے عورتوں کے پڑھنے کے قابل

"ماں متا" راز مرزا فدا علی خنجر، فسانہ نمبر میں سب سے زیادہ دلگداز اور رقت انگیز یہ فسانہ ہے۔ پڑھتے ہوئے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگتے ہیں۔

"خوش قسمت ناہید" سب سے زیادہ طویل فسانہ ہے۔ جو فسانہ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ محترمہ ممتاز رفیع بیگم نے اس میں عورتوں کے لئے بہت سی نصیحتیں اور اخلاقی سبق کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ ہر بہن کو یہ فسانہ بڑے غور سے پڑھنا چاہئے۔ فسانہ اگرچہ اصلاحی اور اخلاقی ہے اور اس قسم کے فسانے عام طور پر خشک ہوتے ہیں مگر یہ فسانہ ان سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ اسے پڑھتے ہوئے ناظر کی دلچسپی شروع سے آخر تک برابر قایم رہتی ہے۔

"ہوٹل کا کمرہ" ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی فسانہ نگاری کی حیرت انگیز لیاقت رکھتے ہیں۔ اور آپ کے فسانے ملک میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ آپ کا یہ ایک بڑا دلچسپ مزاحیہ فسانہ ہے۔ پڑھتے پڑھتے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں

"جاہل گریجویٹ" جناب شوکت تھانوی کا بڑا پرلطف مزاحیہ فسانہ ہے جس میں آپ نے اپنے مخصوص انداز میں آجکل کے نوجوانوں کی تعلیمی لیاقت کی خوب قلعی کھولی ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے حرف بحرف صحیح بھی ہے۔ قوم میں بیشتر تعداد بدقسمتی سے ایسے ہی تعلیم یافتہ جاہلوں کی پائی جاتی ہے۔

"پُراسرار خط" میرے نہایت عزیز دوست شیخ محمد بدرالاسلام صاحب فضلی بی۔اے۔بی۔ٹی سابق پروفیسر ٹوکیو یونیورسٹی جاپان کی طرادش طبع کا نتیجہ ہے۔آپ کو سراغرسانی کے فسانے لکھنے میں خوب مہارت حاصل ہے۔اس فسانہ کا مسودہ سُنکر میری اہلیہ کہنے لگیں کہ شیخصاحب محکمہ سراغرسانی کے انسپکٹر کیوں نہ بن گئے۔معلمی کے پیشے سے تو یہی اچھا تھا"۔میں نے کہا اُن سے پُوچھونگا کہ انسپکٹر بننے میں کیا مشکلات آپ کے سدِّ راہ ہوئیں"؟

"فسانۂ جمیل" جناب طالب الہ آبادی کا نصیحت آمیز فسانہ ہے جسمیں انسانی کمزوریوں کی بڑی ہی سچی تصویر آپنے صفحۂ کاغذ پر کھینچکر رکھدی ہے۔ہم میں سے بہتوں کی زندگی جمیل سے بھی زیادہ شرمناک افعال میں مصروف ہے۔مگر دوسروں کے سامنے ہم اپنے آپکو جُنیدِ وقت اور شبلیٔ عصر ظاہر کرتے نہیں شرماتے۔ایسے لوگوں کے لئے فسانۂ جمیل ایک سبقِ رُشد وہدایت ہے۔

یہ تو میں نے بہت ہی مختصر طور پر صرف چند فسانوں کا ناظرین سے تعارف کرایا ہے۔باقی جبوقت آپ پڑھیں گے تو ملاحظہ فرمائیں گے کہ ہر فسانہ پڑھنے کی چیز اور ہر قصہ مطالعہ کے قابل ہے۔

"فسانہ نمبر" کا حصّۂ نظم بھی خاص طور سے مطالعہ کی چیز ہے۔قادر الکلام شعراء کا منتخب اور اعلیٰ پایہ کا کلام اس حصے میں جمع کرنے کی کوشش کیگئی ہے۔یہ حصّہ محترمی جناب جوش ملسیانی کے سپرد تھا۔اور آپ نے بڑی ہی قابلیت اور عمدگی کے ساتھ اسے مرتب فرمایا ہے۔

میں جوشِ دل اور خلوصِ قلب کے ساتھ ان باکمال ادیبوں اور انشا پردازوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔جنہوں نے بکمال عنایت و مہربانی تکلیف فرماکر اپنے اپنے شاہکار اشاعت کے لئے بھیجے۔درحقیقت یہ اُنہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ ناظرین اتنا ضخیم "فسانہ نمبر" ملاحظہ فرمارہے ہیں۔ساتھ ہی میں ان فسانہ نگاروں سے نہایت شرمندگی کے ساتھ معافی خواہ ہوں جن کے فسانے اس نمبر میں شائع نہ کرسکا۔اس بات کا مجھے بہت افسوس رہا۔کہ بعض قابل ادیب اپنی مجبور کُن پریشانیوں یا اپنی یا اپنے اعزہ کی بیماریوں یا انتہائی مصروفیت کی وجہ سے اس ادبی بزم میں شرکت نہ فرماسکے۔خیر یار زندہ صحبت باقی۔

یہاں اس مجبوری کا بھی اظہار ضروری ہے کہ بعض اچھے فسانے ایسے تنگ وقت ملے جبکہ کاپیاں پریس میں جاچکی تھیں۔اور اب اُن کے شاہکار سے رسالہ کے اوراق کو زینت دینے کا وقت گذر چکا تھا۔

شکریہ اور معذرت کے ساتھ اُن احباب سے شکوہ بھی سخت ہے۔جن کو مکرمی سردار جگت سنگھ صاحب نے بار بار قلمی اعانت کے لئے لکھا۔مگر اُن کے مُنہ پر ایسی مُہر سکوت لگی کہ کسی طرح کھُل ہی نہ سکی۔

اب میں خداوند کریم کے حضور فسانہ نمبر کی کامیابی کی دُعا کرتا ہوا ان سطور کو ختم کررہا ہوں۔خدا کرے میری دُعا قبول ہو۔آمین۔

(محمد اسماعیل پانی پتی)

دل سے نکلی ہے دعائے سالِ نو

(از جناب گوردھن داس شاکر کھاوری چھارہ ضلع رہتک)

یا الٰہی راس آئے سالِ نو — ہو موافق ابتدائے سالِ نو
اے مرے داتا مرے ربِّ کریم — سُن لے میری بھی دُعائے سالِ نو
رنج کو آلام کو آزار کو — لوحِ عالم سے مٹائے سالِ نو
ایک مدت سے جو ہیں بچھڑے ہوئے — ان کو آپس میں ملائے سالِ نو
دیکھ کر مشکل کو جو مشکل میں ہیں — ہمتیں ان کی بڑھائے سالِ نو
چار سو عیش و طرب کا دور ہو — دن مسرت کے دکھائے سالِ نو
مفلس و محتاج و غمگیں کے لئے — فیض کے دریا بہائے سالِ نو
علم کی دنیا میں جو ہیں تشنہ کام — تشنگی اُن کی بجھائے سالِ نو
مرحبا اے ناظرینِ محترم — ق — ہو مبارک رہنمائے[2] سالِ نو
دیکھئے[1] افسانہ نمبر دیکھئے — خوب تحفہ ہے برائے سالِ نو
اے جگت سنگھ مرحبا صد مرحبا — تجھ کو سو مژدے سنائے سالِ نو
اور ہو تیرے رفیقوں[2] کیلئے — جاں فزا آب و ہوائے سالِ نو

ہے تہِ دل سے یہ شاکر کی دُعا
سب کی بگڑی کو بنائے سالِ نو

[1] افسانہ نمبر۔ [2] سرپرست و مدیر و معاونین رسالہ ہذا۔

(خاص "رہنمائے تعلیم لاہور" کے افسانہ نمبر کے لئے)

"افسانوی پلاٹ کی تعمیر"

مولانا محمد حسین صاحب ادیب ایم اے۔ بی۔ ای سی ڈی
حیدرآباد۔ دکن

انسانی زندگی کے واقعات اور تجربات کو منطقی ترتیب کے ساتھ بیان کر دینے سے افسانہ کا پلاٹ یا ڈھانچ تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ اگر ہمیں کسی ایسے کردار کا علم ہو جسکے تجربات زندگی میں تنوع اور گوناگونی پائی جائے تو ہم اُس کے منتشر تجربات اور واقعات میں ربط و نظم پیدا کر کے ایک دلچسپ افسانہ مرتب کر سکتے ہیں۔ الغرض پلاٹ تیار کرنے کا سب سے سادہ اور سہل طریقہ یہ ہے کہ کوئی علمی مسئلہ اور اس کا حل تجویز کر لیا جائے اور پھر مختلف واقعات و معاملات کو باہم اس طرح مربوط کیا جائے اور ان میں ایسی منطقی ترتیب ملحوظ رکھی جائے کہ ذہن فطری طور پر ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی جانب منتقل ہوتا چلا جائے۔

ماہرین فن کا اس امر پر اتفاق ہے کہ افسانہ نویس کو پہلے کوئی مسئلہ اور اُس کا حل۔ کوئی عقدہ اور اُس کی گرہ کشائی یا کوئی مزاحمت اور اس پر غالب آنے کی تدبیر سوچ لینی چاہیے۔ مسئلہ۔ عقدہ یا مزاحمت جتنی پیچیدہ اور مشکل ہوگی قصہ اتنا ہی دلچسپ اور پُرلطف ہوگا۔ بالعموم افسانوں کی ہیئت ترکیبی اس طرح کی ہوتی ہے:۔

افسانہ نویس پہلے صورت حال۔ حقیقت واقعہ یا کیفیت موقعہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ پھر قصہ کا ہیرو اس حالت۔ واقعہ یا موقعے کے لحاظ سے کوئی مقصد پیش نظر رکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ حصول مقصد کے لئے مختلف قسم کی جدوجہد اور کوششیں کرتا ہے۔ اس دوران میں اس کو طرح طرح کے حادثات و معاملات پیش آتے ہیں۔ جو بعض صورتوں میں حصول مقصد کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اکثر صورتوں میں وہ ہیرو کو مقصد سے دُور کر دیتے ہیں۔ ہیرو کو متعدد موانعات و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پایئن کار ہیرو غالب آتا ہے یا مغلوب ہو کر اپنا ارادہ بدل دیتا ہے۔ اخیر میں ہیرو کی کامیابی یا ناکامی کے نتائج قلمبند کر دئے جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام اجزا کو صرف دو عنصر یعنی "مسئلہ اور اُس کے حل" میں تحلیل کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اساتذہ نہایت معمولی بنیادوں پر دلچسپ سے دلچسپ افسانہ کی عمارت تعمیر کر سکتے ہیں۔ لیکن نو آموز کو چاہیئے کہ وہ کسی حیرت انگیز اور پُراسرار واقعہ سے اپنا قصہ شروع کرے۔ مثلاً موپاساں (Maupassant) نے "سیاہ دھاگہ" پر ایک بے نظیر افسانہ لکھ ڈالا ہے۔ اس قصہ میں اُس نے انسانی جذبات کے ایسے ایسے رموز و اسرار وا شگاف کئے ہیں۔ جو بڑے بڑے عالموں کو بھی محو حیرت کر دیتے ہیں۔

لیکن اس قسم کی اعلیٰ صناعی صرف مایاسان جیسے اہلِ کمال ہی سے انجام پاسکتی ہے۔ یہ کمان ہر کہ ومہ سے زہ ہونے والی نہیں ہے۔ نوآموزوں کو چاہیئے کہ وہ زبردست ہیجات و محرکات سے کام لیں اور "سیاہ دھاگہ" کے بجائے کسی "طلسمی انگشتری" یا "پوشیدہ خزانہ" کو اپنے افسانہ کا موضوع قرار دیں۔

اگر مشکلات۔ موانعات اور مسائل کے حل کی تشریح مثالوں کے ذریعہ سے بیان کی جائے۔ تو اُس کی تفہیم میں بڑی سہولت ہوگی۔ فرض کرو کہ ایک شخص غلط الزامات کے تحت میں گرفتار ہو کر قید خانہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ یہی صورتِ حال ہے، جہاں سے قصہ کا آغاز ہونے والا ہے۔ ملزم کا مقصد واضح ہے یعنی وہ قید سے رہائی کی فکر میں ہے وہ ہر روز نہایت بیتابی کے ساتھ مراحمِ خسروانہ کا انتظار کرتا رہا۔ مہینوں پر مہینے چڑھتے گئے۔ لیکن شاہی معافی نامہ صادر نہیں ہوا۔ بالآخر وہ اپنی مخلصی کی تدبیر سوچتا اور اس پر عمل کرنیکے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر افسانہ نگار تجربہ کار اور ہوشیار نہیں ہے۔ تو اس کی سمجھ میں اس قسم کی تدبیریں نہیں آئینگی

پہلا حل۔ ملزم جس کمرہ میں قید ہے۔ اس کا وہ بڑی احتیاط کے ساتھ جائزہ لیتا ہے۔ کمرہ کے گوشہ گوشہ میں وہ کوئی مناسب آلہ یا اوزار تلاش کرتا ہے۔ اتفاق سے ایک طاقچہ پر ایک ریتی مل جاتی ہے۔ رات کے وقت وہ ریتی سے محبس کے قفل کا کنڈا گھس ڈالتا اور فرار ہو جاتا ہے۔ یقیناً ایسے مہمل حل پر کوئی شخص اپنی ہنسی ضبط نہیں کرسکتا۔ کیونکہ محبس کے کمرہ میں ریتی کا پایا جانا ایک ایسی بات ہے جس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ اب دوسرے حل پر غور کرو۔

دوسرا حل۔ ایک روز صبح سویرے تالے چابی کے کھڑکھڑانے سے ملزم بیدار ہوا۔ اس نے سمجھا کہ حسبِ معمول محبس کا داروغہ قفل کھولنے کے لئے آیا ہوگا۔ لیکن اُدھر جو نظر اُٹھائی تو کیا دیکھتا ہے کہ بجائے داروغہ کے شاہی افسر اپنی شاندار وردی میں کھڑا ہے اور ملزم سے کہہ رہا ہے کہ جہاں پناہ نے تمہارے معاملے کو خود اپنے ہاتھ میں لیا اور تفتیش کی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ تم بے قصور ہو۔ اس لئے تمہاری غیر مشروط رہائی کے لئے فرمانِ عطوفت نشان شرفِ صدور لایا ہے۔ چنانچہ معافی کا حکمنامہ حاضر ہے۔ تم خود کو آزاد سمجھو"۔ لیکن یہ بھی کوئی دلچسپ حل نہیں ہے۔ الغرض دونوں حل ناقص ہیں۔ پہلا اس لئے کہ وہ قرینِ یقین نہیں ہے۔ اور دوسرے میں حیرت اور تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ کامیاب قصہ وہ ہے جس میں مسئلہ کا حل منطقی استدلال کے مطابق ہو۔ لیکن وہ اس قدر بدیہی بھی نہ ہو کہ ہر شخص کو آسانی سے سوجھ جائے۔

اب ایک دوسری مثال لو۔ فرض کرو۔ کہ گرمی کے موسم میں دوپہر کے وقت ایک مسافر کسی سڑک پر چلا جا رہا ہے پیاس کی شدت سے اس کا حلق سوکھ گیا ہے۔ سڑک کے ایک جانب ایک کنواں ہے۔ جہاں رسّی اور ڈول موجود ہے یہی صورتِ حال ہے۔ جہاں سے قصہ شروع ہوگا۔ مسافر کا مقصد واضح ہے۔ وہ کسی طرح اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہے

یہاں قصہ کے دو ابتدائی عناصر یعنی صورت حال اور مقصد موجود ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ حصول مقصد یا مسئلہ کے حل کے لئے قصہ کا ہیرو کیا تدبیر کرتا ہے۔ مسافر کنوئیں کی طرف بڑھتا ہے۔ بیس پچیس قدم چلا ہوگا۔ کہ اس کی ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی جو کنوئیں سے ایک گھڑا پانی لیکر آ رہا تھا۔ مسافر نے کہا "میاں لڑکے میں بہت پیاسا ہوں۔ کیا تم مجھے ایک گلاس پانی پلا سکتے ہو؟ اُس نے جواب دیا۔ کہ "معاف کیجئے۔ مَیں بہت جلدی میں ہوں۔ میری ماں انتظار کرتی ہوگی لیکن میرا بڑا بھائی پیچھے آ رہا ہے۔ وہ تم کو پانی ضرور پلائیگا"۔ بہرحال یہ ایک ایسی کوشش تھی جو حصول مقصد کی معاون کہلا سکتی ہے۔ اس کے بعد مسافر آگے بڑھتا ہے اور کنوئیں کے قریب اس کی بڑے بھائی سے ملاقات ہوتی ہے۔ مسافر اس سے پانی مانگتا ہے۔ لیکن وہ جواب دیتا ہے کہ "تم خود کنوئیں پر جا کر ڈول سے پانی کھینچ لو اور پیو"۔ یہ حصول مقصد میں مزاحمت کی مثال ہوئی۔ بالآخر مسافر کنوئیں پہ جاتا ہے اور ڈول سے پانی کھینچکر اپنی پیاس بجھاتا ہے۔

یہاں پلاٹ کے تمام ضروری عناصر مثلاً حالت۔ مقصد۔ کوشش۔ معاون۔ واقعہ۔ دوسری کوشش۔ مزاحمت۔ آخری کوشش۔ کامیابی وغیرہ موجود ہیں تاہم کیا اس قصہ کا شمار کامیاب افسانہ میں ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی بامذاق مدیر اُسے قیمتاً خرید کر اپنے رسالہ میں شائع کر سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ نہ تو مسئلہ ایسا اہم اور پیچیدہ ہے کہ وہ قاری یا ناظر کی دلچسپی کا موجب ہو۔ اور نہ اُس کے حل کے ذرائع میں کوئی حیرت یا ڈرامائیت پائی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ مواد۔ مصنف اور سامع میں آخر الذکر عنصر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ افسانہ اسی لئے لکھا جاتا ہے کہ لوگ اُسے پڑھیں اور اس سے لطف اندوز ہوں۔ قصہ کا مواد کتنا ہی اہم اور مفید ہو۔ افسانہ نگار کتنا ہی قابل ہو۔ لیکن اگر قصہ قاری یا سامع کو محظوظ نہ کر سکے تو وہ بیکار ہے۔ لہذا سامع کی دلچسپیوں کا لحاظ رکھنا مقدم چیز ہے۔ سامع کو قصہ سے اُسی وقت دلچسپی ہوگی۔ جب اس میں ڈرامائی عناصر موجود ہوں۔ پلاٹ میں ڈرامائیت پیدا کرنے کے لئے افسانہ نگار کو یہ دکھانا چاہیئے کہ قصہ کے ہیرو کو مشکلات کا سامنا ہے۔ جن پر غالب آنے کے لئے وہ جد و جہد کرتا ہے۔ یا اُس کو کسی زبردست دشمن یا مخالف قوت کا مقابلہ کرنا ہے۔ یا، اس پر کوئی تباہی آنے والی ہے۔ جس سے بچنے کے لئے وہ جانفشانی کر رہا ہے۔ تباہی کا خطرہ جتنا زبردست اور حریف یا مدِ مقابل جتنا قوی ہوگا۔ قصہ اُتنا ہی زیادہ جاذب توجہ ہوگا۔ مخالف قوتوں کے ساتھ ہیرو کا مردانہ وار مقابلہ سامعین کے دل میں حیرت و استعجاب اور عظمت و احترام کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

اثنائے جد و جہد میں ہیرو پر جو واقعات و حادثات پیش آتے ہیں ان میں سے بعض اس کے حصول مقصد کے ممد و معاون اور بعض مخالف و مزاحم ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن معاون واقعات کی بہ نسبت مخالف واقعات زیادہ حیرت انگیز اور "سنسنی خیز" ہوتے ہیں اور اُن میں ڈرامائیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس لئے جب تک قصہ اپنے منتہا

(Climax) کو پہنچکر ہیرو کی آخری کامرانی یا ناکامی پر منتج نہولے اس وقت تک قصّہ جن معاون واقعات کے استقصا کا متقاضی ہو ان میں سے ہر واقعہ کے فوراً بعد ہی افسانہ نگار کو بتا دینا چاہیئے۔ کہ اگرچہ ہیرو کو تھوڑی سی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ لیکن یہ کامیابی محض عارضی و ہنگامی ہے کیونکہ اس کے آگے ہیرو کو سخت خطرہ کا سامنا ہونیوالا ہے۔

قدیم مشرقی افسانوں اور داستانوں میں ہیرو سے بڑے بڑے مہمات اور ہفت خواں طے کرائے جاتے تھے۔ صحرائے لق ودق میں بڑے بڑے ساحروں۔ دیوؤں۔ عفریتوں اور جنوں سے مقابلے ہوتے تھے۔ غرضیکہ واقعات تو نہایت خطرناک۔ تعجب انگیز اور "سنسنی خیز" ہوتے تھے۔ جن میں اعلیٰ درجہ کی ڈرامائیت پائی جاتی تھی۔ لیکن مسئلہ کا حل یعنی مشکلات پر غالب آنے اور تباہی سے بچنے کا طریقہ نہایت بھونڈا اور پھسپھسا ہوتا تھا۔ جب ہیرو کا موقف سخت خطرناک ہو جاتا اور اس سے نکلنے کی کوئی معقول تدبیر سمجھ میں نہ آتی تو افسانہ نگار خواجہ خضر سے استمداد کرتا یا کسی دیبی دیوتا کو مدد کے لئے بلاتا یا بال سیمرغ اور منتر جنتر سے کام لیتا۔ لیکن آجکل اس قسم کے خلاف عادت عناصر اور مافوق البشر قوتوں کی دخل اندازی اصول افسانہ نگاری کے منافی خیال کی جاتی ہے۔ افسانہ میں حقیقی زندگی کے واقعات و معاملات کی ترجمانی ہونی چاہیئے۔ اور مسئلہ کا حل ایسا ہونا چاہیئے جو عقل و استدلال کے مطابق ہو۔

جونکہ کسی اہم و پیچیدہ مسئلہ کا ایسا حل تجویز کرنا جو معقول و قابل یقین بھی ہو۔ اور حیرت انگیز و غیر متوقع بھی آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے بعض نقادوں کی رائے ہے کہ افسانہ نویس کو چاہیئے کہ وہ پہلے حل پیش نظر رکھلے۔ اور اسی کے مطابق مسئلہ سوچے یعنی مروّجہ طریقہ کو اُلٹ دے۔ اس اصولِ کار کا پہلا علمبردار سر ایڈگر ایلن پو تھا۔ جس کا قول ہے کہ ہر کامیاب و مؤثر افسانہ طریقہ منقلبہ پر عمل کرنے سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اس لئے افسانہ نویس کو پلاٹ کی تعمیر میں آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف ہٹنا چاہیئے۔ مس ایڈا ویلی جس کے مختصر افسانے امریکہ اور انگلستان دونوں ملکوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ مقر ہے کہ وہ اپنے کسی قصّہ میں اس وقت تک ہاتھ نہیں لگاتی تھی جب تک کہ مسئلہ کا حل واضح طور پر اس کے پیش نظر نہ ہو جاتا تھا۔ افسانوی ادبیات کا مشہور نقاد ویلارڈ ہاکنس بھی پہلے حل اور بعدہٗ مسئلہ سوچنے کے طریقہ کا زبردست حامی ہے۔

ہاکنس نے دلچسپ اور مؤثر پلاٹ ترتیب دینے کی تشریح حسب ذیل مثال سے کی ہے۔ ایک عکاس (فوٹوگرافر) اپنے آلات عکاسی کے ساتھ ایک پہاڑی ندی پار کر رہا تھا۔ ندی اس وقت پایاب تھی۔ پانی عکاس کی کمر تک تھا۔ ابھی آدھی ندی بھی عبور نہیں کی تھی کہ اس کا پاؤں پتھر کے ایک تنگ سوراخ میں پھنس گیا۔ ہزار جتن کئے لیکن پاؤں نہ نکل سکا۔ پہاڑی ندی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ ابھی گھٹنوں گھٹنوں پانی ہے۔ اور ابھی پہاڑ سے ایسا ریلا آیا۔ کہ ندی لبالب ہو گئی۔ اور زور شور سے بہنے لگی۔ چنانچہ عکاس پاؤں نکالنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ پانی بڑھنے لگا۔ عکاس کے ساتھ اس کا کمین

ملازم بھی تھا۔ لڑکا اپنے مالک کو اس مصیبت میں گرفتار دیکھکر لوگوں کو بلانے کے لئے گاؤں کی طرف دوڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی عکاس کے سر تک بلند ہوگیا۔ یہاں حل طلب مسئلہ یہ ہے۔ کہ اب عکاس کس طرح اپنی جان بچائے۔ اگر کہہ دیا جائے۔ کہ بڑی کوششوں سے وہ اپنا پاؤں سوراخ سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ تو یہ ایک معمولی اور بدیہی بات ہوگی۔ جو ہر شخص کو سوجھ سکتی ہے۔ اگر یہ حل تجویز کیا جائے کہ پانی اس کی گردن تک پہنچکر پھر گھٹنے لگا۔ تو یہ خلاف عادت بات ہوگی۔ افسانہ نویس نے اس موقع پر یہ دکھایا تھا۔ کہ عکاس نے کیمرا کا جوفہ (بلب) اپنے منہ میں لے لیا۔ اور ربڑ کی لمبی کھلی نلی کو سطح آب کے اوپر کر دیا۔ اس طرح وہ اتنی دیر تک زندہ رہا کہ گاؤں کے لوگ پہنچ گئے۔ اور اسے اس آفت سے چھڑایا۔ اس میں شک نہیں کہ افسانہ نگار نے پہلے سے حل کو پیش نظر رکھ کر قصہ گھڑا تھا۔ افسانہ نویس نے جب کسی کیمرے کی نلی اور جوفہ کو دیکھا ہوگا۔ تو اصول مشابہت کے تحت اس کا ذہن معاً غوطہ خوری کے آلہ کی طرف منتقل ہوا ہوگا۔ پس وہ سر ایڈگر ایلن پو کی ہدایت پر عمل کرکے منتہا سے مبدا رکی جانب گامزن ہوا یعنی حل کو پیش نظر رکھ کر اس نے اس کے مطابق واقعات اور مسائل گھڑنے شروع کئے۔

ایک جگہ مسٹر ہاکنس نے لکھا ہے۔ کہ "عام طور پر مصنفین کی جودت طبع کو تقویت پہنچانے کی غرض سے ان کو ہدایت کیجاتی ہے کہ اشخاص قصہ اور خصوصاً ہیرو کو مصائب میں مبتلا کر دو۔ اور پھر ان کی رہائی کی کوئی نادر تدبیر سوچ نکالو۔ اس میں شک نہیں کہ بعض وقت یہ طریقہ بھی کسی حد تک کامیاب ثابت ہوا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر صورتوں میں نتیجہ ادنیٰ درجہ کا برآمد ہوتا ہے۔ بہت سے بے اثر و بے لطف افسانے جو میری میز پر تنقید کے لئے آتے ہیں۔ اسی طریقہ پر مرتب کئے گئے تھے۔ مصنف اشخاصِ قصہ کے موقف کو تو ایسا نازک اور خطرناک ضرور بنا دیتا ہے۔ کہ قارئین کے دل میں اضطراب اور سنسنی پیدا ہو جائے۔ لیکن مسئلہ کا حل یا قصہ کا منتہا معمولی درجہ کی ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔ بالعموم وہ نہایت پست۔ بدیہی اور مصنوعی ہوتا ہے۔ مسئلہ اور اسکا حل یہی پلاٹ کے دو مشہور اور ضروری عنصر ہیں۔ ان میں حل کو مسئلہ سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جب کوئی بلند پایہ مدیر تمہارے افسانہ کو اس نوٹ کے ساتھ مسترد کر دیتا ہے۔ کہ قصہ تو خوب لکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں جدت و ندرت مفقود ہے۔ تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے۔ کہ تم نے مسئلہ کو نہایت معمولی اور مانوس طریقہ پر حل کیا ہے۔ پڑھنے والا پہلے ہی سے اس حل کو معلوم کر لیتا ہے۔ بہترین پلاٹ وہ ہے۔ جس میں مسئلہ کسی غیر متوقع و حیرت انگیز طریقہ پر حل کیا گیا ہو۔ اس لئے افسانہ نویس کو چاہئے کہ وہ قصہ کے منتہا یعنی مسئلہ کے حل کو اپنا مقام روانگی قرار دے۔ اور اسکے مطابق واقعات و مسائل ترتیب دے۔ مبتدی کے لئے اس ہدایت پر کار بند ہونا بہت مفید ثابت ہوگا۔"

بہرحال پلاٹ تعمیر کرنے کا منطقی و مثالی طریقہ یہ ہے۔ کہ ابتداء ہی سے منتہا یا حل کو پیش نظر رکھو۔ لیکن دوران تحریر میں اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب اور نادر و غیر متوقع خاتمہ کی فکر کرتے رہو۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ بعض

وقت تم کو ایسی نادر باتیں سوجھنے لگیں گی۔ جن کا تم کو سان و گمان بھی نہ تھا۔ اور جن پر خود تم کو سخت تعجب ہوگا۔ بالعموم اس قسم کا غیر متوقع منتہٰی رجال افسانہ کی بعض پوشیدہ کرداری خصوصیات کے انکشاف پر مبنی ہوتا ہے۔

اس کی تشریح کے لئے حسب ذیل مثال پر غور کرو۔ جو "امریکن بائے میگزین" سے لی گئی ہے۔ فرض کرو کہ تم کالج کے ایک کمزور لڑکے کے متعلق ایک افسانہ لکھنا چاہتے ہو۔ لڑکے کے باپ نے اس کو ایک سال کے لئے مغربی چراگاہ میں بھیجدیا تھا۔ چرواہے اسے کمزور سمجھ کر اس سے مذاق کیا کرتے تھے بلکہ اکثر اس کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے لڑکا ہمیشہ اس دُھن میں لگا رہتا تھا۔ کہ وہ کس طرح چرواہوں میں اپنا وقار قائم کرلے۔ ایک روز اس کو معلوم ہوا کہ سال میں ایک بار اس چراگاہ کے بہترین کھلاڑی کا دوسری چراگاہ کے بہترین کھلاڑی کے ساتھ دوڑ کی بازی کا مقابلہ ہوا کرتا ہے۔ دوسرے دن دوپہر کو جب سب چرواہے تیز دھوپ سے بچنے کے لئے ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں میں بیٹھے ہوتے تھے۔ اس لڑکے نے ان کو ایک طلائی تمغہ دکھایا اور بیان کیا کہ میری ظاہری شکل و شباہت سے دھوکا نہ کھانا۔ اگرچہ دیکھنے میں مَیں دُبلا پتلا ہوں۔ لیکن کوئی لڑکا دوڑنے میں میرا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ کالج کے سالانہ اسپورٹ کے موقع پر نصف میل کی دوڑ میں اوّل آیا تھا۔ اور یہ طلائی تمغہ بطور انعام حاصل کیا تھا۔ فی الحقیقت یہ تمغہ لڑکے کے ایک ساتھی کا تھا جو کالج میں اُس کا ہم جماعت تھا۔ لیکن چرواہے اس کے دھوکے میں آگئے اور اُس کو اپنا میر مقرر کرلیا۔ اس روز سے وہ اُس کی عزت کرنے لگے اور آنے والے چراگاہی مقابلہ میں شرکت کے لئے اُس کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ قصہ کے ہیرو کا مقصد یہی تھا کہ چرواہے اُس کی عزت و توقیر کریں۔ جو حاصل ہوگیا۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ مقابلہ کے موقع پر وہ کیا کرتا۔ ممکن تھا کہ وہ اپنے کسی وطنی دوست کو خط لکھ کر ایک فرضی تار اس مضمون کا منگا لیتا کہ "تمھاری ماں سخت بیمار اور جاں بلب ہے، تم فوراً چلے آؤ" اس طرح قبل اس کے کہ اس کا فریب ظاہر ہو وہ اپنے وطن کو چل دیتا اور چرواہوں کو اپنا معاملہ آپ سنبھال لینے کے لئے چھوڑ دیتا۔

فرض کرو کہ اس قسم کا کوئی حل پیش نظر رکھ کر تم نے قصہ لکھنا شروع کیا تھا۔ چرواہے جو لڑکے کو پہلے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اب اُس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرنے لگے۔ وہ نہ صرف اُس کی عزت و توقیر کرتے بلکہ اُس کا بہت سا کام بھی خود کردیتے۔ اس کے مویشی کو اپنے جانوروں کے ساتھ چراتے اور لڑکے کو دوڑ کی مشق کرنے کے لئے فرصت دے دیتے تھے۔ لڑکا آرام سے زندگی بسر کرتا رہا۔ البتہ مقابلہ کا زمانہ قریب آنے پر اُس کو فکر ہوئی ہوگی کہ وہ اپنے گھر سے اپنی طلبی کا تار منگائے یا اپنے انعام پانے والے ساتھی کو بلا کر اپنے عوض میں اُس کو بازی کی شرط میں شریک کردے اور خود پاؤں میں موچ آجانے یا یکایک درد شکم میں مبتلا ہوجانے کا بہانہ کرکے بازی میں حصہ لینے سے بچ جائے۔ اس قسم کے اور بھی بہت سے حیلے تراشے جاسکتے ہیں۔

لیکن قصہ جوں جوں اُبھرتا، پھیلتا، بڑھتا اور ترقی کرتا گیا۔ افسانہ نویس کو ہیرو کے ساتھ زیادہ دلچسپی پیدا

ہو گئی اور قصہ کا منتہا اپنے اصلی مقام سے آگے بڑھتا گیا۔ فرض کرو۔ کہ روزانہ مشق و مہارت سے لڑکے کی جسمانی قوت اور چستی میں ترقی ہوتی جاتی ہے اور وہ دغاباز ہیرو سے اصلی ہیرو بن جاتا ہے۔ اب تم کو نئے مسئلہ کا نیا حل سوجھتا ہے۔ لڑکا گھر سے فرضی تار منگانے یا پاؤں میں موچ آنے یا پیٹ میں درد ہونے کا حیلہ سوچ ہی رہا تھا کہ یکایک اس کے کالج کا ساتھی لنگڑاتا ہوا وہاں پہنچ جاتا ہے۔ فی الحقیقت کسی ناگہانی حادثہ سے اُس کے پاؤں کو سخت چوٹ لگی تھی۔ اب لڑکے کو اپنے بدلہ میں اپنے ساتھی کو دوڑانے کا موقع باقی نہ رہا۔ چرواہے لڑکے پر بہت بڑی بازی لگا چکے تھے اور وہ اُسے کسی حیلہ کی بنا پر گھر جانے کی اجازت نہ دیتے۔ اب وہ کوئی عذر لنگ قبول کرنے کے بھی روادار نہ تھے۔ اگر لڑکا بازی کی شرکت میں لیت ولعل کرتا تو وہ نہ صرف چرواہوں کی نظر میں اپنی وقعت وعزت کھو بیٹھتا۔ بلکہ وہ اس سے سخت انتقام لیتے اور مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے۔

روزانہ مشق کی وجہ سے لڑکے کی قوت چستی۔ اور پھرتی میں فطری طور پر ترقی ہوتی جاتی تھی۔ اس کے لنگڑے ساتھی نے اُس کی اور ہمت بڑھائی شروع کی۔ بالآخر وہ مصیبت کی گھڑی آپہنچی جس کا عرصہ سے انتظار تھا۔ لڑکا اپنے مدمقابل کے پہلو بہ پہلو سو گز کی دوڑ کے لئے کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بہادر لنگڑے ساتھی نے اُس کے نزدیک جا کر یہ آخری ہدایتیں دیں کہ جب تم حکم کے انتظار میں آگے کی طرف جھکو تو ایک لمبا سانس کھینچو اور بندوق سر ہوتے ہی سانس باہر پھینک دو اور دوبارہ زور سے سانس کھینچو تاکہ تمہارا سارا شُش ہوا سے بھر جائے۔ اب دم سادھ کر دوڑو۔ اور ایک ہی دم میں دوڑ پوری کرنے کی کوشش کرنا۔ داہنے یا بائیں جانب نہ دیکھنا بلکہ سیدھے میری طرف دیکھتے رہنا۔ میں آخری منزل پر تم کو سنبھالنے کے لئے موجود ہونگا۔ دیکھو دوست کالج کا نام بدنام نہ کرنا۔ تم کو اپنی چراگاہ کا وقار بھی قائم رکھنا ہے۔ سر کو ذرا جھکا ہوا اور ٹھوڑی کو آگے کی طرف بڑھا ہوا رکھنا اور ہرگز پیچھے نہ تاکنا۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ ہمت کرو۔ تم ضرور بازی جیت لوگے۔" اس غیرت دہی اور حوصلہ افزائی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ لڑکا سخت جانفشانی سے کام لیتا اور شرط جیت جاتا ہے۔

اس طرح تم نے اپنے کمزور و نام نہاد ہیرو کو حقیقی ہیرو بنا دیا۔ جس سے قصہ میں جان آگئی اور افسانہ نہایت دلچسپ اور پُر لطف بن گیا۔ یہ حل سابقہ حلوں سے کہیں زیادہ شاندار اور پُر عظمت ہے۔ اگر تم واقعات اس انداز سے بیان کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ قارئین کو قصہ کا نتیجہ غیر منطقی اور ناقابلِ یقین نہ معلوم ہو۔ تو کوئی شخص تمہارے اس نئے حل پر محض بدیہی ہونے کا اعتراض عاید نہیں کر سکتا۔

چونکہ پلاٹ کی تعمیر کا انحصار صرف ڈرامائی مسئلہ اور اُس کے حیرت انگیز و غیر متوقعہ حل پر ہے۔ اس لئے مبتدیوں اور نو آموزوں کی مشق کے لئے مسٹر جی کلارک نے چند مسائل اور حل تجویز کئے ہیں۔ جو قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ "سائنٹیفک امریکن" اور "پوپلر سائنس منتھلی" کے رسالوں میں اس قسم کے بے شمار

مسائل اور اُن کے حل دستیاب ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ افسانہ نویسی کا شوق رکھتے ہیں۔ اُن کی ذہنی اپج اور جودت طبع کی ترقی کے لئے وہ بہت مفید ثابت ہونگے۔

[الف] حسب ذیل مسائل کے لئے مناسب حل تجویز کرو

(۱) ایک شریف خاتون اپنی ایک ہمجولی کے یہاں جو شہر کے مضافات میں رہتی ہے۔ دو ہفتہ کے لئے تفریحاً تعطیل گذارنے جاتی ہے۔ ہمجولی اپنی بساط بھر اُس کی خاطر تواضع کرتی ہے۔ جب خاتون اپنے گھر واپس آتی ہے۔ تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے، وہ ٹیلیفون پر جاتی ہے۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے دوسرے محلہ سے اس کی بہن پوچھ رہی ہے کہ "کیوں بہن آپ بخیر و عافیت پہنچ گئیں؟ مزاج کیسا ہے"؟

اُس نے جواب دیا "بہن کچھ نہ پوچھو۔ عمر بھر میں کبھی ایسا بے لطف زمانہ نہ گذرا تھا۔ بھلا دیہاتیوں میں میرا جی کیا لگتا؟ ہر چیز کی وہاں تکلیف ہی رہی"

ٹیلیفون سے آواز آئی "اگر ایسا ہے تو مجھے اس کا سخت ملال ہے۔ میں نے تو مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا تھا"

اب خاتون کو معلوم ہوا کہ اُس کی مخاطب اُس کی بہن نہیں۔ بلکہ میزبان ہمجولی ہے۔ وہ سخت ندامت اور پریشانی محسوس کر رہی ہے اور اس فکر میں ہے کہ بگڑی بات کو کس طرح بنائے۔

بتاؤ کہ معاملہ کے سدھارنے کی کیا ترکیب ہے؟

(۲) لا کالج کے ایک نوجوان طالب علم کو ایک اپنی ہم جماعت دوشیزہ لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنے پر رضامند ہیں۔ کسی طویل تعطیل میں طالب علم اس لڑکی کو اپنے گھر بلا کر اپنے والدین سے اُس کا تعارف کرانا چاہتا ہے۔ اس کی بوڑھی ماں میں تنہا دعوت کا انتظام کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس لئے وہ اپنے بھائی کو جو اسی شہر میں رہتا ہے۔ جہاں لا کالج واقع ہے۔ تار دیتی ہے کہ کوئی ہوشیار باورچن بھیجدی جائے۔ بہر حال ضعیفہ کو اطلاع ملتی ہے کہ منگیتر لڑکی صبح کی گاڑی سے اور باورچن دوپہر کی گاڑی سے آنے والی ہے۔ لیکن کچھ ایسے حادثات پیش آتے ہیں کہ باورچن پہلے اور لڑکی بعد میں پہنچتی ہے ضعیفہ باورچن کو منگیتر سمجھ کر اُس کی خوب آؤ بھگت کرتی ہے اور مہمان لڑکی کو باورچن خیال کر کے اس کے ساتھ ملازموں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔ بتاؤ لڑکی کے ساتھ اس ذلت آمیز سلوک کی کیا تلافی ہو سکتی ہے؟

ہندوستان میں پردہ نشین دلہنوں کے بدل جانے کے اکثر قصے سُننے میں آتے ہیں؟

(۳) ایک نوجوان آدمی اپنی بہن کے ساتھ بال (رقص گاہ) میں جاتا ہے۔ رقص و سرود کی مجلس برخاست

ہونے پر لوگ اپنے گھروں کو واپس ہوتے ہیں۔ نوجوان بہت دیر تک رقص گاہ کے دروازے پر کھڑے رہ کر اپنے ایک دوست کے ساتھ باتیں کرتا رہتا ہے۔ بالآخر برقی روشنیاں بجھا دی جاتی ہیں۔ نوجوان تاریکی میں باہر جاتا ہے۔ تو موٹر گاہ پر صرف ایک گاڑی کھڑی پاتا ہے۔ آگے کی نشست پر بیٹھ کر موٹر ڈرائیور کو اپنا پتہ دیتا ہے۔ گاڑی پوری رفتار سے روانہ ہو جاتی ہے۔ پچھلی نشست پر ایک عورت بیٹھی ہے۔ نوجوان اور عورت دونوں اپنے اپنے خیالات میں محو ہیں۔ کچھ دور جا کر جب نوجوان نے سگرٹ سلگانے کے لئے دیا سلائی روشن کی تو عورت چیخ اٹھی نوجوان نے پریشان ہو کر دوسری سلائی روشن کی تو عورت نے خوف اور تعجب سے پوچھا کہ "تم کون ہو اور میری گاڑی میں کیسے گھس آئے۔ نوجوان بھی حیران ہو گیا اور کہنے لگا کہ" میں تو تم کو اپنی بہن سمجھ رہا تھا۔ مجھے سخت غلط فہمی ہوئی"۔

"بتاؤ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

(۴) ایک ریلوے سٹیشن کے تار گھر کے کلرک کو رات کے وقت نیند آجاتی ہے۔ حالانکہ اس کے فرائض منصبی کا اقتضا تھا کہ وہ ہوشیار اور بیدار رہے۔ آخر تار کی گھنٹی سن کر وہ جاگ اٹھتا ہے اور جب کھٹکے کی آواز پر کان دھرتا ہے تو اُسے برقی اطلاع ملتی ہے کہ "پچھم جانے والی اکسپرس گاڑی کو وہیں ٹھیرالو۔ پریسیڈنٹ کی اسپیشل یہاں سے پورب کو روانہ ہو چکی ہے"۔ جب وہ تار گھر کے باہر آتا ہے تو کیا دیکھتا ہے اکسپرس رات کی تاریکی میں تیزی کے ساتھ شور مچاتی ہوئی موت کے منہ میں چلی جا رہی ہے۔ اس پر سخت بدحواسی چھائی ہوئی ہے کہ یکایک گاڑی کو ٹھہرانے اور آنے والے خطرہ کو دفع کرنے کی ایک تدبیر اُسے سوجھتی ہے۔ بتاؤ وہ کون سی تدبیر ہے ؟

(۵) ایک کان کے اندر چار مزدور فرودگاہ سے ایک میل کے فاصلہ پر کام کر رہے ہیں۔ جس شاخ میں وہ کام کر رہے ہیں۔ اس میں ایک چٹان کے گرنے سے راستہ بند ہو جاتا ہے اور اُن کو بھاگنے یا نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ملتی۔ بتاؤ کہ ایسے موقع پر اُن کو بچانے کی کیا سبیل کیجا سکتی ہے ؟

[ب] حسب ذیل حل کے مطابق مسئلے دریافت کرو

(۱) ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی یکایک سخت خطرہ اور بڑی ذمہ داری کے عہدہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ خطرے سے خائف نہیں ہوتا۔ بلکہ نہایت گرم جوشی اور جفاکشی سے اپنی ذمہ وارانہ خدمت انجام دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے۔ جہاں شکست کا خدشہ تھا۔ وہاں اُسے کامیابی و فیروزی حاصل ہوتی ہے۔

کوئی موقع یا مسئلہ دریافت کرو۔ جہاں ادنیٰ درجہ کے کسی آدمی نے ایسا شاندار کارنامہ پیش کیا ہو۔

(۲) ایک سیدھی سادی لڑکی جو دیکھنے میں بہت خوبصورت بھی نہیں تھی۔ شہر کے ایک بڑے متمول اور

ونسعد آدمی سے شادی کر لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ حالانکہ بہت سی حسین و مہ جبین عورتیں اس کے حبالہ عقد میں منسلک ہونے کی متمنی تھیں۔ لیکن کسی کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس واقعہ سے تمام باشندگانِ شہر کو سخت حیرت تھی۔ کیا تم بتا سکتے ہو، کہ وہ سادہ رُو لڑکی کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی؟

(۳) ایک نٹ اپنے جسم کے ہر جوڑ کو اُس کی جگہ سے سرکا دیتا ہے۔ اور پھر تمام جوڑوں اور ہڈیوں کو اپنی اپنی جگہ بٹھا دیتا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر اور جراح یہ تماشہ دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ تم کوئی ایسا موقعہ یا مسئلہ دریافت کرو۔ جہاں اس قسم کے تعجب خیز کرتب کی تشریح ہو سکے۔

(۴) ایک آوارہ شخص جسے زندگی میں سوائے لق لق زق زق کرنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ اپنے عادات و اطوار کے لحاظ سے ٹھیک ایک حاکم ریاست کے مشابہ تھا۔ ایک مسئلہ دریافت کرو۔ جس کے حل میں آوارہ شخص اور حاکم ریاست کی اس کرداری مطابقت سے مدد ملے۔

(۵) ایک بخیل کسان ڈول کی رسّی سے کنوئیں میں لٹکا ہوا ہے۔ اُس کی شوخ بیوی منڈیر پر کھڑی کہہ رہی ہے۔ کہ میں تم کو ہرگز باہر نہیں نکالوں گی۔ جب تک تم مجھے ریشمی ساری منگا دینے کا وعدہ نہ کرو گے۔ جسے میں ایک مدت سے طلب کر رہی ہوں"۔ بتاؤ اس عورت نے کسان کو کس طرح کنوئیں میں لٹکایا ہوگا۔

ہمارے بھی خدام ہیں کیسے کیسے!!

(از جناب رائے بہادر پنڈت شیو نرائن صاحب شمیمؔ ایڈووکیٹ)

بعض لوگوں کو اللہ میاں کے ہاں سے عقل بہت ناپ تول کر ملتی ہے۔ ہمارا نوکر بھولا ناتھ بھی بدقسمتی سے اُنہی لوگوں میں سے ہے۔ سب سے بڑی صفت اُس میں یہ ہے کہ اسم بامسمیٰ ہے۔ کیا مجال جو اُسے کبھی کوئی بات یاد رہے چنانچہ ایک روز جب کہ ہم روٹی کھانے کے لئے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ اور چٹنی سِل پر پس رہی تھی۔ اُس کے لئے انار دانہ کی ضرورت تھی۔ ہماری جو کم بختی آئی۔ تو ہم نے لالہ بھولا ناتھ کو بلایا اور کہا۔ لو میاں یہ دو پیسے اور جلدی سے ان کا انار دانہ لے آؤ۔ اب لالہ جی جو گھر سے چلے تو بازار پہنچتے پہنچتے انار کا لفظ تو بھول گئے اور دانہ یاد رہا۔ اب آپ سوچنے لگے کہ سارے بازار کے ہر ایک دوکاندار سے دریافت کرنا چاہیئے۔ پہلی دوکان بزاز کی آئی۔ آپ پوچھتے ہیں۔ کیوں جی لالہ جی آپ کے ہاں دانہ ہے۔ بزاز حیران کہ یہ دیوانہ کیا مانگتا ہے۔ کہنے لگا۔ کہ ہم نہیں سمجھتے۔ بھولا ناتھ کہتا ہے کہ دانہ دانہ اگر نہیں ہے تو کہدو نہیں ہے۔ پھر حلوائی کی دوکان آئی۔ وہاں بھی دانہ پوچھا۔ اُس نے کہا۔ کہ بھئی بنیئے کی دوکان پر جاؤ۔ پھر دوکان عطار کی آئی۔ وہاں پوچھا۔ عطار نے کہا۔ کہ بھئی میرے پاس بھی دانہ انار دانہ تو ہیں۔ لیکن اگر گائے بھینس، گھوڑے کے لئے دانے کی ضرورت ہو تو بنیئے کے جاؤ۔ درزی، جفت فروش، کباڑیا، کرانہ فروش غرض کوئی دوکان نہ چھوڑی۔ آخر بنیئے کی دوکان پہ پہنچے۔ بنیئے نے کہا کہ دلا ہوا دانہ تو نہیں جتنے سیر کہو دل دیتا ہوں۔ آپ واپس ہوئے اور جواب یہ لائے کہ دانہ دلا ہوا تو ملا نہیں۔ سب دوکانداروں سے دریافت کیا۔ حکم ہو تو چنے کا دانہ دلوا لاؤں۔ ہم نے کہا:۔

ارے کمبخت! دانہ کس نے مانگا تھا۔ ہم نے تو انار دانہ کہا تھا۔ تجھے چاہیئے تھا کہ پنساری کے ہاں سے دریافت کرتا۔ پھر جا اور انار دانہ لے آ۔ آپ کو اب کے انار دانہ تو یاد رہا۔ مگر یہ یاد نہیں رہا کہ پنساری کی دوکان سے خریدنا ہے۔ آپ بازار گئے اور میوہ فروش کی دوکان پہ انار دیکھے۔ اُس سے پوچھا۔ کہ تیرے ہاں انار کے دانے بکاؤ ہیں۔ اُس نے کہا کہ انار لئے جاؤ اور دانہ نکال لو۔ دانہ علیحدہ نہیں ملتا۔ آپ واپس آتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ کہ میوہ فروش انار دیتا ہے۔ دانہ نکال کر نہیں دیتا۔ ہم نے کہا۔ اے عقل کے دشمن! تجھے کہا تھا کہ پنساری کے جا۔ اور انار دانہ لا۔ بولے مجھے پنساری تو بھول گیا۔ انار دانہ یاد رہا۔ میں نے سمجھا کہ انار تو میوہ فروش کے ہاں سے

ملیں گے۔ مجھے بخشو غلطی ہوگئی۔ آپ پھر بازار جاتے ہیں۔ مگر پیسے لے جانے بھول جاتے ہیں۔ جب دوکان پر پہنچے
تو یاد آئے۔ پھر آئے اور پیسے لئے۔ ہم نے کہا۔ کیوں واپس آیا۔ فرماتے ہیں۔ جناب پیسے بھول گیا تھا۔ ہم نے کہا
بھئی جا کہیں جلدی کر چٹنی کے پسنے تک جلدی لا۔ اب آپ دوکان پر پہنچتے ہیں۔ پھر واپس آکر اطلاع دیتے ہیں
کہ اتنے پیسے کا انار دانہ دوکاندار پڑیا میں دیتا تھا۔ لیکن بھاؤ نہیں بتلاتا کہ کس نرخ سے بیچتا ہے۔ مَیں نے نرخ
پوچھا وہ خفا ہوگیا اور پڑیا میرے حوالے کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ کہ لالہ جی میں مالک سے دریافت کرلوں۔
جناب فرمائیں تو پڑیا لے آؤں۔ ہم نے کہا۔ بھولے نہادیو جا پڑیا لے آ۔ پھر آپ تشریف لے جاتے ہیں۔ اتنے
عرصہ میں دوکاندار دوکان بند کرکے گھر چلے گئے۔ بھولا ناتھ بیرنگ واپس آکر رپورٹ کرتے ہیں۔ بازار میں پنساریوں
کی دوکانیں بند ہوگئیں۔ کوئی تہوار تھا یا کیا بات تھی کہ آج جلد ہی بنیوں نے دوکانیں بند کر دیں۔ القصہ
اُس روز چٹنی میں صرف دھنیا ہی دھنیا تھا۔ ترشی نہ آئی نہ پڑی +

(شمیم)

جذباتِ ٹیگور

(کسی سے خطاب)

تمہاری جستجو کرنے والی آنکھوں سے رنج ٹپکتا ہے۔ وہ میری حقیقت سے باخبر ہونے کے لئے بیقرار ہیں جس طرح چاند سمندر کی گہرائی کا اندازہ لگاتا ہے۔

مَیں نے اپنی ساری زندگی بلاتامل تمہارے سامنے رکھدی ہے اور کوئی راز نہیں چھپایا۔ یہی وجہ ہے کہ تم مجھے نہیں سمجھتیں اگر فقط یہ ایک موتی ہوتا تو سینکڑوں ٹکڑے کر ڈالتا۔ اور تمہارے گلے میں ڈالنے کے لئے ایک ہار پرو دیتا۔ اگر یہ ایک ننھا سا خوبصورت پھول ہوتا۔ تو میں اُسے تمہاری زلف میں پرونے کیلئے ٹہنی سے توڑ لیتا مگر پیاری! یہ دل ہے اُس کا کنارہ اور تہ کہاں؟

تم اس ملک کی حدود سے بے خبر ہو۔ مگر پھر بھی اس کی ملکہ ہو۔

اگر یہ صرف خوشی کا ایک لمحہ ہوتا۔ تو ایک ہلکے سے تبسم کی صورت میں عیاں ہو جاتا اور تم اُسے دیکھ لیتیں اور لمحہ بھر میں اس کا مطالعہ کر ڈالتیں۔

اگر یہ درد ہی ہوتا تو صاف اور شفاف آنسوؤں میں پھوٹ کر بہہ نکلتا اور بغیر کچھ کہے اندرونی راز اس طرح ظاہر کر دیتا۔

لیکن پیاری! یہ پریم ہے

اس کے رنج و راحت بیشمار ہیں اس کی ضروریات اور دولت بے انتہا ہیں۔ یہ تم سے اتنا ہی نزدیک ہے جتنی تمہاری زندگی۔ پھر بھی تم کو ہرگز ہرگز مکمل طور پر اس کا علم نہیں ہوگا۔

(زیدی جوش مدرس مڈل سکول منی منزعہ (انبالہ)

ہندوستان کی عورت

(جناب پنڈت شیوناتھ صاحب کول شاکر گوالیاری)

ہمدرد ہے۔ رفیق ہے۔ درد آشنا بھی ہے
ہمدم ہے۔ ہمخیال ہے۔ اہلِ وفا بھی ہے

سنجیدہ بھی ہے۔ نیک بھی ہے۔ پارسا بھی ہے
صابر بھی ہے حلیم بھی ہے۔ باخدا بھی ہے

عورت اگر ہے خوب تو ہندوستاں کی ہے
اُس کے ہی انتظام سے رونق مکاں کی ہے

وابستہ اُس کی ذات سے گھر کا نظام ہے
ہر خاندان کا اُس سے ہی مشہور نام ہے

فکر اُس کو گھر کے کام کی ہر صبح و شام ہے
ممنون اُس کے فیض کا ہر خاص و عام ہے

بچوں کی مامتا اُسے رہتی ہے رات دن
تکلیف اُن کے واسطے سہتی ہے رات دن

عورت جو ہند کی ہے۔ وہ ہے قابلِ وقار
قانع۔ شریف طبع۔ خردمند ہوشیار

شوہر کی ہے وہ رنج و مصیبت میں غمگسار
اُس کی خوشی پہ اس کی خوشی کا ہے انحصار

گلدستۂ حدیقۂ الفت وہی تو ہے
گنجینۂ سرور و مسرت وہی تو ہے

دھندے سے گھر کے ہی کبھی فرصت نہیں اُسے فیشن سے۔ سوٹ بوٹ سے رغبت نہیں اُسے
بے پردہ ہو کے پھرنے کی عادت نہیں اُسے آزاد ہو کے رہنے کی حسرت نہیں اُسے

وہ چھل فریب۔ مکر۔ ریا جانتی نہیں
وہ کجروی۔ عناد۔ دغا جانتی نہیں

ہے عورتوں میں ہند کی یہ بات خاص کر مردوں سے اپنے رکھتی ہیں وہ اُنس سربسر
رہتا ہے یہ خیال اُنہیں نقش کالحجر سیتا کو رامچندر سے الفت تھی کس قدر

شوہر کی جو مطیع ہے وہ نیک نام ہے
شوہر نہیں تو پھر اُسے جینا حرام ہے

شوہر کا بھی لحاظ۔ عزیزوں کا بھی خیال چھوٹوں سے اُس کو اُنس۔ بڑوں کا ادب کمال
بچوں کا دھیان اُدھر۔ تو اِدھر گھر کی دیکھ بھال چال اُس کی بے نظیر۔ چلن اُس کا بے مثال

عورت جو ایسی ہو۔ وہ نہ کیوں بھاگوان ہو
کیوں رشکِ باغِ خلد نہ اُس کا مکان ہو

ہندوستان میں ہو گئے کتنے ہی ذی وقار شاہ و گدا و عالم و یکتائے روزگار
جرار و اہلِ سیف و تنومند و ہوشیار مرتاض و متقی و خدا ترس و دیندار

عورت کے بطن ہی سے وہ پیدا ہوئے تمام
اس طرح اس زمیں پہ ہویدا ہوئے تمام

ماں کا ہمیشہ ہوتا ہے اولاد پر اثر ہوتی ہے ماں جو عاقل و باہوش و باخبر
دانا و نیک طینت و ذی علم و ذی ہنر خوش خلق و خوشخصال و خوش اقبال و خوش سیر

اولاد میں بھی آتا ہے اُس کا اثر ضرور

اچھے شجر میں ہوتا ہے اچھا ثمر ضرور

لائق تھے۔ بے نظیر تھے۔ وہ عقلمند تھے ہر مرد و زن کو اُن کے نصائح پسند تھے
بے شبہ رشک کانِ طلا اُن کے پند تھے ہندوستان کے واقعی وہ درد مند تھے
بخشا تھا حق نے خوب اثر اُن کی زبان میں
یہ لکھ گئے ہیں حضرات اب اس کی شان میں

ہر اک تھا زیر سایۂ دامانِ مادری کس کو نہیں ہے یاد وہ الطاف گستری
جب منحصر تھی شیر ہی پر جسم پروری تاثیرِ مادری سے ہو کیونکر کوئی بری
بچوں کو ماں کی گود بھی مکتب سے کم نہیں
اس مدرسے میں حاجت لوح و قلم نہیں

آتا ہے دیکھنے میں تو یہ بھی زیادہ تر پڑتا ہے عورتوں ہی کا مردوں پہ بھی اثر
رہتی ہیں اُن کے ساتھ وہ اس طرح عمر بھر ہو جیسے ربط جان و بدن کا بہم دگر
گلدستۂ حیات میں بوئے وفا نہ ہو
یہ دیویاں نہ ہوں تو کوئی دیوتا نہ ہو

لیکن اب اور حال ہے ہندوستان کا نقشہ زمیں کا اور ہے اور آسمان کا
رنگ اور راب ہے دہر میں ہر نوجوان کا ڈھنگ اور عورتوں کی بھی ہے آن بان کا
شائستگی تو نظر آتی ہے ہر طرف
جو چیز ہے نئی وہی بھاتی ہے ہر طرف

رنگِ زمانہ اور ہے اب ڈھنگ اور ہے تعلیمِ مغربی کا بھی ہر سمت دور ہے
دیکھو جدھر مسائلِ ملکی پہ غور ہے ہر مرد و زن کا اب تو نرالا ہی طور ہے

شوق اور فیشن اور روشن اور چال اور
دل اور۔ آنکھ اور۔ خیال اور۔ حال اور

جس مرد و زن کو دیکھئے عشرت پسند ہے تعلیمِ مغربی سے ہر اک بہرہ مند ہے
جو صاحب دول ہے وہی سربلند ہے بے زر جو ہے وہ صورتِ خاکِ نژند ہے

عورت کی ہے یہی۔ یہی شوہر کی آرزو
ایمان جائے۔ جائے نہیں زر کی آرزو

رفتار وقت ایک سی رہتی نہیں کبھی یہ آج ہے کچھ اور۔ یہی کل کچھ اور تھی
چلتی ہے ایسی تند ہوا انقلاب کی محفوظ جس سے رہ نہیں سکتا ہے آدمی

رہتا ہے اُس کا شور ہمیشہ مچا ہوا
عالم ہے انقلابِ مجسّم بنا ہوا

یارب تیرے کرم سے اب ایسا ہو انقلاب راہِ غلط پہ چلنے سے سب کو ہو اجتناب
ہو ذوق و شوق پریم کا بھگتی کا بیحساب مانائیں سب ہوں حسنِ عقیدت میں لاجواب

شاکر رہیں وہ دھرم پہ ثابت قدم رہیں
ایمان کے ساتھ دولت و جاہ و حشم رہیں

(شاکر)
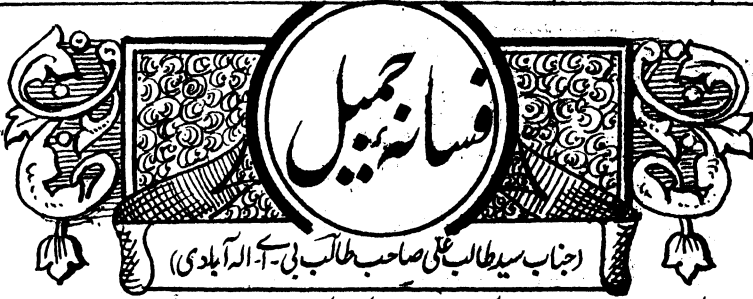
میں - میں ایک فسانہ کہنا چاہتا ہوں - مگر ایسا کہ اس کا ایک ایک لفظ سچا ہو جھوٹ کی چھاؤں تک نہ پڑے -
جمیل - سادگی کے آگے تصنع، واقعات کے سامنے گڑھنت اور حقیقت کے مقابلہ میں مضمون آرائی کی کوئی وقعت نہیں - کوئی وزن ہی نہیں -
میں - ٹھیک ہے - مگر جب تک مسالہ نہ ہو کھانا بے مزہ اور بناؤ سنگار نہ ہو تو دلہن بد نما معلوم ہوتی ہے -
جمیل - اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری زندگی نمایشوں کا مجموعہ اور ہماری نگاہ تصنع کی عادی ہو گئی ہے - آج میں اپنی زندگی کی ایک سچی کہانی سناتا ہوں - سادی ہونے کے ساتھ کس قدر عجیب اور کس حد تک دلچسپ -
میں - خیر آپ کہانی سنائیے - سادگی مزہ اور دلچسپی کا فیصلہ دوسروں کے سپرد کیجئے -
جمیل - بہت خوب جہاں بے ربطی معلوم ہو - وہاں ٹوک دیجئے گا -

آپ کو معلوم ہے کہ میرے والد وکیل تھے - ضلع میں اُن کی وکالت ایسی چلی کہ دھوم مچ گئی، وکلا کی فہرست میں سب سے پہلا نام انھیں کا تھا، روپیہ، پیسہ، آرام و راحت، سکون و عیش میرے لئے یہ سارے سامان جمع تھے، آمدنی وافر تھی - خرچ کھلا ہوا تھا - مجھ سے چھوٹا آٹھ برس کا ایک بھائی تھا اور مجھ سے بڑی دو بہنیں - میری پرورش بڑے لاڈ پیار سے ہوئی تھی - کبھی کوئی تکلیف نہیں دیگئی - ڈانٹ تو کبھی کبھی ضرور پڑجاتی تھی - مگر گوشمالی یا مار پیٹ کبھی نہیں ہوئی -

اب اس وقت سنہ ۳۳ء میں میرا سن اکتیس برس کا ہے - سنہ ۱۹۱۵ء تک میں نے گھر پر قرآن شریف پڑھا - فارسی کی بہت سی کتابیں مولوی صاحب سے پڑھیں اور اُردو بھی کافی پڑھ لی -

بعد ازاں محلّے کے ایک سکول میں چوتھے درجہ میں انگریزی پڑھنے کے لئے داخل ہوا - چوتھا اور پانچواں درجہ ایک سال کے اندر پاس کر لیا - اور سنہ ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول بھیجا گیا - سنہ ۱۹۱۷ء میں چھٹا درجہ پاس کرنے کے بعد میں نے تعلیم ترک کر دی -

میری صحبت بہت بُری ہو گئی تھی - سگرٹ کلب کا صدر تھا - اسراف میں اوّل نمبر، گپ کا شیدائی،

پتنگ کا دلدادہ اور پوشاک میں نواب بے ملک۔

۱۹۲۱ء میں عربی پڑھنی چاہی۔ سو روپیہ پر ایک مولوی رکھے گئے۔ مگر پانچ مہینے سے آگے معاملہ نہ چل سکا ۱۹۲۲ء میں ایک اسکول میں آٹھویں درجہ میں نام لکھایا اور چھ مہینے کے بعد چھوڑ دیا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ آدمی بیکار رہتا ہے۔ تو اس کا دماغ شیطان کا چرخہ بن جاتا ہے۔ چڑچڑاپن، لغویت، غرور، غصہ، بے حیائی ان سب میں بیکاری کا کافی حصہ ہوتا ہے۔

لوگ مجھ سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ ولی کے گھر میں شیطان پیدا ہوا ہے میں خود بھی اپنے آپ سے مایوس تھا۔ میرے والد ہزاروں کے لئے نمونہ تھے، غربت میں تعلیم حاصل کی، عزیزوں کی پرورش کی، پشتینی جھگڑوں کو مٹا دیا، اور ایسی نیکنامی پیدا کی جو عرصہ تک یادگار رہیگی۔

غرض اس زمانے میں میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بالکل جاہل، بلا کا خراج، نہ کسی کی بات سنتا تھا نہ کبھی اپنی حالت سنبھالنے کا خیال ہوتا تھا۔

مگر خدا کی دین کہئے یا طبیعت کی افتاد سمجھئے ایک بات میری گھٹی میں پڑی ہے۔ وہ یہ کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ سخت سے سخت موقعے گذرے ہیں۔ ذرا سے جھوٹ میں راحت ہی راحت ہوتی میں نے کوشش بھی کی مگر جھوٹ نہیں بول سکا۔ کبھی نہیں بول سکا۔ نہ اب تک بول سکتا ہوں۔

میرے خیال میں صرف یہی ایک ایسی شمع ہے جو جہالت اور گناہ کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی اپنا نور پھیلاتی رہتی ہے۔

میری پتنگ بازی کی یہ حالت تھی۔ کہ دن دن بھر کوٹھے پر گذرتی تھی۔ صبح ہے تو شام ہے تو دوپہر ہے تو میں ہوں اور کوٹھا، شروع میں دس بیس کے ماٹھے جاتی تھی پھر اور شوق ہوا تو میدان بدے جانے لگے، عمدہ مانجھا سُتنے لگا۔ چودہ تاری سادی بٹنے لگی، خاص پتنگ تیار ہونے لگے۔

رفتہ رفتہ بازی بدبد کر پتنگ لڑنے لگی، نہ کھانے کی فکر، نہ گھر کا خیال، کوئی بیمار ہے تو ہو، ماں باپ کو بیچینی سے انتظار ہے تو ہو، میدان ہاتھ رہے اور ایک آدھ پیچ بڑھے رہیں۔

اب دو ڈھائی سو ماہوار کی بیچ لگ گئی۔ ایک روز میری بھانجی بیمار تھی، ڈاکٹر کو بلانے گیا وہ نہ تھے۔ وہاں سے لوگ ایک میدان میں پکڑ لیگئے۔ شام کو چار بجے آدمی پہنچا۔ گھر واپس آیا تو بھانجی کا جنازہ دروازے سے نکل رہا تھا۔

والد نے پوچھا۔ کہاں تھے۔

میں نے شرم سے گردن جُھکالی۔ "پتنگ لڑا رہا تھا۔

والد نے ایک نگاہ ڈالی اور خاموش آگے بڑھ گئے۔

میں بھی جنازے کے ساتھ گیا۔ میرا اعتقاد یہ ہے کہ انسان ہر عادت کے ترک کر دینے پر قادر ہے۔ جب کوئی شخص قسم کھاتا ہے یا ترک عادت کا عہد و پیمان کرتا ہے تو میں نے بھی دیکھا ہے کہ سو میں ننانوے صرف اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں، میں نے کبھی نہ قسم کھائی۔ نہ عہد کیا۔ مگر کیا آپ یقین کریں گے۔ کہ بھانجی کے جنازے والا دن اور آج کا دن، پھر کبھی پتنگ بازی کیسی خیال تک نہیں آیا۔

ترک تعلیم کے پورے سات برس کے بعد ایک روز کسی ہمدرد مگر جاہل عزیز نے مجھ سے پوچھا۔ کیوں بھیّا تم وکالت کب سے کرو گے؟

ایک تیر تھا کہ کلیجے سے پار ہو گیا۔ اس سے پہلے بہت سی کوششیں ہو چکی تھیں۔ کہ میں دوبارہ تعلیم کی طرف متوجہ ہو جاؤں مگر آپ سمجھتے ہی ہیں کہ ضد، دباؤ، اور خلاف طبیعت باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

جاہل عزیز کے ایک فقرے نے ایسا کچھ اثر کیا کہ میں نے والد سے اجازت لی کہ انٹرنس کا امتحان پرائیویٹ دیدوں۔ یہ اکتوبر ۱۹۲۴ء کا ذکر ہے۔ کئی جگہ خط و کتابت کی گئی۔ مگر ہر جگہ سے صاف جواب ملا کہ ایسا طالب علم جس نے چھٹے درجے سے چھوڑ دیا ہو۔ اور سات برس تک چھوڑ رکھا ہو۔ امتحان میں شریک نہیں ہو سکتا۔ آخر ایک یونیورسٹی نے اجازت دی۔ امتحان کے صرف پانچ مہینے رہ گئے تھے۔ چار سال کا پورا کورس میں نے پانچ مہینے میں ختم کیا۔ اور ۱۹۲۵ء میں دوسرے درجے میں کامیاب ہو گیا۔

سب کو خوشی ہوئی مگر مجھ کو سب سے زیادہ تھی۔ اب ٹوٹی ہوئی امیدیں بندھ گئیں۔ میں جن عزیزوں اور دوستوں کی نگاہ میں خار تھا پھول بن گیا۔

۱۹۲۵ء میں میری شادی بھی ہو گئی۔ روپیہ پہلے سے کہیں زیادہ صرف کرنے کو ملنے لگا۔ تاش کا شوق ہمیشہ سے تھا۔ مگر جوئے سے نفرت تھی۔ جوا حرام ہو یا حلال اچھا ہو یا برا۔ زہر ہو یا تریاق۔ مگر اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جوا، بداخلاقی، بے حیائی، خود غرضی اور بربادی کا نہایت چلتا ہوا آلہ ہے۔

میری حالت یہ تھی کہ جو لوگ فلش کھیلتے تھے اور صرف دل بہلانے کی غرض سے محض چار چھ آنے سے کھیلتے تھے۔ ان کے پاس بیٹھنا بھی اپنی ذلت سمجھتا تھا۔ اور انہیں لعنت ملامت کرتا تھا۔ مگر کسے خبر تھی کہ ایک دن یہ عادت خود مجھے بھی پڑ جائیگی۔ اور افسوس یہی ہوا۔ اوّل اوّل تو میں بھی صرف تفریحاً کھیلتا تھا۔ مگر سکھانے والوں نے اپنا اُلّو سیدھا کیا تھا۔ روپیہ دھیلی جیت لیا کرتے تھے۔ اب عمدہ کھیلنے کی خواہش ہوئی۔ جیتنے کی آرزو نے بیچین کیا۔ اور ہاری ہوئی رقمیں واپس لینے کا شوق چرایا۔ پھر کیا تھا بدی کے دیوتا نے ہاتھ پاؤں نکالے رات رات بھر پھڑ پر بیٹھنے کی ٹھہری۔ فلش ہر چیز سے زیادہ عزیز، جب بیٹھ گئے آٹھ آٹھ گھنٹے اُٹھنے کا خیال بھی نہیں

آتا۔ جیتتے ہیں تو اور کی ہوس ہارے ہیں تو واپس جیتنے کی کوشش، شہر بھر کے جواریوں سے دوستی، دو دو سو چار چار سو کا وارا نیارا ہونے لگا، رات کو جاگنے سے طبیعت بگڑنے لگی۔ تعلیم سے جی اُکتانے لگا۔ اور نئی نویلی بیوی انتظار کی گھڑیاں مشکل سے کاٹنے لگی۔

میں نے دیکھا کہ لوگ بے ایمانیاں کرتے ہیں، تاش لگاتے ہیں، نشان کرتے ہیں، ذراسی بات پر جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، ایک دوسرے کا اعتبار نہیں کرتے، دوستی بالائے طاق ہو جاتی ہے۔ مگر آنکھیں نہیں کھلتی تھیں۔

ایک دن میرے ایک دوست نے کہا۔ کہ بھائی میں تم کو سمجھا تو نہیں سکتا۔ مگر خرچ کرنے کا لطف جبھی ہے جب انسان خود کمائے۔ باپ کی کمائی اُڑا دینا کوئی تعریف کی بات نہیں۔

افسوس ہے کہ یہ بات اس وقت کہی گئی۔ جب جوئے کی لت اچھی طرح پڑ چکی تھی اور آٹھ برس گذر چکے تھے۔ پھر بھی ایسا اثر ہوا کہ اسی دن سے فلش چھوٹ گیا۔

مگر آپ جانئے کہ منہ سے لگی ہوئی مشکل سے چھوٹتی ہے۔ طبیعت نے کہا۔ کہ فلش بُرا ہے اور بالکل پتوں کے آنے پر موقوف ہے۔ مگر برج اس وقت تمام ممالک میں کھیلا جاتا ہے۔ اوسط درجہ کا کھیل ہے۔ اور چار چھ گھنٹے کے بعد حساب کیا جائے تو چار پانچ سے زیادہ کی ہار جیت نہیں ہوتی۔

اب فلش کی جگہ برج ہونے لگا اور بہت بڑھ گیا۔ ابھی دو مہینے ہوئے۔ ایک صاحب نے ہنس کر کہا۔ آپ دو تین بار عتبات عالیات کی زیارت کر آئے ہیں۔ اور پھر بھی بازیاں بدتے ہیں۔ اُسی دن سے یک لخت چھوڑ دیا۔ اور اُمید ہے کہ اب کبھی اس بلا میں گرفتار نہ ہوں گا۔

یہ سچ ہے کہ جب تک چیز فطری حدوں میں رہتی ہے اچھی اور بُری نہیں ہوتی۔ جب زیادتی ہوتی ہے۔ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر ایسے خوش نصیب لوگ کم ہیں، جو شراب، جوئے، گفتگو اور عیش پرستیوں میں اوسط کی سنہری پتلی کی حفاظت کر سکیں۔

میں۔ آپ کی سرگذشت بڑی دلچسپ اور عبرت خیز ہے۔ مگر یہ تو کہئے کہ آپ کی صحت کیسے سنبھلی اور تعلیم کا کیا حشر ہوا؟

جمیل۔ ہاں میں بھول گیا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں انٹرنس پاس کر کے میں نے ۱۹۲۷ء میں ایف اے پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں بی اے کا پہلا سال ختم کیا۔ ۱۹۲۹ء میں حاضری کی کمی اور قلب کی خرابی سے نہیں بیٹھ سکا اور دوبارہ تعلیم ترک کر دی۔ مگر جولائی ۱۹۳۱ء میں اپنے سے آٹھ برس چھوٹے بھائی کو بی اے کے امتحان کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر پھر جوش آگیا۔ حالانکہ اُسی سال والد کا انتقال ہوا تھا۔ خاندان کی، علاقہ کی اور مختلف قسم کی ذمہ داریاں اکبارگی مجھ ایسے آزاد کے سر آپڑی تھیں۔ پھر بھی ہمت عجیب چیز ہے۔ میں نے ۱۹۳۲ء میں بی اے پاس کر لیا۔ اور

آج ۱۹۳۳ء میں ایم اے کے آخری سال میں ہوں۔ رہ گئی میری صحت، تو میں بچپن سے کمزور ہوں۔ پیدائشی دُبلا پتلا ہوں۔ طفلی میں چیچک کے دو حملے اور بہت سخت حملے اُٹھا چکا ہوں۔ یوں بھی ہمیشہ لاغر اور بیمار رہا کرتا تھا ۱۹۲۵ء کے بعد میں نے تھوڑی تھوڑی ورزش اور ٹینس شروع کی ہے۔ ورزش پابندی کے ساتھ کرتا ہوں۔ صرف اسی قدر جتنی طبیعت پر بار نہ ہو۔ اب میری صحت خدا کے فضل سے بالکل درست ہے۔ معمولی زکام بخار تو سبھی کو ہو جایا کرتا ہے۔

میں۔ مگر پارسال تو آپ دو مہینے تک بستر سے لگے ہوئے تھے، اچھے ہونے کی اُمید نہ تھی۔

جمیل۔ آپ نے بڑا نازک سوال پوچھا، خیر سنیئے یہ تو آپ جانتے ہیں۔ کہ میں اس سال بھی ایران گیا تھا اور پارسال بھی گیا تھا۔ میری جوانی، وہاں حسن کی فراوانی اور ارزانی۔ پھر لطف یہ کہ بیوی ساتھ تھی۔ مگر بلا سبب بلاوجہ آپس میں شکر رنجیاں ہوگئیں تھیں۔ اس ماحول سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں نے کیا کیا۔

میں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ آپ کا چال چلن رشک کے قابل ہے اور بہت مضبوط۔ پھر کیا ہوا۔

جمیل۔ یہ سب کیا پوچھتے ہو مجھے بھی معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ مجھ کو اپنے چال چلن پہ ناز ہے۔ شاید دو ایک بار کے علاوہ کبھی کوئی لغزش نہ ہوئی ہو گی۔ مگر بے خطا بیوی سے انتقام لینے کی سوجھی اور مذہب کو محض آرٹ بنا کر میں نے دادِ عیش دینی چاہی۔ جس طرح ہر اچھے خاصے انسان میں دیوانگی کے جراثیم موجود ہو سکتے ہیں۔ ویسے ہی فطرت انسانی بہانے تراش تراش کر بُرائی کی طرف مائل کرتی رہتی ہے۔ اس لئے عقل سلیم اور مذہب کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ گناہوں کا جوار بھاٹا چشم زدن میں انسان کو تہ نشین کر دے۔

مظلوم بیوی کا صبر کہیئے۔ قانون فطرت کی خلاف ورزی کی سزا میں حبس دوام سمجھئے یا خُدائی قہر سے تعبیر کیجئے۔ میں ایک ایسی بیماری میں گرفتار ہوگیا۔ جو تلپے سر سے کی گھناؤنی اور لاعلاج تھی۔ اور جس ناگن کا مارا کبھی پھلتا پھولتا نہیں۔

مگر یہاں بھی میرا سچ بولنا کام آیا۔ میں نے مرض کے آغاز ہی میں ڈاکٹروں حکیموں، تیمار داروں اور ہمدردوں سے تمام کچا چٹھا صاف صاف بتا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب بالکل اچھا ہوں۔ اگر شرافت کے راستے سے قدم نہ ڈگے تو دوبارہ ایسی روح فرسا اور ذلیل بیماری کے پنجے میں گرفتار نہ ہوں گا۔

میں۔ اب آئندہ کیا ارادہ ہے، نوکری یا زراعت یا تجارت،

جمیل۔ بھائی صاف تو یہ ہے کہ میں نے اکتیس برس کے تجربہ میں صرف چار باتیں سیکھی ہیں۔

ایک تو یہ کہ جھوٹ کبھی نہ بولو۔ چاہے کچھ بھی ہو۔

دوسرے یہ کہ قرض نہ لو

تیسرے یہ کہ آئندہ کے لئے بہت زیادہ نہ سوچو۔ فی الحال ایم اے پاس کرنے کا ارادہ ہے۔ آئندہ سال کیلئے اپریل ۳۴ء میں سوچوں گا۔

اور چوتھی بات یہ ہے کہ ہمیشہ ہنستے رہو۔ اور ہنسانے کی کوشش کرتے رہو ورنہ زندگی بیکار ہے۔ خلق کی خدمت بہت مشکل، لوگوں کو نفع پہنچانا دشوار، مگر یہ بہت آسان ہے کہ ہنسو اور ہنساؤ۔

(فسانہ نگار)

(از حضرت کوکب شاہجہانپوری)

نگاہِ محبت فزا چاہتا ہوں — مسافر ہوں اک رہنما چاہتا ہوں

تجلّی نظر آشنا چاہتا ہوں — تجھے جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہوں

ستم چاہتا ہوں، جفا چاہتا ہوں — کہ مشقِ طریقِ وفا چاہتا ہوں

نہ پوچھے کوئی مجھ سے کیا چاہتا ہوں — کہ اپنے کیے کی سزا چاہتا ہوں

ابھی خام ہے کچھ مذاقِ تمنّا — کرہائے صبر آزما چاہتا ہوں

مجھے کوئی کافر مسلمان کر دے — مجازِ حقیقت ادا چاہتا ہوں

دِلا دے کوئی یاد بھولا ہوں کس کو — بتا دے کوئی ہائے کیا چاہتا ہوں

خریدار ہے کون دنیا میں دل کا — کہاں اور کیا بیچنا چاہتا ہوں

خطا پر ندامت خطا در خطا ہے — خطا کر کے دادِ خطا چاہتا ہوں

کیا ہے محبت نے گستاخ کتنا — کہ تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں

ہوس چاہتی ہے تجلّیِ عریاں — مگر میں نگاہِ رسا چاہتا ہوں

جو قیدِ مجاز و حقیقت اٹھا دے — وہ کیفیتِ دل کشا چاہتا ہوں

تمنائے دل اور محدود! کوکب

مقامِ ورا الورا چاہتا ہوں

از جناب مظہر انصاری بی - اے آنرز

بچے نے ماں کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" امّی آپ کھلونے تو لے چلنے دینگی نا؟"

ماں ٹرنک میں کپڑے رکھ رہی تھی۔ اُس نے سر اُٹھا کر بچّے کو دیکھا۔ بولی۔" تمہارے کھلونے! تم.... ہارے ...... کھلونے"۔

اور یہ کہتے کہتے اس کے چہرے پر جو دھوئے کپڑے کی طرح سفید تھا، خون کی سُرخی دوڑ گئی۔

بچے سے پوچھنے لگی۔" کیا کہہ رہے تھے تم..... کیا کہہ رہے ہو لال؟" بچّے نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔" میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ مجھے اپنے کھلونے تو ساتھ لے چلنے دینگی نا"؟

عورت گھبرا سی گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بچّے کی بات اپنی ضرب کے لحاظ سے کوئی گھونسہ تھی۔ بیٹھے بیٹھے وہ اس طرح ڈھلک گئی۔ جیسے کوئی پتھر کھا کر پیچھے کی طرف پلٹے۔ اگر دیوار کا سہارا نہ لے تو یقیناً گر جاتی۔

بچہ بولا۔" اب ہم اِس گھر سے تو جا رہے ہیں نا؟ ابّا کے گھر سے؟ میں اپنے کھلونے یہاں کیوں چھوڑوں؟ خبر نہیں کون آکے رہیگا۔ میرے کھلونوں کو تو پھوڑ دیگا"۔

عورت نے پھٹے پھٹے دیدوں سے بچّے کو دیکھا۔ اس کے لانبے لانبے بال گل جھٹیوں کی صورت میں رُخ پر آرہے تھے۔ دل کی وضع کے بیضوی تراش لیئے ہوئے چہرے پر افسردگی طاری تھی اور آنکھوں میں دُکھ۔ بولی۔ "بیٹے جس نئے گھر میں ہم جا رہے ہیں۔ وہ کچھ بڑا نہیں ہے۔ لے دے کے دو ہی تو کمرے ہیں۔ تم اگر اپنے سارے کھلونے لے گئے تو رکھوگے کہاں؟

بچہ بولا۔" رکھوگے کہاں؟ امّی کمرے میں رکھینگے۔ جیسے یہاں رکھتے ہیں۔ ابّا جان کے گھر میں"

ماں نے جواب دیا۔" مگر بیٹے ابّا جان کا گھر تو بہت بڑا تھا۔ یہاں تمہارے کھلونوں کے لیئے ایک کمرہ کا بندوبست ہو سکتا تھا۔ جس دو کمروں والے نئے گھر میں ہم اُٹھ کے جا رہے ہیں۔ وہاں اگر پورا ایک کمرہ تمہارے کھلونوں سے بھر گیا تو باقی ضروری سامان کہاں رکھا جائیگا"۔

بچّے نے حیرت سے کہا۔" ضروری سامان؟ تو کیا کھلونے ضروری نہیں ہیں"؟

ماں نے تعجب سے اُسے دیکھا۔ بولی "ہاں بیٹے ہیں۔ زندگی میں سب کو کھلونوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر اُمّی کی جان تمہارے کھلونے ایک دو تھوڑے ہی ہیں۔ ایک پورا کمرہ اُنھیں سے بھرا پڑا ہے۔ سب کے سب لے چلنے پہ ضد کروگے تو نیا گھر سارے کا سارا تمہارے ہی کھلونے سے بھر جائیگا"۔

بچہ اس فلسفے کو نہیں سمجھ سکا۔ مگر ماں کا لحاظ کرکے چُپ ہو رہا۔ معاً اُس کے ذہن میں سمجھوتے کی ایک صورت آئی۔ تیزی سے آگے بڑھ کر ماں کے زانو پہ جا بیٹھا۔ بازو گردن میں حمائل کر دئے۔ اور اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "امّی! ہم بتائیں۔ ابا جان کے گھر سے جاؤ نہیں ہیں اُمّی؟ یہیں رہو۔ بڑا اچھا گھر ہے یہ..... اُس نئے گھر میں تو دو ہی کمرے ہونگے...... میں کھیلونگا کہاں"؟

عورت نے بچّے کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کا سر ٹرنک میں آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ بال گر کر آنکھوں کے آگے آ گئے تھے۔ بچہ ماں کے چہرے کو دیکھنے کی ناکام کوشش چھوڑ کر زانو سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ دفعتاً اُس کی نگاہ عورت کی گردن پر پڑی اور پھر اِس تل پر جو صراحی دار بلّوریں گردن کی زینت تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ اور ایک اُنگلی آہستہ سے اُس تل پر رکھتے ہوئے بولا۔ "ابا جان اس تل کو پیار کیا کرتے ہیں کیوں امّی"؟

عورت ایک چکّر کی طرح گھوم کر ٹرنک سے ہٹی۔ اور روکھے لہجے میں بچے سے مخاطب ہو کر بولی۔ "ننھے کیوں مجھے دق کرتے ہو؟ دیکھتے نہیں کام کر رہی ہوں؟...... جاؤ..... کھیلو...... جاؤ"۔

کہتے کہتے اُس کی آواز بھرّا گئی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ اور رونے لگی۔

بچہ ششدر رہ گیا۔ اور ماں کی اس حرکت کا مطلب بالکل نہیں سمجھ سکا۔ ایسی اُس نے کونسی بات کہدی۔ جس سے اُمّی دِق ہو گئیں؟ آخر اُس نے امّی کو ایسا کیا دِق کیا۔ کہ رونے پہ آ گئیں؟ کیا یہ پوچھنا بھی گناہ ہے کہ کہ میں اپنے کھلونے لے چلوں؟ رہا تل سو اُسے وہ اب سے پہلے بھی ہزاروں دفعہ اُنگلی سے چھُو چکا ہے اور اور یہ بات بھی اس نے کچھ غلط نہیں کہی کہ ابّا اس تِل کو پیار کیا کرتے ہیں۔

بچّہ بالکل نہیں سمجھ سکا۔ آخر اس طرح رو پڑنے سے ماں کا مطلب کیا ہے۔ مگر نہ سمجھنے کے باوجود بھی وہ ماں کے ساتھ تھا۔ وہ روئی۔ تو یہ بھی رویا۔ اُس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ وہ بھی روتے روتے نڈھال ہو کر فرش پر گر پڑی۔ تو یہ بھی روتا ہوا اُس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ اور سسکیاں بھرتے ہوئے بولا۔ "اچ ــــ چا ــــ تو ــــ ام ــــ بی ــــ ام ــــ می ــــ کو ــــ کو ــــ پیار ــــ نہیں کرنے کے...... ام ابّا سے کہدینگے ...... امّی نے ــــ"

اور فقرے کو نا تمام چھوڑ کر رو پڑا۔ (آخر کو بچّہ تھا) اور ماں کی گود میں آ رہا۔

ایک لمحہ نہیں گذرا کہ عورت کے ہونٹ اُس کے اشک آلود رُخساروں پر تھے۔ بولی "میری جان ــــ میرے

لال۔ تو کیوں جان ہلکان کرتا ہے۔ ماں اُجڑتی ہے۔ اُجڑا کرے۔ تیرا دل کیوں میلا ہو۔ بھلا ہو سکتا ہے۔ کہ میں اپنے دل کے ٹکڑے کو پیار نہ کروں۔ تجھے ناراض کرکے اُمی کہاں رہیگی۔ آ ؤ۔ اُٹھو۔

کہتی جاتی تھی اور اپنے دوپٹے کے آنچل سے گود میں لئے ہوئے بچے کے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔

بچے نے ماں کے لہجے کو اُمید افزا پاکر کہا۔ "تو اُمّی یہاں سے جاؤ نہیں —— اچھی میری اُمّی —— نیا گھر تو بہت چھوٹا ہوگا۔ نہ واں باغ ہوگا نہ باجہ ہوگا، نہ کھلونے رکھنے کے لئے جگہ نکلیگی"۔

عورت نے آنکھوں پر سے رومال ہٹا کر جواب دیا۔ "نہیں بیٹے اب یہاں تو ہم رہنے کے نہیں۔ یہ ابّا جان کا گھر ہے۔ اب ہم تمھارے ابّاجان کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائینگے"۔

لڑکے نے بیتابی سے پوچھا۔ "کیوں؟ ابّاجان منع کرتے ہیں؟ وہ تو منع نہیں کرتے۔ انھوں نے تو کبھی بھی منع نہیں کیا۔ وہ تو کہیں گے ہاں تم ہر چیز کو ہاتھ لگاؤ۔ وہ تو کبھی بھی نہیں کہنے کے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ"۔

عورت نے گردن ہلا کر انکار کیا۔ "نہیں بیٹا تم نہیں سمجھتے"۔

بچے کو چپ لگ گئی۔ جہاں سے چلے تھے وہیں پھر آگئے۔ ماں پھر ٹرنک میں کپڑے رکھنے لگی۔ اُس کا سر پھر آگے کی طرف ٹرنک میں جھک گیا۔ بچہ پھر ایک مُتفکرّ صورت بنا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے سوالات پھر بغیر جواب کے رہ گئے۔

اپنے ذہن میں اُس نے صورتِ حالات پر ایک نظر ڈالی۔ دماغ سوچنے میں مصروف تھا۔ اور نگاہیں...

... کمرے کا جائزہ لینے میں۔ کھڑکی کے قریب ایک کونے میں ایک پیانو رکھا تھا، پیانو کے قریب کتابوں کی الماری تھی جس میں سے کتابیں نکال نکال کر وہ تصویریں دیکھا کرتا تھا۔ الماری سے چند قدم کے فاصلے پر ...نشدان تھا —— دل ہی دل میں بچے نے ان چیزوں کا مقابلہ اُن دو چھوٹے چھوٹے کمروں سے کیا۔ ...ن کا ذکر امّی نے کیا تھا۔ سوچنے لگا وہ کمرے ایسے کیا ہونگے۔ زیادہ سے زیادہ نکلینگے ہمارے باورچی خانہ ...ے برابر۔ تو پھر میرا بلیک بورڈ کہاں لٹکیگا۔ میرا کاٹ کا گھوڑا کہاں دوڑیگا، میری ریل گاڑی کہاں چلیگی ...ب وہ ترچھ کہاں ناچیگا۔ اور ہاں —— وہ گاؤں کہاں بسیگا۔ جو ابّا جان نے پٹھے کے مکانوں سے تیار کیا ہے۔ ایک دم بول اُٹھا۔ "اُمّی! ہم سب کھلونے لے کر چلینگے اپنے"۔

عورت نے بچے کی بات سُنی ان سُنی کر دی۔ ٹرنک کپڑوں سے پُر ہو چکا تھا۔ بند کرتے ہوئے بولی۔ اچھا یہ تو ہو گیا۔ اب برتن بھانڈا" بچے نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو لے چلوں نا سب کھلونے اُمّی"

عورت نے پھر چُپ سادھنی چاہی۔

بچہ اُسے جھنجھوڑ کر بولا۔ "کیوں اُمی"۔

عورت بولی" اچھا!! اچھا!! سن لیا۔ لے چلو کہیں۔ (کسی فوری خیال سے متاثر ہو کر) جتنے کھلونے ثابت ہوں وہ لے چلو۔۔۔۔۔۔ جاؤ اپنے کمرے میں جاکر دیکھو جو کھلونے ثابت ہوں اُنہیں ایک جگہ جمع کر لو۔ ثابت کھلونے لے چلیں گے۔ ٹوٹے ٹوٹے چھوڑ دینگے۔"

یہ گویا آخری جواب تھا۔ بچّہ سمجھ گیا کہ یہ ماں کی طرف سے آخری جواب ہے۔ اب کسی بات کی پذیرائی نہیں ہوگی۔

بغیر کچھ کہے سُنے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اور کمرے سے نکل گیا۔ ماں کے الفاظ دماغ میں گونج رہے تھے ـــــ ثابت کھلونے لے چلینگے اور ٹوٹے چھوڑ دینگے ـــــ

دو ہی قدم گیا ہوگا۔ جو اُسے خیال آیا کہ ثابت کھلونے میرے پاس ہیں کتنے؟ بلیک بورڈ ہے تو اُس میں دراڑ پڑی ہوئی۔ ریل گاڑی ہے تو وہ پچکی ہوئی۔ گھوڑا ہے تو اُس کے دونوں کان اُلٹے ہوئے۔ اور وہ ریچھ تو کہیں سے ثابت ہی نہیں (اور یہی ایک کھلونا اُسے سب کھلونوں میں عزیز تھا) قریب پہنچ کر بچّے نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر کی طرف دیکھا۔ چوکھٹ پھلانگ کر اندر پہنچا۔ وہاں حالت خیال سے بھی بدتر نکلی۔ ایک کھلونا بھی ایسا نہیں تھا جو ثابت کہا جا سکے۔ بچّہ ہر کھلونے کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لینے لگا۔ کام بہت تھا اور وقت تھوڑا۔

فلسفیانہ تدبّر کے ساتھ وہ ہر کھلونے کی حالت پر غور کرتا۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا اور دماغ میں ہلچل ۔ دفعتاً اُٹھ کھڑا ہوا۔ دَوڑا دَوڑا ابّا جان کے کمرے میں گیا۔ اور وہاں سے گوند دانی اور لیٹھے کی دھجیاں لے کر آیا۔ پھر امّاں جان کے کمرے میں گیا اور وہاں سے تاگے لچھیاں اور سوئی لایا۔ اور پھر یہ سارا مالِ غنیمت مع ٹوٹے کھلونوں کے اپنے گرد جمع کر کے فرش پر بیٹھ گیا۔

اب ایک ایک کھلونے کو اُٹھاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کی مرمت کیونکر ہو سکتی ہے ۔۔۔۔۔۔

سب سے پہلے ریچھ کا نمبر آیا۔ بچّے نے اُسے اُٹھایا۔ سینے سے اُسے چمٹا لیا اور پھر اُس کی درستی میں مصروف ہو گیا۔

اُنگلی میں سُوئی چبھتی تو آنسو ضرور نکل آتے مگر آواز نہ نکلتی ۔

✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢

شام ہونے لگی۔

بچّہ برابر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اُسے نہ شام کے ہونے کی خبر تھی۔ نہ رات کے آنے کی۔ گھر کے بند دروازے پر دستک ہوئی۔

بچے کو اپنی مصروفیت میں دستک کی آواز کہاں سنائی دیتی۔ البتہ اُس کی ماں نے جو صدر دالان میں افسردہ حال بیٹھی تھی کھٹ کھٹ کی آواز سُنی۔ نوکر چاکر سب کو جواب مل چکا تھا۔ خود ہی دروازہ کھولنے اُٹھی۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ دالان سے باہر نکلے۔ ایک لمبا تڑنگا مرد انگنائی طے کر کے دالان کی چوکھٹ پر قدم رکھ چکا تھا۔

عورت نے سٹ پٹا کر کہا۔ "تم — تم آ گئے"۔

مرد نے جواب دیا "ہاں"

عورت بولی۔ "اچھا تو لو اپنا گھر بار سنبھالو۔ بندی رخصت ہوتی ہے۔ جو چیزیں میری تھیں وہ میں نے باندھ لی ہیں۔ باقی تمہارا گھر تم کو مبارک رہے"۔

مرد نے آگے بڑھ کر عورت کے ہاتھ پکڑ لیئے۔ بولا "تم کچھ دیوانی تو نہیں ہوئی ہو"۔

عورت بولی۔ "جی ہاں اب تو میں دیوانی ہی ہوں۔ بلکہ دیوانوں سے بھی بدتر۔ بھلا غضب خدا کا، جو جو کچھ تم نے مجھ کو کہا ہے۔ اُسے سُننے کے بعد بھی میں تمہارے گھر میں رہونگی۔ دانا کھانا حرام، پانی پینا حرام، ہونی نہیں جواب میں ایک لمحہ کے لیئے یہاں ٹھیروں۔ تمہارے آنے کا انتظار تھا۔ سنبھالو اپنا گھر۔ یہ جگہ نہ اب میرے لائق، نہ میرے بچے کے۔

مرد ۔ بچے کو لیجانے والی تم کون، بچہ میرا ہے"۔

عورت ۔ وہی بچہ جس کی ماں تمہاری نگاہوں میں بے عزت ہے۔ جس کی تم نے دس اپنے پرایوں کے سامنے بھٹی کی۔

مرد ۔ اور تم نے دس اپنے پرایوں کے سامنے مجھ سے دُو بدُو نہیں کی۔ کیا اتنی سی بات پر۔ کہ گھر کے اخراجات میں کچھ کمی ہونی چاہیئے تمہیں یوں زیبا تھا؟

عورت ۔ اُس اتنی سی بات کو تم نے بہانہ بنایا۔ ورنہ غبار تمہارے دل میں بہت دن سے تھا۔ تمہاری خاصیت تو ایک ضدی بچے کی سی ہے۔

مرد ۔ اور تمہاری؟ تم اپنی بھی تو کہو! ہر بات پر ایک ضدی چھوکری کی طرح اڑ جاتی ہو۔

عورت نے مرد کے طعن کا کوئی جواب نہ دیا۔ کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی۔ تاریکی بڑھتی جاتی تھی۔ ایک طرف مرد کھڑا تھا۔ غصّے میں بھرا ہوا۔ دوسری طرف عورت کھڑی تھی، اپنے جذبات کے طوفان کو سنبھالے ہوئے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ دفعتاً بچہ کمرے میں داخل ہوا۔ اور چھوٹتے ہی بولا۔

"اُمّی"۔ "اُمّی۔ آپ ذرا میرے کمرے تک تو آئیے۔ میں نے ——"

فقرہ ناتمام تھا۔ کہ اُس کی نگاہ مرد پر پڑی۔ "اباجان"۔ کہکر دوڑا اور اُس سے لپٹ گیا۔ اب وہ باپ کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ اُس کے کوٹ کے کالر کو اُلٹتا پلٹتا جاتا تھا۔ اور کہتا جاتا تھا۔ "اباجان آپ کہاں تھے۔ کبھی

روز سے گھر نہیں آئے ۔ مَیں تو بڑا یاد کر رہا تھا ۔ معلوم ہے آپ کو ؟ نہیں آپ کو کہاں معلوم ہوگا ۔ آپ تو کئی روز سے آئے ہی نہیں ۔ اماں جان اور مَیں اس گھر سے جا رہے ہیں ۔ ایک نیا گھر لیں گے ۔ مگر وہ بہت چھوٹا ہے ۔ اُمّی کہتی ہیں ۔ اُس میں دو ہی کمرے ہیں ۔ "اِسی لیے مَیں نے" ـــــ اسے کھلونے یاد آ گئے ۔ اور کھلونے کے یاد آتے ہی ماں کا رونا آنکھوں تلے پھر گیا ـــــ "اُسی لئے مَیں نے" ـــــ فقرے کو نا تمام چھوڑ کر بچّہ ماں سے مخاطب ہو گیا ـــــ اُمّی جان ...... اچھی اُمی ...... سُنیئے تو .... مَیں نے سب کھلونے جوڑ جاڑ کے ثابت کر لئے ہیں ۔ آپ نے کہا تھا نا صرف وہ کھلونے لے چلیں گے جو ثابت ہونگے ۔ مگر میں نے جا کے دیکھا ۔ تو ایک بھی کھلونا ثابت نہیں تھا ۔ بس میں نے مار مار کر کے کسی کی کھال سی ، کسی کی ٹانگ جوڑی ...... اب میرے لوٹٹے ہوئے کھلونے سب ثابت ہیں ۔"

مرد نے عورت کو دیکھا ۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ۔ اور اُس کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں ۔

عورت نے یہ سماں دیکھا اور منہ موڑ لیا ۔

بچّہ جو اس ناٹک کے اثرات سے بے خبر تھا ۔ باپ کے آغوش سے جُدا ہوا اور باہر جانے لگا ۔ دروازے پر پہنچ کر بولا ۔ آئیے ، اُمی آئیے میں آپ کو اپنے ثابت کھلونے دکھاؤں ۔

اس کی آواز میں کچھ ایسی کشش تھی کہ ماں اور باپ دونوں کے دونوں ایک ساتھ اُس کے کمرے میں داخل ہوئے جو خاصا کھلونوں کا بازار معلوم ہوتا تھا ۔

بچّے نے اپنی چمکدار آنکھوں سے ماں کا استقبال کیا ۔ اور اپنی کوششوں کی رپورٹ سنانے لگا : "اُمّی جان نے آج صبح مجھ سے کہا ۔ کہ ہم ایک نئے گھر میں چل کر رہیں گے ۔ مَیں نے پوچھا ۔ میں اپنے سب کھلونے لے چلوں ۔ اُمّی نے کہا ۔ جو کھلونے ثابت ہوں ۔ وہ ایک جگہ کر لو ۔ ثابت ثابت لے چلیں گے ۔ ٹوٹے ٹوٹے چھوڑ دینگے ۔ مگر ابّا جان میرا ایک کھلونا بھی ثابت نہیں تھا ۔ بس میں نے ۔ آپ کی گونددانی لی ۔ اُمّی کی بُغچی لی اور سی سا کے جوڑ جاڑ کے اپنے سب کھلونے ثابت کر لئے ۔ اب دیکھوں اُمّی کیا کہتی ہیں ۔ ان کے لے جانے کو ـــــ"

فقرہ ختم کرتے ہی وہ ہنسنے لگا ......

چیپیاں لگا کر ...... اور .... اُلٹی سیدھی کھونپیں بھر کر اُس نے اپنے شکستہ کھلونے .... ثابت کر لئے تھے اور اُس کی کارگذاری عورت مرد دونوں کے سامنے تھی !

ایک کپڑے کا گھوڑا تھا ۔ جس کے کان اُلٹے سیدھے ٹانکوں سے جوڑ دئے گئے تھے ۔ ایک بلیک بورڈ تھا ۔ جس کی دڑاڑوں کو کالی سیاہی مل کر چھپا دیا گیا تھا ۔ ایک ٹین کی ریل گاڑی تھی ۔ جس کے ٹوٹے ہوئے

پہیئے سُتلی سے گاڑی کے ساتھ زبردستی باندھ دئے گئے تھے۔ ایک اُونی کپڑے کا ریچھ تھا جس کی اکڑی ہوئی ٹانگیں بڑی کوشش کے ساتھ پھٹے پھٹائے جسم سے پیوستہ کر دی گئیں تھیں۔ اور ایک ٹانگ اب بھی غائب تھی۔ جس کی بدنمائی کو چھپانے کے لئے ریچھ کو اتنی لمبی قمیص پہنا دیگئی تھی کہ زمین تک لٹکتی تھی۔

بچہ ایک ایک چیز ماں کو دکھاتا اور خوشی کے مارے پھولے نہ سماتا تھا۔ ماں سے مخاطب ہو کر بولا۔ اَمّی دیکھئے اب میرے کھلونے سب ثابت ہو گئے ہیں۔ اب آپ کو نئے گھر میں میرے سب کھلونے لے چلنے پڑینگے۔

عورت پر جو چپ کھڑی اپنی مینا کی چہکار سُن رہی تھی، ایک کیفیت طاری ہو گئی، آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آگے بڑھی شوہر کے آغوش میں گری۔ اور بولی۔ بچہ اپنے کھلونوں سے جدا ہونے کے لئے تیار نہیں۔ خواہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر بیکار ہی کیوں نہ ہو گئے ہوں۔ ہم دونوں جو ایک دوسرے کی زندگی کے شریک ہیں اور ایک دوسرے کے کھلونے۔ ذرا سے بگاڑ پر کیوں جُدا ہو جائیں۔ تمہیں حق ہے، ناراض ہو، بگڑو، میں تمہیں مناؤنگی۔ بچوں کو ٹوٹے ہوئے کھلونے بھی عزیز ہوتے ہیں۔ ان کی نظروں میں وہ کبھی شکستہ نہیں ہوتے۔ تو پھر مجھے تم کیوں نہ عزیز ہو۔ چاہے تم مجھ پر کتنے ہی ناراض ہو۔

دوسرے لمحے وہ دونوں ہنس رہے تھے اور بچہ اصرار کر رہا تھا۔ کہ "امی! چلو نئے گھر میں۔ تم اپنا ٹرنک اُٹھاؤ اور میں اپنے کھلونے"۔
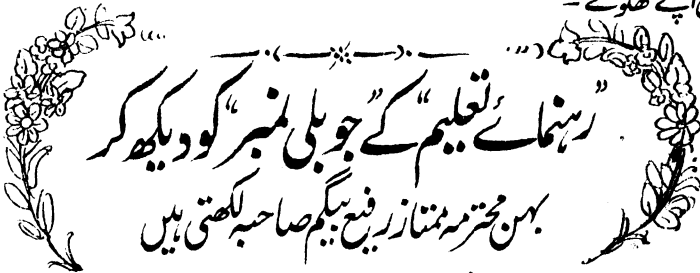
"رہنمائے تعلیم" کے "جوبلی نمبر" کو دیکھ کر

بہن محترمہ ممتاز رفیع بیگم صاحبہ لکھتی ہیں

جناب محترم!　　تسلیم نیاز!!

"رہنمائے تعلیم کا جوبلی نمبر کیا موصول ہوا۔ یہ معلوم ہوا کہ آفتابِ علم و ادب کا ایک درخشندہ ٹکڑا ٹوٹ کر میرے دامن میں گر پڑا۔ جس کی چمک دمک سے نگاہیں چوندھیا گئیں ـــ حیران رہ گئی۔ آپ کی اس علمی بلند ہمتی اور ادبی شجاعت و مردانگی پر ـــ حقیقت میں یہ ایک بڑا زبردست ادبی کارنامہ ہے ـــ جس کی زرین یادگار تاریخ علم و ادب کے روشن صفحات پر ہمیشہ ہمیشہ آپ کے نامِ نامی کو زندہ رکھیگی ـــ خدا گواہ ہے کہ اس شان کا "خاص نمبر" آج تک میری نظر سے نہیں گزرا ـــ آپ کی اس علمی کامیابی پر آپ کو میں دلی مبارکباد دیتی ہوں۔ اور مرحبا و حبذا کہتی ہوں ـــ جوبلی نمبر کیا ہے۔ مختلف علمی، اخلاقی اور تاریخی موضوع کے گوہرِ انتخاب مضامین سے مرصّع کشتیوں کا ایک سلسلۂ حسین ہے ـــ کہ سبحان اللہ!

غزل

(پنڈت رلیارام صاحب رتن منشی فاضل)
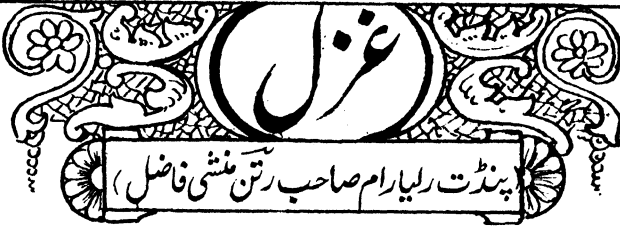
اُسکی نظروں میں ہے اب حالِ پریشاں میرا
حاصلِ عشق ہوا چاکِ گریباں میرا

ذرّہ ذرّہ میں بپا حشر کے ہنگامے ہیں
ہر بیاباں سے کچھ آگے ہے بیاباں میرا

دیکھتا اب تو کوئی منزلِ معراجِ جنوں
چاکِ دامن سے ملا چاکِ گریباں میرا

سیر ہوتی نہیں رعنائیٔ دلکش سے نظر
جانے؟ پہنچا ہے کہاں دیدۂ حیراں میرا

سوچتا یہ ہوں کہوں بھی تو کہوں کیا اَے دل
پُوچھتی ہے وہ نظر حالِ پریشاں میرا

رُخِ منزل کا بھی احساس اُٹھا جاتا ہے
ہوش میں آنے دے مجھ کو دلِ حیراں میرا

ہاتھ اُٹھتے ہی زمانے کی نگاہیں اُٹھیں
ایک افسانہ ہوا چاکِ گریباں میرا

خلشِ شوقِ اسیری بھی ہے اک پردۂ راز
کس نے رُخ پھیر دیا جانبِ زنداں میرا

عشق میں کاوشِ جانسوز ہوئی وجہِ سکوں
درد سمجھا تھا جسے ہے وہی درماں میرا

میں رہا ہو کے جو آیا بھی تو تسکیں نہ ہوئی
خود بخود پھرنے لگا رُخ سوئے زنداں میرا

دیر و کعبہ میں بھی نظروں کو تسلی نہ ہوئی
رازِ سربستہ رہا حاصلِ ایماں میرا

دامنِ دشت جہاں سامنے آتا ہے رتن
مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ہے گریباں میرا

(رتن)
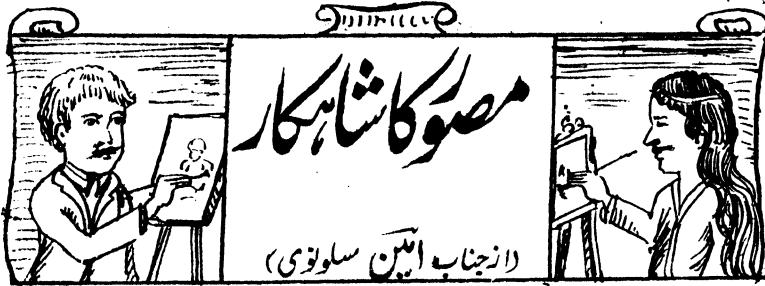
جمال اپنی سوسائٹی میں اپنی بھاری بھرکم طبیعت اپنی تدبر پسندی کے لحاظ سے نہایت ذی ہوش اور سلیم الطبع انسان تصور کیا جاتا تھا۔ اور اس کی حیثیت بالکل ایسی تھی جیسے کسی ناول کا ہیرو نہ اس کی ہنسی بے موقع ہوتی نہ اسکا رونا خلاف مصلحت۔ پھر بھی اس کے احباب اس کا صحیح طور پر مطالعہ کرنے سے قاصر تھے۔ اس کے متعلق سوسائٹی کے ہر رکن کی رائے الگ الگ تھی۔ جمال نے اپنے طرز عمل سے کسی پر کبھی یہ نہیں ظاہر ہونے دیا۔ کہ وہ ایک غریب انسان ہے نہ اس نے کسی کے سامنے کبھی دست طلب دراز کیا نہ اس کے دل میں کسی ایسی خواہش کا گذر ہوا جو اس کو کسی سے سوال کرنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ اس نے ابتدائی زمانہ تعلیم سے اس وقت تک ایسی زندگی بسر کی جو ہر لحاظ سے قابل رشک تھی۔ اس کی زندگی کی یکسانیت۔ اس کی سادہ مزاجی۔ اور اس سادہ مزاجی میں ایک لطافت جو غالباً دنیا کے ہر شخص کو کم میسر آتی ہے۔ ایسی چیزیں نہ تھیں کہ جن کو کوئی فراموش کر دیتا۔ اس کی تعلیمی حالت بہت اعلیٰ وارفع نہ تھی کیونکہ زمانہ نے اور واقعات زندگی نے اس کے لئے مناسب موقع بہم نہیں پہنچایا تھا۔ چنانچہ اس نے میٹرک پاس کرنے کے بعد بڑی کوشش کی کہ وہ اپنے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھے۔ مگر حالات ایسے نہ تھے اس لئے وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ دوران تعلیم ہی میں فکر معاش بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہ فکر رفتہ رفتہ اس کی پوری زندگی پر مستولی ہو چکی۔ کیونکہ اس کے دو خورد سال بھائی اور ایک بیوہ ماں کا سہارا صرف جمال تھا۔ اس لئے فکر معاش اس کے لئے ناگزیر تھی۔ مگر ملازمت کا سوال بھی ایک سخت مسئلہ تھا۔ نہ اسکے پاس روپیہ تھا نہ کوئی سفارش کا ذریعہ۔ مجبور ہو کر اس نے اس خیال کو چھوڑ دیا اور چار معمولی ٹیوشنوں کی مجموعی آمدنی میں جو پندرہ بیس روپیہ سے زیادہ نہ تھی بسر کرنے لگا۔ مگر اس کے پاس کافی فاضل وقت تھا۔ اس نے اس کو ضائع کرنے کی بجائے آرٹ میں صرف کرنا شروع کیا۔ کچھ طبیعت کو مصوری سے لگاؤ تھا۔ اور کچھ خود اس کی محنت چند مہینوں کی کاوش نے اس قابل کر دیا کہ وہ خاکے بنانے لگا۔ لیکن اب اس کی فکر ہوئی کہ اس کو فن کی حیثیت سے مکمل کیا جائے۔ چنانچہ وہ اس کے لئے مصوری کے ایک کالج میں داخل ہو گیا۔ اس کے پاس فیس ادا کرنے کیلئے ایک پائی بھی نہ تھی مگر محنت و جفاکشی حد درجہ موجود تھی۔ پرنسپل نے جمال کو از راہ ہمدردی مشورہ دیا۔ کہ وہ ایک گھنٹہ روزانہ اس کے بچوں کو فارسی وغیرہ پڑھا دیا کرے اور اس کے معاوضہ میں وہ اس کی فیس معاف کر دیگا۔ اور مصوری کا کچھ سامان بھی مہیا کر دیگا۔ جمال نے اس کو منظور کر لیا

اور پورے انہماک سے اس نے اس فن کو سیکھنا شروع کر دیا۔

کچھ تو حالات نے اور کچھ خود اس کی کوششوں نے جماعت میں اس کو ایک منفرد ہستی بنا دیا تھا۔ مہربان پرنسپل نے غالباً اس کی طبیعت، اور ذہانت کا پورا اندازہ کر لیا تھا۔ اس لئے اب بجائے اسکول کے مکان پر بھی فرصت کے لمحوں میں فن مصوّری کے نکات و رموز اس کو سمجھاتا رہتا۔ اور جمال بھی ان کے بچوں کو بلا قید و تعین وقت سرگرمی سے تعلیم دیتا رہا۔ پروفیسر صاحب کے بچوں میں رستم تو بالکل ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ لیکن فیروزہ جو کافی شعور دار اور ذہین تھی اس پر اچھی خاصی توجہ کرنا پڑتی کیونکہ اب وہ گلستان بوستان کا درس لے رہی تھی۔ جمال کو اگرچہ افکار زمانہ نے شروع ہی سے دبا رکھا تھا۔ اور اس کی جسمانی نشوونما کے لئے جیسی فراغت میسّر آنا چاہئے تھی وہ میسّر نہ آئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے شباب نے اس کے جسم کو سڈول اور خوبصورت بنا دیا تھا۔ اگر کہیں ہم جماعت لڑکوں کی طرح اس کو بھی ان افکار سے دور رہنا پڑتا تو اس کا مردانہ حسن قابل دید ہوتا۔ مگر اس کے رکھ رکھاؤ اور محنت و جفاکشی نے اس کو تندرستی کی ایسی نعمت مہیّا کی تھی۔ کہ دیکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ جسم مصیبتوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہے۔ اس کا نظام عمل اگرچہ بہت سادہ تھا تاہم وہ اس کی پوری پابندی کرتا تھا۔ کالج کے اوقات میں کسی نے اس کو کبھی بیکار وقت گذاری کرتے ہوئے نہیں دیکھا یہی وجہ تھی کہ آج وہ کالج میں ایک قابل فخر آرٹسٹ تصور کیا جانے لگا۔ پروفیسر ہرمزجی ایشیائی آرٹ کے بہترین ماہر سمجھے جاتے تھے اور ان کے آرٹ کے نمونے ایک دنیا میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ خود بھی جمال کی ذہانت اور تخیل کی بہت معترف تھے۔ اور اس کے بنائے ہوئے نمونوں کی نوک پلک کو دیکھ کر بعض وقت تو وہ بیخود ہو جاتے تھے۔ جب کسی وقت فنی حیثیت سے اس قسم کا ذکر آ جاتا تھا تو بے اختیار کہہ اٹھتے تھے کہ اگر جمال کی ترقی کی رفتار یہی رہی تو ایک دن وہ دنیا میں آپ اپنی مثال بن کر رہیگا۔

جمال نے اپنا کورس تقریباً پورا کر لیا تھا۔ بیسوں مرتبہ اس کو اپنے موئے قلم کا مظاہرہ بھی کرنا پڑا۔ جس میں اس کو متعدد انعامات اور سرٹیفیکیٹ ملے۔ اور اب یہ عالم ہو گیا تھا کہ اگر جمال آنکھ بند کر کے بھی کوئی خط کھینچ دے۔ تو اس میں بھی کچھ نہ کچھ حُسن پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ بات اس کے متعلق مبالغہ آمیز نہ تھی۔ بلکہ خُداداد تصوّر کیجاتی تھی۔ چنانچہ اس کی اس ترقی محنت اور جانفشانی کو دیکھ کر پروفیسر ہرمزجی نے اس کے لئے بیس روپیہ ماہوار کا ایک اسکالرشپ منظور کرا دیا۔ اور اب جمال کو کسی قدر فراغت حاصل تھی۔ پروفیسر ہرمزجی کی عنایت بے غایت اور مہربانیاں دیکھ کر اس کے غیور دل نے اس بات کو گوارا نہ کیا۔ کہ اب وہ اُن کے لڑکوں کے ٹیوشن کا ان سے معاوضہ لے۔ اس لئے ایک روز اس نے پروفیسر ہرمزجی سے صاف الفاظ میں کہدیا کہ آپ کی ان عنایات اور مہربانیوں کے بعد مجھ میں یہ طاقت نہیں ہے۔ کہ میں اپنی ایک معمولی سی خدمت کا آپ سے کوئی معاوضہ لوں۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ پروفیسر ہرمزجی نے یہ اس کی خدمت کا معاوضہ نہیں مقرر کیا تھا بلکہ دراصل اس کے ساتھ ان کی انتہائی ہمدردی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اگر جمال کو اس کی ضروریات کی طرف سے بے نیاز کر دیا جائے۔ تو وہ اس فن میں کمال حاصل کر لیگا۔ انہوں نے جمال کی ہمت کی تعریف کرتے ہوئے اس سے کہا کہ

تم اس کو میرے کسی احسان سے تعبیر نہ کرو۔ ہمدردی انسان کی انسانیت کا ایک لازمی جزو ہے اور قابلِ ہمدردی ایسے ہی انسان ہوتے ہیں۔ جو دنیا میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں۔ میری بڑی خوشی یہی ہے کہ تم اس معاوضہ کے قبول کرنے سے گریز نہ کرو۔ جمال کے دل میں اگرچہ اس وقت ہزاروں جذبات موجزن تھے۔ اور اس کی غیرت بار بار اکساتی تھی کہ وہ اپنے ضمیر کا خون نہ کرے۔ لیکن شفیق استاد کا حکم ماننا بھی اس کی خمیر میں تھا۔ اس لئے مجبوراً اس کو اپنے خیال میں تبدیلی پیدا کرنی پڑی۔

آج جمال کو کالج میں داخل ہوئے پورے چھ سال ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں معلوم نہیں دنیا میں کتنے انقلاب ہوئے اور نہ معلوم کس قدر تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ زمانہ کے ساتھ واقعات اور واقعات کے ساتھ انسان میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جمال بھی انسان تھا اور وہ بھی اسی دنیا میں رہتا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی۔ تبدیلیاں ہوئیں اور ضرور ہوئیں مگر یہ وہ تبدیلیاں نہ تھیں جو عام نگاہوں میں سما جائیں۔

بہرحال وہ اب بھی کالج میں طالب علم تھا۔ اور اب بھی پروفیسر ہرمزجی کے لڑکوں کا ٹیوٹر لیکن اب صرف رستم ہی کی تعلیم کا ذمہ دار تھا۔ کیونکہ فیروزہ فارسی کا علم جہاں تک حاصل کرتا تھا حاصل کر چکی تھی اور کالج میں ایم۔ اے فائنل کے امتحان میں بیٹھنے والی تھی۔ لیکن اب بھی اس کے پاس کبھی کبھی آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ آج اس میں ایک قسم کی متانت اور بردباری پیدا ہو گئی تھی۔ اور شباب کے ساتھ اس کی سلیقہ مندی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر آزاد تعلیم کے آزاد نتائج سے وہ بری نہ تھی۔ پہلے جمال اس کا ٹیوٹر تھا۔ اس لئے کبھی کبھی دوران سبق میں جھڑکیاں بھی دیتا تھا۔ مگر آج ان دونوں میں گفتگو کا رنگ مہذب شائستگی اور متانت سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن نسبتاً جمال کم سخن تھا اور زیادہ گفتگو کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ مگر فیروزہ جب کوئی بات دریافت کرتی تو اس کو مجبوراً جواب دینا ہی پڑتا۔ حالانکہ اب جب وہ اس کی بات کا جواب دیتا تو اس کی آواز میں ایک کرختگی اس کی زبان میں لکنت اور اس کے لبوں میں ایک ارتعاشی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی وہ اکثر جواب دینے سے گریز کرتا۔ مگر جواب دینا اس کیلئے ناگزیر تھا۔

فیروزہ کی جسمانی نشوونما اور بالیدگی کے لئے پوری فراغتیں میسر تھیں۔ اس لئے وہ دن بدن نکھرتی جاتی تھی اس کی معصوم اداؤں میں ایک کشش تھی اس کے چہرے میں ایک جذب تھا۔ اس کی نگاہوں میں ایک جادو تھا۔ اور ایسا جادو کہ جس سے انسان تو انسان ہے کسی فرشتہ کا بھی بچنا ناممکن تھا۔ اس کی دوشیزگی کی خوشبو سے اس کے گھر کی ساری فضا مہک رہی تھی۔ اور وہ اس میں ایک نازک اور حسین تیتری کی طرح ادھر سے اُدھر محوِ خرام رہا کرتی تھی۔ جمال نے رستم کی تعلیم کا وقت تبدیل کر دیا تھا۔ اور ایسے وقت میں اس کو تعلیم دینے جاتا تھا کہ جب فیروزہ کالج میں ہوتی تھی۔ اگرچہ اس کو اپنی تبدیلی وقت سے تھوڑی سی زحمت تو ضرور تھی۔ مگر اس نے عمداً اس زحمت کو گوارا کر لیا تھا مگر پھر بھی کسی نہ کسی وقت فیروزہ سے سامنا ضرور ہو جاتا تھا۔ اور دونوں میں گفتگو بھی ہوتی تھی لیکن یہ گفتگو کچھ زیادہ

طویل نہ ہوتی تھی۔ فیروزہ چاہے اس بات کو نہ سمجھتی ہو لیکن جمال کے طرز عمل سے یہ بات ہر شخص محسوس کر سکتا تھا۔ کہ اس کی گفتگو میں بہت زیادہ نرمی اور حد درجہ کا حجاب پایا جاتا تھا۔ بظاہر اس کے اسباب و وجوہ صرف یہ تھے کہ چونکہ اب وہ فیروزہ کو کوئی تعلیمی مشورہ نہ دیتا تھا۔ اس لئے اب کوئی ایسی گفتگو جس میں انہماک پایا جائے۔ نہ کرتا تھا۔ مگر فیروزہ کو جیسے جمال کے ساتھ گفتگو کرنے میں کوئی لطف آتا تھا کیونکہ وہ اکثر اُسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر گفتگو کرتی اور زبردستی اپنے سوالات کا جواب طلب کرتی۔ اور جمال کو مجبوراً اس کی باتوں کو دہرانا پڑتا۔ ممکن ہے جمال کو یہ چیز باطناً خوشگوار معلوم ہوتی رہی ہو لیکن بظاہر اس پر ایک بیخودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ مگر باوجود اس کے جمال اپنا پیچھا چھڑا کر چلا جاتا۔

جمال میں کچھ عرصہ سے ایسی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں جو اس سے پہلے نہ تھیں چنانچہ اس کے ہم جماعت طلبا ریں اس کی اس تبدیلی کو بہت حیرت و استعجاب سے دیکھا جا رہا تھا۔ اس کے بہت زیادہ بے تکلف احباب میں ناظر اور رزمی اس کی اس تبدیلی کو بہت زیادہ محسوس کر رہے تھے اور انہوں نے اس امر کی طرف کئی مرتبہ جمال کو توجہ دلائی لیکن جمال نے ہمیشہ اس کو باتوں میں اڑا دیا۔ مگر یہ اس کی زندگی کا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ جسے آسانی سے نظرانداز کر دیا جاتا۔ اور خصوصاً روزانہ کے ملنے والوں کے لئے جنھوں نے جمال کو ہمیشہ اپنی سوسائٹی کا فخر تصور کیا ہو۔ جنھوں نے ہمیشہ اس کی فطرت کا مطالعہ کیا ہو۔ خواہ وہ ظاہری ہی سہی۔ لیکن چونکہ بہت سی تبدیلیوں کے اثرات اس کے ظاہری حالات میں بھی ایک قسم کا رنگ پیدا کر چکے تھے۔ اس لئے ان کو یہ حق تھا کہ وہ جمال سے اس کے متعلق دریافت کرتے۔ گو وہ اس سے پہلے بھی لہو و لعب کے مشاغل سے ہمیشہ علیحدہ رہا۔ مگر کم از کم سوسائٹی کی اجتماعی حیثیت میں تو اس کا جگمگاتا ہوا وجود ایک زندگی پیدا کر دیا کرتا تھا۔ مگر اب چونکہ وہ خود بھی طبعاً ایک خاموش پسند انسان ہو گیا تھا۔ اس لئے سوسائٹی میں بھی ایک سوگواری طاری رہتی۔ جمال آج بھی سوسائٹی میں اسی طرح آتا اسی طرح بیٹھتا۔ اس کی گفتگو میں وہی متانت اور سنجیدگی آج بھی تھی۔ لیکن ان میں آج وہ کیف نہ تھا۔ بلکہ اکثر اس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب اس کو سوسائٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور محض احباب کی خوشی کے لئے وہ تھوڑی دیر کو ہنس بول لیتا ہے۔ یہ تمام حالات ناظر اور رزمی پر پوری طرح سے واضح ہو چکے تھے۔ اور روزانہ واضح ہوتے جاتے تھے لیکن وہ بھی اس کے سمجھنے سے قاصر تھے۔ ایک روز تنہائی میں جبکہ جمال ایک تصویر میں رنگ کا کام کر رہا تھا۔ ناظر اور رزمی بھی پہونچ گئے۔ اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ناظر نے جمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ مسٹر جمال! غالباً آپ اس خبر سے ناواقف نہ ہونگے۔ کہ کسی سوسائٹی کا مقصد ایک ایسے اجتماع سے ہوتا ہے جس میں بے تکلف احباب تھوڑی دیر کے لئے اپنا غم غلط کر سکیں؟۔ جمال نے برش پھیرتے ہوئے لاپرائی کے

انداز میں جواب دیا۔ یہ آپ نے کوئی نئی بات نہیں بتائی ہے۔ دنیا کی ہر سوسائٹی کا یہی مقصد ہوتا ہے اور کسی سوسائٹی کے قیام سے پہلے ہی ان مقاصد کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ ناظر نے کہا۔ تو میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں آپ کو سوسائٹی کے مقصد کی طرف توجہ دلاؤں۔ بلکہ یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اس مقصد سے کیوں علیحدہ ہو رہے ہو۔ جمال نے متانت کے ساتھ کہا یعنی ؟۔ ناظر نے کہا یعنی کیا تم آج کل اس قدر کھوئے ہوئے سے رہتے ہو۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ تمہیں یہ سوسائٹی ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ جمال نے جواباً کہنا شروع کیا۔ مگر آپ نے میرے کس انداز سے ایسا نتیجہ اخذ کیا۔ جبکہ میں نے کسی بات میں کمی نہیں کی ؟۔ ناظر نے ایک لمحہ کے بعد جواب دیا۔ تو پھر ہم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کا ازالہ کیجئے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ اس سے پہلے تم سوسائٹی کے ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے۔ مگر آج بخلاف اس کے جب تم سے بار بار کہا جاتا ہے۔ تو تم کسی کام میں ہاتھ لگاتے ہو ورنہ چپ چاپ بیٹھے رہتے ہو۔ کیا تمہارے پاس اس کا کوئی جواب ہے۔؟

جمال نے ذرا طرز گفتگو کو بدلتے ہوئے کہا۔ ناظر تعجب ہے کہ تم مجھ سے ایسا سوال کرتے ہو۔ درآنحالیکہ ہزاروں مرتبہ تم خود اسی طرح چپ چاپ رہا کئے ہو۔ بارہا تم سے مشورے طلب کئے گئے اور تم نے کوئی جواب نہیں دیا پھر اگر میرے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش آیا تو کیا تعجب ہے ؟

اس کے علاوہ تم کو معلوم ہے کہ میں تمہاری طرح آزاد نہیں۔ فارغ البال نہیں۔ تمہارے لئے صرف سوسائٹی کا غم ہے۔ مگر ہمارے لئے اس کے علاوہ بھی بہت سی فکریں ہیں۔ جو صرف میری ذات سے وابستہ ہیں۔ اگر کسی وقت مجھے میرے آلام میرے افکار ناشگفتہ رہنے پر مجبور کریں۔ تو اس سے تم کو کوئی برا اثر نہ لینا چاہئیے۔ اور یا یہ تصور کر لینا چاہئیے۔ کہ اب میں ایک ناکارہ انسان ہوں سوسائٹی کے لئے میرا عدم وجود دونوں ایک جیسی حیثیت رکھتا ہے ایک ایسے دور سے میں ضرور گذر رہا ہوں۔ کہ جب مجھے دنیا کا ذرہ ذرہ ہنستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ زمانہ کی ہر روش ہموار و ناہموار میں میرے لئے یکسانیت تھی۔ ہر ہر قدم پر مجھے خوشی اور مسرت جھومتی ہوئی نظر آتی تھی۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ دنیا میں کسی کا دور یکساں نہیں رہا۔ اور شائد ایک دور ایسا آئیگا۔ کہ تمہیں بھی اپنے حال میں تبدیلی پیدا کرنی پڑیگی۔ اگر تم اس کو کوئی غیر متوقع بات کہو۔ تو یہ غلط ہے۔ پھر اگر تم نے مجھ میں اب کوئی نقص یا کمزوری کو محسوس کر لیا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کم از کم آج کل مجھے صرف یہی خیال ہے کہ آئندہ سال آرٹ کی تکمیل کا ڈپلومہ حاصل کر لوں۔ جس کا تعلق میرے مستقبل سے ہے۔ اور اگر اس سلسلہ میں میری طبیعت کا انہماک صرف ایک ہی طرف ہو جائے۔ تو اس سے سوسائٹی میں کیا خامی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ کچھ روز کے بعد ہم میں سے کوئی ایک یا تنہا میں ہی اس دنیا میں نہ رہوں۔ تو اس کے بعد دنیا کا کوئی کام بند ہو سکتا ہے۔ یہی روشن چاند یہی جگمگاتے ستارے اور یہی سوسائٹی آج سے زیادہ پُر رونق معلوم ہوگی۔ آج میرا ہی وجود اس شمار میں ہے۔ کل میرا وجود نہ ہوگا۔ بہرحال

مجھے اس کا علم ہے۔ کہ تم کو میرے ساتھ خلوص ہے۔ ہمدردی ہے اور یہ شکایت اسی خلوص اور ہمدردی پر مبنی ہے
مگر میرے عزیز دوست اس سے زیادہ تم کو کوئی اثر نہ لینا چاہئے۔ کہ انسان کے حالات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔
ورنہ مجھے آج بھی تمہاری سوسائٹی میں دلچسپی نصیب ہوتی ہے۔ اور میں آج بھی اسی طرح لطف اندوز ہوتا ہوں۔
یہ ممکن ہے کہ مجھ سے تم کو لطف اور دلچسپی کی توقع اُٹھ گئی ہو۔ اور کسی فوری خیال نے تمہیں ایسا خیال کرنے پر
مجبور کیا ہے ——— ناظر اب بھی متحیر تھا۔ اور یہ سوچ رہا تھا۔ کہ میں کیا کہنے آیا تھا اور کیا سُن رہا ہوں
جمال نے تو کبھی اس سے پہلے ایسی گفتگو نہ کی تھی۔ اگرچہ اس میں ایسی ہی متانت اور سنجیدگی پہلے بھی تھی لیکن
گفتگو میں نہ کھچاؤ۔ الفاظ میں یہ تاثر اس سے پہلے نہ تھا۔ کچھ دیر تک وہ بیٹھا سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے پریشان ہو کر
اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے کہا۔ بہر حال میں اس مسئلہ پر تم سے پھر کبھی گفتگو کرونگا۔ ناظر باہر نکل گیا۔ اور جمال
پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

اب جمال اس کالج میں صرف ایک سال اور رہنے والا تھا۔ کیونکہ تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ امتحان دے چکا تھا
لیکن کالج کی طرف سے اسے روک لیا گیا تھا۔ پرنسپل ہرمزجی کی یہ خواہش تھی۔ کہ جمال کو یہیں سے کوئی ملازمت
بھی ملجائے۔ جمال نے جس محنت اور جانفشانی سے مصوّری میں کمال حاصل کیا تھا۔ آج اس کا نتیجہ نہ صرف
اُس کو بلکہ تمام کالج کو مل رہا تھا۔ اس نے لندن کی نمائش کے لئے کیلو پیٹرا کی ایک رنگین تصویر بنا کر بھیجی تھی
جس نے نمائش کے اُس کورٹ کو جس میں یہ تصویر رکھی ہوئی تھی۔ عام دلچسپی کا مرکز بنا دیا تھا۔ اور بالآخر اس
کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تصویر پر متعدد انعامات اور تمغے کالج کو ملے۔ اور آخر میں اس تصویر کو مغرب کے ایک دولتمند
انسان نے کئی ہزار پونڈ میں خرید لیا۔ کالج کے لئے یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ صرف ایک تصویر نے تمام دنیا
میں اس کالج کا نام روشن کر دیا تھا۔ اس کے کالج کے ذمہ داروں نے تصویر کی قیمت اور موصول شدہ انعامات سے
ایک بڑا حِصّہ جمال کو دیدیا۔ اور باقی حِصّہ سے کالج میں ایک کمرہ تعمیر کیا گیا۔ اور اس کو جمال کورٹ کے نام سے
موسوم کیا گیا۔ ہر طرف اس کالج اور تصویر کی دھوم تھی۔ بیرونی ممالک کے اخبارات نے کالم کے کالم سیاہ کر
ڈالے۔ اور ہر شخص نے اس تصویر کے متعلق اپنے اپنے انداز میں تنقید کی۔ اور بالاتفاق یہ طے کر دیا کہ یہ انسان
جس نے اس تصویر کو بنایا ہے۔ اس نے گویا کیلو پیٹرا کو اس کے حسن سے زیادہ حسین بنا کر پیش کر دیا۔ اس
کے بعد بمبئی میں یہ عالم تھا۔ کہ کالج میں لوگوں کے ٹھٹ لگے رہتے۔ اور ہزاروں مغربی خواتین یہ آرزو کرتی
ہوئی آتی تھیں۔ کہ جمال ان کی بھی تصویر بنا دے۔ چنانچہ کالج کے علاوہ جمال کے پاس پرائیویٹ کام کا بھی انبار
لگ گیا۔ اور اس نے اسی رقم سے ایک چھوٹا موٹا۔ لیکن خوبصورت سٹوڈیو بنا لیا تھا۔ اور کالج کے اوقات کے
علاوہ وہ بیرونی کام بھی کرتا رہتا۔ پرنسپل ہرمزجی کو جمال پر بیحد ناز تھا۔ اور ہونا بھی چاہئے تھا۔ اس لئے جمال ہی

ایک ایسا طالبعلم اس کالج سے کامیاب نکلا تھا۔ کہ جس نے اس قدر جلد دنیا میں اپنے کمال کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ دنیا اس کے کمال سے خوش تھی۔ ایک زمانہ کو مسرت تھی۔ کہ شرقی دنیا میں ایک ایسا باکمال آرٹسٹ موجود ہے یہ سب کچھ تھا۔ مگر جمال کے دل میں ان واقعات نے بھی کوئی امنگ نہیں پیدا کی وہ بدستور تنہائی پسند اور خاموش زندگی پر قانع تھا۔ فن کے اعتبار سے تو وہ ایک زبردست ماہر تھا۔ لیکن اس مہارت پر اُسے کچھ ناز نہ تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کے لئے یہ سب بے نتیجہ حقیقت ہے۔

جمال کی حالت میں دن بدن ایک فرق پیدا ہو رہا تھا۔ اور اب اس درجہ یہ چیز نمایاں ہو گئی تھی کہ عام نگاہوں میں بھی جمال اب وہ جمال نہ تھا۔ اب وہ مصوری میں ایک ماہر فن کا درجہ رکھتا تھا۔ اور اس کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے لئے یہ بہت ممکن تھا کہ اوسط درجہ سے زیادہ حیثیت والے انسان کی طرح اپنے معاشرتی حالات میں تغیر پیدا کر لیتا۔ لیکن جیسے اس کو کسی چیز سے دلچسپی ہی نہ تھی۔ اسٹوڈیو میں کام کرنے کیلئے بیٹھتا لیکن وہ پہروں کسی خیال میں ڈوبا رہتا اور اس پر ایک ایسی بے خودی طاری ہو جاتی کہ پھر وہ اس بیخودی میں بالکل گم ہو جاتا اس کے دل بہلانے کے لئے اس کے اسٹوڈیو کی رعنائیاں بہت کافی تھیں۔ لیکن شائد اسے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے دل میں ایک غیر محسوس جذبہ کی پرورش ہو رہی تھی۔ مگر یہ ایک ایسا راز تھا جس کی رازداری کے فرائض وہ خود بڑی احتیاط سے ادا کر رہا تھا۔ ایک روز وہ اسی انداز سے اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک باریک برش تھا۔ اور سامنے ایک تصویر رنگ کرنے کے لئے رکھی تھی۔ اور اسٹوڈیو میں بالکل تنہائی تھی۔ کہ دفعتاً دروازہ کا پردہ ہٹا۔ اور خلاف توقع مس فیروزہ ہرمزجی اسٹوڈیو میں داخل ہوئی۔ جمال ایک گہرے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ چونک پڑا۔ فضا میں ایک مترنم نغمہ گونجا اور اس کے کانوں میں یہ آواز پہنچ گئی۔ مسٹر جمال! کیا میں آپ کے کام میں ہارج ہوئی؟ جمال جس کو اپنے ہوش و حواس پر ہمیشہ قابو رہتا تھا۔ آج خدا معلوم کیوں اس قدر بے قابو تھا کہ اس کی زبان بالکل چپ تھی۔ اس کے جواب میں اس کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا اور وہ دیر تک محوِ حیرت رہا۔ بالآخر ایک مرتبہ عنابی ہونٹوں میں لرزش پیدا ہوئی اور پھر چند نغمے ہوا میں منتشر ہو گئے۔ جمال صاحب جمال صاحب! .... آپ حیران ہیں یا مجھے حیران ہونا چاہئے؟۔ ان دونوں میں سے کیا صحیح ہے۔ آپ مجھے نہیں پہچان سکے۔ یا میری نگاہیں غلطی کر رہی ہیں۔ فیروزہ نے کہا .... اب جمال ایک دوسرے ماحول میں تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر چونکا۔ اور کچھ اس طرح جیسے وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے اس عالم وارفتگی کو آنے والے نے تو نہیں دیکھا اور ہاتھ سے برش رکھتے ہوئے۔ مس فیروزہ تم یہاں کیسے؟۔ تو کیا یہاں آنے کے لئے میرے واسطے کوئی ممانعت تھی یا عام و خاص کی کوئی قید ہے۔ فیروزہ نے کہا .... جمال نے ندامت کے

ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا - نہیں نہیں میرا یہ مقصد نہیں تھا - تم یہاں ہر وقت آسکتی ہو - اس اسٹوڈیو کا ذرہ ذرہ تمہارے خیر مقدم کے لئے ہر وقت تیار ہے - معاف کرنا فیروزہ میرے الفاظ سے تم کو کچھ تکلیف ہوئی - میرا مقصد یہ تھا کہ یہ وقت غالباً تمہارے کالج کا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں درست ہے مگر اب میرے کالج کے اوقات کی پابندی ضروری نہیں ہے - لیکن میں خاص طور پر آج اس لئے آئی ہوں کہ آپ کا وہ آرٹ میں بھی دیکھوں - جس نے ایک دنیا میں دھوم مچا رکھی ہے - جمال اظہار تشکر کرتے ہوئے بولا - میں نہیں سمجھ سکتا - کہ دنیا کی طرح تمہیں بھی میرا آرٹ پسند آئیگا - اور بہرحال اس اسٹوڈیو کی ہر چیز آپ کے سامنے موجود ہے - فیروزہ نے اسٹوڈیو کے ہر گوشہ پر ایک غلط انداز نگاہ ڈالنے کے بعد جمال سے کہا تو کیا میں یہ دریافت کر سکتی ہوں - کہ آپ میری تصویر بھی بنا دیں گے ؟ - جمال خاموش تھا - اور کیوں خاموش تھا - یہ اس کے لئے ایک امتحان کا وقت تھا -

جمال میں فن کے اعتبار سے اس قدر مہارت تھی کہ وہ ہر انسان کا اسکیچ ایک منٹ میں بنا لیتا تھا - اور صرف ایک نظر دیکھنے کے بعد پوری تصویر مکمل کر دیتا تھا - لیکن فیروزہ کے اس سوال نے "کہ کیا آپ میری تصویر بھی بنا دینگے" اس کے جسم میں لرزہ پیدا کر دیا - جیسے اس کی دل کی طاقتوں کو کوئی کچل رہا تھا - اور اس کے ہوش و حواس اس سے جدا ہو رہے تھے - اور وہ صبر و آزمائش کی کشمکش میں مبتلا تھا - وہ مُنہ سے جواب دینا چاہتا تھا لیکن زبان میں طاقت نہ تھی - ہاتھوں میں قدرت نہ تھی - اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے اس کے راز کو افشا کر رہے تھے - وہ دیر تک ایک مسلسل سکوت کے عالم میں کھڑا رہا - یہ دیکھ کر پھر فیروزہ نے دریافت کیا - تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ کو میری تصویر کے بنانے سے کچھ گریز ہے ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ہاں - تم مجھے اپنی تصویر بنانے سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر - تو ۔ ۔ ۔ ۔ فیروزہ کیا تم ایسا خیال کر سکتی ہو جمال نے نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا - میں اور تمہاری تصویر بنانے سے گریز کروں - لیکن میں غور یہ کر رہا ہوں - کہ تمہاری تصویر بنائی بھی جا سکتی ہے یا نہیں - فیروزہ کی گردن ان الفاظ کے ساتھ جھک گئی - اور اس پر ایک ایسا حجاب طاری ہو گیا - کہ جس کا تحمل اس کی شفقی رنگ کی ساری بھی نہ کر سکتی تھی - اس کے چہرے پر ایک ایسا رنگ پیدا ہو گیا تھا - جس سے یقیناً حیاداری کی تخلیق ہوتی تھی - لیکن ایک لمحہ کے بعد حسین فیروزہ نے گردن کو جنبش دی - اور اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ ماحول سے بے پروا ہو کر جمال کو مخاطب کیا - کیوں کیا میں اس قابل نہیں ہوں - کہ میری تصویر بنائی جائے ؟ - ان الفاظ نے ایک مرتبہ پھر جمال پر بجلی گرا دی - اس کا سر چکرانے لگا - اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا - اسکی نگاہیں مس فیروزہ کے قدموں پر عذر خواہی کے لئے گڑی ہوئی تھیں - دل میں ایک عجیب تلاطم برپا تھا - اور دل اس طرح سے دھڑک رہا تھا - کہ اس کی آواز صاف سنائی دیتی تھی - مگر اس پر بھی جمال نے متانت اور سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا - اس نے حواس

درست کئے اور ایک مجرم کی طرح دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ میرا یہ مقصد تھا کہ تم کو اپنی تصویر بنوانے کی کیا جلدی ہے میں تمہاری تصویر بناؤنگا لیکن فوراً اور اطمینان کے بعد معصوم فیروزہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ آپ کی اسٹوڈیو سے سینکڑوں تصویریں بن گئی ہیں اور بنتی رہیں گی۔ میری خواہش ہے کہ آپ میری تصویر بھی جلد بنادیں۔ جمال نے اس انداز سے سر جھکا دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ وہ اب تیار ہے ..... تو کیا کل سے آپ میرا کام شروع کردینگے؟ فیروزہ نے کہا۔ ہاں۔ میں کل سے شروع کردوں گا۔ جمال نے جواب دیا۔

آج خلاف معمول جمال دیر تک اپنے نگار خانہ میں بیٹھا رہا۔ حالانکہ وہ دن کا پورا کام ختم کرچکا تھا مگر پھر بھی وہ ایک تصویر کے سامنے برش لئے ہوئے بیٹھا تھا لیکن اس کے چہرے سے اس کے قلبی جذبات کا عکس پورے طریقہ پر نمایاں تھا۔ وہ خاموش تھا لیکن اس کا مسلسل سکوت ایک باطنی کرب و اذیت کی پردہ داری میں مصروف تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ کسی اہم راز کے اخفا کی کوشش میں مصروف ہے مگر اس کے افشا کا خیال اُسے پریشان کر رہا ہے۔ اس نے دفعتاً ہاتھ سے برش پھینکدیا۔ لبوں کو جنبش ہوئی اور ایک فقرہ "آہ محبت" جو نگار خانہ کی پوری فضا میں گونج گیا۔ مگر نہیں۔ یہ میں کیا کر رہا ہوں جمال خود سے۔ شرم کرو۔ اگر کسی نے تمہاری زبان سے یہ سن لیا۔ تو اُس کا نتیجہ تمہارے مستقبل کو ہمیشہ کیلئے ہولناک اور تاریک بنا دیگا۔ اُف مجھے ضبط کرنا چاہیئے۔ صبر کرنا چاہیئے۔ گو..... گو ممکن نہیں ہے پھر بھی میں ایسا کرونگا۔ اُسے کیا خبر کیا معلوم کہ میں اُس کی تصویر بنانے سے کیوں گریز کرتا تھا اور کیا میں اب ایسا نہیں کرسکتا ضرور کرسکتا ہوں لیکن شاید نہ کرسکونگا۔ آہ حسین فیروزہ تیری رعنائیوں نے مجھے لوٹ لیا۔ تیری محبت نے مجھے تباہ کر ڈالا۔ تجھے کیا خبر ہے کہ ایک خاموش زندگی بسر کرنے والا انسان آج بھی اس فراغت کو نہ پا سکا۔ جس کیلئے اُس نے سات سال مسلسل جدوجہد کی تھی۔ میرے لئے دنیا کا ہر منظر ہمیشہ تاریک رہا اور تاریک رہیگا لیکن میں کم از کم اپنی زندگی کی آخری یادگار یہی تیری تصویر تیرے پاس چھوڑ جاؤنگا۔ جمال یہ کہتے کہتے چُپ ہوگیا۔ اس کے لبوں پر اب بھی تھرتھراہٹ تھی لیکن آنکھیں بند ہوگئیں اور پھر وہ فرش پر گر گیا۔

جمال کا نگار خانہ اب دن کے علاوہ رات کو بھی کھلا رہتا اور وہ مسلسل انہماک سے فیروزہ کی تصویر بنانے میں مصروف رہتا۔ فیروزہ بھی تقریباً روزانہ اس کے نگار خانہ میں دو ایک گھنٹہ کیلئے آتی اور نگار خانہ میں آرٹ کے ان نمونوں سے دل بہلاتی جس کو جمال نے بڑی کوشش سے طیار کر کے آراستہ کیا تھا اور اکثر ان نمونوں کی تفصیلات بھی پوچھتی۔ جمال کا آرٹ اس کے تخیلات کی مناسبت سے تھا۔ جس کی بلندی تک پہنچنا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی بعض بعض نمونے تو ایسے تھے جس میں مکمل زندگی کی داستانیں بھر دی گئی تھیں اور اگر کوئی شخص اسی دل و دماغ سے ان نمونوں پر تبصرہ کرتا۔ تو مکمل تصنیف کا مواد بہم ہوجاتا۔ آج اُس کو فیروزہ کی تصویر بناتے ہوئے مکمل دو ہفتے گذر گئے تھے لیکن ابھی تک وہ تصویر کا صرف ایک حصّہ بنا سکا تھا۔ فیروزہ کیلئے یہ دستور العمل بن گیا تھا کہ وہ روزانہ نگار خانہ میں آتی اور دریافت کر کے چلی جاتی کہ تصویر کب تک تیار ہو جائیگی۔ جمال نے ہمیشہ یہی بتایا کہ پورے ایک ماہ کے بعد یہ تصویر مکمل ہو جائیگی۔ جس رفتار سے وہ کام کر رہا تھا اس کو صحیح طور پر ایک آرٹسٹ ہی سمجھ سکتا تھا حالانکہ اس عرصہ میں مسلسل محنت کی وجہ سے اُس کی صحت پر بھی بُرا اثر پڑا تھا۔ جسے وہ خود بھی اچھی طرح محسوس کرتا تھا لیکن اُس کو بھی اس تصویر کے بنانے میں خود بخود ایک انہماک پیدا ہوگیا تھا۔ اُس نے اس سے پہلے بھی سینکڑوں تصویریں اسی طرح کی بنائی تھیں لیکن اُس نے کبھی اس قدر انہماک سے اس میں دلچسپی نہ لی تھی مگر یہ ایک عجیب بات تھی کہ اُدھر تصویر مکمل ہو رہی تھی۔ اس کے خطوط نمایاں ہو رہے تھے تصویر میں دلآویزی پیدا ہو رہی تھی اور اِدھر اُس کی ظاہری حالت میں رفتہ رفتہ تغیر ہو رہا تھا۔ اور یہ تغیر کوئی ایسا معمولی تغیر نہ تھا کہ جس کو کوئی چھپا سکتا۔ باوجود اُس نے لوگوں کو محسوس نہ ہونے دیا۔ اس چیز کو

فیروزہ بھی محسوس کر رہی تھی اور بُری طرح محسوس کر رہی تھی ایک دن اُس نے باتوں باتوں میں جمال سے کہدیا۔ کہ مسٹر جمال مجھ کو اپنی تصویر کی ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم اس قدر مسلسل محنت کرو۔ میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ اس محنت سے تمہاری جسمانی صحت پر خراب اثر پڑ رہا ہے اور بہتر یہ ہے کہ آپ کچھ دنوں کے لئے آرام کر لیں۔ ورنہ اس سے خرابی صحت کا مزید اندیشہ پیدا ہو جائیگا۔ جمال جس کو ہر وقت تصویر کے مکمل کرنیکی فکر تھی۔ برابر کچھ نہ کچھ کہکر سمجھا دیا کرتا۔ حالانکہ وہ خود جانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ تندرستی اگر اس سے زیادہ خراب ہو گئی تو پھر اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا لیکن عزم اور جمال کا عزم، پیمان اور فیروزہ سے پیمان اس نے طے کر لیا تھا۔ کہ ایک آخری تاریخ اس کے لئے مقرر کر دی تھی۔ کہ اس دن تصویر مکمل ہو جائیگی۔ نہ اُس نے کام چھوڑا نہ اُس کی طبیعت بحال ہوئی۔ تصویر مکمل ہو رہی تھی، اور جمال آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہا تھا۔ ایک ہی جذبہ کے ماتحت دونوں چیزیں تھیں، اُسے اپنا انجام بھی سامنے نظر آرہا تھا۔ اور اُس کی زندگی کا ایک نیا شاہکار بھی بالکل تیاری پر پہنچ چکا تھا۔ اب فیروزہ کی تصویر اُس کے حسنِ شباب کی مکمل رعنائیوں کے ساتھ اُس کے سامنے تھی۔ اگر کوئی شخص تصویر اور جمال دونوں کو ایک ساتھ دیکھتا تو اچھی طرح اندازہ کر سکتا کہ اُس نے اس تصویر کی تیاری میں اپنی زندگی کی پوری روح کھینچکر بھر دی تھی اور واقعہ بھی یہی تھا کہ وہ اپنے خون کا ایک ایک قطرہ اُس کی رنگ آمیزی میں صرف کر رہا تھا۔ کل تصویر کی مکمل تیاری کا دن تھا۔ اس لئے آج جمال نے ساری رات کو اسی کام کے لئے وقف کر دیا تھا۔ تصویر بالکل تیار تھی اور صرف چہرے پر آخری برش لگانے کی دیر تھی۔ رات ختم ہو رہی تھی اور اُس کا کام بھی ختم کے قریب تھا۔ چونکہ مسلسل کام کرنے سے کچھ تھک گیا تھا۔ اس لئے وہ بھی آرام کی غرض سے وہیں لیٹ گیا۔ مگر پو پھٹ گئی۔ اور آسمان پر ہلکی ہلکی سُرخی طلوعِ آفتاب کی خبر دینے لگی۔ وہ پھر اُٹھ بیٹھا۔ اور تصویر کا آخری کام بھی ختم کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ تصویر کے سامنے کچھ سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور ڈرائنگ بکس سے ایک تیز نشتر نکال لایا۔ نگارخانہ پر ایک ایسی نظر ڈالی جیسے اب اُس کے بعد ان چیزوں سے اُس کو کوئی واسطہ نہ رہیگا۔ نشتر ہاتھ میں لیا اور جلدی سے سینہ کے بائیں جانب چبھو دیا۔ خون سے برش کو تر کیا اور تصویر پر ایک آخری ہاتھ پھیر کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ ابھی چند لمحے بھی نہ گذرے تھے کہ فیروزہ بھی اپنی تصویر کے شوق میں نگارخانہ میں پہنچ گئی، اُس نے کیا دیکھا کہ اُس کی تصویر پردے سے لگی ہوئی رکھی تھی اور جمال اُس کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی اور اُس نے جمال کو جھنجھوڑنا شروع کیا۔ فرش خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ اور سرہانے ایک کھلے ہوئے کاغذ پر دو سطروں میں صرف یہ لکھا ہوا تھا۔ "پیاری فیروزہ! میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ تمہاری تصویر مکمل ہو گئی اور میری زندگی بھی تمہاری خوشگوار محبت میں جذب ہو گئی۔ ہوسکے تو تصویر کو قبول کرو اور میرے لئے نجات کی دُعا۔ تمہارا .... آج بھی جمال کا نگارخانہ اسی طرح موجود ہے۔ لیکن اب اس میں لوگ تصویریں بنوانے نہیں آتے۔ بلکہ ایک ماہرِ فن کی قبر کی زیارت کیلئے آتے ہیں۔ جہاں ایک طرف جمال اور دوسری طرف فیروزہ ابدی راحت کے مزے لے رہے ہیں۔ اور بیچ میں جمال کا شاہکار اسی طرح جگمگاتا ہوا موجود ہے۔

امین سلونوی

ترا دیوانہ

صبوحی کش فضائے ساغر و مینا میں رہتا ہے فرشتہ نور بن کر عالم بالا میں رہتا ہے
کوئی دوزخ میں کوئی جنت الماوا میں رہتا ہے نہ گلشن ہی میں رہتا ہے نہ وہ صحرا میں رہتا ہے

خدا جانے ترا دیوانہ کس دنیا میں رہتا ہے

نظر کے سامنے جو کچھ ہے اُس کو ماسوا سمجھے حرم کو بتکدے کو وہ کسی کا نقش پا سمجھے
جسے ہم انتہا کہتے ہیں اس کو ابتدا سمجھے کوئی یہ بھید کیا جانے کوئی یہ راز کیا سمجھے

خدا جانے ترا دیوانہ کس دنیا میں رہتا ہے

کبھی روتے ہوئے ہنگامہ پر جوش ہو جانا کبھی سازِ شکستہ کی طرح خاموش ہو جانا
کبھی بیگانہ صورت سے کبھی ہم آغوش ہو جانا کبھی اپنی نگہ سے آپ ہی روپوش ہو جانا

خدا جانے ترا دیوانہ کس دنیا میں رہتا ہے

چمن کو شہر کو بستی کو ویرانہ سمجھ لینا بیانِ جنت و دوزخ کو افسانہ سمجھ لینا
خوشی کی عیش کی محفل کو غم خانہ سمجھ لینا خرد سے ہوش سے دنیا کو بیگانہ سمجھ لینا

خدا جانے ترا دیوانہ کس دنیا میں رہتا ہے

ہمیشہ خندہ زن ہے عقل و حکمت پر جنوں اس کا کوئی خم خانۂ معنی ہے جام واژگوں اُس کا
زمانے بھر میں ہلچل ڈالنے والا سکوں اس کا لگا دے آگ ہفت افلاک میں سوزِ دروں اُس کا

خدا جانے ترا دیوانہ کس دنیا میں رہتا ہے

ہمیشہ اس کی چشمِ تر کے آنسو مسکراتے ہیں　　ہمیشہ اس کے نالے نغمۂ شیریں سناتے ہیں
ہمیشہ اس کے تقویٰ کی قسم میخوار کھاتے ہیں　　ہمیشہ اس کی پُر نوشی سے تائب فیض پاتے ہیں

خدا جانے ترا دیوانہ کس دنیا میں رہتا ہے

جہانِ رنگ و بو کو دخل کیا اس کی طبیعت میں　　جگہ پاتی نہیں جنت بھی اس کے باغِ فطرت میں
نیا سودا نئی شورش ہے اس کے جوشِ الفت میں　　وہ اس دنیا کی حسرت میں نہ اُس دنیا کی حسرت میں

خدا جانے ترا دیوانہ کس دنیا میں رہتا ہے

(جوش ملسیانی)

غزل

(طاہر غلام ناصر خاں طاؔہر سکنڈ ایر کلاس گورنمنٹ کالج لاہور)

آہ ہم نے جان دی جن کے لئے　　کاش آجاتے وہ اک دن کے لئے
کیا خطائیں تھیں مری اور کیا قصور　　جن کے بدلے تم نے گن گن کے لئے
ہم رہینِ منتِ اغیار ہیں　　عشق میں احسان کن کن کے لئے
ہم سے جو اقرار جو پیمان تھے　　وہ اُٹھا رکھے ہیں کس دن کے لئے
آہ ظالم یہ جفائیں یہ ستم　　اک مسلماں! ایک مومن کے لئے
لاش گویا ہے زبانِ حال سے　　آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے
آہ ان کو میری پروا بھی نہیں　　جان جاتی ہے مری جن کے لئے

مر مٹا طاؔہر انہیں کے واسطے
سر بکف ہے اک جہاں جن کے لئے

اصغر اپنے آپ کو ایک کامیاب افسانہ نویس خیال کیا کرتا تھا۔ اگرچہ علمی اور فنی نقطۂ نگاہ سے اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ادب اردو کی کس صنف پر "افسانے" کی اصطلاح کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ افسانہ کس طرح لکھا کرتے ہیں؟ پلاٹ کسطرح تیار کئے جاتے ہیں؟ اور انہیں کسطرح ترتیب دیا جاتا ہے؟ افسانہ کے افراد ان کے کیریکٹر اور زبان وغیرہ سے بھی وہ بڑی حد تک ناواقف تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی عبارت کو زبان کے خاص محاورات الفاظ کی دلکش تراکیب۔ چستی بندش اور تشبیہات و استعارات سے رنگین کرنا بھی نہیں جانتا تھا۔ معمولی سطحی عاشقانہ اور بازاری خیالات کو اردو کے ایسے الفاظ کا جامہ پہنا دینے کو جن پر پنجابی کا گمان ہونے لگے وہ ایک کامیاب افسانہ خیال کیا کرتا تھا۔ اگرچہ بچپن ہی سے اس کی طبیعت علم ادب کی طرف مائل تھی۔ لیکن کسی کامل صاحبِ فن استاد کی شاگردی میسر نہ آنے کی وجہ سے وہ علم ادب میں کوئی خاص ترقی نہ کر سکا۔ مذاقِ سلیم کی دولت سے بھی وہ کسی حد تک بے بہرہ تھا۔ مزید برآں اس کے بد مذاق اور خوشامدی دوستوں کی ضرورت سے زیادہ داد نے اسے خودی اور انانیت کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔

۲

اس کے دماغ میں شاعری کا بھی جنون تھا اگرچہ علم عروض کے باریک اور عمیق ترین نکتے اور باریکیاں تو در کنار وہ وزن ردیف اور قافیے سے بھی ناآشنا اور شعر کہنے میں ان قیود سے ایک حد تک آزاد تھا۔ تاہم اپنے بعض اشعار کے متعلق اس کا دعوٰے تھا کہ غالب۔ ذوق۔ مومن اور اقبال وغیرہ کے دواوین میں بھی ان کا جواب نہیں۔ اسے اپنے معمولی معمولی گیت فنِ ادب کے شاہکار نظر آتے تھے وہ اپنے شعر پڑھ پڑھ کر پہروں غنغناتا رہتا۔ اور اپنی پرواز تخیل کی خود ہی داد دیتا۔ آج تک اسے کسی مشاعرے یا علمی مجلس میں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا۔

۳

بہار کی ایک دلفریب صبح کو کہ اصغر مقبرۂ جہانگیر میں اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھا اپنی بہترین نظمیں بڑی سریلی لے سے گا گا کر سنا رہا تھا ایک دوست نے ایک ادبی رسالے کے اجرا کی تجویز پیش کی۔ اصغر کے دماغ میں عرصے سے

ایک ادبی رسالے کے اجرا کا خیال پرورش پا رہا تھا۔ اس کے دوست کی یہ تجویز اسکے سمندِ شوق پہ اک اور تازیانہ کا کام کر گئی۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے رسالے کے ابتدائی اخراجات۔ ڈیکلریشن۔ کتابت۔ طباعت اور اشاعت وغیرہ سے متعلق تجاویز پر بحث شروع ہو گئی۔ آخر طے پایا کہ سب دوست مشترکہ سرمائے سے رسالہ جاری کریں۔ سر دست کوئی لائق تجربہ کار۔ تنخواہ دار ایڈیٹر ملازم رکھ لیا جائے۔ بعد میں مستقل طور پر اس کی ادارت کے فرائض مسٹر اصغر انجام دیں۔ اور باقی اصحاب کتابت طباعت اور اشاعت وغیرہ میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔

اگرچہ مسٹر اصغر کا خیال تھا کہ ایک ماہوار رسالے کی ادارت کونسا مشکل کام ہے جس کے لئے تنخواہ دار ملازم کی ضرورت ہے۔ لیکن انہیں اپنے دور اندیش دوستوں کی کثرت رائے کے سامنے جھکنا ہی پڑا +

اسی دن "آسمان ادب پر ایک درخشاں ستارے کا طلوع"

"ثریا"

اپنی پوری لمعانیوں اور درخشانیوں کے ساتھ اگلے مہینے کے ابتدائی ہفتے میں میدانِ صحافت میں جلوہ گر ہوگا دو تین سطروں کے جلی عنوانات سے مختلف روز ناموں اور ماہوار رسائل میں اشتہار دیدیا گیا۔ جسمیں ابتدائی خریداروں کیلئے چندے کی رعایت کا اعلان بھی تھا۔

ایڈیٹر کے انتخاب کیلئے بھی "ضرورت" کے عنوان سے ایک اشتہار اخبارات میں دے دیا گیا۔ ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ دھڑا دھڑ امیدوار آنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ باہمی مشورے سے ایک لکھنوی کو "ثریا" کی ادارت کے لئے چن لیا گیا۔

۴

ایک مہینے کے قلیل عرصے میں رسالے کی اشاعت کے تمام ابتدائی انتظامات مکمل ہو کر اگلے مہینے کے شروع میں رسالے کا پہلا نمبر بڑی آب و تاب سے شایع ہو گیا۔ ہونہار برواکے چکنے چکنے پات قابل اڈیٹر کی قابلیت اور تجربہ کاری سے رسالے نے تھوڑے ہی عرصے میں اتنی ہر دلعزیزی حاصل کر لی کہ ایک سال میں اسکے خریداروں کی تعداد ۵ ہزار تک پہنچ گئی۔ ایک ہندوستانی رسالے کی اتنے قلیل عرصے میں اتنی خریداری واقعی حیرت انگیز کامیابی تھی رسالے کے ظاہری محاسن کتابت و طباعت کی دلکشی مضامین کی جدت تصاویر کی متانت اور مقبولیت اور سب سے بڑھ کر پابندیٔ وقت اور خریداروں کے ساتھ حسن سلوک جہاں "ثریا" کے حلقۂ اشاعت کو وسیع کر رہے تھے وہاں دوسرے رسائل کے معیار کو بھی بلند کرنے چلے جا رہے تھے +

۵

اگلے سال حسب قرارداد حصہ داران رسالے کی ادارت کا کام مسٹر اصغر نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شروع میں

آپ اس کام کو نہایت آسان خیال کرتے تھے۔ لیکن بعد میں تجربے نے ثابت کر دیا کہ جتنا یہ کام آسان نظر آتا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ اپنے خیال میں وہ بڑے بلند پایہ ایڈیٹوریل اور معیاری نظمیں لکھتا۔ لیکن خریداروں کے لئے اب "ثریا" کے ایڈیٹوریل بے معنی مضامین اور نظمیں بے کیف ہوتی تھیں۔ دو تین مہینے تو کام بدستور چلتا رہا۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اصغر نے محسوس کیا کہ نئے خریدار پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں۔ اور پرانے خریداروں میں سے بھی جن کا چندہ ختم ہوتا جاتا ہے۔ آئندہ "ثریا" کو اپنی سرپرستی سے محروم کرتے چلے جا رہے ہیں +

انہیں دنوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس نے رسالے کی روایتی ہر دلعزیزی اور بلند پایگی کو بالکل ملیامیٹ کر دیا۔ وہ یہ کہ ایک شاعر نے اپنی ایک بہترین نظم ثریا میں اشاعت کے لئے بھیجی۔ نظم عربی کی ایک بحر میں تھی۔ اور صاحب نظم اس کے ذریعے عربی کی اس بحر کو اردو میں رواج دینا چاہتے تھے۔ اور حصولِ مقصد کیلئے انہوں نے اس رسالے کو محض اس کی جدت پسندی کی وجہ سے منتخب کیا تھا۔ مسٹر اصغر نے اپنی ہمہ دانی کے غرور میں وہ نظم ذیل کے نوٹ سے واپس کر دی +

عزیزی

آپ کو اس باب میں ابھی مزید مشق اور تعلیم کی ضرورت ہے۔ مبادیاتِ شاعری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اگر فطرت نے آپ کو مذاقِ سلیم دیا ہے۔ تو مبارک۔ ورنہ چھوڑئیے اس دردسری کو +

اصغر

٦

شاعر فطرتاً خوددار اور حساس ہوتا ہے۔ وہ اس توہین کو برداشت نہ کر سکا اس نے اپنی انتہائی قوتیں انتقام کے لئے وقف کر دیں۔ اسی بحر میں "ایڈیٹر" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں اصغر اور اس کی ایڈیٹری کی خوب خوب خبر لی گئی تھی۔ اور ایک کثیرالاشاعت ادبی رسالے میں اشاعت کے لئے بھیج دی۔ نیز اپنے کئی پیشہ ور مضمون نگاروں کو اس رسالے کی تخریب کیلئے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اصغر کی کم علمی ناتجربہ کاری اور اس پر اس نظم پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ "ثریا" ننگِ صحافت خیال کیا جانے لگا۔ اور اگلے سال کے شروع میں اس کے خریداروں کی تعداد اصغر کے مختصر سے حلقۂ احباب تک محدود رہ گئی۔

٧

گرمیوں کی ایک شام کو وہ سیر سے واپس آیا۔ تو تھکا ماندہ تھا۔ تھکاوٹ دور کرنے کے لئے چارپائی پر لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

خواب میں وہ ایک لائق استاد کا شاگرد تھا۔ مضامین افسانے اور نظمیں لکھتا اور استاد کی خدمت میں اصلاح کے

لئے پیش کرتا۔ اپنی جن تحریروں کو وہ ادبِ اردو کے جواہر پارے اور فنی نقطۂ نگاہ سے شاہکار خیال کیا کرتا تھا۔ جب اصلاح کے لئے پیش ہوتے۔ تو استاد زبان، انشا، خیالات، محاورات اور فن کی ایسی غلطیاں اس کے ذہن نشین کرتا کہ اسے اپنی تحریریں بے معنی سی معلوم ہونے لگتیں۔ اب رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں کے آگے سے خود پسندی کا پردہ اٹھنے لگا اور اس نے کچھ حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

خواب سے بیدار ہونے پر اصغر جسمانی حیثیت سے اگرچہ وہی اصغر تھا۔ لیکن اس کی ذہنی حالت بالکل بدل چکی تھی۔ اب وہ مذاقِ سلیم کی دولت سے بہرہ مند تھا۔ اسے اپنے بہترین مضامین اور نظمیں ادبی نقطۂ نگاہ سے بے معنی نظر آنے لگیں۔ اس نے سب کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ رسالے کے لئے پھر سے ایک قابل اور تجربہ کار ایڈیٹر تلاش کیا گیا۔ اور خود ایک لائق استاد سے زباندانی کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔

مذاقِ سلیم کی بدولت اس نے تھوڑے ہی عرصے میں کافی ترقی کرلی۔ اب وہ ایک کامیاب افسانہ نویس اور بلند پایہ شاعر تھا۔ ادبی دنیا میں وہ ایک مقتدر حیثیت کا مالک خیال کیا جانے لگا۔ اس کا تخیل بلند زبان شستہ اور خیالات پاکیزہ تھے۔ اس کی نثر بھی شاعرانہ رنگ کی ہوتی۔ معمولی معمولی باتوں کو سلاست زبان اور رنگینئ استعارات سے ایسا رنگین بناتا۔ کہ پڑھنے والے عش عش کر اٹھتے۔

"زندگی کے دریا کا پانی خشک ہو چلا تھا"

"اس نے اپنی گفتگو کا ٹوٹا ہوا تاگا جوڑا"

"یہ ذرات روح سے بھی زیادہ غیر محسوس تھے۔" وغیرہ ایسے فقرات اس کا "روزمرہ" بن چکے تھے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں وہ خاص طور پر مدعو کیا جاتا۔ ادبی رسالے اپنے ایڈیٹوریل سٹاف میں اصغر کا نام لکھنا رسالے کی ترقی اشاعت کا موجب خیال کرنے لگے۔ ثریا نے مسٹر اصغر کی سرپرستی میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کرنی شروع کردی۔ اب وہ تمام ملکی رسالوں میں سب سے کثیر الاشاعت اور ہر دلعزیز رسالہ تھا۔

زرین اقوال

(۱) بچھو کا زہر اس کی دم میں ہوتا ہے مکھی کا اس کے سر میں سانپ کا اس کے پھنوں میں لیکن برے آدمی کا زہر اس کے جسم کے ہر حصہ میں موجود رہتا ہے۔

(۲) جس طرح چاند رات کو روشن کرتا ہے اور سورج دن کو ویسے ہی نیک اولاد خاندان کی روشنی کا موجب بنتی ہے۔

(۳) جو شخص محنت اور استقلال سے کام کرتا ہے کبھی بھوکا نہ رہیگا۔ جو سچے دل سے سوچ بچار کے سمندر میں غوطہ لگاتا رہتا ہے کبھی کوئی گناہ نہ کریگا۔ جو ہمیشہ چوکس رہتا ہے۔ کبھی خطرہ محسوس نہ کریگا۔ اور جو شخص بولنے کے وقت بولتا ہے اور خاموش رہنے کے وقت خاموش رہتا ہے۔ کبھی لڑائی کے خوفناک گرداب میں نہ پھنسے گا۔

(۴) سچ ہماری ماں ہے۔ انصاف ہمارا باپ۔ رحم ہماری عورت دوسروں کے لئے ادب آداب ہمارا دوست۔ مہربانی ہماری اولاد ایسے رشتہ داروں کی موجودگی میں ہمیں کسی چیز سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

بستی کمرِ خویش شکستی کمرِ من

(از ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوح ناروی)

ہمارے غمزدہ محترم حضرت نوح ناروی نے افسانہ نمبر کے لئے یہ افسانۂ غم تحریر فرمایا ہے جس میں اُنہوں نے اپنے مخصوص اور متعارف انداز میں جو اُنہیں کا حصہ ہے اپنی ہی مصیبت کی ترجمانی کی ہے۔ اس لئے اس دردناک نظم کا ہر شعر۔ ہر ایک مصرع۔ ہر ایک لفظ داد طلب نہیں بلکہ فریاد طلب ہے۔ ہم دُعا کرتے ہیں کہ خدائے کریم صاحب موصوف کو تسکینِ قلب کی نعمت ارزانی کرے۔ (جوش ملسیانی)

اک مردِ کہن سال کو لڑکے کی ہوس تھی
حسرت یہی تھی صرف تمنا یہی بس تھی

موجود زر و مال بہت کچھ تھا مکاں میں
اعزاز سا اعزاز تھا اربابِ جہاں میں

لیکن غمِ فرزند سے مشغولِ بکا تھا
وارث کے لئے صرفِ فغاں صبح و مسا تھا

افکار میں اوہام میں وسواس میں اُمید
اُمید میں یاس اور کبھی یاس میں اُمید

اکثر حکما سے ملا اکثر فقرا سے
مطلب کوئی نکلا نہ دوا سے نہ دُعا سے

برسوں یونہیں ناکامی و زحمت میں بسر کی
راحت کے عوض عمر مصیبت میں بسر کی

آخر اُسے دل شاد کیا فضلِ خدا نے
سنسان گھر آباد کیا فضلِ خدا نے

تاریکیٔ قسمت مٹی انوارِ پسر سے
ظلمت ہوئی کافور سپیدیٔ سحر سے

بچے کو بڑے ناز بڑی شان سے پالا
سو جان کی اک جان کو سو جان سے پالا

جب آئی جوانی تو جوانی نے دغا کی
سر پیٹتے سب رہ گئے بیٹے نے قضا کی

وہ جوشِ قلق تو نظر لختِ جگر کا
میت کے قریں قول وہ مغموم پدر کا

تو عزمِ سفر کردی و رفتی ز برِ من
بستی کمرِ خویش شکستی کمرِ من (نوح)

دریائے فصاحت

(از فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری جانشین حضرت امیر مینائی)

داغ کھا کر دل مرا گرم فغاں ہوتا نہیں — سچ تو یہ ہے آتشِ گل میں دھواں ہوتا نہیں

محتسب سے میکشی کا ڈھنگ سیکھا چاہیئے — مست ہے لیکن ذرا اُس پر گماں ہوتا نہیں

یہ مقولہ میکدے میں آ کے باطل ہو گیا — پیر ہو کر کوئی دنیا میں جواں ہوتا نہیں

ساتھ اشکوں کے ہو نالہ بھی کہ بے بانگِ جرس — کوئی منزل سے روانہ کارواں ہوتا نہیں

نکہتِ گل کی پریشانی نہ پوچھو باغ میں — اس طرح طائر کوئی بے آشیاں ہوتا نہیں

چشم و دل کے چند پردے کیا چھپائینگے اُسے — حُسن اُس کا لاکھ پردے میں نہاں ہوتا نہیں

عشق کی دنیا الگ ہے ساری دنیا ہے جہاں — یہ زمیں ہوتی نہیں یہ آسماں ہوتا نہیں

صبح کا وہ منتظر ہو اس سے جو واقف نہ ہو — ہجر کی شب انقلابِ آسماں ہوتا نہیں

ساتھ چلنے دو مجھے اے رہروانِ کوئے دوست — کارواں میں کیا غبارِ کارواں ہوتا نہیں

کس مزے کی آگ پھولوں سے لگی ہے باغ میں — نذرِ آتش بلبلوں کا آشیاں ہوتا نہیں

کیوں نہ بلبل ہوں میں گلہائے معانی کا جلیل

یہ چمن وہ ہے جو پامالِ خزاں ہوتا نہیں

زعفران زار

ہمارے دوست منشی عنایت اللہ خاں صاحب عطاؔ تخلص (یادش بخیر) بلاشبہ ایک طرفہ معجون تھے۔ عہدِ شباب کی رنگینیٔ صحبت جب کبھی یاد آتی ہے تو اُس کی خیالی جلوہ گاہوں میں وہ ہمیشہ محفل آرا ہوا کرتے ہیں۔ جس طرح ایک لالۂ خودرو تمام صحرا کے لئے باعثِ زینت ہو جاتا ہے اسی طرح یہ افسردہ کر دینے والی یاد ان کے متبسم جلوے سے حیات افروز بن جاتی ہے۔ یوں تو دنیا میں ہزاروں قسم کی طبیعتیں روزمرہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ مگر اس قسم کا نادر الوجود اور عجیب الخلقت آدمی بہت کم نظر آئیگا۔ ہر شخص لوگوں کی زبان سے اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے۔ مگر یہ تعریف اسی حد تک خوشنما ہوتی ہے جبتک کہ وہ کم و بیش اصلیت پر مبنی ہو۔ دانشمندوں کے نزدیک اس کا مبالغہ آمیز ہونا۔ اس کے بے وقعت ہونے کا مترادف ہوتا ہے۔ اور یہ مبالغہ اگر اغراق و غلو کے رنگ میں پایا جائے۔ تو معمولی عقل رکھنے والا آدمی بھی فوراً سمجھ جاتا ہے۔ کہ یہ ہجوِ قبیح ہے۔ عطا صاحب کی دنیا اس دنیا سے بالکل مختلف تھی۔ وہ اپنی تعریف سُن کر اس قدر بے خود ہوتے تھے کہ ہم اس منتر کے ذریعے جو کام ان سے لینا چاہیں لے سکتے تھے۔ اور جس رنگ میں اُنھیں دیکھنے کی خواہش ہو دیکھ سکتے تھے۔ کئی دفعہ ان کے ہاتھوں حریفانِ تندخو کی پگڑیاں اُتروائی گئیں۔ اور خود الگ کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کسی زبردست سے پالا پڑنے پر اُنہیں کے بھرے ہوئے بازو آڑے آئے۔ اور وہ رندوں میں رند۔ پارساؤں میں پارسا۔ حکیموں میں حکیم۔ شاعروں میں شاعر۔ غرض ہر مسلے میں پیپلا مول تھے۔ انتہا یہ ہے کہ انہیں پہلوانوں میں پہلوان۔ مطربوں میں مطرب بلکہ رقاصوں میں رقاص بنا دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ ان کا تخلص بھی حشو و زوائد میں سمجھنا چاہیئے۔ ورنہ شاعری اور موزونیٔ طبع سے اُنہیں اتنی نسبت بھی نہ تھی۔ جتنی پائے شل کو رفتار سے یا الکن کی زبان کو گفتار سے ہوتی ہے۔

زود باور اتنے کہ ممکن اور ناممکن میں کوئی امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔ جو کہدو۔ وہی درست۔ جو سنادو وہی برحق۔ بالخصوص دوستوں کی ہر ایک بات کو آیت و حدیث سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی۔ کہ انہیں اپنے ڈھب پر لانا بہت آسان تھا۔ لاہور کے ایک کالج میں تیس سے زیادہ طالب علم ان کے ہم جماعت تھے اور سب ایک ہی ہوسٹل میں رہتے تھے ایک دفعہ ہمارے پادری صاحب کو (مسٹر بھاردواج جنہیں تقریر بازی کی بہت عادت تھی اور اس عادت کی وجہ سے ہم سب اُنھیں پادری صاحب کہا کرتے تھے) کچھ دل لگی سوجھی۔ اُنھوں نے تین چار طالب علم جن میں ایک ہم بھی تھے اپنے ہم راز بنا لئے۔ اور یہ مشہور کیا۔ کہ وہ صرف آئینے کی مدد سے ہر چیز کا فوٹو لے سکتے ہیں۔ عطا صاحب کے کانوں میں بھی

یہ بھنک پڑ گئی۔ وہ دوڑے آئے بڑے اشتیاق سے کہا کہ میں بھی اپنی تصویر اُترواتی چاہتا ہوں۔ اُنہوں نے کہدیا کہ رات کے وقت تشریف لانا۔ نیز روشنی میں تصویر اچھی نہیں اُترتی۔ کہنے لگے۔ کہ اچھا رات ہی کو آجائیں گے۔ مگر کوئی ایسی تصویر دکھاؤ تو سہی۔ جو کسی نے آپ سے اُتروائی ہو۔ اُنھوں نے فوراً ایک چھوٹی سی تصویر نکال کر دکھائی جو اُن کے ہم رازوں میں سے ایک طالب علم کی تھی۔ (جو اُس نے کبھی کسی فوٹوگرافر سے بنوائی اور مقصد برآری کے لئے اب پادری صاحب کے حوالے کی ہوئی تھی) دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ صاحب تصویر نے بھی شہادت دی اور کہا۔ کہ یہ کل رات میں نے ان سے اُتروائی تھی۔ اور آج اُنھوں نے دھو دھا کر مکمل کر لی ہے۔ غرض آٹھ بجے شام کا وقت مقرر کیا گیا۔ اور وہ تشریف لیگئے۔

گھڑیاں گنتے گنتے دن ختم کیا۔ مفت کی شراب کون چھوڑے۔ وقت مقررہ پر تشریف لے آئے۔ پادری صاحب نے ایک اسٹول پر اُنہیں بٹھا دیا۔ اور خود سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ ہمرازوں کو پہلے ہی سے نقیب و فراز سمجھا رکھا تھا۔ اس لئے ایک طالب علم اسٹول کے ذرا عقب میں بطور تماشائی کھڑا ہوگیا۔ باقی دو تین دوست سامنے حاضر رہے۔ اس بات کی احتیاط کی گئی۔ کہ عقب میں رہنے والے طالب علم کے متعلق عطا صاحب بالکل بے خبر رہیں۔ یہاں ہم نے ذرا دُور اندیشی سے کام لیا۔ اور عطا صاحب کی جنگجویانہ طبیعت سے جو ہونے والے تماشے کے بعد سب کے لئے بلائے جان ہو سکتی تھی۔ مرعوب ہو کر کمرے کے ایک کونے میں چارپائی پر لیٹ گئے۔

اس موقع پر اس مختصر جماعت کا کمال ضبط و سکوت جسے خرق عادت کہنا چاہیئے۔ قابل داد تھا۔ ورنہ تھوڑا سا تبسم بھی بنے بنائے کھیل کو بگاڑ دینے کے لئے کافی تھا۔ اس قدر خاموشی تھی۔ کہ اس تماشے کا ہر ایک ایکٹر بجائے خود پیکر تصویر بنا تھا۔ پادری صاحب نے لیمپ کی لو ذرا مدھم کر دی اور اپنے کراماتی آئینے کے اردگرد سیاہ رنگ کا رومال اس طرح لپیٹا۔ کہ آئینے کا شفاف حصہ بہت تھوڑا سا نظر آسکتا تھا۔ اب آئینہ عطا صاحب کے سامنے رہے۔ پادری صاحب چھ سات فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہیں۔ اور ہدایت کر رہے ہیں۔ کہ میری اُنگلی کے اشارے کے مطابق آپ اُٹھتے بیٹھتے رہیں۔ تاکہ عکس واضح اور روشن ہو سکے۔ آئینے پر نظر جمائے رکھئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ ورنہ عکس کے بگڑ جانے کا احتمال ہے۔ عطا صاحب نے اس حکم کی پوری تعمیل کی۔ پادری صاحب کی اُنگلی اُوپر کی طرف اُٹھتی تھی۔ تو وہ سروقد کھڑے ہو جاتے تھے اور انگلی نیچے کی طرف آتے ہی اپنی مقدس نشست گاہ پر آرہتے تھے۔ چار دفعہ یہ فوجی قواعد ہو چکنے پر جب پانچویں دفعہ کھڑے ہوئے۔ تو عقب والے ہمراز نے نہایت آہستگی سے اسٹول پیچھے کی طرف ہٹا لیا۔ اب اُنگلی نیچے کی طرف آتے ہی ہمارے بے وقوف دوست بیٹھنے کی کوشش میں چاروں شانے چت گرے۔ دھڑام کی آواز پر تالیوں کا شور بلند ہوا۔ خندۂ بے اختیار نے فوراً طلسماتی قفل توڑ دئے۔ آنکھوں کے سامنے یہ عجیب و غریب تصویر دیکھ کر قہقہے پہ قہقہہ پڑنے لگا۔ سارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ہم بھی چارپائی سے اُٹھ کر شگفتہ صحبت میں شامل ہوگئے کمال یہ تھا۔ کہ خود عطا صاحب بھی سقف رُو بہ فرش رہیں بنے ہوئے بڑے زور سے ہنس رہے تھے اور ہمارا یہ وہم کہ اس

تماشے کے بعد خدا جانے کیا ہو۔ ان کے کھلکھلانے کی آواز سے بالکل دور ہو چکا تھا۔

عطا صاحب ابھی فرشِ زمین بن رہے ہیں۔ سوچتے ہونگے۔ کہ کیا اچھی تصویر اُتروائی ہے۔ چابک دستوں کی اس صناعی کا چرچا جس نے سُنا دم بخود ہو گیا۔ سر دھننے لگا۔ اگلے روز تصویر دیکھنے کی فرمائشیں آنی شروع ہوئیں۔ یاروں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ کئی دن تک اس زندگی بخش تماشے کا ذکرِ خیر رونقِ محفل رہا۔

جب یہ مذکور کچھ پُرانا ہو کر بے لطف ہو گیا۔ تو یارانِ طریقت ان کے رقص و سرود کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے۔ کوئی طبلہ کہیں سے مستعار لے آیا اور کوئی سارنگی۔ اتوار کی شام تھی۔ دس بجے کا وقت ہو گا۔ کہ تھاپ کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو یہ دیکھا۔ کہ ہمارے کئی زندہ دل دوست حلقہ باندھے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف عطا صاحب طبلے پر تھاپ لگا رہے ہیں۔ اور ان کے قریب ہی دوسرے صاحب سارنگی بجا رہے ہیں۔ سُر تال سے کوئی بھی واقف نہ تھا اور نہ کسی کو اس بات کی پروا تھی۔ عورتوں کی پٹس میں بھی کوئی باقاعدگی ہوتی ہے۔ یہاں وہ بھی نہ تھی۔ مگر یہ نہایت بُری بے آہنگی بھی ہر ایک کے مُنہ سے خراجِ تحسین لے رہی تھی۔ جملہ حاضرین محویت کے عالم میں غرق ہوئے جاتے تھے۔ اتنے میں کسی نے یہ کہہ دیا۔ کہ فرش پر بیٹھ کر طبلہ بجانا کیا مشکل ہے۔ بات تو جب ہے کہ کھڑے ہو کر تھاپ درست پڑے۔ دوسرے نے کہا۔ کہ ہاں کہتے تو سچ ہو۔ یہ تائیدی قول سن کر عطا صاحب فوراً اُٹھے اور ایک چادر سے دونوں طبلے پیٹ کے قریب باندھ لئے اب سارنگی والے کو بھی طوعاً و کرہاً کھڑے ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ واللہ یہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ فردوسِ گوش اور فردوسِ نظر دونوں کا ایک جگہ اجتماع یہیں دیکھا۔ سارنگی والے کی بے ہنری پر کبھی کبھی نکتہ چینی ہو جاتی تھی۔ مگر طبلے کی ہر ایک تھاپ پر محفل جھوم رہی تھی۔ داد پر داد لٹتی تھی۔ ہر واہ واہ کے ساتھ حاضرین کے ہاتھ طبلہ نواز کے ہاتھوں کی طرف اُٹھتے تھے۔ گویا بلائیں لیا چاہتے ہیں۔ دنیا بھر کی کسی محفلِ نشاط میں گرمیِ صحبت اتنی ہنگامہ آرا نہ ہوئی ہو گی۔ جتنی یہاں دیکھنے میں آئی۔ تال کو درست رکھنے کے خیال سے عطا صاحب کی آنکھیں چھت سے لگ گئی تھیں۔ تضحیک نما آفرین کے مصنوعی مگر خوش رنگ پھول ہر طرف سے اس باکمال سازندے پر برس رہے تھے۔

اس کے بعد سارنگی کا دور شروع ہوا۔ عطا صاحب نے اس کی بھی خوب گوشمالی کی۔ سارنگی کا گز ان کے طاقتور ہاتھوں میں اُس کند چھُری سے کم نہ تھا۔ جو کسی مظلوم کی گردن پر چل رہی ہو اور اُس کی ہر ایک حرکت سے یہ آواز آ رہی ہو۔

گوئی رگِ جاں مے گسلد نغمۂ ناسازش

اور اس شعر کے مصرعِ ثانی نے حاضرین کی پُر شور تحسین کا روپ بھر رکھا تھا۔ کامل دو گھنٹے کے بعد یہ قابلِ یادگار صحبت ختم ہوئی۔ اور سب کے دل میں ایک نقشِ استوار چھوڑ گئی۔

ابھی تین چار دن نہ گزرے تھے۔ کہ یارانِ رندمشرب میں پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ اب کی دفعہ محفلِ رقص منعقد کرنے کی تیاری تھی۔ کسی کو یقین نہ تھا۔ کہ عطا صاحب اس کام کے لئے بھی آمادہ ہو جائیں گے۔ مگر خدا جانے یارانِ شاطر نے کیا افسوں

پھونکا۔ کہ رات کو یہ دلکش منظر بھی دیکھ لیا۔ ہوسٹل میں دو تین افغان طالب علم بھی تھے۔ پہلے اُنھوں نے اپنا افغانی ناچ دکھایا۔ شاید انہیں ڈھرے پر لانے کے لئے یہی ترکیب سوچی گئی ہوگی اور انہیں کہا گیا ہوگا۔ کہ ہم سب باری باری ناچیں گے۔ اس شرط کے ماتحت ان کا رضامند ہوجانا مشکل بھی نہ تھا۔ چنانچہ افغان طالب علموں کے بعد جب ان کے رقص کا مطالبہ شروع ہوا۔ تو یہ بالکل آمادہ نظر آئے جھجک اور رکاوٹ تو اب رہی نہ تھی علاوہ ازیں تماشائیوں کے لئے داخلہ بھی بند تھا۔ اسی غرض سے کمرے کے دروازے اندر سے بند رکھے تھے۔ مگر جب یہ حضرت کھل کھیلے۔ تو کسی نے آہستہ سے ایک دروازہ کھول دیا۔ سب تماشائی جو باہر برآمدے میں نہایت خاموشی سے کھڑے تھے۔ یکبارگی کمرے میں داخل ہوگئے دیکھا تو یہ دیکھا کہ عطا صاحب پاؤں میں گھنگرو باندھے بڑے لطف سے رقص فرمارہے ہیں۔ اب طبلے اور سارنگی کے لئے بھی گوشہ گیری کی ضرورت نہ رہی تھی۔ رازداری کا کوئی محل باقی نہ رہا تھا۔ نیز اس خیال سے کہ ساز کے بغیر خالی رقص بے لطف سمجھا جاتا ہے یہ چیزیں بھی زینتِ محفل ہوگئیں۔ اب صرف ایک چیز کی کمی رہ گئی تھی نغمہ و سرود کے بغیر یہ منظر ابھی پھیکا سا نظر آتا تھا حسنِ اتفاق سے دو اصحاب اچھے خوش گلو تھے اُنھوں نے پیش دستی کے خیال سے دوچار شعر گائے۔ اب سب نے مل کر تقاضا شروع کیا۔ کہ عطا صاحب سے بھی گانا سُنیئے۔ ورنہ ناچنا تو سبھی کو آتا ہے۔ دیوانے کو ایک موہبت ہوتی ہے۔ یہاں تو سب نے ان کے لحن داؤدی کی تعریف میں قصیدہ خوانی کی اور ان کے ماہر موسیقی ہونے کی شہادت دی۔ آخر اہل محفل اپنے منصوبے میں کامیاب ہوگئے عطا صاحب نے "دُور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم" گانا شروع کیا۔ گاتے تھے اور ناچتے تھے۔ ناچتے تھے اور گاتے تھے۔ پاؤں اُٹھانے کا انداز سبحان اللہ۔ اس پر گھنگرو کی آواز سونے پہ سہاگہ محفل اندر کا اکھاڑا بن گئی ناچ میں گھومنے کا انداز دیکھ کر نوآموز بچھیرے کے کاوے یاد آتے تھے۔ بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ بازو ہاتھ انگلیاں بلکہ آنکھیں بھی رقص کر رہی تھیں اور صاف کہہ رہی تھیں۔ کہ

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ایک ایک لفظ کو محاکات کے رنگ میں ادا کرتے تھے۔ مدالصوت قصرالصوت۔ تغیر لحن غرض ہر چیز پر خراجِ تحسین لیتے تھے۔ عروض میں تھوڑا سا تقطیع کا بیان پڑھ چکے تھے اس لئے فاعلاتن کے وزن پر سارگاما۔ سارگاما سناکر ماہرِ فن ہونے کا ثبوت بھی پیش کر رہے تھے۔ اور جب "سارگاما۔ سارگاما۔ سارگاما۔ سارگاما کہکر

"دُور سے آ۔ اے تھے ساقی۔ سن کے میخا۔ نے کو ہم" الاپتے تھے۔ تو جدتِ ادائے محفل تہ و بالا ہوجاتی تھی۔ آخری رکن جب زبانِ مبارک سے نکلتا۔ خاص کر لفظ ہم تو زمین پر پاؤں اس زور سے پڑتا۔ کہ گاؤ زمین کے سر میں بھی دھمک ہوتی ہوگی۔

اس غزل کے بعد اُنھوں نے پنجابیوں کے مخصوص انداز میں پنجابی زبان کے دو گیت سُنائے۔ آخر بارہ بج جانے پر

بے مثال صحبت جس کے دیکھنے کو آج تک آنکھیں ترس رہی ہیں ختم ہوئی۔ خاموشی ہوجانے پر بھی اس کمرے کی فضا موسیقی سے معمور تھی اور ذرہ ذرہ ان کے حرکات وسکنات کی نقالی کر رہا تھا۔

اس کے چند یوم بعد ایسا ٹرڈے کا جلسہ ہونے والا تھا منتظم جلسہ نے دو تین طالبعلموں سے جو شاعرانہ حسن طبیعت رکھتے تھے۔ اس جلسہ میں پڑھنے کے لئے برکات برطانیہ پر نظم لکھنے کی فرمائش کی۔ عطا صاحب اگرچہ گنہگار تخلص تھے مگر یہ سبکی اور اہانت کب گوارا کر سکتے تھے۔ کہ اس جلسہ کے لئے وہ کوئی نظم نہ لکھ سکے۔ چنانچہ انھوں نے بھی پندرہ بیس اشعار اسی موضوع پر گھسیٹ لئے نادانی یہ ہوئی۔ کہ جلسہ سے پیشتر یہ نظم بعض احباب کو سنادی اور انھوں نے مصلحت وقت کے خیال سے منتظم جلسہ کے حضور میں اس نظم کی بہت کچھ مذمت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اسٹیج پر آنے کے لئے تکلیف نہ دی گئی اور انھوں نے یہ توہین بہت بری طرح محسوس کی۔

جب یہ نظم چند احباب کو سنائی جا رہی تھی۔ تو ہمیں بھی اس پر لطف صحبت میں شریک ہونے کا فخر بخشا گیا تھا۔ ایک ایک شعر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے تھے۔ خوش گفتی۔ گل گفتی۔ دُرسفتی کی آوازیں پے درپے بلند ہو رہی تھیں۔ اس نظم کا ایک مصرع یہ تھا۔ ع

بوروں کو تیری فوج نے چنے چبوائے

بوروں سے مراد بوئر قوم ہے۔ جس نے ٹرانسوال میں اپنی آزادی کے لئے برطانیہ سے جنگ آزمائی کی تھی اور جنرل بوتھا جس کا مشہور قائد لشکر تھا۔

اس زریں تصرف پر کہ بوئروں کی جگہ بوروں کہا۔ داد کے پھولوں سے عطا صاحب کو لاد دیا گیا۔ اور پھر ناکوں چنے چبانے کی جگہ صرف "چنے چبادئے" میں اختصار کی جو خوبی مضمر ہے۔ اس نے تو ہمارے مجتہد شاعر کے اجتہاد کا سکہ بٹھا دیا۔ چنے (نون مشدد) پر حرف گیری کی گنجائش کیوں ہو۔ جب تسکین جائز ہے۔ تحریک جائز ہے۔ مد جائز ہے شد کیوں جائز نہ ہو۔ آخر اس سے کونسا گناہ کبیرہ سرزد ہوا ہے۔ یہی لفظ تو اس مصرع کی جان ہے اور شاید یہ اسی کی برکت تھی کہ جب یہ مصرع سنایا گیا۔ تو ہم سب پر آسمانی انوار نازل ہوئے۔

یہ مصرع کم سے کم دس دفعہ پڑھوایا گیا ہوگا۔ داد دینے والوں کے دل میں داد کی حسرت رہی جاتی تھی۔ ایک نے کہا خاں صاحب ہمارا منہ نہیں۔ جو اس مصرع کی داد دے سکیں۔ یہ سن کر خاں صاحب نے ایرانی طریق سے تین دفعہ سلام تشکر ادا کیا۔ اور دو دفعہ بندہ نواز بندہ نواز کہہ کر تیسری دفعہ غریب نواز بھی کہہ دیا۔

جتنی دفعہ یہ مصرع پڑھوایا گیا اتنی ہی دفعہ اس میں نئی نئی خوبیاں نکالی گئیں۔ ایک نکتہ رس نے اس لحاظ سے کہ چنے بوریوں میں بھرے جاتے ہیں۔ بوروں اور چنوں میں صنعت مراعاۃ النظیر بتائی۔ دوسرے نے اس لحاظ سے کہ ٹرانسوال میں ہندوستانی فوج بھی لڑی تھی اور کسے میدان جنگ میں بھنے ہوئے چنے ملا کرتے ہیں۔ اس مصرع کو دعوی متضمن دلیل کہا۔

کسی نے یہ نکتہ پیدا کیا۔ کہ اس میں دشمن کی فوج کو گھوڑوں اور مویشیوں سے نسبت دی گئی ہے۔ مگر سب سے زیادہ داد نون مشدد کا حصہ تھی۔ اتنی دولتِ تحسین و مرحبا آج تک کسی لفظ کے لئے قسمت نہ کی گئی ہوگی۔

اس جلسہ سے چند یوم بعد عطا صاحب نے بازار میں مشاعرہ کا اشتہار لگا ہوا دیکھا۔ جس کا مصرعۂ طرح یہ تھا۔ ع

وہ بے چلے ہی مجھے پائمال کر بیٹھے

اس مصرع طرح پر انھوں نے بھی غزل لکھ لی۔ مگر اب کی دفعہ کسی کو نہیں سنائی۔ بلکہ ذکر تک نہیں کیا۔ کہ میں نے بھی غزل لکھی ہے یہ مشاعرہ پندرہ روزہ تھا۔ حسبِ معمول ہم سب اُس روز وقتِ مقررہ پر مقام مشاعرہ میں پہنچ گئے حضرت ساغر اکبر آبادی کی صدارت میں مشاعرہ شروع ہوا۔ بہت سے مقامی شعرا نے حاضرین کو اپنے حسنِ طبیعت سے محظوظ کیا۔ جب تمام شعرا یکے بعد دیگرے اپنا اپنا کلام سنا چکے۔ تو صدر جلسہ نے کھڑے ہو کر کہا۔ کہ اور کوئی صاحب کچھ سنانا چاہیں تو تشریف لائیں۔ ہمیں یقین تھا۔ کہ اب اور کوئی پڑھنے والا نظر نہیں آتا۔ اس لئے محفل برخاست ہونے والی ہے۔ مگر ہماری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب یہ دیکھا۔ کہ ہمارے ہر فن مولا خاں صاحب اسٹیج پر پہنچ گئے ہیں۔ اس وقت انھیں سمجھانے اور روکنے کا کوئی موقعہ باقی نہ رہا تھا اور کوئی روکتا بھی تو یہ رُکنے والی اسامی نہ تھے۔ اس حوصلے اور جرأت کا کیا کہنا۔ جلسہ میں پڑھنے کی اجازت اگر نہیں ملی تو بلا سے۔ ہمت والے نے اپنی نمود کا سامان خود پیدا کر لیا۔ مطلع عرض ہے پر ارشاد کا شور سُن کر زبانِ بلاغت نشان سے یوں گویا ہوئے۔

کسی کے عشق میں بُرا اپنا حال کر بیٹھے

اس مصرع پر اہلِ محفل تو خاموش رہے۔ مگر صدر جلسہ نے تقطیع درست رکھ کر یہ مصرع اس طرح دہرا دیا۔ ع

کسی کے عشق میں کیا اپنا حال کر بیٹھے

عطا صاحب کو کچھ بھی ادراکِ سخن ہوتا۔ تو وہ اس اصلاح سے عبرت حاصل کرتے۔ مگر یہاں تو باوا آدم ہی نرالا تھا۔ انھوں نے اپنا وہی مصرع پھر اسی طرح اعادہ فرمایا اور کہا۔ ع

کسی کے عشق میں بُرا اپنا حال کر بیٹھے

اور ساتھ ہی یہ مصرع ثانی پڑھ کر

افسوس ہے کہ دل کو نہ کیوں ہم سنبھال کر بیٹھے

مطلع پورا کر دیا۔ اب صدر صاحب نے بھی مزید اصلاح کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ تو اپنی جگہ پر خاموش ہو گئے۔ مگر داد دینے والے اصحاب نے اس شکستہ پر طائر کو عرش پر اُڑانا شروع کیا۔ واہ وا۔ سبحان اللہ۔ بارک اللہ۔ بارک اللہ۔ کیا مطلع نکالا ہے۔ کیا اچھی طبیعت پائی ہے۔ مکرر فرمائیے وغیرہ وغیرہ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ مکرر فرمائیے کا شور سُن کر عطا صاحب پھر اس مطلع کو پڑھنے لگے۔

عطا۔ کسی کے عشق میں — بہت سے حاضرین۔ بُرا اپنا حال

عطا۔ بُرا اپنا حال کر بیٹھے — حاضرین۔ واہ وا۔ کیا عشق ہے۔ یہ عشق نہیں بلکہ حُسن ہے۔

عطا۔ کسی کے عشق میں بُرا اپنا — حاضرین۔ (بڑے زور سے) حال کر بیٹھے۔

یہ آواز اس قدر پُر شور تھی۔ کہ عطا صاحب کے ہی الفاظ دَب کر رہ گئے۔ اور کسی کو سُنائی نہ دیئے۔

عطا۔ افسوس ہے — حاضرین۔ واقعی سخت افسوس ہے

عطا۔ افسوس ہے کہ دل کو نہ کیوں ہم سنبھال کر بیٹھے۔

اب پھر وہی واہ واہونے لگی۔ جزاک اللہ۔ ماشاءاللہ کے نعروں سے ہلڑ مچ گیا۔ کوئی کہتا تھا یہ مطلع مطلع آفتاب ہے۔ کوئی کہتا تھا۔ حصّہ ہے حصّہ۔ کسی نے کہا بندش تو دیکھئے کتنی چست ہے۔ ایک نے کہا اسکی چاروں چولیں چوکس ہیں۔ دوسرے نے کہا۔ خدا کی قسم ہر ایک کل سیدھی ہے۔ تیسرے نے کہا۔ ردیف کیا اچھی نباہی ہے۔ ہاں صاحب ذرا پھر ارشاد فرمائیے کیا نور کا مطلع ہے۔

اب عطا صاحب نے تیسری دفعہ یہ مطلع پڑھنا شروع کیا۔ داد دینے والوں کی پُر شور آوازوں سے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ اس لئے وہ کئی دفعہ رک کے رُک رُک کر از سرِ نو پڑھتے اور پھر اُسی شور کی وجہ سے رکتے تھے آخر بہت دفعہ رک رک کر پورا مطلع ادا کرنے کی نوبت آئی اور ساتھ ہی واہ وا۔ واہ وا کے دونگڑے برسنے شروع ہوئے۔ پہلے تو سامنے ہی کے دس بارہ آدمی یہ ہنگامہ برپا کر رہے تھے۔ اب دیکھا دیکھی بیسیوں اصحاب گرمیِ محفل کے حصّہ دار ہو گئے۔ عطا صاحب اس ہلڑ کو دیکھ رہے تھے۔ مگر ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ بہت سے ہاتھ ان کے چہرے کی طرف اُٹھ اُٹھ کر اس خوش بیانی کی داد دے رہے تھے اور یہ بندہ نواز بندہ نواز کہے جاتے تھے۔ اتنے میں کسی نے کہا ایک دفعہ پھر فرمائیے۔

غرض اسی طرح یہ سلسلہ جاری تھا۔ جب چھ دفعہ اس مطلع کو پڑھوایا جا چکا۔ اور اس کے بعد پھر وہی مکرر فرمائیے کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ تو صدر جلسہ اس دل لگی سے تنگ آ گئے۔ اُنھوں نے کھڑے ہو کر حاضرین سے درخواست کی۔ کہ براہِ مہربانی خاموش رہ کر سُنتے جائیے۔ یہ بھی فرمایا۔ کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ آپ دل ہی دل میں مزے لیجئے اور پڑھنے والے کو غزل ختم کرنے کا موقع دیجئے۔

تھوڑی سی عقل رکھنے والا بھی اس کنائے کو جو صراحت سے زیادہ واضح تھا سمجھ جاتا۔ مگر عطا صاحب پر اس تازیانے کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اُنھوں نے دوسرا شعر پڑھنا شروع کیا۔

عطا۔ ہم ان کی بزم میں دب کر رہے نہ غیروں سے — حاضرین۔ ہم ان کی بزم میں

عطا۔ ہم ان کی بزم میں دب کر رہے نہ غیروں سے۔ بیٹھے تو آنکھیں آنکھوں میں

حاضرین۔ (متفقہ آواز سے) ۔ ڈال کر بیٹھے ۔ (اس وقت سب نے آنکھیں شاعر کی آنکھوں میں ڈال رکھی تھیں) ۔
عطا۔ بیٹھے تو آنکھیں آنکھوں میں ڈال کر بیٹھے ۔

یہ شعر سُن کر حاضرین نے صدرِ جلسہ سے کہا لیجئے صاحب ۔ اب ہم مجبور ہیں ۔ کہ اس شعر کو مکرر پڑھوائیں ۔ یہ سُن کر صدرِ جلسہ بھی لاجواب ہو گئے ۔ اور حاضرین نے پھر وہی مکرر مکرر کی رٹ لگانی شروع کی ۔ گرمیِ محفل نے پھر وہی رنگ جما لیا ۔ اب عطا صاحب سے بار بار یہ شعر پڑھوایا جا رہا ہے ۔ مصرع ثانی پر محفل متزلزل ہو رہی ہے ۔ کوئی کہتا ہے کہ قلم توڑ دیا ہے صاحب ۔ کوئی کہتا ہے ۔ سبحان اللہ کیا خودداری ہے ۔ واہ وا ۔ واہ وا ۔ مصرع ثانی کس بلا کا ہے کیا مضمون پیدا کیا ہے ۔ اس شعر سے تو جلال برس رہا ہے ۔ خدا کی قسم شعر کیا ہے ۔ الہام ہے الہام ۔

سامنے کے بنچوں پر یہ ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی ۔ پچھلے بنچوں پر جہاں آخری صف میں ہم بیٹھے تھے ۔ شور و غل میں دبی ہوئی یہ آوازیں بھی سُنائی دیتی تھیں ۔ ایسے سے ایسا ہی سلوک ہونا چاہیے ۔ یہ بہروپیا لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہوا ہے ۔ یہ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل گیا ہے ۔ یہ دھاگے ہی سے مصرع ناپ لیا کرے ۔ تو اس سے اچھا ہے ۔ اسے یہ مشورہ کس نے دیا ۔ کہ مشاعرہ میں غزل پڑھو ۔ اُسے جرأت کس طرح ہوئی ۔ یہ تو تک بھی پوری نہیں ملا سکتا ۔ یہ جہل مرکب کا پتلا ہے ۔ اُسے کیوں نہیں کہتے کہ اب مقطع کہیئے ۔

اس شعر پر بھی مکرر فرمائیے کا سلسلہ ختم نہ ہوا ۔ تو صدرِ جلسہ نے پھر وہی تاقین شروع کی اور حاضرین کو بصد مشکل خاموش ہو جانے پر مائل کیا ۔ اب عطا صاحب نے باقی شعر سُنانے شروع کئے ۔ ہر ایک شعر پر فرمائشی قہقہے پڑتے تھے ۔ اس قدر شور برپا ہو رہا تھا ۔ کہ پیچھے بیٹھنے والوں کو عطا صاحب کی آواز بھی سُنائی نہ دیتی تھی ۔ ہر ایک مصرع پر ضیائے موزوں تھی ۔ ہر ایک قافیہ نورٌ علیٰ نور تھا ۔ دو جگہ جنجال اور استقبال کے قافیے بھی آئے تھے ۔ جنجال کر بیٹھے ۔ استقبال کر بیٹھے ۔ ان قافیوں پر بھی محفل لوٹ گئی اور یہ شعر بھی کئی دفعہ پڑھوائے گئے ۔ داد دینے والے جھاڑ بن کر لپٹ رہے تھے محفل ہنس رہی تھی ۔ شاعری رو رہی تھی ۔ خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹا اور عطا صاحب اپنی غزل ختم کر کے اسٹیج سے اُتر آئے ۔

وقت زیادہ گزر رہا تھا ۔ محفل برخاست ہوئی ۔ ہمیں یقین تھا ۔ کہ عطا صاحب آئندہ کے لئے کان کو ہاتھ لگائیں گے ۔ اور کبھی کسی مشاعرہ میں پڑھنے کی جرأت نہ کریں گے ۔ مگر باہر آ کر اُن کی زبان سے سُنا تو یہ سُنا کہ دیکھا کسی کو بھی اتنی داد نہیں ملی جتنی ہمیں ملی ہے ۔ کسی کا کلام اتنا مقبول نہیں ہوا ۔ کسی کی غزل اتنی سرسبز نہیں ہوئی ۔ ایک ایک شعر دس دس دفعہ پڑھوایا گیا ۔ ہم تو پڑھتے پڑھتے تنگ آ گئے ۔ مگر تقاضا ختم نہ ہوا سخن فہموں نے کئی نکتے ایسے نکالے ۔ کہ شعر کہتے وقت ہمارے خیال میں بھی نہ تھے ۔ اور بیان کے سانچے میں بے ساختہ ڈھل گئے تھے ۔ یہ سُن کر ہمیں بھی کہنا پڑا کہ ہاں سچ ہے ۔ دنیا میں ہنرمند ہی فوقیت پاتے ہیں ۔ فقط

جوش ملسیانی

شاعر اور تارے

(علامہ مضطر نعمانی شاہجہانپوری فاضل ادب)

شاعر:-

اپنی دنیا میں مجھے کاش بسالو تارو! قرب میں اپنے بہر کیف بلالو تارو!
المدد دہر کے طوفاں سے بچالو تارو!

حال جو کچھ ہے وہ سب تم پہ ہے روشن میرا ہوں تنہ حال ہر اک ذرہ ہی دشمن میرا
برق بھی تاکتی رہتی ہے نشیمن میرا

مختلف بھیس میں اس دہر کی رنگت دیکھی کیا کہوں حیف جوان آنکھوں سے حالت دیکھی
پیکرِ مکر و دغا دہر کی صورت دیکھی

مضطرب حال ہوں بیحد ہے پریشاں ہستی نذرِ طوفانِ شب و روز ہے میری بستی
شاعری شغل ہے لیکن ہے وہ فاقہ مستی

باعثِ لطف و سکوں مجھ کو تمہارا گوشہ گلشنِ چرخ میں پروین کا سنہرا خوشہ
روح پرور ہی اخوت کا تمہاری توشہ

تارے:۔

تجھ پہ قربان ترے جوشِ وفا پر قربان
سر پہ آنکھوں پہ ہے واللہ یہ تیرا ارمان
ان دنوں سر میں بیشک ہے بپا اک طوفان

حیف معلوم نہیں حال ہمارا تجھ کو
ہم ہیں کیا چیز جو دیں کچھ بھی سہارا تجھ کو
بسمل اُس تیغ کے ہیں جس نے کہ مارا تجھ کو

غور سے دیکھ جہاں میں ہے جو چشمک مشہور
اُس میں اندازِ رقابت ہے ہمارا مستور
پیکرِ درد ہیں روتے ہیں بہ شکلِ ناسور

ہم ہیں کم ضو ہے کوئی اور کوئی روشن تر
بغض و رشک و حسد و مکر و دغا کا منظر
جستجو میں ہیں کہ ملتا نہیں کوئی رہبر

فخرِ کونین ہے پہلو میں جو تیرے دل ہے
عشق کے بارِ امانت کا یہی حامل ہے
کچھ عجب شان سے مضطر ترا مستقبل ہے

شورشِ دہر میں تو نوح کی کشتی بن جا
سحرِ فرعون کیلئے موسیٰ کی لاٹھی بن جا
تجھ میں قدرت تو ہے اُٹھ قوم کا حامی بن جا

ہم بھی محتاج ہیں ہر فرد ترا شیدائی
چند قطرات عطا کن زمئے بینائی
اے زہے قسمتِ ما سوئے غریباں آئی

(۱)

ایشوری ایک بڑے زمیندار کا لڑکا تھا۔ میں ایک غریب کلرک کا۔ جس کے پاس قلم کی مزدوری کے سوا اور کوئی جائداد نہ تھی۔ ہم دونوں میں برابر بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔ میں زمینداروں کی برائی کرتا۔ انہیں خونخوار جانور اور خون چوسنے والی جونک اور پیرازائٹ کہتا۔ وہ زمینداروں کی حمایت کرتا۔ مگر اس حجت کے دور میں اس کا پہلو قدرتاً کچھ کمزور ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس زمینداری کے جواز کے لئے کوئی زوردار دلیل نہ تھی۔ یہ کہنا کہ سبھی انسان برابر نہیں ہوتے۔ چھوٹے بڑے ہمیشہ رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ رہینگے۔ بیچ دلیل تھی۔ جور و جبر کی اور مفت خوری کی کسی اخلاقی یا انسانی قانون سے تاویل کرنی مشکل تھی۔ میں ان مباحثوں کی گرما گرمی میں اکثر تیز ہو جاتا۔ اور دلآزار باتیں کہہ جاتا۔ لیکن ایشوری ہار کر بھی مسکراتا رہتا تھا۔ میں نے کبھی اسے تیز یا گرم ہوتے نہیں دیکھا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا۔ کہ وہ دل میں میرے پہلو کو منصفانہ سمجھتا تھا۔ نوکروں سے وہ سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ امیروں میں جو ایک رعونت اور بے دردی ہوتی ہے۔ اسمیں اسے بھی وافر حصہ ملا تھا۔ نوکر نے بستر لگانے میں ذرا بھی دیر کی۔ دودھ ضرورت سے زیادہ گرم یا ٹھنڈا ہوا۔ جوتے پر پالش اچھی نہ ہوئی تو وہ برہم ہو جاتا تھا۔ سستی یا بدتمیزی کی اسے مطلق برداشت نہ تھی۔ لیکن دوستوں سے، اور خاصکر مجھ سے اسکا برتاؤ انتہا درجہ شریفانہ تھا۔ بالکل مخلصانہ کہئے۔ شاید اسکی جگہ میں ہوتا۔ تو مجھ میں بھی وہی اثرات پیدا ہو جاتے۔ کیونکہ میری جمہوریت اصول پر نہیں، ذاتی حالات پر مبنی تھی۔ لیکن وہ میری جگہ ہو کر بھی شاید امیر ہی رہتا۔ کیونکہ وہ خلقتاً امیر واقع ہوا تھا؛

اب کے دسہرہ کی چھٹیوں میں میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ گھر نہ جاؤں گا۔ میرے پاس کرایہ کے لئے روپے نہ تھے۔ اور نہ میں گھر والوں کو تکلیف دینا چاہتا تھا۔ میں جانتا ہوں وہ جو کچھ مجھے دیتے ہیں۔ وہ انکی حیثیت کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہوسٹل میں تنہا رہنے کا خیال بھی سوہان روح ہو رہا تھا۔ سارے نوکر چلے جائیں گے۔ اکیلا میں بھوت کی طرح پڑا رہونگا اسلئے جب ایشوری نے مجھے گھر چلنے کی دعوت دی۔ تو میں بغیر حیل حجت کے راضی ہو گیا۔ خصوصاً اسلئے کہ ایشوری کے ساتھ تعطیل کے لمحات گزارنے سے امتحان کی تیاری بہتر ہو سکتی تھی۔ اسمیں ذہانت اور ریاضت دونوں غیر امیرانہ اوصاف موجود تھے؛

اس نے کہا۔ لیکن بھئی! ایک بات کا خیال رکھنا۔ وہاں اگر زمینداریوں کی برائی کرو گے تو میری بڑی ہتک ہوگی۔ اور میرے گھر والوں کو ناگوار گزرے گا۔ وہ لوگ تو اسامیوں پر اسی دعوے سے حکومت کرتے ہیں۔ کہ خدا نے اسامیوں کو اُن کی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسامی بھی یہی سمجھتا ہے۔ اگر اُسے خیال آ جائے کہ زمیندار اور اسامی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے تو زمینداروں کے لئے عرصۂ گیتی تنگ ہو جائے ؛

میں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا "تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہاں جاتے ہی میں کچھ اور ہو جاؤں گا؟"

"ہاں، میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

"تو تم غلط سمجھتے ہو۔"

ایشوری نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ غالباً اُسنے اس معاملہ کو میری فراست پر چھوڑ دیا۔ اور بہت اچھا کیا۔ مباحثہ شروع ہو جانے میں میری جانب سے ردِّ دعوت کا اندیشہ تھا۔

اُسی دن شام کو ہم دونوں رخصت ہوئے۔ سفر کی تیاریوں کا ذکر فضول ہے۔ سارے ہوسٹل میں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے کپڑے، کھلونے، مٹھائیاں، میوے، باجے، تکلفات اور آرائش کی چیزیں، تیل، عطر، لوٹ مچی ہوئی تھی۔ ایشوری اس سے کیوں مستثنیٰ ہوتا ؛

(۲)

سیکنڈ کلاس تو کیا میں نے کبھی انٹر کلاس میں بھی سفر نہ کیا تھا۔ ایشوری نے انٹر کلاس کے ٹکٹ لیے۔ شام کو ریفرشمنٹ روم میں ہی کھانا کھانے کی ٹھہری۔ ہوسٹل کی روٹیاں آج اس خوشی میں کون کھاتا۔ میری وضع قطع اور طرز و انداز سے قیافہ شناس خانساموں کو مالک اور طفیلئے کی تمیز کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ان کی بے توجہی ناگوار معلوم ہو رہی تھی۔ پیسے ایشوری نے دیئے۔ شاید میرے والد کو جو تنخواہ ملتی ہے۔ اس سے زیادہ ان خانساموں کو انعام و اکرام مل جاتا ہو (ایک روپیہ تو چلتے وقت ایشوری ہی نے دیا۔) پھر بھی میں ان سے اسی توجہ اور ادب کا منتظر تھا جس سے وہ سب ایشوری کا لحاظ کر رہے تھے۔ کیوں ایشوری کے حکم پر سب کے سب دوڑتے ہیں۔ اور میں کوئی چیز مانگتا ہوں۔ تو بے دلی اور بیرخی کا اظہار کرتے ہیں۔ گویا بیگار جھیل رہے ہوں۔ مجھے اسوقت کھانے میں مطلق مزہ نہ آیا۔ یہ امتیاز میری توجہ کو تمام تر اپنی جانب کھینچے ہوئے تھا ؛

گاڑی آئی۔ ہم سوار ہوئے۔ خانساموں نے ایشوری کو سلام کیا۔ مجھے نظر انداز کر دیا۔

ایشوری نے سرکار جتلاتے ہوئے کہا "کتنے تمیز دار ہیں یہ سب۔ ایک ہمارے نوکر ہیں۔ کہ کوئی کام کرنے کا سلیقہ نہیں۔"

میں نے کچھ ترشی سے کہا "اسی طرح تم اپنے نوکر کو بھی ایک روپیہ روز انعام دے دیا کرو۔ تو شاید اس سے زیادہ

تمیزدار ہو جائے "۔

" تو کیا تم سمجھتے ہو۔ یہ لوگ محض انعام کے لالچ سے اتنی تندہی کرتے ہیں "؟

" جی نہیں۔ تمیز اور ادب تو ان کے خون میں پیوست ہو گیا ہے "۔

" تم بات نہیں مانتے۔ میں یہ ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا۔ کہ عملاً کوئی آدمی تمیزدار بنایا جا سکتا ہے "۔

گاڑی چلی۔ ڈاک تھی۔ پرتاب گڑھ آ کر رکی۔ ایک آدمی نے ہمارا کمرہ کھولا۔ میں فوراً چلا اٹھا " دوسرا درجہ ہے۔ سیکنڈ کلاس ہے "۔

اس مسافر نے گاڑی کے اندر آ کر میری طرف ایک عجیب تمسخر کی نگاہ سے دیکھا اور بولا " جی ہاں بندہ بھی اتنا سمجھتا ہے " اور اسطرف والے برتھ پر بیٹھ گیا۔ میں کتنا شرمندہ ہوا۔ کہہ نہیں سکتا۔

صبح ہوتے ہوتے ہم شاہجہانپور پہنچے۔ اسٹیشن پر کئی آدمی ہمارے منتظر تھے۔ پانچ بیگار، دو مختار۔ ایک خاصی فوج تھی ایک مختار مسلمان تھا۔ ریاست علی۔ دوسرا برہمن تھا رام رکھا۔ دونوں نے میری طرف مستفسر نگاہوں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ تم کیسے آ گئے ؟

ریاست علی نے الیشوری سے پوچھا " یہ بابو صاحب کیا سرکار کے ساتھ پڑھتے ہیں "؟

الیشوری نے جواب دیا " ہاں ساتھ پڑھتے بھی ہیں اور اسی کمرہ میں رہتے بھی ہیں۔ یوں کہئے کہ آپ ہی کی بدولت میں الہ آباد پڑا ہوا ہوں۔ ورنہ کب کا لکھنؤ چلا آیا ہوتا۔ اب کی میں انہیں گھسیٹ لایا۔ ان کے گھر سے کئی تار آ چکے تھے۔ مگر میں نے انکاری جواب دلوا دیئے۔ آخری تار تو ارجنٹ تھا۔ جسکی فیس چار آنہ فی لفظ ہے۔ مگر یہاں سے اس کا جواب بھی نفی میں گیا۔

دونوں مختاروں نے میری طرف حیرت آمیز نظروں سے دیکھا۔ کچھ مرعوب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے معلوم ہوئے۔

ریاست علی نے ایک لمحہ تامل کے بعد کہا " مگر آپ بڑے سیدھے سادے لباس میں رہتے ہیں "۔

الیشوری نے بڑی متانت سے کہا " مہاتما گاندھی کے پیرو ہیں صاحب۔ کھدر کے سوا کچھ پہنتے ہی نہیں۔ پرانے سارے کپڑے جلا ڈالے۔ اور کھدر بھی وہ نہیں پہنتے۔ جو امیر لوگ استعمال کرتے ہیں۔ آپ کے نوکر آپ سے اچھے کپڑے پہنتے ہیں "۔

اسکے بعد اس نے رازدارانہ انداز سے آہستہ آہستہ کہا " یوں کہو کہ راجہ ہیں۔ ڈھائی تین لاکھ سالانہ کی ریاست ہے مگر حضرت کی صورت دیکھو تو معلوم ہوتا ہے ابھی یتیم خانہ سے پکڑ کر لائے گئے ہیں "۔

رام رکھا نے مرعوب ہو کر کہا " امیروں کا ایسا سبھاؤ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے "۔

ریاست علی نے تائید کی۔ "آپ نے مہاراجہ چنگا کو دیکھا ہوتا۔ تو حیرت میں آ جاتے۔ ایک گاڑھے کی مرزئی پہنے بازاروں میں گھوما کرتے تھے۔ سنتے ہیں ایکبار بیگار میں پکڑے گئے تھے۔ انہیں نے دس لاکھ سے چھتری کالج کھول دیا۔"

میں دل میں جھینپ رہا تھا۔ مگر نہ معلوم کیا بات تھی۔ کہ یہ سفید جھوٹ بھی اسوقت مجھے ناگوار نہیں معلوم ہو رہا تھا اس کے ہرایک جملہ کے ساتھ گویا میں اسکی فرضی امارت کے قریب تر آتا جاتا تھا۔ اپنی ہی نظروں میں کچھ اونچا اٹھتا جاتا تھا۔

دیہاتی راستہ تھا۔ موٹروں کا گذر نہ تھا۔ ہماری سواری کے لئے دو گھوڑے کھڑے تھے۔ گھوڑے کا میں شہسوار نہیں۔ لڑکپن میں کئی بار ٹٹوؤں گھوڑوں پر سوار ہوا ہوں۔ کالاں ماس گھوڑے پر سوار ہوتے ہوتے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ زمینداروں کے گھوڑوں کی بدمزاجیاں دیکھ چکا ہوں۔ الف ہونا اور دولتیاں جھاڑنا تو معمولی بات ہے۔ مگر میں نے چہرہ پر شکن نہ آنے دیا۔ اسطرح رکاب پر پاؤں رکھکر سوار ہوا۔ گویا سواری کا عادی ہوں۔ خیریت یہ تھی۔ کہ ایک دن قبل یہاں بارش ہوگئی تھی۔ اور راستہ کھیتوں کی مینڈوں سے تھا۔ اسلئے الیشوری نے گھوڑے کو تیز نہ کیا ورنہ شاید میں دست و پا شکستہ لوٹتا۔ ممکن ہے اس نے میری خامی بھانپ لی ہو۔ مگر اس نے اس کا اظہار نہ کیا۔ پردہ ڈھکا رہ گیا۔

(۳)

الیشوری کا مکان کیا تھا۔ بالکل قلعہ تھا۔ امام باڑے کا سا پھاٹک۔ دروازہ پر مسلح پہرہ دار ٹہلتا ہوا۔ نوکروں کا کوئی حساب نہیں۔ جسے دیکھئے بڑا سا پگڑ باندھے، کندھے پر لٹھ رکھے کھڑا ہے۔ ہاں کرتے کھدر کے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ قومیت کا اثر چاہے دلوں تک نہ پہنچا ہو۔ مگر جسم تک ضرور پہنچ چکا ہے۔ الیشوری نے اپنے باپ، چچا اور دوسرے رشتہ داروں سے میرا تعارف کرایا۔ اور اسی شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ۔ ایسی ہوا باندھی کہ کچھ نہ پوچھئے۔ نوکر چاکر ہی نہیں۔ گھر والے بھی میرا احترام کرنے لگے۔ دیہات کے زمیندار، لاکھوں کا منافعہ، پھر بھی پولیس کانسٹیبلوں کو افسر سمجھنے والے۔ کئی صاحب تو مجھے 'حضور' کہنے لگے۔

جب ذرا تخلیہ ہوا، تو میں نے الیشوری سے کہا۔ "تم بڑے شیطان ہو یار۔ میری مٹی کیوں پلید کر رہے ہو؟"

الیشوری نے ہنسکر کہا۔ "ان احمقوں کے سامنے یہی چال ضروری تھی۔ ورنہ سیدھے منہ بات نہ کرتے۔ یہاں شرافت کی، علم کی، کمال کی پوچھ نہیں۔ بس خستیا۔ کی پوچھ ہے۔"

ناشتہ کر کے بیٹھے ہی تھے۔ کہ ایک نائی آگیا۔ بابو لوگ اسٹیشن سے گھوڑوں پر آئے ہیں۔ تھک گئے ہونگے۔ پاؤں دبانا لازمی تھا۔

الیشوری نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "پہلے کنور صاحب کے پاؤں دبا۔"

میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ زندگی میں مجھے اپنے پاؤں دبوانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ میں اسے امیرانہ بیہودگی۔

رئیسانہ حماقت، مُٹھ مردی۔ اور نہ جانے کیا کیا کہکر مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اور آج میں بھوج تیلی کی طرح، ریاست کے سایہ میں آکر رئیس بنا ہُوا تھا۔ حریت اور مساوات کے وہ احساسات ہی گویا فنا ہو گئے تھے۔ اتنے میں دس بج گئے۔ اندر سے بلاوا آیا "رسوئی تیار ہے"۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ نئی روشنی ابھی صرف درخت کی چوٹی تک پہنچ پائی تھی۔ تنہ اور شاخیں دھندلکے میں پڑی ہوئی تھیں۔ ہوسٹل میں جوتے پہنے میز پر ڈٹ جاتے تھے۔ یہ ایک وضعدار رئیس کا گھر تھا۔ یہاں کرتہ اُتارنا اور پاؤں دھونا لازمی تھا۔ آنگن میں خدمتگار پانی کا لوٹا لئے کھڑا تھا۔ ایشوری نے اپنے پاؤں بڑھا دیئے خدمتگار نے پاؤں دھوئے۔ میں نے بھی خدمتگار ہی سے پاؤں دھلوائے۔ تب رسوئی میں جا کر آسن پر بیٹھے؛

سوچا تھا وہاں دیہات میں خوب یکسوئی ہوگی۔ اور امتحان کی تیاریاں کریں گے۔ مگر یہاں سارا دن سیر و تفریح میں گذر جاتا تھا۔ کہیں دریا میں کشتی کی سیر ہے۔ کہیں مچھلیوں یا چڑیوں کا شکار رہے۔ کہیں پہلوانوں کی کشتی دیکھ رہے ہیں۔ کہیں شطرنج ہو رہا ہے۔ ایشوری خوب انڈے منگواتا تھا۔ اور کمرہ میں اسٹوو پر آملٹ بنتے تھے۔ گھر کے لوگ دیکھتے تھے۔ پر آنکھیں چُرا لیتے تھے۔ لڑکا انگریزی پڑھ رہا ہے۔ دھرم کرم کی پابندی کیسے کر سکتا ہے۔ اس کے اس انحراف کو بزرگانہ فیاضی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ غالباً اس کے برعکس دیکھکر ان لوگوں کو حیرت ہوتی۔ گود کا بچہ پیشاب کر دے۔ تو لوگ کپڑے نہیں بدلتے۔ نہ بچے پر خفا ہوتے ہیں۔ اس کا بوسہ لیتے ہیں؛

ہر وقت نوکروں کی فوج ہمیں گھیرے رہتی تھی۔ اپنے ہاتھ پیروں کو ہلانے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ نہانے بیٹھتے۔ تو دو آدمی نہلانے کو حاضر۔ لیٹتے تو دو آدمی پنکھا جھل رہے ہیں۔ کہیں جائیے تو چار سپاہی پیچھے پیچھے لٹھ لئے آ رہے ہیں میں یہاں مہاتما گاندھی کا کنور چیلا مشہور تھا۔ بھیتر سے باہر تک میری دھاک تھی۔ ناشتے میں ذرا بھی دیر نہ ہونے پائے۔ کہیں کنور صاحب ناراض نہ ہو جائیں۔ بستر عین وقت پر لگ جائے۔ کنور صاحب کے سونے کا وقت آ گیا۔ میں ایشوری سے بھی زیادہ نازک دماغ بن گیا۔ یا یوں کہئے بننے پر مجبور ہو گیا۔ ایشوری اپنے ہاتھ سے اپنے بستر بچھا لے لیکن کنور مہمان اپنے ہاتھوں کیونکر اپنے بستر بچھا سکتے ہیں۔ ان کی شان میں فرق آجائیگا۔ ایک دن واقعی یہی کیفیت ہو گئی۔ ایشوری گھر میں تھا بس گیارہ بج گئے۔ کوئی ملازم بستر بچھانے نہ آیا۔ میری آنکھیں نیند سے گرانبار ہو رہی تھیں۔ بار بار جھپکیاں لے رہا تھا۔ مگر بستر کیسے لگاؤں۔ کنور جو ٹھہرا۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے مہرا آیا۔ بڑا منہ لگا نوکر تھا۔ لیکن میں نے اُسے ایسا ڈانٹا۔ کہ وہ بھی یاد کرتا ہوگا ایشوری میری ڈانٹ سنکر باہر نکل آیا۔ اور بولا تم نے بہت اچھا کیا۔ یہ سب حرامخور اسی برتاؤ کے مستحق ہیں"

اسی طرح ایک دن ایشوری کسی دعوت میں گیا ہُوا تھا۔ شام ہو گئی تھی۔ کمرہ میں لیمپ نہ جلا تھا۔ لیمپ میز پر موجود تھا۔ دیا سلائی بھی وہیں رکھی ہوئی تھی۔ لیکن ایشوری خود کبھی لیمپ نہیں جلاتا تھا۔ پھر کنور صاحب کیسے جلائیں۔ میں جھنجھلا رہا تھا۔ اخبار آیا رکھا ہُوا تھا۔ طبیعت اُسے پڑھنے کے لئے بیقرار تھی۔ مگر لیمپ ندارد۔ سوء اتفاق سے مختار ریاست علی آنکلے بزرگ آدمی تھے۔ مگر میں نے انہیں ایسی پھٹکار بتائی۔ کہ رو دیئے۔ بھیتر باہر ہلچل مچ گئی۔ دوڑ کر بچارے نے خود

لیمپ جلا یا۔

ایک ٹھاکر اکثر آیا کرتا تھا۔ کچھ منچلا آدمی تھا۔ مہاتما گاندھی سے اُسے بڑی عقیدت تھی۔ مگر مجھ سے کچھ پوچھتے ڈرتا تھا۔ ایک دن مجھے تنہا دیکھکر آیا۔ اور ہاتھ باندھکر بولا "سرکار تو مہاتما جی کے چیلے ہیں نہ؟ لوگ کہتے ہیں سوراج ہو گا۔ تو جمیندار نہ رہیں گے"

میں نے شان جمائی "زمینداروں کے رہنے کی ضرورت کیا ہے۔ یہ لوگ ناحق غریبوں کا خون چوستے ہیں"

ٹھاکر نے پھر پوچھا "تو کیوں سرکار۔ سب جمینداروں کی جمین چھین لی جائیگی؟"

میں نے کہا۔ بہت سے لوگ تو خوشی سے دیدیں گے۔ جو لوگ خوشی سے نہ دیں گے۔ ان کی چھیننا ہی پڑے گی"

ٹھاکر نے کہا "ہم لوگ تو تیار بیٹھے ہیں۔ جونہی سوراج ہؤا۔ اپنے سارے علاقے اسامیوں کو ہبہ کر دیں گے"

مَیں کرسی پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ ٹھاکر میرے پاؤں دبانے لگا۔ پھر بولا "آج کل جمیندار لوگ بڑا ظلم کرتے ہیں سرکار۔ ہمیں بھی اجور اپنے الاکے میں تھوڑی سی جمین دے دیں۔ تو چلکر وہیں رہوں"

مَیں نے کہا "ابھی تو میرا اختیار نہیں ہے بھائی۔ لیکن جونہی اختیار ملا۔ سب سے پہلے تمہیں بلاؤں گا۔ تمہیں موٹر ڈرائیوری سکھا کر اپنا ڈرائیور بنا لوں گا"

میں نے بعد میں سنا کہ اس دن ٹھاکر نے خوب بھنگ پی۔ اور اپنی بیوی کو خوب پیٹا۔ اور گاؤں کے بنئے سے لڑنے پر تیار ہو گیا۔

(۴)

چھٹی اسطرح تمام ہوئی۔ اور ہم لوگ پھر الہ آباد واپس چلے۔ گاؤں کے بہت سے آدمی ہم لوگوں کو پہنچانے آئے۔ ٹھاکر تو ہمارے ساتھ اسٹیشن تک آیا۔ میں نے بھی اپنا پارٹ خوب صفائی سے کھیلا۔ اور اپنے امیرانہ انکسار اور شرافت کی ہر ایک کے دل پر مُہر لگا آیا۔ جی تو چاہتا تھا۔ کہ ملازموں کو خوب انعام و اکرام دوں لیکن اسکی گنجائش نہ تھی۔ اور الیگزوری اتنا فراست مند نہ تھا کہ میری شان قائم رکھنے کیلئے مجھے دس بیس روپے دیدیتا۔ اسوقت مجھے قرض بھی مل جاتے تو ملازموں کو مایوس نہ کرتا۔ انکی منتظر صورتیں دیکھ دیکھ کر میرا دل پارہ پارہ ہؤا جا رہا تھا۔

واپسی ٹکٹ تھا ہی۔ مگر گاڑی آئی۔ تو بورے کی طرح بھری ہوئی تھی۔ درگا پوجا کی چھٹیاں ختم کر کے سبھی لوگ لوٹ رہے تھے۔ سکنڈ کلاس میں تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ انٹر کلاس کی حالت اس سے بھی بدتر۔ یہی آخری گاڑی تھی۔ رُک نہ سکتے تھے۔ امتحان میں نہ بیٹھ سکتے۔ آخر تیسرے درجہ میں بڑی مشکل سے جگہ ملی۔ مگر مجھے اس ڈبے میں بیٹھنا بڑا ناگوار گذر رہا تھا۔ آئے تھے آرام سے لیٹے لیٹے۔ جا رہے تھے سکڑے ہوئے۔ پہلو بدلنے کی بھی جگہ نہ تھی۔

ایک آدمی جسکی پیٹھ پر بڑا سا گٹھر بندھا ہؤا تھا۔ کلکتے جا رہا تھا۔ کہیں گٹھری رکھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ مجبوراً پشت پر

باندھے ہوئے تھا۔ کوئی دہقانی معلوم ہوتا تھا جس سے دم گھٹنے لگتا۔ تو آکر بار بار کھڑکی پر کھڑا ہو جاتا۔ میں بھی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کا بار بار آکر میرے منہ کو گٹھری سے رگڑنا مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔ ایک تو ہوا یوں ہی کم تھی۔ دوسرے اس دہقان کا منہ پر آکر کھڑا ہو جانا گویا میرا گلا دبانا تھا۔

لوگ باتیں کر رہے تھے۔ ایک بوڑھے میاں بولے" انگریزی بادشاہت کے بھی کیا کہنے۔ عدالت کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ چاہے بادشاہ پر دعویٰ کر دیجئے۔ آپ کے حق میں قانون ہے تو ضرور ڈگری ہوگی"

دوسرے صاحب جو کائستھ معلوم ہو رہے تھے۔ بولے" ایسی بادشاہت تو صاحب کبھی نہ ہوئی ہے نہ ہوگی۔ رام چندر اور ہرلشچندر کا نام سنتے تھے۔ وہ رام راج آنکھوں دیکھ لیا"

میں کچھ دیر خون کا گھونٹ پی پی کر اس دہقان کی شرارتیں برداشت کرتا رہا۔ یکایک مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اُسے پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا۔ اور دو طمانچے۔ زور زور سے لگائے۔ وہ مسافروں پر جا گرا۔ اس نے آنکھیں نکالکر کہا" کیوں مارتے ہو، بابو صاحب۔ ہم نے بھی کرایہ دیا ہے"

چاروں طرف سے میرے پرئے دے ہونے لگی۔

بوڑھے میاں صاحب بولے" اگر اتنے نازک مزاج ہیں آپ۔ تو اوّل درجے میں کیوں نہیں بیٹھتے؟"

لالہ صاحب نے فرمایا" کوئی بڑا آدمی ہوگا تو اپنے گھر کا ہوگا۔ مجھے اس طرح مارتے تو دکھا دیتا"

تیسرے صاحب بولے" بالکل بے قصور مارا صاحب۔ گاڑی میں تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ کھڑکی پر ذرا سانس لینے کھڑا ہو گیا۔ اُس پر اتنا غصہ۔ امیر ہو کے کیا آدمی انسانیت بالکل کھو دیتا ہے"

بوڑھے میاں نے فرمایا" امیر آدمی انسانیت نہیں کھوتا صاحب۔ یہ حرکت ان کی ہے۔ جو ہیں تو ٹکے کے آدمی مگر زعم یہ ہے کہ ہم بھی رئیس ہیں"

ایک دہقانی بولا" دپھسترن میں گھسن تو پاوت ناہیں۔ اسپر مجاج اِتّا ہے"

ایشوری نے انگریزی میں کہا " Whah an idiat you are Bir.

اور میرا نشہ کچھ اُترتا ہُوا معلوم ہو رہا تھا۔ اور اپنی شوریدہ سری اور تنگ ظرفی صاف نظر آنے لگی تھی+

از جناب الحاج سید شاہ ولی عینی بی اے (آنرز) ہیڈ ماسٹر کال گڑھ

ذیل کے دلچسپ افسانہ کی تخلیق ہمارے مکرم دوست سید شاہ ولی عینی کی جدّتِ طبع کی رہین منت ہے جس میں آپنے پُرلطف اندازِ بیان کے ساتھ دورِ حاضر کے اُن مصنّفین کا خاکہ اُڑایا ہے۔ جو کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کُنبہ جوڑا" کی مشہور مثل سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کی ہر تحریر میں" تیرے ہی گھر سے آگ لائی۔ اور نام رکھا بسنتی کی جھلک" نمایاں رہتی ہے۔ سید صاحب کا روئے سخن اُن مصنفین اور مؤلفین کیطرف نہیں ہے۔ جو کسی مسئلہ کی علمی تحقیق کے لئے متقدمین کی بوسیدہ ہڈیوں کی ریزہ چینی کرتے یا تاریخ قدیم کے انکشاف کے لئے عہدِ عتیق کے گڑے مُردے اکھیڑ کر ان سے کشفِ حقیقت کے طالب ہوتے ہیں۔ بلکہ سید صاحب کا خطاب تو صرف اُن "اُٹھائی گیروں" سے ہے۔ جو کبھی حلوائی کی دکان پر دادا جی کی فاتحہ دینے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی پرائے مال پہ "یا حسین" کا وظیفہ پڑھنے کیلئے آمادہ نظر آتے ہیں۔ عینی صاحب کو اس گروہ سے بچکر زندہ سلامت گھر واپس آجانے پر . . . . . ہم مبارکباد دیتے ہیں۔ لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ کہ وہ ذرا سنبھل کے رہا کریں۔ اگر آپ کہیں ان کے پھندے میں پھنس گئے تو ناک کان کی خیر نظر نہیں آتی۔ کیونکہ اکیلا چنا کیا بھاڑ کو پھوڑے گا۔ اور جب ایک حمام میں سب ہی ننگے ہوں تو اُن ننگوں کی غیرت کسطرح گوارا کرے گی۔ کہ اُن کے درمیان کوئی لباس والا بھی نظر آئے۔ لہذا ایسی خطرناک حالت میں عینی صاحب سر کی پگڑی دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑے رہیں۔ ورنہ ہم کہے دیتے ہیں کہ پچھتائیں گے :

(اسماعیل)

یہ امر میرے لئے اکثر موجبِ حیرت رہا ہے کہ پریس کی سرزمین اس قدر زرخیز کیوں ہے۔ اور بعض بنجر دماغ بھی اسقدر ضخیم کتابوں کے مصنّف کسطرح بن گئے؟ جوں جوں انسان زندگی کا سفر طے کرتا جاتا ہے۔ اس کا تعجب دن بدن کم ہوتا جاتا ہے۔ اور ہر ایک عجیب و غریب امر کی کوئی نہ کوئی تفسیر اُسے ضرور مل جاتی ہے۔ ایسے ہی اتفاق سے میں نے بھی

ایک ایسا عجیب نظارہ دیکھا جس نے میری عقل کی آنکھوں سے جہالت کے پردے اٹھا دیئے۔ اور فن تصنیف و تالیف کے راز کا انکشاف کر کے میری حیرت کا خاتمہ کر دیا!

گرمی کے موسم میں دوپہر کے وقت مجھے ایک مشہور و معروف لائبریری میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نہایت خاموشی کے ساتھ اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ کبھی کسی الماری میں کتابوں کے نام پڑھتا۔ کبھی میز پر سے کوئی رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کا لطف اٹھاتا۔ اچانک میری نگاہ ایک دروازہ پر پڑی۔ جو ہال کے ایک کونے میں کھلتا تھا۔ یہ بند تھا مگر کبھی کبھی ایک سیاہ پوش اردلی باہر نکلتا۔ اور نہایت تیزی سے الماریوں کے بیچ میں سے گھومتا ہوا دوسرے سرے پر چلا جاتا تھا اس میں کوئی نہ کوئی راز تھا۔ جس نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ اور میں نے اس کا پتہ لگانے کا مصمم ارادہ کر لیا؛

چنانچہ اس خطۂ ظلمات کی سیاحت کرنے کیلئے میں نے اپنے قدم اٹھائے۔ اور دروازے پر جا کر اسے ہاتھ سے دھکیلا دروازہ کھل گیا۔ اور میں نے اپنے آپ کو ایک وسیع کمرے میں کھڑے پایا۔ چاروں طرف مقدس کتابوں سے بھری ہوئی منین الماریاں خاموش کھڑی تھیں۔ الماریوں کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ مشہور و معروف قدیم مصنفین کی تصاویر آویزاں تھیں۔ کمرے کے وسط میں لمبی لمبی میزیں رکھی تھیں۔ اور کئی ایک دُبلے پتلے زرد رو اصحاب کرسیوں پر بیٹھے مطالعہ کتب میں مصروف تھے۔ اس پُر اسرار کمرے میں سناٹے کا عالم تھا۔ اور اسقدر خاموشی تھی کہ صریر کلک بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ یا بعض اوقات جب کوئی مقدس ہستی کسی کتاب کا ورق الٹتی۔ تو ایک چھوٹی سی آہ جو اس کے دل سے نکلتی۔ کانوں تک پہنچ جاتی۔ کبھی کبھی ان ہستیوں میں سے کوئی ایک کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھ دیتی۔ اور ہاتھ کے اشارے سے اردلی کو بلاتی۔ ایک سیاہ پوش آدمی فوراً آتا۔ اور کاغذ لیکر سُرعت کے ساتھ باہر نکل جاتا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کتابوں سے لدا ہوا آتا۔ اور میز پر انبار کے انبار لگا دیتا۔ کرسی نشین آستینیں چڑھا کر ان کو الٹنا پلٹنا شروع کر دیتا مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مجوسی فلاسفر ہیں۔ جو مخفی علوم کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ یہ منظر دیکھکر مجھے الف لیلہ کا ایک قصہ یاد آ گیا جس میں ایک فلاسفر ایک پہاڑ کے اندر ایک سحور لائبریری میں مقید ہے۔ جو سال میں صرف ایک دفعہ کھلتی ہے۔ اور وہ اپنے زورِ علم سے وہاں کی روحوں پر حکومت کرتا ہے۔ جو اس کے لیئے ہر قسم کے جادو کی کتابیں مہیا کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ جب آئندہ سال دروازہ پھر کھلتا ہے۔ تو وہ اسقدر عالم بنکر نکلتا ہے کہ قدرت کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے؛

جب میری حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ تو میں نے ایک اردلی کے کان میں کہا۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ چند الفاظ میری تسکین کیلئے کافی تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو میں مجوسی خیال کرتا تھا۔ وہ مصنف ہیں۔ اور کتابوں کی تصنیف میں مشغول ہیں۔

اس راز سے واقف ہو کر میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اور کتابوں کی تعمیر" کا تماشہ دیکھنے لگا۔ ایک نحیف الجثہ صفراوی مزاج

شخص، کرم خوردہ کتابوں کا انبار سامنے رکھے غالباً کوئی زبردست علمی مسودہ تیار کرنے میں مشغول تھا۔ جو شائع ہوکر ہر شخص کے میز کی زینت کا باعث ہو، ہر لائبریری کی رونق بڑھائے مگر کوئی اسے مطالعہ نہ کرسکے۔

میں نے دیکھا کہ وہ کبھی بسکٹ کا ایک ٹکڑا اپنی جیب سے نکالتا اور دانتوں سے تھوڑا سا کاٹ لیتا۔ ممکن ہے یہ چاشت کا نعم البدل ہو۔ یا اس اشتہا کا دفعیہ جو روکھی پھیکی کتابوں کے مطالعہ سے معدہ میں پیدا ہوجاتی ہے اس کا فیصلہ مطالعہ کے شائقین احباب خود کرسکتے ہیں ؛

ایک چالاک، پست قامت، شوخ مزاج مصنف دوسری طرف بیٹھا تھا۔ اس کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ تاجران کُتب اس کی کتابوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے اسکی حرکات وسکنات کا ملاحظہ کیا۔ وہ ان متفرق کتابوں کی تالیف میں مصروف تھا۔ جو ضرورت زمانہ کے معیار پر پوری اُتریں۔ وہ بڑی تیزی سے اپنے ہاتھوں کو جنبش دیتا۔ کبھی کسی کتاب کے ورق اُلٹتا۔ کبھی کسی کتاب کو کھولتا۔ دو سطریں یہاں سے لکھتا۔ دو وہاں سے نقل کرتا۔ اس کا مسودہ بالکل کباڑی کی دکان کی مانند تھا۔ کہیں نصیحت، کہیں مقولہ، کہیں کچھ، کہیں کچھ۔ میں نے سوچا ممکن ہے یہ "اٹھائی گیرہستی" کسی خاص مقصد کیلئے مصنفین کی صف میں شامل ہوئی ہو۔ ممکن ہے قدرت نے زمانۂ سلف کے علوم کو محفوظ کرنے کے اسباب پیدا کئے ہوں ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت مختلف اجناس کے بیج فصلی پرندوں کے [illegible] میں محفوظ کرکے ایک ملک سے دوسرے ممالک میں پہنچا دیتی ہے۔ اور وہ پرندے جو بظاہر فصلوں اور باغوں کے تباہ کُن دشمن نظر آتے ہیں۔ درحقیقت قدرت کی برکات کو جگہ بہ جگہ بکھیرتے پھرتے ہیں ؛

اسیطرح زمانۂ سلف کے عجیب وغریب خیالات اور علوم ان فصلی مصنفوں کی معرفت زمانہ مستقبل میں جا پڑتے ہیں۔ اور کوئی زرخیز دماغ کسی نہ کسی وقت ان کی مدد سے کوئی عظیم الشان کام کر دکھاتا ہے۔ بہت سی تصانیف تبدیل روح کرکے نئی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تاریخ کہانی میں۔ فسانہ ڈرامہ کی شکل میں۔ فلسفہ علم انشا کی صورت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ تو پھر یہ امر قابل افسوس نہیں کہ متقدمین کی تصانیف بحر فراموشی میں گری جارہی ہیں۔ وہ تو قدرت کے اس اصول پر عمل کر رہی ہیں کہ ہر ایک مادی چیز ایک خاص میعاد کے بعد ضائع ہوجائیگی۔ مگر مادہ کسی نہ کسی شکل میں قائم رہیگا۔ حیوان اور انسان نسلاً بعد نسلٍ تباہ ہوجاتے ہیں۔ مگر اصلی جوہر اولاد میں باقی رہتا ہے۔ اور نسلیں قائم رہتی ہیں۔ اسی طرح ایک مصنف سے دوسرا مصنف پیدا ہوتا ہے۔ اور جب نسل بڑھ جاتی ہے۔ تو متاخرین بھی متقدمین کے ساتھ خواب عدم میں جا سوتے ہیں ؛

یہ سوچتے سوچتے میں کتابوں کے ایک انبار پر سر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ شاید ان کرم خوردہ مسودوں کی بُو باس سے یا کمرے کی خاموشی اور سناٹے کی وجہ سے یا ادھر اُدھر گھومنے کی تکان کے باعث یا وقت بے وقت سوجانے کی عادت سے مجبور ہوکر میں اونگھ گیا۔ مگر میرا تخیل اپنے کام میں لگا رہا۔ اور کمرے کا نقشہ ذرا تبدیل ہوکر میری آنکھوں کے سامنے آگیا

میں نے دیکھا کہ کمرے میں تصویریں بدستور آویزاں ہیں۔ مگر ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ لمبی لمبی میزیں غائب ہیں۔ اور ان مجوسی فلاسفروں کی جگہ عوام الناس کے گروہ کے گروہ ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ جب وہ کسی کتاب کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ تو وہ عجیب فیشن کے لباس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور وہ اسے پہن لیتے ہیں۔ مگر ایک ہی قسم کا لباس زیب تن نہیں کرتے۔ بلکہ کسی کی آستینیں۔ کسی کا دامن۔ کسی کا جبہ۔ کسی کا عمامہ۔ اسی طرح فرد فرد ٹکڑوں سے اپنے جسم کو سجاتے ہیں۔ مگر اصلی چیتھڑے پھر بھی کہیں نہ کہیں ضرور نظر آ جاتے ہیں۔

ایک معمر مولوی صاحب جو توند بڑھائے، عینک لگائے چند ایک ضخیم مسودوں کو گھور رہے تھے۔ ایک موٹی سی جلد کے لبادے پر پھسل پڑے۔ اور دوسرے مصنف کی سفید ڈاڑھی کھسوٹ کر پھر سنبھل گئے۔ ایک دائم المریض شخص ایک دریدہ بوسیدہ غزل کے دامن کی نہری دھاگے سے مرمت کر رہا تھا۔ ایک اور نے ایک شاندار مسودہ میں ترمیم کر کے اپنا لباس اتار لیا۔ اور سینہ پر گلدستہ لگا کر حضرت آزاد کا عمامہ سر پر رکھ کر عجیب انداز سے باہر نکل گیا۔ ایک اور مختصر سا شخص فلسفہ اور منطق کے کرم خوردہ پشتوں سے تکیہ لگا کر بڑی شان سے اکڑ کر بیٹھ گیا۔ مگر اس کے جبہ کو پشت کی طرف بیسیوں پیوند لگے ہوئے تھے۔

چند ایک شریف آدمی اجلے لباس پہنے بھی نظر آئے۔ جنہوں نے دو ایک موتی تلاش کر کے اپنے کپڑوں میں لگا لئے۔ بعض متقدمین کے طرز تلبیس پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ بہت سے محض اپنے جسموں کو پیوندوں سے ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہی نظر آئے۔

یکلخت میری توجہ ایک ضعیف العمر شخص کی طرف منعطف ہوئی۔ جو نیم عریاں لباس پہنے ننگے سر کھانستا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور ایک عربی کتاب کے مسودے کو اٹھا کر بڑے زور سے اپنے سر پر دے مارا۔ پھر مصری جبہ پہن کر چپکے سے باہر نکل گیا۔ اس علمی اور ادبی کارخانے میں اچانک ہر طرف سے چور چور کی صدائیں بلند ہوئیں۔ دیواروں پر کی بیجان تصویریں حرکت میں آ گئیں۔ اور متقدمین ایک ایک کر کے زندہ ہو گئے۔ اور اس گروہ پر جھپٹنے لگے۔ پھر نیچے اتر آئے اور اپنی تصانیف طلب کیں۔ اٹھائی گیرا اور مضامین کے چور مصنف اور مؤلف کتابیں بغلوں میں دبا بھاگنے لگے۔ مگر اصلی مالکوں نے ان کا تعاقب کیا۔ اور سب کے کپڑے اتار لئے اور ان سب کو برہنہ تن کمرے سے باہر نکال دیا۔ ننگے سر والا بوڑھا بھی بھاگا۔ آٹھ دس مصنف اس کے پیچھے بھاگے۔ اور اس کا جبہ اتار کر پھینک دیا۔ وہ اپنے چیتھڑوں کو سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اور میں چونک پڑا۔ کمرہ اپنی اصلی حالت میں تھا۔ زمانہ قدیم کے مصنف دیواروں پر سے جھانک رہے تھے۔ کتابوں کے کیڑے میری طرف گھور رہے تھے۔ لائبریرین میری طرف بڑھا اور کہنے لگا۔ کیا آپ کے پاس لائبریری کا کارڈ ہے؟ پہلے تو میں اس کا مطلب نہ سمجھا۔ پھر میری سمجھ میں آیا کہ یہ لائبریری درحقیقت ایک علمی و ادبی شکار گاہ ہے۔ جہاں لائسنس کے بغیر کوئی شخص شکار نہیں کھیل سکتا۔

میں فوراً باہر نکل آیا۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو اٹھائی گیر مصنفوں کا گروہ مجھ پر پل پڑے۔

عہدِ استوار

(از جناب ظہیر حسن صاحب بی۔ اے الہ آبادی)
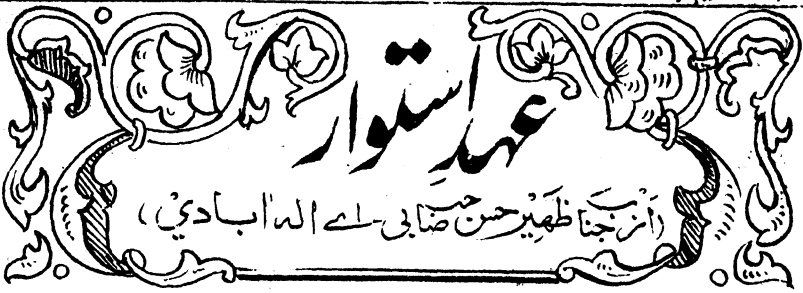
میرا اور جگت کا تعارف ایک عجیب قسم سے ہوا۔ ۱۹۱۶ء کا ذکر ہے۔ جبکہ میں نویں جماعت میں مشن اسکول میں داخل ہوا۔ جگت دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اور نہایت شریر۔ اسکول کے تمام لڑکے اور ماسٹر اس سے نالاں تھے۔ جگت کو ستانے میں ایک خاص مزہ آتا تھا۔ خصوصاً اسکول میں جب کوئی نیا لڑکا داخل ہوتا تو وہ اسکی اتنی بُری درگت کرتا کہ بعض اوقات وہ لڑکا اسکول چھوڑ دیتا۔

میرا جب نیا نیا داخلہ ہوا ہے۔ تو جگت اتفاق سے بیمار تھا۔ چنانچہ مجھے کچھ عرصہ کے لئے اتنی مہلت مل گئی۔ کہ لڑکوں سے میل جول پیدا کر سکوں۔ تاکہ جگت کی شرارت کے وقت میرے بہی خواہ میری ہمدردی کریں — مگر یہ خیال (مجھے ہفتہ بھر بعد معلوم ہوا) غلط نکلا۔ جگت جب صحت پا کر اسکول آیا ہے۔ تو میرے نئے دوستوں نے مجکو چھوڑ کر جگت سے کہنا شروع کیا۔ کہ ایک نیا "جانگلو" پھنسا ہے۔ ذرا خبر لینا۔ جگت کیلئے اتنا اشارہ کافی تھا — شام کو گھر جاتے وقت میری سائیکل کے دونو پہیوں کی ہوا غائب تھی۔ اگلے دن ڈیسک سے جغرافیہ کی کتاب اٹھالیگئی۔ اسیدن شام کو اسکول کے پھاٹک کے نزدیک جگت صاحب معہ اپنے لشکر کے میرے منتظر تھے۔ میں سمجھ تو گیا۔ کہ کوئی نئی شرارت ہونے والی ہے۔ مگر جو کچھ پیش آیا۔ اس کا وہم بھی نہ تھا۔ جیسے ہی میں نے چاہا کہ سائیکل تیز کر کے جلدی سے پھاٹک پار کروں۔ ویسے ہی ایک زور کا جھٹکا لگا۔ جگت نے سامنے سے بہت زور کے ساتھ پھاٹک کو بند کر دیا تھا — پھر مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوا؟

جب میں ہوش میں آیا ...... تو سر اور بائیں پیر میں سخت تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ قریب ہی کرسی پر ڈاکٹر صاحب بیٹھے تھے۔ اور ان کے پیچھے جگت کھڑا تھا۔ اسکو دیکھتے ہی مجھے فوراً تمام واقعات یاد آگئے۔ میں نے نحیف آواز میں جگت سے کہا۔ "کچھ فکر کی بات نہیں چند دن میں اچھا ہو جاؤں گا۔ اور تم کو پھر شرارت کا موقعہ ہاتھ لگے گا۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ بلکہ خود اپنے پر غصہ آتا ہے کہ ابتک تم کو میں اپنا دوست کیوں نہ بنا سکا۔ اپنی کمزوری کی سزا بھگت رہا ہوں۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔ مگر جگت ایک بات کہے دیتا ہوں۔ ایکدن تم تھک جاؤ گے۔ اور مجھے دوستی کرنے پر مجبور ہو گے۔"

خدا معلوم میری بیچارگی دیکھ کر یا میرے الفاظ کا اثر جگت پر ایسا ہوا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں اس کیلئے ہرگز تیار نہ تھا۔ مگر آپ یقین مانیں کہ باوجود جگت کے ستانے کے مجھکو اس سے انسیت تھی۔ اور ہر وقت اسی ادھیڑبن میں رہا کرتا تھا۔ کہ کاش میرے اسکے دوستانہ بلکہ برادرانہ تعلقات پیدا ہوجائیں میں موقعہ کا منتظر تو تھا ہی۔ اس سے بہتر اور کون موقعہ ملتا۔ باوجود سخت کرب و بے چینی کے میں نے اٹھکر جگت کو گلے سے لگالیا "ارے ارے روتے کیوں ہو؟ خدا کی قسم، تمہارا قصور نہیں، آخر میں نے ہی تو سائیکل تیز کردی تھی۔ واہ، یہ بھی کوئی رونے کی بات ہے"

"خدا کیلئے مجھے معاف کرو"

"جگت اس میں معافی کی کیا بات ہے۔ شرارت میں چوٹ چپٹ آ ہی جاتی ہے۔ اچھا خیر معاف کیا......"

"کیا سچ مچ معاف کیا...... ارے دوست شکریہ ..... قسم ہے، اب ایسی تکلیف نہ دونگا"

جھٹکا لگنے سے سر کے زخم کے ٹانکے کھل گئے تھے۔ اور پیر پھر اکڑ گیا تھا۔ اس لئے میں پھر بیہوش ہوگیا۔

میں تقریباً ڈیڑھ ماہ تک صاحب فراش رہا۔ مگر اس عرصہ میں جگت کی حالت بالکل بدل چکی تھی۔ اس سے زیادہ متین و سنجیدہ لڑکا اسکول میں اور کوئی نہ تھا۔ شرارت کافور ہوچکی تھی۔ ماسٹروں اور لڑکوں کو تعجب تھا۔ کہ یہ کایا پلٹ کیسی۔ مگر اسکی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں۔ اور ابتک بھی سوائے میرے اور جگت کے کوئی اس راز سے واقف نہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جگت نے میری کس تندہی سے تیمارداری کی۔ اپنے اوپر کھانا پینا حرام کرلیا۔ اور چوبیس گھنٹہ میری چارپائی سے لگا رہتا۔ صحت کے بعد میرے اور جگت کے کیسے تعلقات تھے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ اسکول والوں کو تعجب تھا کہ یہ دونوں اسقدر گہرے دوست کس طرح بن گئے۔ ہم سے پوچھا بھی گیا۔ مگر دونوں نے کبھی شافی جواب نہ دیا۔ بلکہ ادھر اُدھر کی باتوں میں ٹالدیا ؛

بدقسمتی سے جگت امتحان میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اور ہم کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا ایک اور موقعہ مل گیا چونکہ ہم سبق تھے۔ اسلئے اب تو چوبیس گھنٹہ کا ساتھ تھا۔ صرف سونے کے لئے علیحدہ ہوتے تھے۔ ورنہ ہمہ وقت ساتھ رہتے۔ کھانے پینے میں کوئی پرہیز نہ تھا۔ ہم دونوں کے اعزا خفا بھی ہوتے۔ مگر یہ وہ نشہ نہ تھا جس کو ترشی اُتار دیتی۔ والدین کی خفگی اور عزیز و اقارب کی کشیدگی کا بھی ہم پر اور ہمارے تعلقات پر کوئی اثر نہ پڑا۔ بلکہ ان میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ آخر کار تنگ آکر جگت کے والدین نے اس کے کھانے پینے کے برتن بھی یہ کہکر علیحدہ کردیئے کہ تم ایک مسلمان سے دانت کاٹی روٹی رکھتے ہو۔ اسلئے ہم اپنے آپ کو ناپاک نہیں کرسکتے۔ تمہارے برتن علیحدہ ہیں۔ تم چوکہ میں بھی نہیں آسکتے۔ والدین کے اس فیصلہ سے جگت کو جیسی کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ظاہر ہے۔ مگر واہ رے جگت!

تعلقات بڑھتے ہی گئے۔ اور ہم ایکدوسرے سے زیادہ مانوس ہوتے گئے۔ اکثر ہماری بحث ہندو مسلم تعلقات پر ہوا کرتی بہت کچھ رد و کد کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑتا کہ جب تک ہندو مسلم ایکدوسرے کو بھائی بھائی نہ سمجھیں گے۔ اور چھوت کا مسئلہ ترک نہ کریں گے کبھی ہندوستان کو آزادی نہیں مل سکتی۔ اور نہ کبھی یہ دونوں قومیں بغیر ایک دوسرے کی مدد کے شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکتی ہیں۔ ہمیں اکثر اس بات پر تعجب ہوتا کہ آئے دن ہندو مسلم فسادات کیوں ہوتے رہتے ہیں۔ اور کیوں ہندو مسلمان کے اور مسلمان ہندو کے خون کا پیاسا ہے۔ جگت اور میں ایک طرف ہوتے اور ہمارے احباب دوسری طرف اکثر یہی مبحث ہوتا۔ مگر نہ وہ مانتے اور نہ ہم مانتے۔ نمونہ کے طور پر جگت اپنی اور میری مثال پیش کرتا۔ مگر مخالف پارٹی ہمیشہ اس کو ازراہِ تمسخر ٹھکرا دیتی۔ وہ کہا کرتے تھے "اگر یہ تعلقات ہمیشہ ایسے ہی رہیں تو بیشک مثالیہ ہیں۔ مگر یہ بات ناممکن ہے جب تم دونوں زندگی کے جھگڑوں میں پھنسو گے۔ تو یہ سب بھول جاؤ گے" ان کی ان باتوں سے ہمیں بہت افسوس ہوتا۔ اور یہ عہد بار بار کیا کرتے کہ تعلقات میں فرق نہ آنے دیں گے۔ بلکہ موقع ہوا تو اس سے بھی زیادہ کچھ اور کر کے دکھائینگے۔

جگت نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔ اور میں نے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ جگت اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ چنانچہ اسکو گورکھپور میں اسسٹنٹ سرجن کا عہدہ پیش کیا گیا۔ مگر اُس نے ملازمت کی بہ نسبت مطب کرنا بہتر خیال کیا۔ اس لئے گورکھپور جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے بہت کچھ سر مارا۔ اس کے اعزا و احباب نے سمجھایا۔ مگر وہ بندۂ خدا ٹس سے مس نہ ہوا۔ میرے بار بار اصرار پر اُس نے کہا "ظفر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تم سب مجھے مجبور کیوں کرتے ہو۔ کہ میں پابندی کی زندگی بسر کروں"۔

"بے شک ملازمت سے پابندی تو ہو جاتی ہے۔ مگر پوزیشن بھی تو کوئی چیز ہے۔ کچھ عرصہ بعد سول سرجن ہو جاؤ گے سرکار میں، لوگوں کی نظروں میں کتنا وقار اور مرتبہ بڑھے گا۔ قوم اور ملک کو فائدہ پہنچا سکو گے۔۔۔۔۔"

جگت نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ سب کچھ صحیح ہے مگر مجھ سے اوّل تو پابندی نہیں ہو سکتی دوسرے یہ کہ تم سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔ امید ہے تم اب زیادہ زور نہ دو گے"۔

یہ ایسا قاطع جواب تھا کہ مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔

چنانچہ دونوں نے بریلی ہی میں پریکٹس شروع کی۔ اور خدا کے فضل سے خوب چمکے اور معقول آمدنی ہونے لگی۔ شہر سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا بنگلہ کرایہ پر لیلیا۔ اور ہم دونوں وہاں رہنے لگے۔ دن کیسے لطف سے گزرتے تھے۔ مگر اب ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

خدا کی قدرت ہے کہ بیویاں بھی ہمارے ہم خیال ہی ملیں۔ جس سے لطفِ زندگی و صحبت دوبالا ہو گیا۔ موہنی اور

زاہدہ بہت جلد آپس میں گھل مل گئیں اور حقیقی معنوں میں ایک جان دو قالب تھیں۔

ہمارے عزیزوں نے ہم سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا۔ مگر ہمیں اپنی دھن میں کسی کی پروا نہ تھی۔ اور اپنی ناؤ کو ہندو مسلم جھگڑوں کے طوفان سے بچاتے ہوئے نہایت کامیابی سے کھیتے چلے جا رہے تھے۔ کہ فلک تفرقہ انداز نے اس بساط مودت و محبت کو درہم برہم کر دیا۔

شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ اور جگت کے ایک لڑکا پریم اس دوران میں ہو چکا تھا۔ نہایت حسین و ذہین۔ اس کی بھولی بھالی باتوں نے ہم سب کے دل موہ لئے تھے۔ زاہدہ کی آنکھوں کا تو وہ تارا تھا۔ موہنی کو زاہدہ کی اولاد کا بڑا ارمان تھا، اور اکثر وہ چھیڑا کرتی تھی جس پر زاہدہ شرما کر اس کے مارنے کو دوڑتی۔ اور پریم کو گود میں اٹھا کر کہتی۔ میری اولاد تو یہ ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب چاروں طرف سے ہندو مسلم فسادات کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ کوئی قریہ، کوئی شہر ایسا نہ تھا۔ جہاں پر فرقہ وارانہ لہر نہ دوڑ رہی ہو۔ ہم یہ سب قصے اخباروں میں دیکھتے اور ہندوستان کی حالت پر افسوس کرتے، زاہدہ اور موہنی بھی کڑھا کرتیں مگر وہاں تو سر پر خون کا بھوت چڑھا تھا۔ جو بغیر اپنی پیاس بجھائے نہ اتر سکتا تھا۔ پھر بھلا بریلی کب محفوظ رہ سکتی تھی۔

زاہدہ امید سے تھی۔ دن قریب تھے۔ کہ یکایک بریلی میں بھی ایک زبردست فساد ہو گیا۔ قضیہ اسطرح شروع ہوا کہ ایک محلہ میں کچھ مسلمان لڑکے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ اتفاقاً ایک ہندو کا جو ادھر سے گذر ہوا۔ لڑکوں کو اپنے کھیل میں کیا دھیان تھا۔ ایک لڑکے نے جو گلی پھینکی تو ہندو راہگیر کے پاؤں میں لگی۔ اس نے بڑھ کے ایک چانٹا رسید کیا اور کہا "کیوں بے اد یکھ کے نہیں کھیلتا"۔ پاس ہی ایک مسلمان جا رہا تھا۔ اس نے کہا "کیوں لالہ جی! بچے کو مارتے شرم نہیں آتی" اور یہ کہہ ایک لاٹھی اسکی پیٹھ پر جمائی۔ اتفاق سے اسی وقت دو تین ہندو سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ انہیں دیکھتے ہی وہ ہندو چلایا "دھائی ہے مسلمانوں نے مار دیا۔ دوڑیو"۔ یہ سننا تھا کہ وہ تینوں نوجوان بھاگے۔ اور آتے ہی مسلمان کی لاٹھی چھین اسے مارنا شروع کیا۔ محلہ مسلمانوں کا تھا۔ غل شور جو مچا۔ تو لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے اور اپنے بھائی کو جو پٹتے دیکھا۔ تو جھٹ دوڑے اور ہندوؤں سے دست و گریباں ہو گئے۔ ہندوؤں نے دیکھا کہ اب تو برے پھنسے فوراً چپکے سے انمیں سے ایک شخص مسلمانوں کی آنکھ بچا پاس کے بازار میں دوڑ گیا۔ جس میں زیادہ تر ہندو دکاندار تھے اور بدحواس ہو کر چیخنے لگا۔ کہ جلدی مدد کو دوڑو۔ پاس کے محلہ میں مسلمانوں نے بہت سے ہندوؤں کو پکڑ رکھا ہے۔ کچھ کو جان سے مار ڈالا ہے۔ اور کچھ کو مار رہے ہیں۔ اب کیا تھا۔ گھڑی بھر میں ٹھٹ کے ٹھٹ ہندوؤں اور مسلمانوں کے محلہ میں جمع ہو گئے اور وہ لٹھ بازی ہوئی کہ تھوڑی ہی دیر میں بیس پچیس آدمی زمین پر لوٹ رہے تھے۔ یہ خبر بجلی کی طرح سے سارے شہر میں پھیل گئی۔ ادھر محلہ میں مسلمانوں نے ہندوؤں کو اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو مارنا کوٹنا اور لوٹنا شروع کیا۔ پولیس کافی موجود نہ تھی۔ جو فساد کا انسداد کرتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا شہر میدان کارزار بن گیا۔ مسلمان ہندو کے خون کے پیاسے ہو گئے

اور ہندو مسلمانوں کے جانی دشمن بن گئے۔ جہاں جسے جو ملگیا۔ اُس نے اُسے بغیر جان سے مارے ... نہیں چھوڑا۔ غرض ایک قیامت کا سین تھا۔ جو اپنی خون آشامی کے ساتھ ساری بریلی پر چھا رہا تھا۔

قسمت کا لکھا یوں پورا ہوتا ہے۔ اسی دوران میں زاہدہ کے دردِ زہ شروع ہؤا۔ لیڈی ڈاکٹر کا بنگلہ سامنے ہی تھا اسکو بلا لیا گیا۔ بدقت تمام دوسرے دن لڑکی پیدا ہوئی۔ مگر زاہدہ جو پہلے ہی کمزور تھی۔ اس بار کو برداشت نہ کر سکی۔ اور باوجود جگت، اور لیڈی ڈاکٹر کی انتہائی کوشش کے شام تک اسکی روح فردوسِ بریں میں آرام کے لئے چلی گئی۔ میرا صدمہ قابلِ بیان نہیں مگر موہنی کی حالت دیکھکر میں اپنا غم بھول گیا۔ موہنی زاہدہ کے غم میں قریب المرگ ہوگئی۔ مفرح اور مقوی انجکشن دیئے گئے۔ تھوڑی بہت حالت سنبھلی۔ جگت نے نوزائیدہ کو (جو بالکل ماں کی شکل پر تھی) موہنی کی گود میں یہ کہکر ڈالدیا۔ کہ یہ زاہدہ کی امانت ہے۔ اگر تم کو زاہدہ سے محبت تھی۔ تو اسکی امانت کی حفاظت کرو۔ موہنی جگت کی شکل دیکھتی ہی اسکے بعد ایکدم بچی کو لپٹا لیا۔ اور آنسوؤں کی نہریں اسکی دونوں آنکھوں سے جاری ہوگئیں۔ "ہاں میں اس بچی کے لئے ——— اپنی زاہدہ کی بچی کے لئے جیونگی۔ یہ میرے لئے زاہدہ ہے۔ میں اسکی خدمت کرونگی۔ بچی، میری بچی" خوب زور سے لپٹا لیا۔ اور پیار کرنے لگی۔

بدقت تمام زاہدہ کی تجہیز و تکفین کیگئی۔ ایسی افراتفری میں آدمی کا ملنا مشکل تھا۔ جسطرح بھی ہوسکا۔ رات کے ۱۲ بجے سے پیشتر پیشتر زاہدہ کو سپردِ خاک کردیا گیا۔

بچی کے دودھ کا مسئلہ ایسا تھا کہ کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جھگڑے فساد کی وجہ سے بازار جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ کہ "سیلنس فوڈ" لایا جاتے۔ بغیر بازار جائے بھی کچھ چارہ نہ تھا۔ بہت بحث کے بعد یہ طے ہؤا کہ جگت موٹر پر جائیں۔ اور سیلنس فوڈ لے آئیں۔ بازار جانا جان جوکھم کا کام تھا۔ میں نے بہت کچھ کہا کہ مجکو جانے دو یہ میرا فرض ہے۔ اگر میں ختم بھی کردیا جاؤں۔ تو سوائے اس نوزائیدہ کے اور کون ہے جو میرا غم کرے گا۔ مگر جگت نے میرے سب دلائل ایک "نہیں، ہرگز نہیں" کے آگے ٹھکرا دیئے اور جلدی سے موٹر نکالکر بازار کی طرف روانہ ہوگیا۔

ہم دونوں اسکے سلامتی کے ساتھ واپس آنے کی دعا مانگ رہے تھے۔ کہ سامنے سے موٹر آتا ہؤا دکھائی دیا۔ ہم خوش ہوگئے کہ جگت میاں خیر و عافیت سے واپس آگئے۔ مگر آہ! کسے خبر تھی، کہ دوسرے لمحے میں کیا ہونے والا ہے؟ موٹر آن کر کھڑی ہوئی۔ تو معاً ایک چیخ کی آواز نے ہم سب کو حواس باختہ کردیا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ تو موٹر کے قریب ہی ایک بدبخت جگت کو زمین پر ڈالے خنجر سے اس کا کام تمام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خبر نہیں کمبخت کہاں چھپا کھڑا تھا۔ اور جگت سے اسکی کب کی دشمنی تھی۔ جیسے ہی موٹر آن کر کھڑی ہوئی اور جگت اس میں سے اُترا قاتل فوراً جھپٹا۔ اور اس پر حملہ کردیا۔ میں یہ دیکھتے ہی نیچے بھاگا۔ نوکروں کو آواز دی۔ قاتل نے بھاگنے کی کوشش کی دو ایک نوکروں کو زخمی بھی کیا۔ مگر نوکروں نے بڑی ہمت سے کام لیکر اُسے گرفتار کرلیا۔ اور خنجر اس کے ہاتھ سے

چھین لیا۔نیم بسمل جگت کو میں اٹھوا کر اندر لایا۔

زخم کاری تھا۔اور جان بر ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔تھوڑی دیر بعد جگت کو ہوش آیا۔موہنی اب تک بیہوش تھی۔جگت کے بتانے پر میں نے موہنی کو ایک شیشی سنگھائی۔تھوڑی دیر بعد وہ بھی ہوش میں تھی۔جگت نے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلایا اور نہایت نحیف آواز میں کہا "موہنی میں اب جاتا ہوں۔وہاں جہاں موت کا گذر نہیں۔تم کو افسوس ضرور ہوگا۔مگر انسان پیدا ہوا ہے مرنے کیلئے۔فرق صرف وقت کا ہے۔کوئی آج کوئی کل......ہونٹ خشک ہوئے جاتے ہیں۔تھوڑا پانی دو......کل تم زاہدہ کو رو رہی تھیں۔اور آج ہمارا ماتم کروگی۔مگر میں خوش ہوں۔کہ میں نے دکھا دیا۔کہ ہندو مسلمان کیسے شیر و شکر ہو سکتے ہیں۔ظفر موجود ہیں۔جو ہر طرح تمہارا خیال رکھیں گے.........پانی دو.........دیکھو زیادہ افسوس نہ کرنا۔مرنا سب کو ہے.....؟

میں نے چاہا۔کہ کمرے سے تھوڑی دیر کیلئے چلا جاؤں۔مگر جگت نے اشارے سے روک لیا۔مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "ظفر خدا کا شکر ہے۔کہ ہمارے مخالفین کے خیالات غلط ثابت ہوئے۔ہم ایکدوسرے کے ویسے ہی رفیق رہے جیسے تھے۔شاید میری اس قربانی سے ہندوستان والے جاگ اٹھیں۔اور ہمارا مشن کامیاب ہو جائے۔گو کہ یہ اُمید موہوم سی ہے۔مگر ایک وقت آئیگا۔جب ہمارا ملک اس ضرورت کو محسوس کریگا.........پانی.........

میں اب مرتا ہوں۔مگر دیکھو ہمارے بچوں میں بھی ایسے ہی تعلقات ہونے چاہئیں۔جو ہم دونوں کے رہے.......موہنی اور قریب آؤ اور محبت کی ——— ابدی محبت کی ——— آخری مہر لگا دو" اچھا ظفر رخصت۔موہنی اور جگت کے لب باہم وصل تھے۔کہ جگت نے اس دارالمحن کو خیرباد کہا۔موہنی بیہوش ہو چکی تھی۔

شہر میں امن تھا۔مگر میرے دل میں امن نہ تھا۔دو عزیز ترین ہستیوں کو کھو چکا تھا۔موہنی کو چپ لگ گئی تھی جگت کی موت سے اس کو ایسا صدمہ ہوا تھا۔کہ جب سے ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالا تھا۔یہ حالت تشویشناک تھی۔ایک روز میں نے پریم اور شاہدہ کو اسکی گود میں لاکر ڈال دیا۔پہلے تو وہ چپ چاپ بیٹھی دیکھتی رہی۔مگر آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔بادلوں نے گھر کر آنا شروع کیا۔اور پھوہار پڑتے پڑتے جھڑی لگ گئی۔اسوقت اس سے بولنا مصلحت آمیز نہ تھا۔میں چپکا کھڑا دیکھتا رہا۔آخرکار اس نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"بھائی!" میں نے کہا "بہن موہنی"

ہم دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔دنیا ہمارے متعلق کیا خیال کرتی ہے۔ہمیں کچھ پرواہ نہیں۔موہنی گھر کا کام میری سپردگی میں رکھتی ہے۔پریم اور شاہدہ دونوں اسکول جاتے ہیں۔دونوں کو ایک دوسرے سے بے حد محبت ہے۔

میں نے اور موہنی نے جگت اور زاہدہ کی یادگاریں پریم اور شاہدہ کو منسوب کر دیا ہے۔ ایک طوفان بپا ہؤا جب یہ خبر مشہور ہوئی میرے والدین اس کو ناقابلِ عفو جرم سمجھتے ہیں۔ اور ہر طرف سے طعن و تشنیع موہنی کے اور میرے حصہ میں آتے ہیں مگر ہندوستان کو ہم دکھا دینگے۔ کہ بغیر ملاپ اور ہندو مسلم اتفاق کے آزادی، ترقی، بہتری کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتی ؛

(ظہیر بی اے)
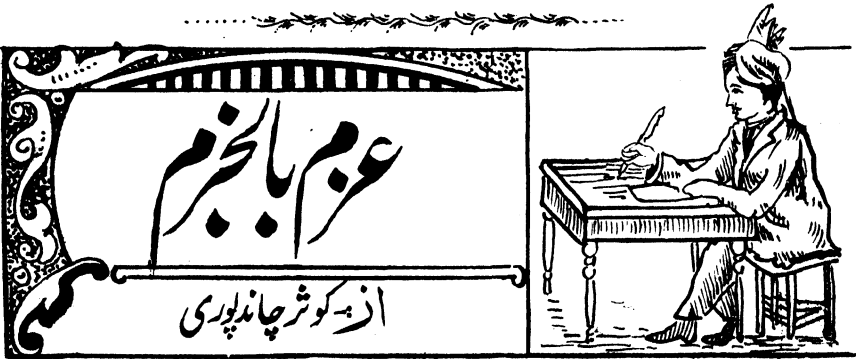
(۱)

اختر کا خاندان اکبرآباد میں علم و فضل اور زہد و اتقا کے اعتبار سے نہایت مشہور تھا۔ اس کے آبا و اجداد علاوہ بلند پایہ عالم و فاضل ہونے کے زبردست طبیب بھی تھے۔ اس کے والد حکیم ہاشم علی کا علمی تبحران کی حذاقت و تشخیص ضرب المثل تھی۔ دستِ شفا بھی خدا نے ایسا دیا تھا۔ کہ جس مریض کی نبض پر وہ ہاتھ رکھدیتے۔ گویا اسکی صحت و تندرستی کی ضمانت ہو جاتی۔ کیسا ہی پیچیدہ اور پرانا مرض ہو۔ کتنا ہی نازک اور مایوس مریض ہو۔ ان کے دارالشفا سے کبھی نامراد واپس نہ ہوتا تھا۔ ہمدردی، ایثار، خوش خلقی و شگفتہ مزاجی نے ان کے فنی کمالات کو اور بلند کر دیا تھا۔ وہ مریضوں کے ساتھ بہت ہی ہمدردانہ سلوک کرتے، اپنے ظریفانہ طرزِ گفتگو سے ان کی طبیعت کو خوش کرتے۔ اور غریب مریضوں کو بغیر فیس کے انکے گھر جاکر دیکھتے ؛

ایک دن کوئی پردیسی ان کے مطب میں حاضر ہؤا۔ قارورے کی شیشی ہاتھ میں تھی۔ شیشی کاہے کو تھی۔ اچھا خاصا گلاس تھا۔ وہ حکیم صاحب کے دیوان خانہ میں آتے ہی حیران ہوگیا۔ ہر طرف مریضوں کا ہجوم تھا۔ حکیم صاحب سر جھکائے ایک تخت پر بیٹھے تھے۔ ضرورتمندوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ہر شخص ہاتھ بڑھائے ہوئے کوشش کر رہا تھا۔ کہ پہلے حکیم صاحب اسکی نبض دیکھ لیں۔ یہ غریب پردیسی تھا۔ قارورہ لیکر پشت کی جانب پہنچ گیا۔ اور ایک مرتبہ موقعہ ملنے پر اس نے قارورے کا گلاس بڑھایا۔ اسی درمیان میں کسی دوسرے آدمی نے ہاتھ بڑھاکر گلاس کو ہٹایا۔ اتفاق سے گلاس ذرا ٹیڑھا ہوگیا۔ اور حکیم صاحب کے کپڑے تر ہوگئے۔ مگر ان کی پیشانی پر شکن نہ آیا۔ وہ فوراً اٹھ

کر زنانخانہ میں گئے۔ غسل کیا۔ کپڑے تبدیل کئے، اور باہر آکر پردیسی کو اپنے قریب تخت پر بٹھایا۔ مفصل حالات دریافت کئے، اور بڑے غور سے نسخہ تجویز کر کے اسکو دیا ؛

ان کے اس اخلاق ہی کا اعجاز تھا کہ شہر اور اطرافِ شہر کے غریب اور امیر بلالحاظ مذہب و ملت انکے آستانہ کمال پر حاضر ہوتے۔ اور صحت و تندرستی کی دولت سے مالامال ہو کر واپس جاتے۔

اختر حکیم ہاشم علی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس پر وہ جسقدر التفات بھی کرتے کم تھا۔ چنانچہ ابتدا ہی سے انہوں نے اختر کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا۔ اختر حسنِ سیرت و صورت کے ساتھ ایک اچھے دماغ کا مالک تھا۔ اسکی دماغی قوتیں تعلیم کے اثرات کو بہت جلد قبول کرتی تھیں۔ اختر نے جلد ہی کافی استعداد پیدا کر لی، اردو، فارسی، اور عربی تو گھر پر ہی اس کو پڑھا دیگئی۔ انگریزی اسکول میں وہ حاصل کرتا رہا۔ غرض بیس بائیس سال کی عمر میں جب شباب کی پر جوش طاقتیں اسکی رگوں میں تڑپ پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے مروجہ علوم میں خاصی قابلیت پیدا کر لی۔ اگرچہ حکیم ہاشم علی اس کے متعلق طے کر چکے تھے۔ کہ وہ اختر کو ایک اچھا طبیب بنائیں گے۔ تاہم ابتک جو کچھ کیا گیا تھا۔ وہ اس کے ذہن و دماغ کی جلا کرنے کیلئے تھا۔ ورنہ اصل مقصد کی راہ میں ابھی کوئی عملی قدم نہ اٹھایا گیا تھا۔

حکیم ہاشم علی رفتہ رفتہ عمر کے اس حصہ میں پہنچتے جا رہے تھے۔ جسمیں پہنچکر طبیب تو بوڑھا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا فن جوانی کی پہلی منزل میں داخل ہوتا ہے۔ ان کی طویل اور سفید داڑھی۔ ستا ہوا نورانی چہرہ، اور چہرے کی جھریاں بتا رہی تھیں۔ کہ انہیں اب ایسے سرمدی سکون کی ضرورت ہے۔ جو دنیوی علائق سے نکال کر انہیں ایسی جگہ پہنچا دے۔ جو انسانی آبادی اور اس کے مشاغل کی دسترس سے باہر ہو۔ انہیں خود بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہیں گے۔ اپنے مطب کی مسند پر وہ جس شخص کو جلوہ گر دیکھنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے، کہ وہ اختر ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن اختر کا یہ حال تھا۔ کہ ابھی وہ "ہوالشافی" کی طبیبانہ کشش، اور اس کے فلسفہ سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اگر ہندوستان کے قدیم دستور کے مطابق کسی ممتاز اور حاذق طبیب کی اولاد کیلئے تحصیلِ علمی کی ضرورت نہیں ہے۔ آبائی شہرت اور خاندانی "لال بیاض" جس کے اوراق کرمخوردہ ہو چکے ہوں۔ کامیابی کیلئے کافی ہیں۔ لیکن حکیم ہاشم علی ایسا با اصول اور باکمال انسان کب گوارا کر سکتا تھا۔ کہ اس کا بیٹا اور وہ بیٹا جس کی قابلیت کے خواب وہ عمر بھر دیکھتے رہے تھے محض ان کی گرمیٔ مطب اور ناموری پر اعتماد کر کے مخلوقِ خدا کو کند چھری سے ذبح کرتا رہے۔ چنانچہ انہوں نے اختر کو لکھنؤ بھیجدیا۔ تاکہ وہ وہاں پہنچکر جھوائی ٹولہ کے یگانۂ روزگار اطباء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے ان کے علمی دسترخوان سے زلہ ربائی کرے ؛

(۲)

اختر کو لکھنؤ آئے ہوئے ابھی پورے چھ مہینے بھی نہ ہوئے تھے، کہ حکیم ہاشم علی پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور ان کے

کمزور اعصاب اس حملہ کی مدافعت نہ کر سکے۔ اختر کو اس حادثہ کی اطلاع تار سے دیگئی۔ وہ فوراً اکبر آباد آیا۔ اور یہاں آ کر کچھ ایسے واقعات پیش آئے۔ کہ وہ پھر لکھنؤ نہ جا سکا۔ اختر کی والدہ زندہ تھیں۔ انہیں گوارا نہ ہوا۔ کہ شوہر کی دائمی مفارقت کے بعد بیٹے کو ایک لمحہ کیلئے بھی جُدا کریں۔ انہوں نے اختر سے کہا کہ تم اب تک جو کچھ پڑھ چکے ہو رہی بہت ہے آرام سے گھر بیٹھو۔ اور تمہارے باپ نے جو سرمایہ چھوڑا ہے۔ خدا پر بھروسہ کر کے اسی کو صرف کرو۔

اختر اتنا کم سمجھ تو نہ تھا کہ وُہ اس حکم کی قباحت کو نہ سمجھ سکتا۔ لیکن اول تو غمزدہ ماں کا اصرار تھا۔ پھر باپ کی ناگہانی اور غیر متوقع موت نے اس کے حواس پر بھی خاص اثر کیا تھا۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ اسوقت ماں کی آغوشِ محبت سے الگ ہو۔

اکبر آباد میں حکیم ہاشم علی کے سانحہ ارتحال کو بہت شدّت کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ عرصہ تک یہاں کی فضا رسے سوگواری اور ہواسے بیقراری نمایاں رہی لیکن ہر زخم کی تکلیف کے ساتھ اندمال کی سکون آمیز راحت اور ہر مصیبت کے بعد آرام و اطمینان کی مسرت بخش توقع اگر شامل نہ ہو۔ تو انسانی زندگی تاریکی اور مستقل خاموشی میں تبدیل ہو جائے، اسی لیئے نوحۂ غم کی ہر صدائے دلکش کے بعد فضا میں ایک نغمۂ شادی کا بلند ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ دوسرے اطبا نے حکیم ہاشم علی کی جگہ کو پُر کر دیا۔ مگر دیہات کے معتقدین نے ان کے دروازے کو نہ چھوڑا۔ روزانہ دس بیس مریض دور دراز کی مسافت طے کر کے آتے۔ اور جب حکیم ہاشم علی کے مطب کو خالی پاتے۔ تو وہ اختر سے التجا کرتے کہ ان کے حالات سنکر انہیں دوا بتا دے۔

اختر بہت پہلو تہی کرتا۔ مگر گاؤں کے لوگ نہایت عقیدتمند ہوتے ہیں۔ وہ کسی طرح نہ مانتے۔ آخر مجبور ہو کر اختر کو محض ان کی تشفی خاطر کی غرض سے کچھ نہ کچھ تجویز کرنا پڑتا۔

ایک دن کسی دیہاتی نے اختر کی ڈیوڑھی میں آ کر آواز دی "حکیم جی! حکیم جی!!"

آواز بہت زیادہ پست اور درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ تیر بنکر اختر کے سینہ پر لگی۔ اور کھانا چھوڑ کر فوراً باہر آیا۔ دیہاتی نے کہا "حکیم جی کہاں ہیں، بڑے حکیم جی"!

"بھائی وہ تو اللہ کے یہاں سدھارے۔ تم اپنا مطلب بیان کرو۔ اختر نے غمگین اور محبت آمیز لہجہ میں کہا:

"کیا حکیم جی مرگئے! ارے رام! دیہاتی نے تعجب اور حیرت سے کہا"!

اختر کے پاس اسکا کوئی جواب نہ تھا۔ مگر اسکی آنکھوں نے آنسوؤں کے چند قطروں سے دیہاتی کے خیال کی تصدیق کی۔ وہ دیر تک مغموم صورت بنائے رہا۔ آخر اس نے کہا۔ "پھر تم ہی دوا بتا دو۔"

"میں نے حکمت نہیں پڑھی۔ کوئی تکلیف ہو، تو کسی حکیم کے پاس چلے جاؤ۔" اختر نے جواب دیا۔

"تمہارے باپ دادا نے تو پڑھی تھی حکمت! پھر تمہیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے حکیم کے بیٹے حکیم ہی ہوتے ہیں۔"

اختر پر ایک طویل سکوت طاری تھا۔ دیہاتی نے پھر کہا "نا بیٹا! ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ حکیم جی کی چوکھٹ نہیں چھوڑی۔ اب مرتے وقت ہمیں کیوں اپنے دروازے سے بھگاتے ہو؟"

"پھر کیا ہو گا۔ مجبوری کے وقت سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہ واپس نہیں آسکتے۔" اختر نے جواب دیا۔

"ہاں، وہ تو نہیں لوٹ سکتے۔ مگر ہم بھی اس گھر کو چھوڑ کر دوسری جگہ نہیں جاسکتے۔ دیکھو، ہماری ناڑی (نبض) مہینہ بھر سے بخار نے جنبش نہیں کھائی۔ سر میں الگ درد ہے۔ ایسی دوا بتاؤ، جو گھڑی گھڑی عطار کے نہ جانا پڑے۔ ایک دو نسخوں ہی میں اچھے ہو جائیں۔" دیہاتی نے اختر کو مجبور کرتے ہوئے کہا۔

"دوا کون بتائے؟ بھائی کوئی معمولی شکایت ہوتی۔ تو ممکن تھا کہ میں نسخہ لکھ دیتا۔ نبض دیکھنا میں نہیں جانتا۔ ایسے بخار کی دوا ابھی مجھے یاد نہیں۔ بہتر ہے تم کسی حکیم کو اپنی نبض دکھاؤ۔" اختر نے اظہارِ واقعہ کے طور پر کہا۔

"اجی حکیم کیا نبض دیکھے گا۔ ہم گادی کو پوجنے والے ہیں۔ تم تو ہاتھ دیکھو اور پرچہ لکھ دو۔ دیہاتی نے اتمامِ حجت کرتے ہوئے کہا۔

اختر نے اس کے اصرار سے مجبور ہو کر نبض پر ہاتھ رکھا۔ سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔ مگر مریض خود کہہ رہا تھا۔ کہ ایک مہینہ سے بخار ہے۔ اسلئے زیادہ سمجھنے کی نہ اسے ضرورت تھی۔ اور نہ اسکی اہلیت اس میں تھی۔ اس نے ایک پرچہ پر دو چار دوائیں لکھکر نسخہ اس کے حوالہ کر دیا۔

اختر نے لکھنے کو تو نسخہ لکھ دیا۔ مگر اس کا ضمیر دیر سے اسے ملامت کرتا رہا۔ اس نے اپنے اندر ایک زبردست کمی کا احساس کیا۔ اختر نے اپنے دل سے سوال کیا کہ ایک باکمال باپ کے بیٹے کو کیسا ہونا چاہئے؟

دل نے "مُرغِ اسیر" کی طرح اختر کی پسلیوں کے پنجرے میں تڑپ کر اس کے حواسِ باطنی کے کانوں میں کہا۔ باکمال اسلاف کے اخلاف کو ہی انکی امانتِ علم و فن کا حامل ہونا چاہئے!

اختر کے دماغ اور اس کے جذبات پر ایک انفعال طاری ہوا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ہاشم علی حکیم تھے، نہ صرف حکیم بلکہ حکیم حاذق۔ انہیں کی ذاتِ گرامی کا فیض ہے کہ لوگ میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے معمولی پرچے کو صحیفۂ آسمانی اور پیامِ شفا سمجھکر قبول کر لیتے ہیں۔ شہر میں بڑے بڑے زندہ طبیب موجود ہیں۔ مگر ایک مُردے کا اعجاز اور روحانی تصرف دیکھو کہ انکی موجودگی میں دردمند مجھ ایسے نالائق انسان کو حکیم ہاشم علی کا بیٹا سمجھکر اپنی موت و حیات کے اہم مسئلہ کو میرے سپرد کر دیتے ہیں اور میری دیانت پر افسوس ہے کہ میں اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہوں۔ جسکی اہلیت مجھ میں نہیں۔ اور یہ جسارت میں صرف اس بھروسہ پر کرتا ہوں۔ کہ حکیم ہاشم علی کا بیٹا ہوں۔

میرے باپ نے نقد سرمایہ میرے لئے جمع کیا — معقول جائداد چھوڑی — اور پھر ایک ایسا اثر ایسا نقش چھوڑا۔ جس نے زبردستی مجھے اربابِ کمال کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مگر کیا میں نے بھی اپنی آئندہ نسل کیلئے کوئی

انتظام کیا ہے؟ کیا میں بھی اپنے فرزندوں کے واسطے کوئی ایسی روشنی چھوڑ سکتا ہوں۔ جو انکی جہل کی تاریکی پر غالب آ سکے۔ میں ایسی کوئی یادگار چھوڑنے کی جگہ تھوڑے دنوں میں اس عزت کو بھی قلوب سے محو کر دوں گا۔ جو میرے باپ نے میرے لئے چھوڑی ہے۔

وہ انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا اپنی ماں کے پاس گیا۔ اور نہایت سنجیدہ انداز میں کہا۔

" اماں! کیا آپ چاہتی ہیں۔ کہ میرے باپ نے اپنی اور اپنے اسلاف کی کوششوں سے پیدا کی ہوئی جو عزت مجھے دی ہے۔ میں اسے بالکل تباہ کر ڈالوں۔ اور انکی نسل میں اسکو باقی نہ رکھوں"!

" کیا کہتے ہو اختر! میں نہیں سمجھی تمہاری بات" اسکی بوڑھی ماں نے ذرا حیرت سے کہا۔

" میں یہ کہتا ہوں کہ میرے باپ نے عزت و عقیدت کا جو بیج بویا تھا۔ وہ انہیں کی زندگی میں نشو ونما پا کر ایک مضبوط درخت بن گیا تھا۔ کیا میں اس درخت کو کاٹ ڈالوں" اختر نے جواب دیا۔

" تم معمول میں گفتگو کرنے کے عادی ہو۔ کیا لکھ پڑھکر آدمی اتنا بیوقوف ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے دل کی بات صاف طور پر ظاہر نہیں کر سکتا۔ میں صرف اردو جانتی ہوں اور تم میرے سامنے فارسی میں باتیں کرتے ہو" اسکی والدہ نے تجاہل عارفانہ کے طور پر کہا۔

" اماں! میں اردو ہی میں بول رہا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ابا نے شہر میں جو اثر چھوڑا ہے۔ میں اسے باقی رکھوں یا مٹا دوں"

" نالائق کہیں کا، مٹا کیوں دے۔ بھلا باپ دادا کے اعزاز کو مٹایا جاتا ہے"،

" ہاں سعادتمند اولاد کا یہی فرض ہے، کہ وہ اپنے خاندان کی شاندار روایات کو برقرار رکھے۔ مگر عورتوں کو بھی چاہیئے کہ وہ ایسے سپوت پیدا کریں۔ جو اسلاف کی بزرگی کے صحیح امانت دار ہوں۔ آپ نے مجھے لکھنؤ جانے سے روک دیا۔ والد کو انتقال کئے ہوئے آج دو سال ہو گئے، اگر میں پڑھتا رہتا۔ تو اب تک نہ معلوم کیا ہو جاتا۔ روزانہ بیسیوں مریض میرے پاس آتے ہیں۔ اور میرا یہ حال ہے کہ میں اس فن سے بالکل ناواقف ہوں۔ میں زیادہ عرصہ تک مخلوق کو دھوکہ دینا نہیں چاہتا۔ یا تو مجھے لکھنؤ یا دہلی جانے کی اجازت دیجئے۔ تاکہ میں اپنے آبائی علم کو حاصل کر سکوں۔ اگر یہ نہیں، تو پھر میں کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا۔ جہاں میرا تعارف صرف "اختر" کے مختصر نام سے ہوگا۔ اور کسی کو میرے خاندانی اعزاز کا حال معلوم نہ ہو"

ماں "میں تمہیں پڑھنے سے نہیں روکتی۔ اگر تمہارا یہ منشا ہے کہ باپ کی جگہ بیٹھکر کام کرو۔ تو میری عین خوشی ہو مگر میں نے تمہاری شادی کی بات پختہ کر لی ہے۔ عید کے چاند میں اس کام سے فارغ ہو جاؤنگی۔ پھر تمہیں اختیار ہے۔ دہلی جاؤ یا لکھنؤ۔ میں بالکل نہ روکونگی"

اختر۔ اماں! یہ تو بتایئے کہ آپ کو لائق بیٹے کی شادی میں لطف آئیگا۔ یا نالائق فرزند کی!

ماں۔ میرے لئے لائق اور نالائق دونوں برابر ہیں۔

اختر۔ مگر میں تو نہیں چاہتا۔ کہ میں کوئی لیاقت حاصل کئے بغیر شادی کروں۔

ماں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ تم شادی سے پہلے دہلی چلے جاؤ، میں جو جھوٹی ہو جاؤنگی۔

اختر۔ جھوٹی ہونیکی کیا بات ہے۔ آپ سال دو سال کے لئے اس کام کو ملتوی بھی کر سکتی ہیں۔ اور جب میں ہی تیار نہ ہوں گا۔ تو آپ شادی کس کی کرینگی۔

اختر کی اس بات پر اسکی والدہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ انہوں نے تیز نگاہوں سے اختر کو دیکھتے ہوئے تند لہجہ میں کہا "کیا تو میری نافرمانی پر آمادہ ہے"؟

"نافرمانی نہیں کرتا۔ لیکن آپ کے سامنے طفلانہ ضد ضرور کروں گا"

(۴)

اختر اکبر آباد سے روانہ ہو کر سیدھا دہلی پہنچا۔ یہاں حاذق الملک اوّل حکیم عبدالمجید مسندِ درس پر جلوہ فرما تھے۔ اور شریف منزل مرجع انام بنی ہوئی تھی۔ ان کے حلقہ درس میں ایسے ایسے یکتائے زمانہ تلامذہ موجود تھے۔ جو مکتب سے نکل کر آفتاب و ماہتاب بنکر چمکے۔

اختر مسجد فتحپوری کے ایک چھوٹے سے حجرے میں قیام پذیر ہُوا۔ اب اُسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ دہلی ٹھہر جائے یا لکھنؤ کا قصد کرے۔ وہ روزانہ حکیم عبدالمجید خاں کے مطب میں حاضر ہوتا رہا۔ اور ان کے طور و طریق سے اس نے اندازہ لگا لیا۔ کہ اس دریا کے کنارے اتنے بلند نہیں ہیں۔ کہ پیاسے کو پانی تک پہنچنے کے لئے زیادہ دشواری پیش آئے۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ مجھے رختِ سفر کھولدینا چاہیئے؛

اختر نے پڑھنا شروع کر دیا۔ پہلے پہلے تو اسے بہت الجھن ہوئی۔ خصوصاً تنہائی نے حد درجہ پریشان کیا۔ پھر بازار کی سخت روٹی اور بدمزہ ترکاری کھانے کا وہ عادی نہ تھا۔ غربت کی تکالیف سے دوچار ہونیکا بھی پہلا ہی موقعہ تھا مگر یہ باتیں ایسی اہم نہ تھیں۔ کہ اسکی ہمت و استقلال میں تزلزل پیدا ہوتا۔ وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ محنت اور ارادہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں۔ جن سے دنیا کی ہر مہم آسانی سے فتح کی جا سکتی ہے۔ اور "عزم بالجزم" کی قوت سے پہاڑ کو بھی ہلایا جا سکتا ہے وہ ان مشکلات کا صبر و سکون سے مقابلہ کرتا رہا۔ اگرچہ "ضبط و شکیب" کا یہ امتحان بہت سخت تھا۔ خصوصاً اس شخص کے لئے۔ جس کے جذبۂ عمل میں بالکل پہلی مرتبہ تحریک پیدا ہوئی ہو ـــــ لیکن اختر کو اپنی کوششوں پر اعتماد تھا۔ اس کا دل یاس و قنوط کی افسردگی سے دُور اور عزم و حوصلہ کی گرمی سے معمور تھا۔ وہ آرزوؤں کی ایک دُنیا تعمیر کر رہا تھا۔ ایسی دُنیا جسمیں ہر چیز اسکی مرضی کے مطابق ہو ـــــ! اختر ارادہ کا پکا، دل کا مضبوط اور بات کا دھنی تھا، اس نے جو

ارادہ کیا تھا۔ دلمیں جو منصوبہ باندھا تھا، اور منہ سے جو بات کہی تھی۔ اس کے خلاف وہ نہ کر سکتا تھا۔

اختر ایک سال تک پوری توجہ کے ساتھ اپنے نصاب تعلیم کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس عرصہ میں بہت سے خارجی محرکات سے اُسے دوچار ہونا پڑا۔ اوّل تو والدہ کی خفگی، خیر اس کے متعلق تو اُسے اطمینان تھا، کہ یہ قائم رہنے والی چیز نہیں ہے۔ ماں کا دل اتنا نرم ہوتا ہے۔ کہ وہ اولاد پر آنچ آتے ہی پگھل جاتا ہے۔ مگر سب سے بڑی دشواری یہ پیش آئی۔ کہ اکبر آباد کے ایک بدمعاملہ مہاجن نے حکیم ہاشم علی کے رقعہ کی بنا پر پچاس ہزار کی نالش کر دی۔ اختر کی والدہ کو یقین تھا، کہ حکیم ہاشم علی کا کوئی رقعہ مہاجن کے یہاں نہیں ہو سکتا۔ یقیناً جعل کیا گیا ہے جو عدالت میں پہنچکر کھل جائیگا۔ اسی وثوق پر وہ مقدمہ کی پیروی میں مصروف رہیں۔ اور دل کھولکر روپیہ صرف کرتی رہیں۔ رقعہ کو شناخت کی غرض سے ماہرانِ فنِ تحریر کے پاس بھیجا گیا۔ دستخط پہچانے گئے، غرض مہاجن نے دستاویزی ثبوت پیش کرکے واضح کر دیا۔ کہ دعویٰ بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ اگرچہ رقعہ کو اتنے عرصہ تک چھپائے رکھنا مہاجن کی بدمعاملگی پر دلالت کرتا تھا۔ لیکن اسکی صحت قطعی تھی۔ چنانچہ اصل رقم میں مصارف شامل کرنے کے بعد ستر ہزار کی ڈگری ہوئی۔

نقد روپیہ مقدمہ کی پیروی میں صرف ہوچکا تھا۔ جو کچھ باقی تھا۔ وہ اتنا نہ تھا کہ اس سے اتنا بڑا قرض ادا کیا جا سکتا۔ آخر مکانات اور جائیداد کے نیلام کی نوبت آئی۔

اختر کی والدہ کو سکونتی مکان اور کل جائیداد سے بیدخل کر دیا گیا۔ اور جس عورت نے ہمیشہ محلوں میں زندگی بسر کی تھی۔ اب اسکے رہنے کو جھونپڑی بھی میسر نہ تھی؛

یہ حادثہ اسقدر حوصلہ شکن تھا کہ پہاڑ بھی ہوتا تو اپنی جگہ سے ہل جاتا۔ لیکن اختر کی پیشانی پر بل بھی نہ پڑا۔ وہ اکبر آباد گیا اور اپنی والدہ کو لیکر پھر دہلی چلا آیا؛

(۴)

چاند اور سورج گردش کرتے رہے، آفتاب کا طلوع و غروب صبح و شام کی تخلیق میں مصروف رہا۔ اور ماہتاب کی پُرسکون روشنی دماغوں کو پیامِ راحت پہنچاتی رہی۔ دن کی ہنگامہ نوازیاں، اور رات کی سکینت زائیاں دلوں کو دعوتِ عمل اور آنکھوں کو اذنِ تماشا دیتی رہیں۔ لیکن اختر دُنیا کی ہر چیز سے بے نیاز، عالم کی ہر کشش سے محفوظ اور کائنات کی ہر دلفریبی سے دامن کش ہوکر اپنی منزل پر پہنچنے کی سعی کرتا رہا۔

وہ راستہ کے روح فرسا اور ہیبت ناک مناظر سے متاثر ہوئے بغیر قطعِ مسافت میں مشغول رہا۔ اور رفتہ رفتہ ایسے مقام پر پہنچگیا۔ جہاں "چراغِ منزل" کی روشنی کو اسکی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اور "دیارِ دوست" کا جاں نواز سواد پوری دلربائیوں کے ساتھ اسے اپنی طرف بلا رہا تھا، اختر چار سال کی مسلسل دماغی کاوش، اور

مصروفیت کے بعد کامیاب ہوا۔ اکابرِ شہر کے ایک بڑے مجمع میں اسکی قابلیت کا اعتراف کیا گیا۔ اور سند کے علاوہ سونے کا تمغہ بھی اسے دیا گیا۔ وہ نہایت خوش تھا اور اسکی بوڑھی اور مصیبت زدہ ماں بھی مسرور تھی۔ اب وہ ایک میدان کو اپنی کوشش کے پیروں سے رَوند چکا تھا۔ لیکن ابھی ایک میدان یعنی "عرصۂ عمل" اور باقی تھا۔ جسمیں وہ بہت جلد قدم رکھنے والا تھا۔

اختر اگرچہ طالب علمی کی پستی سے نکلکر کامیابی و فائز المرامی کی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ مگر وہ اپنے فرائض کی نزاکت، کام کی دشواری اور موانع کی اہمیت سے غافل نہ تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ ہاشم علی اس کے لئے ایک ایسی ہموار سطح چھوڑ گئے تھے جسمیں تخم ریزی کرنے کی غرض سے زیادہ محنت درکار نہ تھی۔ لیکن چھ سات سال کی مدت حالات بدلنے کیلئے کچھ کم نہ تھی۔ چھ سال تو رہے الگ ایک ہی سال میں وہ امیر سے غریب اور متمول سے مفلس بن چکا تھا۔ پھر پانچ سال کے حوصلہ آزما انقلابات نے کیا کمی اٹھا رکھی ہوگی تاہم جس پیکرِ ہمت و استقلال نے اپنی سعیِ مشکور کی قوتوں سے ایک زبردست فتح حاصل کی تھی۔ وہ ان موانع کو کیا دل میں لاسکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اختر کی جیب روپیہ سے خالی تھی۔ مگر اس کا دل ولولۂ کار سے لبریز تھا۔ وہ بڑھنے اور حرکت کرنے کا عادی تھا، سکون اور فالج نما بے حسی سے اسکو نفرت تھی۔ اس کے اعصاب میں روحِ عمل اور دماغ میں جذبۂ تحریک موجود تھا۔ چنانچہ وہ اکبرآباد آیا۔ اور فوراً کام شروع کرنے کی غرض سے اپنے ایک عزیز کے معمولی مکان میں ٹھہر گیا۔ یہاں کی دُنیا بدل چکی تھی۔ حالات نے نئی روش اختیار کر لی تھی۔ جس شہر کی گلیاں حکیم ہاشم علی کی شفابخش تنویر سے منور تھیں۔ اب وہاں سینکڑوں چراغ جل رہے تھے۔ تاہم اخترِ ہمتِ مردانہ پر کار فرما ہوا۔ اور مستقبل کو اپنے ہاتھ میں لینے کی پر جوش تمنا میں اس نے عمل کا پہلا قدم اٹھایا۔

انسان کا دل اگر محض ترقی کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اور دنیا کے جھوٹے اقتدار و سطوت کی اُسے تلاش نہیں ہوتی تو اسمیں شک نہیں کہ قدرت کی کرشمہ سازیاں بھی اس کا ساتھ دیتی ہیں اور سرابِ راہ کی فریب کاریاں اسے سعیٔ ارتقاء سے باز نہیں رکھ سکتیں۔

اختر نے خدمتِ خلق۔ انسانی ہمدردی، اور ایثار و کسرِ نفسی کو اپنا رہبر بنایا۔ اور علم کی جو شمع اسکے سینہ میں روشن تھی۔ اس سے راستہ کی ناہمواریوں کا احساس کیا۔ اول اول مریض انکی طرف کم متوجہ ہوتے۔ مگر اس نے مریضوں کو تلاش نہیں کیا۔ بلکہ ان اسباب پر نظر ڈالی جو اس کے مطب کی سرد بازاری کے اصل ذمہ دار تھے۔ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ دنیا کے فراموش کار دماغوں میں ہاشم علی کے کارناموں کی یاد باقی نہیں ہے۔ یا اگر ہے تو حافظہ انکی یاد دہانی میں بخل سے کام لے رہا ہے، ضرورت ہے اس امر کی کہ رات کی خاموش فضاؤں میں اپنی دلدوز کراہ سے انتشار پیدا کرنیوالے مریضوں کے کانوں میں یہ آواز پہنچائی جائے۔ کہ حکیم ہاشم علی کا نوجوان فرزند، ان کی تمام علمی و عملی امانتوں کا تنہا وارث ہے اختر چار سال کے شبانہ روز انہماک کے بعد اپنے آبائی فن کے "شاہدِ گم گشتہ کو شریف منزل کے حریمِ ناز" سے ڈھونڈ لایا ہے۔ اور حکیم ہاشم علی کا چشمۂ فیض خشک نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے سوت اختر کے سینے سے پھوٹ نکلے ہیں۔

اس خبر کا عام ہونا تھا کہ حافظہ نے اپنے دروازے کھول دیئے اور اکبرآباد و مضافات اکبرآباد کے باشندوں کو یاد آ گیا۔ کہ حکیم ہاشم علی کا بیٹا اختر بے خانماں ہو کر شہر سے نکل گیا تھا۔ اور اس کا اسطرح سے واپس آنا یقیناً" ایک لطیفۂ غیبی ہے۔

مریضوں کی رجوعات بڑھی۔ اور اتنی بڑھی کہ اختر کو دم لینے کی مہلت بھی نہ ملتی تھی۔ اختر نے اپنی ہمت سے زیادہ کام کیا اور صبح کے ۷ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک برابر مریضوں کی خدمت اور دیکھ بھال میں مشغول رہتا۔

طمع اسمیں نام کو نہ تھی۔ اسلئے غریب اور امیر میں امتیاز نہ کرتا تھا۔ مریضوں کو بھی اس کے یہاں جانے میں اس بات کا لحاظ نہ ہوتا تھا۔ کہ اگر ہم متمول ہیں تو اختر کی توجہ کو خرید سکیں گے یا اگر غریب ہیں تو اس کے التفات سے محروم رہ جائیں گے۔

(۵)

اختر کا مطب اسقدر وسیع ہو گیا کہ وہ تنہا کام نہ کر سکا۔ اس نے اپنی امداد کیلئے دو اور طبیبوں کو ملازم رکھ لیا۔ اور چونکہ شہر کے عطار خالص ادویہ کی فروخت کے عادی نہ تھے۔ اسلئے اس نے معمولی سے سرمایہ سے ایک دواخانہ کی بنیاد بھی ڈال دی۔ جہاں سے ذی استطاعت لوگوں کو قیمتاً اور غربا کو مفت دوا دیجاتی تھی۔ یہ دواخانہ اختر کی سرپرستی اور ایک ہوشیار طبیب کی نگرانی میں دیانت و امانت سے مریضوں کی ضروریات پوری کرتا رہا۔ صحیح اجزا سے مرکبات کی تیاری اور کم منافع پر ان کی فروخت اسکا خاص اصول تھا۔ جو مرکبات تیاری کے دوران میں یا عرصہ تک رکھے رہنے سے خراب ہو جاتے تھے۔ وہ دواخانہ کے منتظم اعلیٰ کی موجودگی میں ضائع کر دیئے جاتے تھے۔

یہ خصوصیات ایسی نہ تھیں کہ دواخانہ حکیم ہاشم علی کو ہندوستان بھر کے دواخانوں پر تفوق حاصل نہ ہوتا۔ چنانچہ بہت جلد اسکی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔ اور بیرونجات کے مریض ضرورت کے وقت یہیں سے دوائیں منگانے لگے۔ رفتہ رفتہ اختر کے قایم کئے ہوئے دواخانہ کو اسقدر فروغ ہوا کہ کرایہ کے مکانات اسکی وسعت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور اختر کو شہر سے دو میل کے فاصلہ پر جمنا کے کنارے ایک پرفضا مقام پر دواخانہ کے لئے بڑی بڑی عمارات تیار کرانے کی ضرورت پڑی۔ تین سال کے عرصہ میں کئی لاکھ روپیہ کے صرف سے "دواخانہ حکیم ہاشم علی" کی عمارات پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ اور ہندوستان کے ایک مشہور والی ریاست نے اس کا افتتاح کیا۔

اختر اکبرآباد میں سب سے زیادہ ذی عزت اور متمول شخص ہے شہر میں اسکے بڑے بڑے مکانات ہیں۔ اگرچہ اسکی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی ان ترقیوں کو دیکھنے کیلئے زندہ نہیں۔ تاہم اسکی روح مسرور ہے۔ کہ اختر نے ایسے خیراتی ادارے بھی قایم کر دیئے ہیں۔ جو غربا کی امداد، بیوگان کی اعانت اور یتامیٰ کی تعلیم و تربیت کا وسیع پیمانے پر انتظام کرتے ہیں۔

آج سے چوتھائی صدی پہلے جس شخص کے مکانات نیلام کئے گئے تھے۔ اور جسکی بڈھی ماں ایک میلا برقع اوڑھکر اپنے سکونتی مکان سے نکلی تھی۔ آج وہی اختر ہزاروں لاکھوں قلوب پر حکومت کر رہا ہے۔ اور "دارالسکون" کے نام سے اسکی ماں کے مقبرے پر ایک عالیشان عمارت قایم ہے جسمیں دونوں وقت ہزاروں اپاہج۔ معذور اور غریب انسانوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جاتا ہے۔

(کوثر چاندپوری)

خستہ

(فکر منشی کالکا پرشاد صاحب شاکر بریلوی برغزل منشی سکھ دیو پرشاد سنہا صاحب بسمل الہ آبادی
ہر دو شاگردان تاج الشعراحضرت نوح ناروی مدظلہ)

ناز پر انداز پر غمزے پر اترانے کے بعد — اقربا و دوست و مونس کے سمجھانے کے بعد
خود تڑپ اٹھے بہت کچھ مجھ کو تڑپانے کے بعد — کہتے ہیں دل تھام کر وہ میرے مرجانے کے بعد
ہو گا کیا دیوانہ کوئی ایسے دیوانے کے بعد

زندگی میں رنج اٹھائے مر کے بھی دیکھے ملال — ہر کمالے را زوالے ہر زوالے را کمال
کیا مروت کیا محبت کیا تصور کیا خیال — کون ہوتا ہے دلِ افسردہ کا پرسانِ حال
پھول کی خوشبو بھی چل دیتی ہے مرجھانے کے بعد

تیرے رکنے کا ٹھہرنے کا سبب کھلتا نہیں — خاک اڑانے کیلئے کیا اب کوئی صحرا نہیں
ہم یہی کہتے رہیں گے تجھ کو یہ زیبا نہیں — بیٹھ رہنا تھک کے اے جوشِ جنوں اچھا نہیں
دوسرا ویرانہ دیکھیں ایک ویرانے کے بعد

بڑھ گئی جوشِ جنوں میں کس قدر توقیرِ دشت — دشت کی مٹی بھی اڑ کر بن گئی اکس[illegible]
کھنچتے کھنچتے کھنچ گئی سو رنگ سے تصویرِ دشت — قیس کے بعد مجھکو [illegible]
دیکھئے اب کون پائے میرے مرجا[illegible]

رنج و غم سب دل سے نا اہل ہونگے اے پیرِ مغاں — یعنی عاشق ہ[illegible]
میکدے کے در پہ سائل ہونگے اے پیرِ مغاں — ہم تری بخش[illegible]

دوسرا پیمانہ بھی دے ایک پیمانے کے بعد

گفتگو اچھی بری فوراً جسگہ پاتی نہیں تھک گئے کہہ کہہ کے اُن کی پیش کچھ جاتی نہیں
کچھ بھی ہو تقریر اُن کی راہ پر لاتی نہیں حضرتِ ناصح سے کوئی بات بن آتی نہیں

دل کو بھی سمجھاتے ہیں وہ میرے سمجھانے کے بعد

پارسائی کو فدا توبہ کو صدقے کیجیے دوش پُر خم رکھیے ساغر ہاتھ میں اب لیجیے
ابر اٹھا موسمِ گل آگیا مے پیجیے حضرتِ ناصح یونہیں بکتے ہیں بکنے دیجیے

دل یہ سمجھاتا ہے مجھ کو اُن کے سمجھانے کے بعد

جو ہوئیں سب وہ جفائیں یاد آئیں گی تمھیں جو مجھے دیں وہ سزائیں یاد آئیں گی تمھیں
بعد میں پھر یہ دعائیں یاد آئیں گی تمھیں دیکھ لینا یہ وفائیں یاد آئیں گی تمھیں

قدر میری ہو گی تم کو میرے مرجانے کے بعد

ہو لیا سکنے کا عالم بدحواسی چھا گئی ظلم میں لذت جو تھی اس کو طبیعت پا گئی
قتل کہہ کی بات اے شاکر مجھے یاد آ گئی یہ ادا بھی میرے قاتل کی قیامت ڈھا گئی

دیکھنا مُڑ مُڑ کے بسمل کو وہ تڑپانے کے بعد

معشوقۂ من کیست؟

از:- مسٹر خورسند بہادر سیاح ایم اے ایم او ایل -

روزے در اطاقِ مکتب آنجا کہ دیگر اساتذہ برائے استراحت نشستہ بودند - من ہم بہ صندلی چوبین متمکن بودم - اساتذہ مابینِ خودشاں شوخی و استہزا مے کردند - بالآخر روئے سخن بہ من آوردند یکے از ایشان بدیگر مخاطب شدہ درباب من گفت "نمے دانم کہ خورسند چرا ہر روز زرد رُو - لاغر و لطیف شدہ می رود - ببیں! ببیں!! خونش خشک شدہ فقط استخوانش بہ نظر مے آید - نمے دانم ایں ضعف و ناتوانی برائے چیست" ہر یکے تمسخر مے نمود و ریشخند مے کرد کہ البتہ کدام معشوقہ بنگاہ دارد - دیگر ہا متفق و متحد الرائے شدہ مے خندید و مے گفت - بلے بلے ہمیں طور است من باایں حرف ہائے تمسخر و مضحکہ آمیز ہیچ التفات نہ نمودم و نہ گوش دادم - وقتیکہ ایشاں در جوابِ ایں حرف ہائے دلپذیر ہیچ کلمہ از دہانِ من نہ شنیدند بدل تبسم - ایشاں قاہ قاہ خندیدہ گفتند - اے یاران! ایں حرف ہائے پُرلطفِ ما خوششں آمد - چراکہ او مے خندد و صبر کند - حالا در بابِ معشوقۂ خود چیزے مے گوید - بالآخر ناچار شدہ لب ہا جنبانیدم - زبان کشادم و گفتم " اے رفیقانِ مشفق! شما شوخی و نانہ مے کنید - من بیزار نشستہ ام - برائے خدا شما مرا آزار نہ دہید - بر نیدپس کارِ خودتاں - زیراکہ بے آزار را آزار دادن ثمرۂ خوب ندارد" یکے از ایشان بامتانت و لہجۂ نصیحت آمیز بہ گفتن آغاز نہاد - اے یار! اس دُنیائے دوں چند روزہ است - آخر ہر کس از اینجا کوس رحلت خواہد کوفت - باید کہ بخندی و با راحت زندگانی بسر کنی و غنیمت دانی کہ امروز ما چندکس یک جا نشستہ ایم - فردا مارا نمے بینی - دیگرے بہ شوخی بر کتفِ من دستِ خود گذاشتہ مرا جنبانید و گفت - تا وقتیکہ تو معشوقۂ خودش را نشان نمے دہی - من مثلِ سایہ پسِ تو مے مانم - دیدم کہ سخت گیر افتادہ ام و دیگر حرف ہائے من بدردِ شاں نمے خورد - بجہت ہمیں بہ ایشاں عہد کردہ گفتم کہ بلے بہ شما محبوبۂ خود را کہ موجبِ ناتوانی - زردرُوئی و ضعفِ من است - نشان مے دہم - لاکن شما بکسے نہ گوئید - چراکہ معشوقہ داشتن برائے معلم کہ بچہ ہا را درس مے دہد - بدتر است - ایشاں راضی شدند و برائے شنیدنِ احوالِ معشوقۂ من ہمہ تن گوش شدہ بسوئے من ملتفت گشتند -

اے یارانِ غار! من از عرصۂ دو سال یکے معشوقہ نگاہ دارم - او از ایران است - وقتیکہ من در فارس رفتہ بودم آنجا من با او دوچار شدم - ہمیں کہ من بر عارضِ گلگوں و عذارِ پُر نورش نگاہ کردم - دلِ ناشادم در دامِ زلفش مثلِ صید افتاد - و ......

ہزار ہمان سرش فریفتہ شد۔ من او را دیدہ تبسم کردم۔ او نیز چناں کرد۔ من خواستم کہ با او حرف بزنم۔ و راز ہائے پنہانی خاطرِ دلگیر را کشف کنم و عقدہ ہائے بستہ دلِ پُر ملال خود باو وا نمایم۔ لاکن زبان من با دلم متفق و یک جہت نہ شد۔ ناچار شدہ خاموش ماندم۔ آخر او رفت بہ خانۂ خود۔ من ہم مایوس شدہ بہ جائے خویش آمدم۔ لاکن تصور رسش در دلم جاگزیں شد۔ وقتیکہ من روئے فرش نشستم۔ میزبان بہ پہلوئے من جا گرفت و مرا ملول و الم ناک دیدہ بآوازِ نرم پُرسید کہ اے مہمانِ عزیز ! موجبِ ایں رنج و ملال چیست ؟ مرا بگوئید تا من او را از شما دور بکنم۔ معلوم مے شود کہ ایں ملک خوش تاں نیامد۔ من ایں الفاظِ دلجمعی او را شنفتہ عرض نمودم کہ ہیچ ملالے نیست ہمیں طور چیزے فکر مے زنم۔ آخر شب بوقتِ خواب بر فرشِ مکلف پائے خود را برائے استراحت دراز کشیدم و سعئ بلیغ نمودم کہ بخسپم۔ امّا خواب مرا نہ بُرد۔ در اختر شماری و پہلو عوض کردن شب گذاشتم و تا صبح مہ پیشانہ دیدہ برہم نہ دوختم۔ بامداداں چوں سر از بالیں برداشتم۔ باز رفتم سرِ چہار سُو برائے دیدنِ دلربا۔ آخر او را میانِ اجتماعِ کثیر و جمِ غفیر بہ صد زیبائی و رعنائی جلوہ گری و دلربائی دیدم۔ تا دیر بہ جمالش نگراں بُودم۔ تا اینکہ او ہم بنگاہِ دزدیدہ دید۔ از زیرِ رُو بند عشوہ و کرشمہائے چند اظہار کردہ و تبسم نمودہ از پیشِ من گذشت۔ تا مدتِ دو ماہ مسلسل ہر روز ہمیں طور سے کردم۔ بالآخر معشوقۂ ایرانی مرا با استقلال ثابت قدم و صادق الفعل دیدہ پیشِ من آمد و دستِ مرا گرفتہ بہ خانۂ خود بُرد۔ من باحترامِ تمام داخلِ اُطاق شدم۔ اُطاق را دیدم آراستہ و پیراستہ۔ قالین و غالیچہ ہائے نفیس گستردہ و پردہ ہائے حریر آویزاں بُود۔ او برائے نشستن با دست اشارت کرد و علی الرّؤس مرا گفت کہ من شما را بہ ہر طور آزمودم و فہمیدم کہ تو مرا بہزار جان مے خواہی۔ بجہت ہمیں شما را مے گویم کہ بمطابق رسم و رواجِ ملکِ ایران با من متعہ بکن۔ ہرچہ مدت کہ تو اینجا مے مانی بہ عیش زندگانی بسر کُن۔ باز از روئے خود پردہ برداشت و گفت۔ کہ تو شاہ ہستی۔ من کنیز تو ام [illegible]۔ در کنار رنگ کشیدن و ناچ کردن ہماں چشم زخم دُور۔ من با دلم و او با من مائل بود۔ بعد ازاں ایں قدر با من اُلفت گرفت کہ ہر جائیکہ رفتم۔ او کنیز وار در خدمتِ من موجود بُود۔ او بوقتِ مراجعت در ہندوستان لطوع و رغبت و بہ اجازۂ دولتِ رضا خانی ہمراہ من آمد و من بمطابقِ رسوماتِ دینی بہ عقدِ ازدواج آوردم۔ بعد ازاں ما مثلِ زناشوئی در یک جا ماندیم۔

معشوقۂ من خیلے وفا کیش است۔ و خوئے نیکو دارد۔ با اینکہ افلاس تنگدستی و فلک زدگی روئے نمودہ بود۔ ہیچ پُول ہم نداشتم۔ لاکن معشوقہ مشفقہ مرا خجل نہ کرد۔ و نہ سوئے صاحب تموّل و ثروت نگاہ بالا کردہ دید۔ روزے او مرا گفت کہ من ایرانی نژاد ہستم۔ مثلِ زنِ پنجابی نیستم کہ در غیبتِ تو ترا ترک کردہ بہ کدام متموّل بچسپم۔ لاکن چیزے است کہ تو ہر وقت مرا با دلِ خود داشتہ باش۔ اگر نام خدا پنج کرتے مے گیری مرا ہر لمحہ و ہر ثانیہ فراموش مکن۔ من سرِ تسلیم خم کردہ گفتم بچشم۔ بعد از چندے حالتِ من مبدّل گشت۔ در مکتبے معلّم مامور شدہ بودم۔ مبلغ شصت روپیہ مواجب ماہوار مے گرفتم۔ اما ہمہ صرف ہمی شد۔ اگرچہ معشوقۂ باوفا بود۔ لاکن بر آرائش و زیبائش دلدادہ شد۔ گاہے برائے خوشنودئ

او از لندن (ملکِ فرنگ) چیزہا مے خریدم۔ گاہے از ایران۔ برائے خدمت و امدادش ملازم ہم نگاہ داشتم بالآخر ازیں صرفِ مصارفِ گزاف مقروض شدم۔ لاکن با ایں ہمہ ما مثلِ شیر و شکر و یک جان دو قالب شدم۔

معلّمین مکتب وقتیکہ ایں سخنہائے پُرلطف شنیدند۔ آتشِ اشتیاقِ شاں برائے دیدنِ معشوقۂ من مشتعل و شعلہ زن گشت۔ و بہ انکسار و فروتنی التماس نمودند۔ کہ مارا بالضرور نشان بدہ۔ من گفتم۔ از شما چہ پنہاں۔ او حاملہ است و در دِ زِہ دارد۔ ازیں رو در شفاخانہ برائے معالجہ و مداوا فرستادہ شدہ است۔ من برایش خیلے متشوش و مغموم مے مانم و دلم بیتاب و مضطرب مے باشد۔ دریں اثنا از شفاخانہ کسے آمد و آگاہ کرد کہ امروز یا فردا بچہ تولد خواہد شد۔ من بہ اساتذہ وعدۂ فردا برائے رفتن در شفاخانہ دادم۔ ایشاں ہمگی رفتند۔ پس کارِ خود۔ من تنہا ماندم۔ در تخلیہ با خضوع و خشوع برائے تولدِ فرزند دُعا کردم۔ و اشک ہائے تو بہ از چشمانم ریختم۔ زیرا کہ در سالِ گذشتہ اسقاطِ حمل شدہ بُود۔ روز دیگر بوقتِ چاشت اساتذہ بخیالِ دیدار آمدند۔ من ہمراہ شاں بہ درِ شفاخانہ رفتم۔ لاکن آنجا کسے را نے گذاشتند کہ اندرون برود۔ نہ من برائے داخل اُطاق شُدن جسارت کردم۔ بیرونِ شفاخانہ تا دیر انتظار کشیدم۔ لاکن از اندرون خبر رسید کہ شما از اینجا بروید۔ در خانۂ شما را اطلاع دادہ میشود۔ بالآخر ما ہمگی نا اُمید پس آمدیم۔ ہمیں کہ بہ جائے خود رسیدیم۔ مردے دوان دوان عقبِ من آمدہ مُژدہ داد و گفت۔ مبارک باشد کہ بہ سعادتِ بخت و نیروئے اقبال خدائے آفریدگار ترا پسر کرامت فرمودہ دارزانی داشتہ است۔ از نویدِ ایں ولادت چہرۂ من شگفت و من بسبب خوشی و مسرت دست زدن و رقصیدن گرفتم۔ چوں رفیقانِ من شنیدند بسرعتِ تمام آمدند و مبارک باد دادند و گفتند کہ بخت تُرا یاوری کرد بعض از اساتذہ حظ کردند و بعض از حیرت دہاں باز ماندند۔ بچہ ہائے مکتب گل و گلدستہ ہا آوردند۔ و ضیافت پُرتکلف دادند۔

اساتذہ برائے دیدنِ معشوقۂ و فالیش خیلے بے شکیب شدند و اصرار کردند و نہ خواستند کہ بدونِ دیدنش باز در خانہ خود شاں بروند۔ من عرض نمودم کہ چرا اینقدر تعجیل مے کنید؟ با صبر و شکیب اینجا بنشینید۔ من شما را نشاں مے دہم کہ معشوقۂ من کیست؟ آناں ہمہ تن گوش شدہ عنانِ توجہ بہ من کردند و شرحِ حالِ معشوقۂ خود بدینگونہ شروع نمودم

معشوقۂ ایرانی نژاد مراد از زبانِ فارسی است۔ از دلربائی۔ زیبائی۔ جلوہ گری و رعنائی مراد شیرینی است کہ در زبانِ فارسی مے باشد۔ تا دو ماہ خاموش ماندن و حرف نہ زدن با معشوقہ مراد ازیں است کہ اوّل اول وقتیکہ در ایران رفتم۔ در زبانِ فارسی برائے حرف زدن زبانم نے گشت۔ از متعہ مراد عرصۂ قلیل کہ در ایران بودم و از زبانِ فارسی حظ کردم۔ از زنِ پنجابی مطلب زبانِ پنجابی است۔ کہ زود از یادم رفت و بمشکل حرف زدن مے توانستم۔ چیزہائے نفیس از لندن و ایران خریدم۔ مدعائش ہمین است کہ از لندن و ایران کتب ہائے فارسی کہنہ و متداولہ خریدم۔ مراد از نوکراں و ملازماں کتب و فرہنگ ترجمہ و شرح است کہ ممدِ فہمیدن کُتب درسی بُود۔ از لفظِ حاملہ مراد امتحان ایم اے است کہ آنکہ من نشستم۔ شفاخانۂ ادارۂ تعلیم است از انجا کہ نتائجِ امتحان مے برآید۔ از اسقاطِ حمل مراد ایں است کہ من در سالِ

گذشتہ در امتحان ناکام ماندم۔ از ولادت پسر مراد نتیجہ کامیابی است۔ وقتیکہ ایشاں حلیہ و احوال معشوقۂ من شنیدند انگشت بدنداں مراتحسین و آفریں نمودند و دانستند کہ معشوقۂ من کیست؟ برائے آنکہ من اینقدر لاغر۔ ناتواں و نحیف شدہ بودم ؎

(خورسند بہادر)

پیامِ اتحاد

[از جناب شنکر سروپ مفتوں شکوہ آبادی تلمیذ فصیح العصر ناخدائے سخن تاج الشعرا حضرت نوح ناروی]

احکام اتحاد سے ہے نامِ اتحاد
جاری ہوں ملک ملک میں احکام اتحاد

دیکھے تو کوئی اونچی جگہ سے جہاں کی سیر
پہنچے تو کوئی اڑ کے سرِ بامِ اتحاد

گردن جھکائے پھرتے ہیں جنگل میں غول غول
آہوئے رم سرشت بھی ہیں رامِ اتحاد

میں حسنِ اتفاق کو با دستخط کہوں!
رکتی نہیں ہے روکے سے صمصامِ اتحاد

شاہ و گدا کی اس میں نہیں کچھ خصوصیت
ہے خاص و عام پر نظرِ عامِ اتحاد

آغازِ اتفاق سے معلوم ہو گیا
دل چسپ و دل پسند ہی انجامِ اتحاد

ملتا ہے دل سے دل کہ یہ ملتی ہے دادِ عیش
مسرور وہ ہوں پائیں جو انعامِ اتحاد

ہر صبحِ لطفِ صبحِ بنارس پہ خندہ زن
شامِ اودھ پہ چشمکِ ہر شامِ اتحاد

یادِ خدائے امن کی صورت یہی رہے
ہو دیر دل میں جلوۂ اصنامِ اتحاد

اس کے سرور سے نہیں بڑھکر کوئی سرور
پی کر تو دیکھیں لوگ مئے جامِ اتحاد

میں چاہتا ہوں دور ہو آفاق سے نفاق
میری دعا یہ ہے کہ رہے نامِ اتحاد

بے اس کے زندگی کا مزہ خاک بھی نہیں
کل رات یوں ہوا مجھے الہامِ اتحاد

دیکھے ہیں جب سے اسکے کرشمے نگاہ سے
میں ہو گیا ہوں بندۂ بے دامِ اتحاد

بزمِ نشاط و عیش میں سب مل کے خوب گائیں!
مفتوں کے ہیں یہ شعر کہ احکامِ اتحاد

(۱)

ہم اپنی کہانی تواریخ ہند کے مغل صفحہ کی اُس سطر سے شروع کرینگے ۔ جب شہنشاہ اکبر کے بیٹے سلیم نے اپنے باپ کے برخلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا ۔ اور اس کو مدد دینے والے زیادہ تر اس کے باپ کے دشمن ہندو راجپوت تھے رتن سنگھ نامی راجپوت نوجوان سلیم کی فوج کا سپہ سالار تھا ۔ لیکن وہ ایسی بہادری سے لڑتا تھا اور ایسی لاپرواہی سے دشمنوں کے پرے کے پرے صاف کرتا تھا کہ اس کا نام لیتے ہوئے بھی دشمنوں کے دل دہل جاتے تھے ۔

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

اس صفحہ کی دوسری سطر میں سلیم اکبر کی اطاعت قبول کر لیتا ہے ۔ اور اس کے ہمراہیوں کو پھانسی کی سزائیں دیجاتی ہیں صرف رتن سنگھ کا پتہ نہیں لگتا ۔ نہ معلوم آسمان کھا گیا ۔ یا زمین ہڑپ کر گئی ۔ اکبری دستخطوں سے اکہزار اشرفیوں کا انعام اس کے یا اس کے سر کیلئے نکلا ۔

(۲)

دلّی سے ایک کوس دُور ایک بھکاریوں کا گاؤں ہے جسمیں صرف بیس پچیس جھونپڑیاں ہیں ۔ وہیں ایک جھونپڑی میں ...... ایک نوجوان تھا ۔ پھٹے حال گندے اور بدبودار کپڑے پہنے ، سر کے بال بکھرے ہوئے ، روکھے اور ڈراؤنے ہاتھ پیر ۔ آدھے ننگے اور میلے جسم اور چہرہ بھرا ہوا لیکن پریشان ۔ اسکے ننگے گھٹنے پر ایک بوڑھے کا سر تھا ۔ اس کے سر کے بال آدھے سیاہ آدھے سفید ۔ ڈاڑھی بے طریقہ بڑھی ہوئی ۔ چہرہ اداس ۔ گالوں پر جھریاں اور آنکھیں بند ہونے کے سبب کویوں پر سیاہی پھیلی ہوئی تھی ۔ کپڑے بہت سے لیکن سب بے طرح گندے چیتھڑے بدبودار اور نفرت کے قابل ۔ کمزوری اور بیماری کی وجہ سے بڈھا کانپ رہا تھا ۔ اور رہ رہ کر اس کے منہ سے دلوں کو تڑپانے والی آواز نکلتی تھی ۔ جوان بڑا پریشان اور گھبرایا ہوا تھا ۔ اور دل میں اس وقت کا خیال کر رہا تھا جس وقت انسان کی ——— کیا کروں ، عقل جاتی رہتی ہے ۔

اچانک بوڑھے کے منہ سے نکلا "پیاس ...... پانی ......"
نوجوان نے ہوشیاری سے گھٹنا نکالا - اور مٹی کا برتن اٹھایا - لیکن برتن خالی تھا -
برتن اُٹھائے وہ گھر سے باہر نکلا - سامنے ہی کنواں تھا - بھوک کے مارے اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے - لیکن ہمت نے ابھی جواب نہیں دیا تھا -
اصل میں یہی رتن سنگھ ہے - باغیوں کی گرفتاری پر یہ موقع پاکر بھاگ نکلا تھا - اور باپ کے ہمراہ کسی خفیہ جگہ رہنے پر مجبور ہوا تھا -
جو کچھ نقدی پاس تھی - جب وہ ختم ہوگئی - تو بھیک مانگنے تک کی نوبت آگئی - بیٹے نے باپ سے کہا کہ تمہیں دکھ نہ دوں گا - میں خود بھیک مانگ کر لاؤں گا - باپ نے سمجھایا " تم پہچانے گئے تو گرفتار ہو جاؤ گے "
بیٹا مجبور ہوگیا - باپ بھیک مانگ کر لاتا اور دونوں کھاتے - کئی دن سے باپ بیمار ہے - جو سوکھے ٹکڑے گھر میں تھے - بیٹے نے باپ کو وہی کھلائے لیکن جب وہ بھی ختم ہوگئے - .... تو اس نے اب باپ کو پانی پلا کر خود بھیک مانگنے کا ارادہ کیا - تیار ہوگیا - تیاری میں باقی کھوڑا تھوڑا ہی بڑھنے تھے - ایک پھٹا کوٹ پہنا - ایک گندا کپڑا سر سے لپیٹا - باپ کے جسم کو اچھی طرح سے ڈھانکا اور بولا -
" دادا میں ابھی آیا " یہ کہکر باہر نکل گیا -
باپ نے سُنا ٹمٹماتی ہوئی آنکھیں کھول کر بیٹے کی تیاری دیکھی - اور اس کے دل میں کیا طوفان اُٹھا - وہی جانے - لیکن جب بیٹا جھونپڑی کا دروازہ ڈھک رہا تھا - اس کے ہونٹ ہل رہے تھے - اور وہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا - مگر بولا نہیں گیا -

(۳)

رتن سنگھ چھپتا چھپاتا دلی میں گھسا - کسی طرح دادا کو بچانا ہوگا - یہی اس کا ارادہ تھا - وہ جو چھپنے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا - وہ اپنے لئے نہیں - باپ کے لئے - وہ تلوار چھوڑ کر جوٹھن کھانے کو تیار ہوا تھا - اور باپ کے لئے ہی وہ اپنی جان کی بہت بڑی قیمت سمجھنے پر مجبور ہوا تھا - باپ کیلئے ہی وہ نامرد بنکر فرار ہوا تھا - اور باپ کے لئے ہی جب تک باپ زندہ رہے اُسے کسی طرح مرنا منظور نہ تھا - اس کا سبب یہ تھا کہ اس کا باپ نابینا تھا -
لیکن ذکر دلی کا تھا -
ہاں تو دلی کے بازاروں میں پھرنے لگا - لمبے لمبے چوغے پہنے اور لمبی لمبی تلواریں بغل میں لٹکائے گھوڑوں پر چڑھے راجپوت اور مغل سردار مستی میں ادھر اُدھر گھوم رہے تھے - ڈھاکے کی ململ کا پتلا لباس اور پتلے رنگین کپڑے

کی خوشنما پگڑیاں پہنے مسلمان ہندو اپنے اپنے رستہ جا رہے تھے۔ ہر ایک دروازہ پر شہنائی بج رہی تھی۔ تلنگے پٹ رہے تھے۔ پیڑوں کے نیچے ہاتھی کھڑے تھے۔ اُن کے چاروں طرف بچوں کی بھیڑ تھی۔ مطلب یہ کہ دلّی کے شاہی بازاروں کے شور نے اور محلوں اور کوٹھوں کی بے ترتیب قطاروں نے ایک عجیب منظر پیش کر رکھا تھا۔ رتن سنگھ گھنٹوں بے ہوش گھومتا رہا۔ اور دلّی کی سیر کا لطف اُٹھاتا رہا۔ اچانک ایک اندھے فقیر کو دیکھکر اُسے باپ کی یاد آئی۔ اور بھیک دینے کے لائق آدمیوں کو اُس نے تلاش کرنا شروع کیا۔ لیکن آج اُسے معلوم ہوا۔ کہ بھیک مانگنا کتنا مشکل ہے؟ کیا کہہ کر مانگے کیسے کہے "مجھے کچھ دو"؟ مگر اسطرح سوچتے رہنے سے بھیک نہ مل سکتی تھی۔ دل پر جبر کرکے ایک راہ چلتے امیر کی جانب بڑھا آنکھوں میں امید کی جگہ خوف لئے ہوئے پاس بھی پہنچ گیا۔ لیکن زبان بند ہے؟ کیسے کہے، امیر آگے چلا گیا۔ کئی ایسے موقعے نکل گئے۔ اور تلوار کا دھنی رتن سنگھ بھیک مانگنے کے فن میں فیل ہوا۔ اچانک وہ چونکا:

(۴)

ایک چوراہہ اور اس کے درمیان میں ایک اونچا چبوترہ اور اس چبوترہ کے سامنے درجنوں آدمیوں کی بھیڑ رتن سنگھ نے بھیڑ کو دیکھا اور منہ اُٹھائے اُدھر ہی چلا۔ بھیڑ کا سبب جاننے کے لئے اُسے اندر گھُسنا پڑا اور اندر گھسنے کے لئے اُسے کافی محنت کرنا پڑی۔ تب جا کر اُسے سبب معلوم ہوا۔ اور سبب معلوم ہونے پر کیا ہوا۔ اس کو ٹھیک یہ معلوم ہوا جیسے چلچلاتی دھوپ میں کسی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دینے کے بعد گھُپ اندھیرے میں کھول دینے پر اُسے ہوتا ہے۔ لمحہ بھر وہ سکتہ کے عالم میں کھڑا رہا۔ لیکن پھر سنبھل کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

یہ اسکی گرفتاری کا اشتہار تھا۔ جو دیوار پر لگا ہوا تھا۔ اور اُسے لوگ پڑھ رہے تھے:

بمشکل تمام اس بھیڑ سے باہر آیا۔ اور اپنے دل سے کہنے لگا۔ اکبر مجھے ابھی بھُولا نہیں۔ نہ معلوم میرا کیا بُرا حال ہونا باقی ہے۔ موت یا موت سے بدتر حالت۔

اور اس کا باپ؟

رتن سنگھ کا جسم سر سے پیر تک کانپ اُٹھا اور دادا؟ ان کا کیا حال ہوگا۔ بھوک۔ پیاس۔ دکھ۔ تڑپ تڑپ کر موت ——!

رتن سنگھ کے سامنے سے وہ خوفناک نظارہ بندوق کی گولی کیطرح گذر گیا۔ اس نے بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن بغیر تھوڑی بھیک لئے وہ دادا تو پھر بھی نہیں بچ سکتے:

علاج ....

وہ ایک دیوار کے سہارے کھڑا ہوگیا۔ اور سوچنے لگا۔ اور تب بجلی کی طرح تڑپ کر اس کے دماغ میں ایک خیال

نے چوٹ لگائی۔ زیادہ نہ سوچا۔ بس ایک بار ہجوم میں گھس کر اشتہار پڑھا۔ کچھ اندیشہ نہیں۔ اکبری مہر۔ رتن سنگھ کیلئے اُسی کا حلیہ۔ تب وہ کسی سے دریافت کر کے سیدھا شاہی دربار کی طرف دوڑا۔

(۵)

دربار عام تھا۔ امراء، روسا، پیادے اور پولیس فوج اور فریادی سبھی حاضر تھے۔ مہابلی اپنے سنگھاسن پر تھے۔ اور دربار کی کارروائی جاری تھی۔ اچانک دربان حاضر ہوا۔ کورنش کے بعد اس نے عرض کیا " جہاں پناہ! ایک نوجوان خراب خستہ پریشان۔ فقیر حضور کی قدمبوسی کا ملتجی ہے "

اجازت مل گئی۔ فقیر حاضر ہوا۔ اور بغیر سلام کئے تن کر کھڑا ہو گیا۔ بولا " او بادشاہ! کیا تو نے رتن سنگھ کو گرفتار کرنے کے لئے ایک ہزار اشرفیوں کا انعام مشتہر کیا ہے "؟

مہابلی بھکاری کے اس عجیب سوال کو سُن کر کچھ متعجب ہوئے۔ مگر بھکاری کی بدزبانی کو نظرانداز کر کے آپ ہی آپ ان کا سر ہل گیا۔ اور منہ سے اقرار کی ہلکی آواز نکلی۔

بھکاری نے کہا " اگر میں اُسے یہاں لے آؤں تو کیا انعام مجھے ملیگا "

پھر ویسا ہی ہوا۔ شاہی وقار کے ساتھ شہنشاہ کے سر کو خفیف سی جنبش ہوئی۔

یہ دیکھتے ہی بھکاری بولا " میں رتن سنگھ ہوں۔ مجھے انعام دے " اور ساتھ ہی انعام کے لئے اُس نے بڑے گنوارپن کیساتھ ہاتھ پھیلا دیا " لیکن دیکھ " اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا " انعام لینے کے بعد میں کچھ گھنٹوں کی چھٹی چاہوں گا۔ میرا اندھا باپ بھکاری پورہ میں بھوکا اور بیمار پڑا ہے۔ اس کا مناسب انتظام کر کے میں خود حراست میں آجاؤں گا۔ اپنی بہادری کی قسم کھاتا ہوں۔ نہیں تو میرے ساتھ سپاہی ...... "

اتنے عرصہ میں اکبر سنبھل چکے تھے۔ درباری پہلے خاموش۔ پھر متعجب اور پھر سرگوشیاں۔

اکبر نے رتن سنگھ کی بات پوری نہ ہونے دی۔ اور گرج کر کہا " اس بدلگام باغی۔ بھکاری کو زیر حراست ...."

جملہ پورا بھی نہ ہوا۔ اور رتن سنگھ گرفتار کر لیا گیا۔

اکبر کا دوسرا حکم ہوا " قید خانہ میں۔

رتن سنگھ نے غصہ سے بھری ہوئی نظر بادشاہ پر ڈالی۔ مگر بُزدل کی طرح گھگھیا کر کہا " بھکاری پورہ میں میرا باپ ــ " لیکن معاً ایک سپاہی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھدیا۔

(۶)

بڑی کالی رات تھی۔ جنگلے کی سلاخیں قیدی کے ہاتھ میں تھیں۔ اور دل اسکا بھکاری پورہ میں اپنے باپ کی تو

دیکھ رہا تھا۔ پہرہ دار سنگین کھینچے دروازہ پر گھوم رہا تھا۔ اور سناٹے سے بھاری رات بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ اچانک قیدی نے دیکھا۔ تاریکی میں سے کوئی آدمی نکل کر پہرہ دار کی طرف بڑھا۔ پہرہ دار نے اُسے روکا اور آگے بڑھ کر اس کے پاس گیا۔ قیدی نے چونک کر دیکھا۔ پہرہ دار نے اچانک زمین تک جھک کر اُسے راستہ دیدیا۔ اور پھر آگے آکر کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا قیدی نے سلاخیں چھوڑ دیں۔ اور دیوار کے ساتھ لگ کر دروازہ کھلنے کی راہ دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلا۔ اور ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ پہرہ دار نے مشعل جلائی۔ قیدی نے حیرت سے دیکھا کہ خود مہابلی اس کے سامنے کھڑے تھے۔

پہرہ دار کے ہاتھ سے مشعل لیکر شہنشاہ نے دیوار میں ایک جگہ ٹھونس دی۔ اور پہرہ دار کو باہر جانے کا حکم دیا۔ اور وہ جھکتا ہوا چلا گیا۔

اب مہابلی نے ہنس کر کہا " مجھے پہچانا "

قیدی نے سر ہلایا۔

تم جانتے ہو میں کیوں آیا ہوں۔

" نہیں "

" تمہیں آزاد کرنے "

اسکی آنکھیں چمکیں۔

" اور انعام دینے "

قیدی کا اچنبھا بڑھا!

" یہ پروانہ خزانہ میں پیش کرتے ہی ایکہزار اشرفیاں پاؤ گے " اکبر نے ایک کاغذ قیدی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

" اور اب تم آزاد ہو " کہتے ہوئے مہابلی نے دروازہ کی طرف اشارہ کیا۔

رتن سنگھ خاموش تھا۔ ایک منٹ کے بعد بولا " او ظالم بادشاہ! اتنی دیر میں میرا باپ مر چکا ہوگا۔ اب مجھے نہ تیری اشرفیوں کی ضرورت ہے اور نہ آزادی کی "

" تیرا باپ زندہ ہے "

" سچ " اس نے چمک کر پوچھا۔

" قطعاً تیرا باپ زندہ اور خوشحال ہے۔ جا آزادی اور انعام دونوں بخشتا ہوں۔

" لیکن اس صورت میں اشرفیاں خیرات ہیں۔ میں دشمن کی خیرات نہیں لونگا۔

اب شہنشاہ خاموش تھا۔ اس نے کچھ ٹھہر کر کہا " رتن سنگھ اشرفیاں تیری بہادری کیلئے اور آزادی تیرے باپ کیلئے

اندھا باپ" رتن سنگھ کا دماغ چکر کھانے لگا" اندھا باپ تڑپ تڑپ کر موت!"

"لیکن دشمن کی خیرات، دشمن کی بھیک، دشمن کا نمک"

بھکاری کا بیٹا ہو کر بھی وہ بہادر تھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"بادشاہ تو دشمن۔ تیرا ناک........"

اکبر کا سخی دل ناچ اٹھا" ایسا جوان، ایسا مستقل مزاج" بولا

" تیرے جیسا دشمن میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ کیوں نہ تجھے دوست بنا کر اپنا فخر دوبالا کروں"۔ تیرے جیسا جاں نثار بیٹا ضرور جاں نثار سپاہی ثابت ہو گا"

اور دوسرے لمحے میں ہاتھ پھیلا کر اکبر نے رتن کو چھاتی سے لگا لیا۔

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

کہتے ہیں۔ رتن سنگھ ترقی کرتے کرتے اکبر کا سپہ سالار بن گیا تھا۔

(ترجمہ)

ناموَر پرستی یا ہیرو وَرشپ

از

بابو راؤ کاشی کر بی۔ اے

نام نیکو رفتگاں ضائع مکن تا بماند نام نیکت برقرار

(شیخ سعدی علیہ الرحمۃ)

بڑے بڑے آدمیوں کی زندگیاں ہمیں اس امر کی جانب مائل و راغب کرتی ہیں۔ کہ ہم بھی اپنی زندگیوں کو سنوار کر اعلیٰ بنا سکتے ہیں۔ (لانگ فیلو)

ناموَر پرستی قومی زندگی کی نشو و نما کیلئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ انسان کیلئے خوراک و پوشاک۔ ناموَر پرستی ایک مقدس جذبہ اور متبرک احساس کا نتیجہ ہے جو مختلف قوموں کو ان کے اسلاف کے کارنامے یاد دلاتا اور انکے دلوں میں قومی حرارت کی آگ مشتعل کرتا ہے جن قوموں نے ساری دنیا کو ایک زمانے میں اپنے کارہائے نمایاں سے محوِ حیرت بنا رکھا تھا اور جو آج ناموافق حالات اور غیر معمولی اسباب کی بنا پر پستی کی غار میں گر رہی ہیں۔ ان کو غیرت دلا کر عروج کی طرف لیجانے میں ناموَر پرستی ایک سریع الاثر دوا کا کام کرتی ہے۔

جاپانی قوم جو آج ایشیائی اقوام میں ممتاز ترین خیال کیجاتی ہے۔ یا ترکی قوم جسنے گذشتہ چند سالوں میں اپنی عظمت کا سکہ سارے دولِ یورپ کے دلوں پر بٹھایا۔ اسکی ترقی کا اصلی راز ناموَر پرستی ہی کے جذبہ میں پنہاں ہے ملک ہند میں بھی ناموَر پرستی نہایت قدر و وقعت اور عزت و عظمت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے چنانچہ ہر قوم کے ناموروں کے یادگاری جشن ہر سال نہایت تزک و احتشام اور بڑے دھوم دھام کیساتھ منائے جاتے ہیں لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان میں ناموَر پرستی صرف رسمی طور پر باقی رہ گئی ہے۔ کیونکہ ناموروں کی عملی تقلید کا جذبہ ہماری روزانہ زندگی سے بہت کم نمایاں ہوتا ہے۔

اگر ہمیں اپنی قوم کو اسی آب و تاب اور عظمت و شان کے ساتھ دیکھنے کی دلی خواہش ہو تو ہمیں چاہیئے کہ قوم کو غفلت کے خمار آلود خواب سے بیدار کر کے اسکو بھی ناموَر پرستی سے حقیقی ہیرو پرستی کیطرف راغب و متوجہ کریں جو نہایت ضروری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون سے ہیرو ایسے ہو سکتے ہیں جنکے نقش قدم پر چلنا ہمارے لئے مفید و مناسب ہے۔ ہمارے نزدیک پانچ ناموراد ہیرو دیسی ہو سکتے ہیں۔ جو قوم کی بہبودی اور بہتری کیلئے

ایک رات

(از جناب سردار کرپال سنگھ صاحب بیدار)

(۱)

نیلگوں چرخ ابر پوش ہے آج ذرّہ ذرّہ سکوں فروش ہے آج

چار سُو خوفناک ظلمت ہے دہر آشوب گاہِ عبرت ہے

انجم تابدار غائب ہیں رات کے سحر کار غائب ہیں

جلوۂ مہ نظر نواز نہیں طائرِ دل نوا طراز نہیں

ابر خاموش ہے ہوا خاموش سازِ فطرت کی ہر نوا خاموش

موت ساکن ہے زندگی ساکن رگِ ہستی کی بیکلی ساکن

پُر سکوں عالمِ حیات تمام بے صدا بزمِ کائناتِ تمام

عیش و غم کا وجود ـــ خواب و خیال عالمِ ہست بود ـــ خواب و خیال

رنجِ امروز، فکرِ فردا ـــ وہم وہم ہر روز کا یہ جھگڑا ـــ وہم

حلقۂ صبح و شام ـــ ایک فریب زندگی کا نظام ـــ ایک فریب

ذکرِ سرمستیٔ جوانی ـــ ہیچ قصۂ عیش و کامرانی ـــ ہیچ

لطفِ راز و نیاز ـــ بے بنیاد لذّتِ سوز و ساز ـــ بے بنیاد

لو وُہ کُتا کہیں سے بھونک پڑا دلِ مخمورِ خواب چونک پڑا

اور وہ برق بھی مچل اُٹھی روح یکبار گی دہل اُٹھی
مضطرب روشنی ہوئی پیدا جسم پر سنسنی ہوئی پیدا
پھر اُسی طرح چھا گئی ظلمت رنگ اپنا جما گئی ظلمت

آہ یہ منظرِ ہراس انگیز
کیا کہوں اپنا حال یاس انگیز

(۲)

شہر کے اک اداس گوشے میں سبز منڈی کے پاس گوشے میں
وہ جہاں تنگدست رہتے ہیں شدّتِ روزگار سہتے ہیں
جن کے مسکن ہیں بے چراغ تمام جن کے سینے ہیں داغ داغ تمام
کوئی جن کا شفیقِ حال نہیں جن کے زخموں کا اندمال نہیں
ہر نفس آہ سرد بھرتے ہیں شکرِ پروردگار کرتے ہیں
پاس کھانے کو ہے نہ پینے کو اک غمِ بیکسی ہے جینے کو

آہ! کیا جانگزا ہے ناداری
کوئی غیبی سزا ہے ناداری

وجہ آلامِ بے حساب ہے یہ سو عذابوں کا اک عذاب ہے یہ
سختیاں جھیل جھیل کر جینا جان پر کھیل کھیل کر جینا
کوئی نادار ہو خدا نہ کرے جی سے بیزار ہو خدا نہ کرے

کوئی مفلس کو پوچھتا ہی نہیں
سچ ہے نادار کا خدا ہی نہیں

ہاں! تو ایسے اداس گوشے میں سبز منڈی کے پاس گوشے میں

اک مکاں ہے وہاں گوالوں کا / روز آپس میں لڑنے والوں کا
اس کے پہلو میں ایک کمرہ ہے / وہیں محدود میری دنیا ہے
تنگ و تاریک صورتِ زنداں / ایک تصویرِ عبرتِ زنداں
در و دیوار غم فزا یکسر / ایک فریادِ بے صدا یکسر
کوئی ساماں نہیں امارت کا / کوئی درماں نہیں مصیبت کا
لیمپ رکھا ہے تیل سے خالی / آگ پانی کے میل سے خالی
زینتِ فرش اک چٹائی ہے / ایک کونے میں چارپائی ہے
آہ! کس بیکسی میں رہتا ہوں / اس پہ طرہ کہ شعر کہتا ہوں
خوش مذاقی سے ہے ضمیر مرا / نکتہ بیں ہے دلِ بصیر مرا
شعریت ہے مرے رگ و پے میں / کیف مخفی ہو جس طرح مے میں
ایک ہی دھن ہے ایک ہی لے ہے / کیا کہوں ذوقِ شعر کیا شے ہے

(۲)

دیکھ او سفلہ خو زمانے! دیکھ! / سفلہ جوئی میں او یگانے! دیکھ!
اس طرح مجھ کو پائمال نہ کر! / شاعری کو فنا مآل نہ کر!
گرچہ شاعر ہوئے ہیں پہلے بھی / کئی ساحر ہوئے ہیں پہلے بھی
روح افزا مقالِ شیکسپیر / عرش پیما خیالِ شیکسپیر
طبعِ ہومر کی آن بان نئی / فکرِ ڈانٹے میں ایک شان نئی
گوئٹے رازدارِ فطرت کا / بلکہ آئینہ کارِ فطرت کا
شیخِ شیراز کانِ معنی کی / کانِ معنی کی، جانِ معنی کی

وجد پرور کلام حافظ کا سرِ غیبی پیام حافظ کا
شاعرِ سحر کار کالیداس نازشِ روزگار کالیداس
نکتہ آرا طبیعت غالب خلد پیرا لطافت غالب
شعرِ ٹیگور دل نشین نغمہ بربطِ روح کا حسین نغمہ
نظمِ اقبال شاہکار خیال جنت افروز نوبہار خیال
الغرض باکمال سب کے سب آپ اپنی مثال سب کے سب
میں کوئی ان سا باکمال نہیں مجھ میں وہ کیفیت، وہ حال نہیں
پھر بھی کچھ آب و رنگ رکھتا ہوں شعر کہنے کا ڈھنگ رکھتا ہوں
اے زمانے! تو سازگار نہیں غمگساری ترا شعار نہیں
تو جو دل سوز، دل نواز بنے چارۂ دردِ جاں گداز بنے
دیکھ پھر شوکتِ کمال مری آسماں تابی خیال مری
نقشِ فطرت میں رنگ بھر دوں میں شاعری کو جوان کر دوں میں

بخدا لاجواب ہو جاؤں
ذرّے سے آفتاب ہو جاؤں

ایک راجہ تھا

جناب محمد نقی صاحب دہلوی

جب ہم بچّے تھے۔ تو ہمیں یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ کہانی میں جس راجہ کا ذکر آرہا ہے۔ وہ کون تھا۔ ——— ہم کو اس سے بھی کوئی غرض نہ تھی۔ کہ اس کا نام شیلا دیتا تھا یہ شیلابہ۔ وہ کاشی میں رہتا تھا یا قنوج میں۔ وُہ چیز جو ایک آٹھ سالہ بچے کے دل کو خوشی سے باغ باغ کر دیتی ہے۔ وہ محض یہ حقیقتِ عظمیٰ اور صداقت کبرےٰ ہے کہ کسی زمانہ میں ایک راجہ تھا۔ مگر دورِ حاضرہ کے ناظرین بڑے حقیقت کے کھوجی اور جویائے تفصیلات ہوتے ہیں کبھی وہ کسی افسانہ کو اسطرح شروع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تو فوراً معترض اور نکتہ چین بنجاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ افسانہ کے روایتی اسرار پر سائنس کی روشنی ڈالی جائے۔ اور یوں دریافت کرتے ہیں "کون راجہ تھا" مگر اس زمانہ کے افسانہ نگار اور داستان گو بھی بڑے مدقق ہوگئے ہیں۔ اب وہ بھی اس پرانے اور غیر واضح اسلوب پر اکتفا نہیں کرتے اور یہ کہنے کی بجائے کہ "کسی زمانہ میں ایک راجہ تھا" افسانہ کی ابتدا ایک فاضلانہ اور محققانہ طریقہ سے یوں کرتے ہیں کہ "کسی زمانہ میں ایک راجہ تھا جس کا نام اجستر و تھا" عہد حاضرہ کے ناظر ہوتے کی متجسس حقیقت طبیعتیں اس پر بھی مطمئن نہیں ہوتیں اور وہ مصنف کی طرف علم کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ اور پوچھتے ہیں "کون اجستر و؟" مصنف آگے بڑھتا ہے۔ اسکول کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ کہ تین اجستر و تھے۔ پہلا بیسویں صدی عیسوی میں ہوا تھا۔ اور اپنی طفلی کے زمانہ یعنی دو سال اور آٹھ ماہ زندہ رہ کر اس عالم فانی سے سدھار گیا۔ مجھ کو افسوس ہے کہ اسکے دورِ زندگی کے تفصیلی حالات کسی معتبر ذرائع سے دستیاب نہیں ہوتے۔ دوسرے اجسترو سے طبقہ مؤرخین بخوبی واقف ہے۔ اگر آپ نئی انسائیکلو پیڈیا ملاحظہ فرمائینگے۔ تو آپ کو اسکے متعلق بخوبی علم ہو جائیگا۔ اسوقت موجودہ دور کے "روشن دماغ" ناظرین کے تمام شکوک وشبہات رفع ہو جاتے ہیں۔ اور وہ مصنف کو ایک قابل اور لائق مصنف سمجھتے ہیں۔ اور اپنے دل سے کہتے ہیں کہ اب ہم ایک مفید اور ترقی پذیر افسانہ دیکھ رہے ہیں۔

آہ! ہم فریب سے کس درجہ محبت کرتے ہیں۔ ہم کو غافل ہونے اور غافل رہنے کا ایک خطرناک راز یاد ہے۔ حالانکہ ہم کو جو بنی رکھنا چاہیے ہم کتنے اِدھر اُدھر جائیں۔ مگر آخرکار ہر چیز کو ہمیں اپنی لاعلمی پر ہی ختم کرنا پڑتا ہے .... جھوٹ... ایک انگریزی کہاوت ہے "تم مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ اور میں تم سے جھوٹ نہ بولوں گا" ایک سات آٹھ سالہ لڑکا

جب کوئی کہانی سُن رہا ہوتا ہے۔ تو وُہ کہانی کو لفظ بلفظ صحیح سمجھتا ہے، اور دورانِ بیان میں کوئی سوال نہیں کرتا۔ اسلئے کہانی کا خالص اور خوشنما جھوٹ اسطرح عُریاں اور معصوم رہتا ہے۔ جس طرح ایک بچّہ .... لیکن موجودہ زمانہ کا تربیت یافتہ اور عروج پذیر جھوٹ اپنی اصلی چال چلن کو مخفی اور محجُوب رکھتا ہے۔ اور جب کبھی کہیں سے ذرا سا خفیف بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ تو پڑھنے والے کو مضمون میں نہ کوئی دلچسپی رہتی ہے اور نہ اسکی نگاہ میں مصنف کی کوئی وُقعت۔ جب ہم بچّے تھے تو قدرت کی عطا کردہ غیر مکدّر عقل ان دل آویزیوں سے جو ایک کہانی سے حاصل ہوتی تھیں۔ بخوبی لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہم کو علم جیسی بے ضرورت شے کی کبھی پرواہ نہ ہوتی تھی۔ ہمیں تو غرض تھی صرف سچّائی سے —— ہمارے ننھے ننھے سے بے لوث دل خوب جانتے تھے۔ کہ صداقت کا مقدّس قصر کہاں ہے؟ اور ہم اُس تک کسطرح پہنچ سکتے ہیں۔ مگر اب ہم صفحہ کے صفحہ بھر جاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ کسی زمانہ میں ایک راجہ تھا ——"

مجھے کلکتہ کی وُہ شام خوب یاد ہے۔ جب ایک کہانی کہی گئی تھی۔ اُس دن بارش اور طوفان ختم ہی ہونے میں نہ آتا تھا۔ تمام شہر میں پانی ہی پانی تھا۔ ہماری گلی میں بھی گھٹنوں گھٹنوں پانی چڑھا ہوا تھا۔ .... میرے دل میں اپنے اُستاد کے نہ آنے کی ایک شمع امید روشن ہوئی تھی۔ اور ایک حد تک اُن کا نہ آنا قرینِ قیاس بھی تھا۔ .... میں برآمدہ کے آخری کونے پر ایک اسٹول پر بیٹھا ہوا دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ گلی کی طرف دیکھ رہا تھا ...... منٹ منٹ پر میری آنکھیں بارش کی طرف جاتی تھیں۔ اور جب کبھی بارش ذرا کم ہونے لگتی تھی۔ تو میں دعا کرنے لگتا تھا۔ کہ " اے خدا جب تک ساڑھے سات نہ بج جائیں۔ بارش کو خوب برسا تا رہ۔ چونکہ اسوقت مجھے پورا یقین تھا کہ بارش کی اسوقت سوائے اسکے کوئی ضرورت نہیں۔ کہ " ایک شام کو ایک بایار و مددگار لڑکے کی مدد کرے۔ اور اسکے اُستاد کے خوفناک چنگل سے اسکو نجات دلا دے۔ اگرچہ میری دعا کے جواب میں نہ سہی مگر بہرحال قدرت کے بے شمار قانونوں میں سے کسی کے زیر اثر بارش کم نہ ہوئی۔ مگر افسوس میرے استاد کی تشریف آوری بھی نہ رک سکی۔ ٹھیک جسوقت وُہ آیا کرتے تھے۔ اسی وقت گلی کے موڑ پر انکی چھتری بڑھتی ہوئی دکھائی دی —— میرے دل میں امید کا جو بلبلہ پرورش پا رہا تھا۔ وُہ پھوٹ گیا۔ اور میرا دل بیٹھ گیا —— حقیقتاً اگر گناہوں کے کفارہ میں سزا بھگتنی ضرور ہے۔ تو اب کے جنم میں میرے استاد میری جگہ پیدا ہونگے۔ اور میں اپنے استاد کی جگہ —— جونہی میں نے چھتری دیکھی۔ میں سیدھا اپنی ماں کے کمرہ میں بھاگا۔ میری ماں اور نانی ایک دوسرے کے سامنے بیٹھی ہوئیں لیمپ کی روشنی میں تاش کھیل رہی تھیں میں اماں کے پیچھے چارپائی پر جا کر لیٹ گیا اور اماں سے کہنے لگا۔ پیاری اماں استاد آگئے اور میرے سر میں ایسا درد ہے کہ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ میں تو سبق پڑھ نہیں سکتا۔ مجھے امید ہے کہ اس کہانی کو کسی نوعمر لڑکے کو پڑھنے کی اجازت نہ دیجائیگی۔ اور مجھے یہ بھی یقین کامل ہے کہ یہ افسانہ نصاب تعلیم میں ہرگز داخل نہیں کیا جا سکتا —— چونکہ جو کچھ میں نے

کیا۔ وہ بے حد بُرا ہے۔ اور اسکی کبھی مجھے سزا بھی نہ ملی۔ بلکہ برعکس اسکے میری شرارتوں کو ہمیشہ کامیابی کا سہرہ نصیب ہوتا رہا۔ میری ماں نے "اچھا" کہا۔ اور نوکر کیطرف مخاطب ہو کر کہا۔ ماسٹر صاحب سے کہدو کہ وہ گھر تشریف لے جا سکتے ہیں ـــــ مجھ کو اس کا بخوبی اندازہ ہے کہ میری ماں نے میری علالت کو کچھ قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور بدستور وہ اپنے کھیل میں مشغول رہیں۔ اور میں اپنے منہ کو تکیہ میں دیئے ہوئے اپنے دل کی رضا مندی پر خوب ہنستا رہا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ میں اور میری ماں دونو ایک دوسرے سے بخوبی واقف ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ میری ماں میرے بہانوں کو خوب سمجھتی ہیں مگر پھر میری رعایت کرتی ہیں۔ اور میری ماں مجھے جانتی ہیں کہ یہ بہانہ باز ہے۔ بہانہ کر رہا ہے۔ مگر ہر شخص جانتا ہے۔ کہ ایک سات سالہ لڑکے کیلئے بیماری کا بہانہ زیادہ دیر تک نبھانا کتنا مشکل ہے۔ ایک دو منٹ بعد ہی میں چارپائی پر سے اُٹھ گیا۔ اور اپنی نانی سے کہنے لگا۔ نانی مجھے کہانی سناؤ۔ میں نے کئی بار اس فقرہ کو دُہرایا۔ مگر اماں اور نانی بدستور اپنے کھیل میں مشغول رہیں۔ آخرکار میری ماں نے کہا۔ بچے مت دق کرو۔ جب تک ہم کھیل ختم نہ کر لیں۔ خاموش رہو۔ مگر میں برابر اصرار کئے گیا "نانی مجھے کہانی سناؤ" اور میں نے اماں سے کہا اماں تم کھیل کل ختم کر لینا۔ اب نانی کو مجھے کہانی سنانے کے لئے بھیجدو۔ اور برابر میں یہی کہے گیا۔ آخر اماں نے غصہ ہو کر تاش کو زمین پر پھینکدیا۔ اور نانی سے کہا کہ جو یہ کہتا ہے۔ وہ کرو میں اسکو کسی طرح نہیں روک سکتی۔ شاید اُسوقت ان کے دل میں یہ ہوگا کہ اگر کل اسنے اسی طرح ماسٹر جی سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے بہانہ بنایا۔ تو ہرگز میں اس کا کہنا نہیں کرنے کی ـــــ جونہی اماں نے اجازت دی۔ میں نانی کی طرف دوڑا۔ اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر فرطِ مسرت سے اُچھلتا کودتا اپنے بستر پر لیگیا۔ کہنے لگا۔ "نانی کہانی سناؤ" نانی نے شروع کیا۔ "راجہ کی ایک ہی رانی تھی" اس کہانی کا آغاز کتنا اچھا تھا کہ راجہ کی ایک ہی رانی تھی۔ کیونکہ عموماً کہانیوں میں راجاؤں کی کئی کئی رانیاں ہوتی ہیں۔ جب ہم یہ سنتے ہیں کہ دو رانیاں تھیں۔ تو ہمارا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ کہ ضرور ایک غمزدہ رہتی ہوگی مگر نانی کی کہانی میں خطرہ دور ہو گیا۔ کیونکہ راجہ کی ایک ہی رانی تھی۔ پھر میں نے سنا کہ راجہ کے ہاں کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ سات سال کی عمر میں مجکو مطلق احساس نہ تھا کہ اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے بھی انسان کو افسردہ رہنے کی ضرورت ہے مجھے اسکی کچھ پروا نہ ہوئی۔ لیکن یہ سنکر میں کچھ برانگیختہ سا ہو گیا کہ راجہ لڑکے کیلئے تپسیا کرنے کے واسطے جنگلوں میں چلا گیا۔ میری خیال کی دنیا میں تو بس ایک ہی چیز ایسی تھی۔ جسکی وجہ سے انسان جنگلوں میں بھاگ جائے۔ اور وہ محض اپنے استاد سے راہِ فرار حاصل کرنے کیلئے ـــــ ....

راجہ اپنی رانی کے پاس اپنی ایک ننھی سی لڑکی بھی چھوڑ گیا تھا۔ جو اب بڑی ہو کر ایک حسین جمیل عورت ہو گئی تھی ـــــ بارہ سال گذر گئے۔ راجہ برابر تپسیا میں مشغول رہا۔ اور اسکو اپنی ننھی لڑکی کا بھی خیال نہ آیا ـــــ راجکماری کا آفتابِ شباب نصف النہار پر آ چکا تھا۔ اور جوانی کی دوپہر ڈھلنی شروع ہو گئی تھی۔ شادی کا زمانہ گذرتا چلا جا رہا تھا۔ مگر راجہ

اب تک واپس نہ لوٹا۔ رانی اپنی پیاری بیٹی کی شادی نہ ہونے کے غم میں گھلی جاتی تھی۔ اپنے دل میں کہتی تھی۔ ہائے کیا یہ میری رشکِ ماہتاب بیٹی کنواری ہی دنیا سے سدھار جائے گی۔ ہائے میں کیسی ابھاگنی ہوں۔ آخر رانی نے ایک قاصد بھیجکر راجہ سے درخواست کی۔ کہ زیادہ نہیں تو صرف ایک وقت کا کھانا کھانے کیلئے ہی تشریف لے آویں۔ راجہ نے منظور کرلیا۔ رانی نے بڑی احتیاط کے ساتھ کھانا پکایا۔ اور مختلف قسم کی ۴۴ رکابیاں تیار کیں۔ چندن کا سنگھاسن لگایا اور سونے چاندی کی رکابیوں میں کھانا سجا کر پیش کیا۔ راجکماری راجہ کے پیچھے کھڑی ہوئی مورچھل جھل رہی تھی۔ اس کے حسن سے سارا محل جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ راجہ نے راجکماری کی صورت کو جب دیکھا تو کھانا بھول گیا۔ اور رانی سے دریافت کیا۔ بتاؤ تو سہی۔ یہ لڑکی کون ہے۔ جس کا حسن دیوتاؤں کے نورانی تصوّرات پیش کر رہا ہے۔ یہ کس کی بیٹی ہے؟ رانی نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا "ہائے کیا تم اپنی بیٹی کو بھی بھول گئے۔" کچھ دیر تک راجہ تصویرِ حیرت بنا ہوا لڑکی کی صورت کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا "اوہو میری ننھی سی لڑکی ایسی سندر عورت ہوگئی۔" "نہیں تو اور کیا" رانی نے کہا "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کو محل چھوڑے بارہ سال ہو گئے۔" راجہ نے جواب دیا۔ "مگر تم نے ابتک اسکی شادی کیوں نہ کی۔" رانی نے کہا "آپ کی غیر موجودگی میں اس کے لئے کوئی مناسب بر کون تلاش کرتا۔" راجہ یہ سنکر جوش سے دیوانہ ہو گیا۔ کہنے لگا "کل صبح جب میں محل سے نکلوں گا۔ تو سب سے پہلے جس آدمی کو میں دیکھ لوں گا۔ اس کے ساتھ راجکماری کی شادی کر دوں گا۔" راجکماری مورچھل جھلتی رہی۔ اور راجہ نے اپنا بھوجن ختم کرلیا۔ دوسرے دن صبح جب راجہ محل سے باہر آیا۔ تو اسکی نظر ایک برہمن کے لڑکے پر پڑی۔ جو محل کے سامنے سے لکڑیاں چن رہا تھا۔ لڑکے کی عمر کوئی سات آٹھ سال کی تھی۔ راجہ نے کہا "میں اپنی لڑکی کی شادی اس لڑکے کے ساتھ کر دوں گا۔" راجہ کے حکم میں مداخلت کرنے کی کس کی مجال تھی۔ لڑکے کو فوراً بلا لیا گیا۔ اور راجکماری اسکے ساتھ بیاہ دیگئی ـــــ اس موقعہ پر میں اپنی سمجھدار نانی کے بہت قریب آگیا۔ اور اشتیاق کے ساتھ پوچھنے لگا۔ پھر کیا ہوا...... میرے دل کے عمق میں یہ آرزو بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہو رہی تھی۔ کہ وہ خوش نصیب سات سالہ لکڑیاں چننے والا لڑکا میں بنجاؤں ـــــ

رات بارش کی شدت سے گونج رہی تھی۔ لیمپ آہستہ آہستہ جل رہا تھا۔ اور اسکی دھیمی دھیمی روشنی میرے اوپر پڑ رہی تھی۔ نانی کی آواز کہانی کہتے کہتے کچھ مضمحل سی ہوگئی تھی۔ اور یہ تمام باتیں میرے بھولے دل کے کونے میں یہ یقین کرنے پر مدد دے رہی تھیں کہ میں وہ لکڑیاں چننے والا لڑکا بنگیا ہوں۔ اور ذرا سی دیر میں کسی نامعلوم راجہ کی راجدھانی میں پہنچ گیا...... اور وہاں کی راجکماری سے میرا بیاہ ہوگیا ــــ وہ ایسی خوبصورت ہے۔ جیسے حسن کی دیوی۔ اس کے بالوں میں سونے کے کلپ اور کانوں میں سونے کے بندے ہیں۔ اسکے گلے میں ایک سونے کا ہار ہے اور ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں ہیں۔ اسکی کمر میں سونے کی ایک زنجیر بندھی ہوئی ہے۔ اور پیروں میں سونے کے گچھے جگمگا

رہے ہیں۔ اگر میری نانی کوئی مصنف ہوتی۔ تو اسکو اس چھوٹی سی کہانی میں کتنی تشریح کرنی پڑتی۔ سب سے پہلے ہر ایک یہی دریافت کرتا۔ کہ راجہ بارہ سال تک کیوں جنگلوں میں رہا؟ دوسرے یہ کہ راجکماری کو اتنک کیوں کنواری رکھا گیا؟ اور اسکو کیسی بیہودگی سمجھا جاتا۔ نیز یہ کہ اگر اب تک راجکماری بغیر کسی فتنہ کے زندگی بسر کرتی رہی۔ تو اسکو اپنی ایسی شادی کے خلاف چیخ و پکار کرنا چاہیئے تھی۔ اوّل تو یہ کہ ایسی شادی کبھی ہوتی نہیں۔ دوسرے یہ کہ راجاؤں کی جنگجو ذات کی لڑکی کی شادی ایک برہمن پجاریوں کی ذات کے لڑکے کے ساتھ ہو کسطرح سکتی ہے؟ یہاں ناظرین اپنے دلوں میں فوراً یہ رائے قائم کر لیتے کہ اس سے مصنف کا منشا ہماری سماجی رسم و رواج کی مخالفت کرنا ہے۔ اور وہ اخبارات میں احتجاجی مضمون چھپواتے اس لئے میں دُعا کرتا ہوں۔ کہ میری نانی دوبارہ نانی بنکر پیدا ہوں۔ مگر شومیٔ قسمت سے میں اُن کا نواسہ نہ بنوں — میں نے خوشی سے بیتاب ہو کر کہا۔ "نانی پھر کیا ہوا!" نانی نے شروع کیا۔ "راجکماری نے ایک عالیشان محل تعمیر کرایا۔ اور اپنے بالے سیّاں کو لے کر اُسمیں چلی گئی۔ اور اسکی پرورش بڑی نگہداشت کے ساتھ کرنے لگی۔" میں خوشی سے اُچھل پڑا اور نانی سے پوچھنے لگا نانی نے کہا وہ چھوٹا لڑکا اسکول جانے لگا۔ وہ اپنے استاد سے سبق لیا کرتا تھا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا۔ اُسکے ہم جماعت لڑکے اس سے پوچھنے لگے۔ کہ تمہارے ساتھ محل میں جو حسین عورت رہتی ہے۔ وہ تمہاری کون ہے؟ —— رفتہ رفتہ برہمن کا لڑکا بھی خود یہ معلوم کرنے کا بے حد شائق ہو گیا۔ کہ میرے ساتھ محل میں جو حسین عورت رہتی ہے۔ وہ کون ہے؟ اس کو بس اتنا یاد تھا کہ ایکدن میں لکڑیاں چُن رہا تھا۔ اور ایک ہنگامہ سا ہوا تھا —— مگر اس بات کو بھی اتنا عرصہ گذر گیا تھا۔ کہ یہ بھی کوئی قابلِ یقین بات نہ تھی —— چار پانچ سال اسطرح گذر گئے۔ اسکے ساتھی ہمیشہ اس سے یہ پوچھتے تھے کہ تمہارے ساتھ محل میں جو حسین عورت رہتی ہے۔ وہ کون ہے؟ اور برہمن کا لڑکا جب اسکول سے آتا۔ تو آزردہ ہو کر راجکماری سے کہتا۔ میرے ہم جماعت مجھ سے پوچھتے ہیں۔ کہ تیرے ساتھ محل میں جو حسین عورت رہتی ہے وہ کون ہے؟ تو میں اُن کو جواب نہیں دے سکتا۔ تم مجھے بتاؤ کہ تم کون ہے؟ راجکماری کہتی۔ خیر؟ آج تو اس بات کو جانے دو۔ پھر کسی دن بتاؤنگی اسی طرح چار پانچ سال اور گذر گئے۔ آخرکار برہمن کا لڑکا بہت پریشان ہو گیا۔ اور ایک دن کہنے لگا۔ کہ "اے حسین عورت اگر تو مجھ کو نہ بتلائے گی کہ تو کون ہے؟ تو میں محل سے چلا جاؤں گا۔ راجکماری نے کہا اچھا کل میں تم کو ضرور بتاؤنگی —— دوسرے روز برہمن کا لڑکا جونہی اسکول سے آیا۔ کہنے لگا اب بتاؤ کہ تم کون ہو؟ راج کماری نے کہا کہ آج رات کو جب تم کھانا کھا کر اپنے بچھونے پر آرام کرو گے۔ اُسوقت میں تمہیں بتاؤنگی کہ میں کون ہوں۔ برہمن کے لڑکے نے بہت اچھا کہا۔ اور رات کی امید میں گھڑیاں گننے لگا۔

راجکماری نے طلائی چھپر کھٹ پر سفید پھولوں کا بچھونا بچھایا۔ اور ایک سونے کا لیمپ خوشبودار تیل ڈال کر روشن کیا۔ اپنے بالوں کو سنوارا۔ اور ایک باریک ہلکے رنگ کی پوشاک پہنی۔ اور رات کی امید میں گھڑیاں گننی شروع کر دیں شام کو جب اس کا پتی برہمن لڑکا کھانے سے فارغ ہو کر آرام کرنے کیلئے کمرہ میں گیا۔ تو اس کا دماغ پھولوں کی مہک سے

معطر ہو گیا۔ اور وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ کہ آج رات کو مجھ کو ضرور معلوم ہو جائیگا کہ یہ حسین عورت جو میرے ساتھ محل میں رہتی ہے۔ کون ہے۔ راجکماری نے اپنے پتی کے آگے کا بچا ہوا کھانا کھایا۔ اور دبے پاؤں سونے کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ اسوقت اسکو اس بات کا جواب دینا تھا کہ اسکے ساتھ محل میں جو حسین عورت رہتی ہے۔ وہ کون ہے۔ اور جونہی وہ پلنگ کی طرف بڑھی۔ اس نے دیکھا کہ پھولوں میں سے ایک کالا سانپ نکل کر بھاگا۔ اور اس کا پتی برہمن لڑکا پھولوں کی سیج پر مُردہ پڑا تھا .... یہ سُنکر میرے دلمیں ایک گھونسا سا لگا۔ اور میں نے بڑی مشکل سے گلوگیر آواز میں نانی سے پُوچھا۔ پھر کیا ہُوا؟ نانی نے کہا۔ پھر .... مگر در اصل بات یہ ہے۔ کہ ایک سات سالہ لڑکا یہ نہیں جان سکتا۔ کہ اس سوال کا جواب کہ موت کے بعد کیا ہُوا؟ ناممکن ہے۔ اگر نانی کی نانی آ جائے۔ تو بھی نہیں بتا سکتی کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے۔ مگر بچہ کے یقین اور عقیدہ کو ہرگز شکست نہیں ہوتی۔ وہ چاہتا ہے کہ کسطرح موت کے پردہ سے بھی دوبارہ کھینچ لاؤں۔ نیز اس کیلئے یہ خیال کتنا اذیت دہ ہوتا ہے کہ استادکی گرفت سے چھٹکارا ملنے کے بعد ایک شام کو ایک ایسی کہانی اسطرح اچانک ختم ہو جائے۔ اس لئے نانی اپنی کہانی کو اس سب سے بڑے اختتام یعنی موت کی گھاٹی سے بھی نکال لیتی ہیں۔ اور کتنی سادگی کے ساتھ ــــــ کہ محض مردہ جسم کو کیلے کے ایک بڑے پتہ پر رکھکر دریا میں تیرا دیا جاتا ہے۔ اور جادو گر منتر پڑھتے ہیں۔ بہرکیف اس برسات کی رات کو لیمپ کی دھیمی روشنی میں موت اور اسکی تمام دہشت انگیز باں ایک لڑکے کے دل میں ناکامیاب ہو رہی تھیں۔ اور سارا سوا ساری رات کی خواب غفلت کے اور کوئی پُر اثر بات نظر نہ آتی تھی ــــــ جب کہانی ختم ہوئی۔ تو میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں ــــــ اسطرح ہم چھوٹے بچے کے جسم کو نیند کے سمندر میں کہانی کے پتے پر ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر صبح اسکو دوبارہ دنیا کی زندگی اور روشنی میں لانے کے لئے چند منتر پڑھتے ہیں +

عربی فسانہ

ایک عورت عمر بن خطابؓ کی خدمت میں آئی۔ اور عرض کی " امیر المومنین نہ میں اسکی جورو، نہ وہ میرا شوہر" عمرؓ " تمہیں اپنے شوہر کے متعلق کیا شکایت ہے؟" عورت " اس کو سامنے بلوائیے"!

جب بلوایا۔ تو ایک شخص سامنے آیا۔ جس کے میلے کچیلے کپڑے ہیں اور جسم، ناک اور سر کے بال بڑھے ہوئے ہیں حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اُس کو لے جاؤ اور حجامت بنوا کر اور اُجلا لباس پہنا کر لاؤ۔

حکم کی تعمیل کیگئی۔

حضرت عمرؓ نے عورت کو بلوایا۔ جب عورت نے شوہر کو دیکھا تو کہا " اب ٹھیک ہے" عمرؓ " اللہ سے ڈر۔ اور اپنے شوہر کی اطاعت کر" عورت " بسر و چشم"! جب عورت چلی گئی تو حضرت عمر نے فرمایا " تم لوگ عورتوں کیلئے بناؤ کرو کیونکہ جو ...... باتیں تم ان میں پسند کرتے ہو۔ وہی عورتیں بھی تم میں پسند کرتی ہیں +

معراجِ کمال

(ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی)

ہم کبھی حسنِ مجسم کا نظارا کر لیں
وہ نظر آ جائیں کہ دیدار تمہارا کر لیں

قتل کرنے ہی کی زحمت وہ گوارا کر لیں
ہم کو طاقت ہے نظارے سے نظارا کر لیں

چاہنا حور و پری کا ہمیں دشوار نہیں
یہ تو جب ہو تیری تحقیر گوارا کر لیں

غرق ہو جائیں گے ہم اس کے سوا کیا ہوگا
کس لئے بحرِ محبت سے کنارا کر لیں

اے اجل اس لئے دل ہم نے ستمگر کو دیا
جی تو سکتے نہیں مرنے کا سہارا کر لیں

جادۂ عشق و محبت سے گزرنے والے
چلتے پھرتے ہوئے دیدار تمہارا کر لیں

جلوۂ یار کوئی جلوۂ محدود نہیں
ہم اگر چاہیں تو اپنے میں نظارا کر لیں

ہم سے کہتا ہے کوئی آؤنگا میں آؤں گا
احتیاط اسے تصدیق دوبارا کر لیں

اُف یہ دریا کا تلاطم یہ جوانی کی اُمنگ
کس طرح ہم مے و ساقی سے کنارا کر لیں

کیا خبر پھر ہمیں موقع یہ ملے یا نہ ملے
ہے ابھی بس میں زباں ذکر تمہارا کر لیں

دائمی رنج اُٹھانا ہمیں منظور نہیں
چند روزہ ہو تو خیر اس کو گوارا کر لیں

کل نہیں آج سہی بلکہ اسی وقت سہی
امتحاں عشق و وفا میں ہمارا کر لیں

وقتِ آخر میری بالیں سے سرکنا کیسا
آپ انجامِ محبت کا نظارا کر لیں

ہم نشیں ترکِ محبت سے پشیماں ہیں ہم
کیوں نہ پیدا وہی آزار دوبارا کر لیں

دل اُسے دیں وہ ہمیں قول نہ دے لیا یعنی
نفع سے پہلے ہی منظور خسارا کر لیں؟

خاکسارانِ وفا نقشِ کفِ پا بن کر
کوچۂ یار میں رہنے کا سہارا کر لیں

جب یہ غم ہیں تو خوشی کی ہمیں امید نہیں
جب یہ جینا ہے تو مرنا ہی گوارا کر لیں

بحرِ اُلفت میں اگر چاہتے ہوں خیریت
نوح طوفانِ حوادث سے کنارا کر لیں
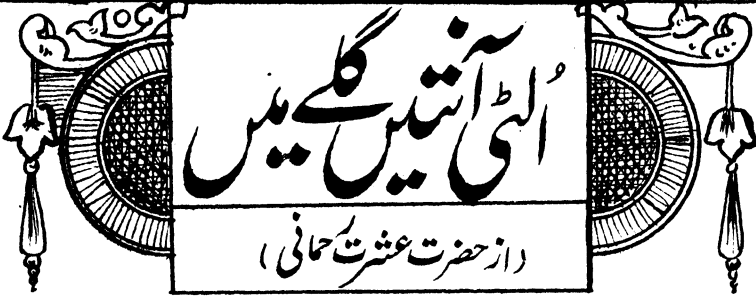
[ذیل کا مختصر، دلکش افسانہ حضرت "عشرت" رحمانی کی طبع جدت طراز کا دلچسپ نتیجہ ہے جس میں نہایت لطیف و دلآویز انداز میں حقیقتِ جرم کے از خود منکشف ہو جانے کی کیفیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور نہایت کامیابی سے "اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" یا "الٹی آنتیں گلے پڑیں" وو ضرب الامثال کی تمثیل نمایاں کیگئی ہے۔ طرزِ بیان کی دلکشی صد درجہ قابلِ داد ہے۔ واقعات کی تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ — جناب عشرت علمی ادبی ٹھوس مضامین کے میدان سے گذر کر جب افسانہ کی دنیا کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ تو اسی قدر کامیاب نظر آتے ہیں۔ بس پڑھیئے اور لطف حاصل کیجئے۔ مدیر]

(۱)

...... اسٹیشن پر پنجاب میل کی آمد کا شور برپا تھا۔ مسافر اُترے۔ "قُلی" "بابوجی قلی" کی دلگداز آوازیں بلند ہوئیں۔ اور قُلیوں کے سب بابو (یعنی مسافر) اور کچھ اسباب برسر یا بغل بردر اپنے دوپایہ یا بو (قلی) کے پیچھے آگے یا آگے سے کچھ پیچھے ہٹ کر ذرا دائیں بائیں پوری احتیاط برتنے کے خیال سے یا کوشش میں کن انکھیوں سے قلی کے بازو پر سے نمبر پڑھتے یا بھانپتے کہ کہیں سامان لیکر چمپت نہ ہو جائے۔ چلے جا رہے ہیں۔

"ہندو چائے"۔ "مسلمان چائے" اور "ہندو مسلم مشترکہ دہی پکوڑی" وغیرہ بولیاں سنی جا رہی ہیں۔ غرض ایک دیسی قسم کی "نیم ولایتی قیامت" برپا ہے۔

(۲)

ایک قُلی اپنے سر پر چمڑے کا، اسٹیل کا، یا شاید خدا جانے کا ہے کا (کیونکہ جلدی میں صرف طائرانہ نظر ہی پڑ سکتی تھی) اچھا خاصا لمبا چوڑا اسوٹ کیس لئے مسافروں کو چیرتا، بھیڑ میں سے تیزی سے گذرنے کی کوشش کرتا پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک قلی کے قول سے بابو صورت سے مومن شیخ اور لباس سے الفربہ خواہ مخواہ لالہ بنواری لال، (مذہب و قومیت کا حال خدا کے علم میں) ہانپتے کانپتے، جلدی جلدی قدم اُٹھاتے۔ مگر پیر لڑکھڑاتے دکھائی دیئے۔ قلیوں کو گھبرا

گھبرا کر بھانپنے سے معلوم ہوا کہ آگے جا نیوالے قلی کے سر پر انہیں کا سوٹ کیس ہوگا۔

تھوڑی دیر میں وہی قلی سامنے سے آگیا۔ اور مسافر بابو نے حیرت وہیبت سے آنکھیں کھول کر اور ہونٹ تول کر ڈانٹا کہ "ہمارا بکس کہاں ہے.........؟" اور بہت کچھ جو ایسے موقعہ، محل کے اعتبار سے مناسب تھا یا ہوتا ہے کہا ہوگا جو سننے میں نہیں آیا لیکن اس قصیدہ خوانی کے گریز میں قلی نے استحقاق جائز کا احساس کرکے فوراً کہا "مزدوری، بابو جی۔ بکس تانگہ پر رکھدیا"۔

"کیسا تانگہ، کس کا تانگہ۔ پاگل کہیں کا"۔

"بابو، ہم تو آپ کے پیچھے بھاگتے بھاگتے گئے۔ اور آپ جس تانگہ پر بیٹھ رہے تھے۔ ہم نے بکس اس میں رکھدیا۔ اب آپ یہاں آگئے۔ ہم پر خفا کیوں ہوتے ہیں۔ مزدوری تو دیدو"۔

شور وغل سنکر کانسٹبل آگیا۔ اور اسکے مشورہ و دخل اندازی سے طے پایا کہ اس تانگہ پر جلدی بکس تلاش کیا جائے

(۳)

باہر قلی نے جس تانگہ کو بتایا۔ اس پر ایک شریف آدمی باضابطہ شان وشوکت سے بیٹھ گئے تھے۔ اور تانگہ آہستہ آہستہ روانہ ہو رہا تھا۔

چیخ پکار کے بعد تانگہ کو روکا۔ تانگہ والے سے دریافت کیا۔ اس نے بکس سے لاعلمی ظاہر کی۔ اُن صاحب نے بھی یہی کہا کہ میں اس تانگہ پر بیٹھا۔ تو بکس کوئی نہیں تھا۔ قلی سے صبر نہ ہوا۔ اور اس نے نشست کے نیچے جھانک کر دیکھا اور بے تحاشا چلّایا۔ "دیکھئے نا۔ بابو ہم جھوٹ نہیں بولتے ہے۔ یہ کون بکس ہے"۔

اُب تو صاحب بکس چلّا اٹھے۔ اور پوری طاقت سے منہ اور گلا پھاڑ پھاڑ کر خوب چلائے کہ "بھلے مانس بنکر میرا بکس چرائے لئے جاتے ہیں"۔

تانگہ والے کو بھی کانسٹبل اور انہوں نے خوب سخت سست کہا۔ لوگ جمع ہوگئے۔ تانگہ پر بیٹھے ہوئے صاحب نے ہر چند سمجھایا کہ اس قلی نے آپ کے دھوکہ میں بے سمجھے تانگہ میں سامان رکھ دیا ہوگا۔ مجھے خبر بھی نہ تھی۔ مگر ایک بھی نہ سُنی گئی۔ اور کانسٹبل نے ان صاحب سے کہا۔ "آپ پولیس اسٹیشن چلئے۔

صاحب بکس بھی جل کر بولے "خوب صاحب خوب۔ بکس اڑا کر لئے جاتے تھے۔ اور اب باتیں بناتے ہیں۔ یہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والی مثل پوری ہوتی یہی دیکھی"۔

جب ہر طرح منّت سماجت کرنے کے بعد ہار گئے۔ تو آخر ان صاحب کو بھی جوش آگیا۔ اور اُنہوں نے ڈانٹ کر کہا "دماغ خراب ہے۔ جانتا ہے میں کون ہوں، پرسوں جو انسپکٹر سی۔ آئی۔ ڈی تبدیل ہو کر آئے ہیں۔ انہیں تو پہچانتا ہے۔ تم سب کی شامت تو نہیں آئی ہے" وغیرہ وغیرہ جو ایک شاندار باعزّت انسپکٹر کو اسوقت کہنا چاہئے تھا۔

سب ہی پوری طاقت سے کہہ ڈالا۔ اور سب کو خوب لتاڑا۔
اب کیا تھا۔ کانسٹبل تو سرد پڑ گیا۔ اور کانپنے لگا۔ اور صاحب بکس گھبرا کر آگے پیچھے ہٹنے لگے۔ اور قلی کو اس انداز میں گھورنے لگے۔ جیسے اُن شریف آدمی کی توہین میں تمام قصور اس ہی کا ہے۔
انسپکٹر صاحب نے اب انسپکٹری کی شان چونکہ پورے طور پر اختیار کر لی تھی۔ اسلئے ہنٹر کو جھٹکا دے کر ذرا جھٹکے دار آواز میں کہا :" اچھا یہ تو بتاؤ، اس بکس میں کیا ہے ؟ یہ بکس واقعی تمہارا ہی ہے یا ــــ "
اسپر صاحب بکس نے ذرا وحشت ناک انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ اور کھانسی کی تمام کیفیات گلے پر طاری کر کے زور سے کھانستے ہوئے پسینہ پونچھکر بولے " ج .... جی .... بکس تو ...... میرا ہے ...... اس ...... اس میں ..... دراصل میں .... یہ میرے دوست کا ہے۔ راستہ سے انہوں نے ساتھ کر دیا تھا۔ معلوم نہیں۔ اس میں کیا ہے ؟"
انسپکٹر صاحب نے ایک زہر خند کے ساتھ انسپکٹرانہ شان سے کانسٹبل کو اشارہ کیا۔ کہ اس بکس کو کھولکر دیکھو۔ یہ شخص مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔"
بکس کھولا گیا۔ کپڑوں کی تہوں میں" کوکین" کے چند لفافے اور شیشیاں برآمد ہوئیں۔
انسپکٹر صاحب نے خاص مستانہ انداز سے صاحب بکس کی طرف نگاہِ غلط انداز ڈال کر کہا " خوب اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ سامان تو آپ کا اس تانگہ میں رکھا ہی تھا۔ اب آپ کو بھی اسی میں تشریف رکھنا ہے۔ آئیے۔ آئیے آئیے تکلف کیا ہے ؟"
صاحب بکس پہلے ہی سرد پڑ چکے تھے۔ اس نگاہ نے اور بھی بجلی گرائی۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے "...... م ... م ..... مگر ..... بکس میرا نہیں ہے ..... م ..... م .... مجھے .... خ ...... خ ..... خبر بھی نہیں ..."
مگر انسپکٹر کب سنتا تھا۔ زبردستی لالہ صاحب تانگہ میں رکھ دیئے گئے۔ اور گھوڑا کوتوالی کی طرف کو ہو لیا۔

عربی فسانہ

ایک عورت زیاد کے پاس اپنے خاوند کا جھگڑا لیکر آئی۔ اور اسکی عیب چینی اور آبرو ریزی کرنے لگی۔
شوہر نے کہا خدا تعالیٰ امیر کو صلاحیت بخشے اصل بات یہ ہے کہ عورت جتنی عمر کی بڑی اتنی ہی بری جبوقت عورت بڑی عمر کی ہو جاتی ہے۔ کوکھ اسکی سوکھ جاتی زبان بگڑ جاتی ہے اور خصلت بد ہو جاتی ہے لیکن آدمی کا سن جب بڑھ جاتا ہے تو اسکی رائے پختہ اور جہالت کم ہو جاتی ہے۔
زیاد نے کہا۔ تم نے سچ کہا اور عورت اس کے حوالے کر دی۔
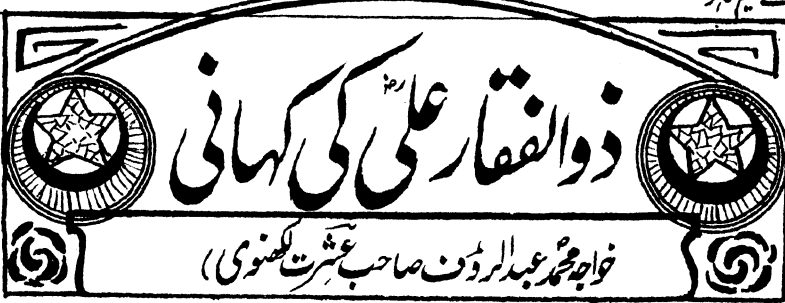
جب لکھنؤ میں غدر ہو گیا۔ اور گورنمنٹ انگریزی نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کیلئے سکھ اور نیپالی اور انگریزی فوج سے تمام شہر کو تین طرف سے گھیر لیا۔ تو اہلِ شہر شریف، امیر، غریب سب ایک ہی مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ صرف ایک راستہ سعادت گنج کی طرف سے کھلا ہوا تھا۔ اسی طرف منہ اٹھائے چلے جاتے تھے۔

رعایا کو یقین ہو گیا۔ کہ اب شہر میں جان بچنی محال ہے۔ کیونکہ نیپالی اور سکھ مال بھی لے لیتے ہیں۔ اور جان سے بھی مار ڈالتے ہیں۔ ہر محلے میں کوچہ بکوچہ قیامت برپا تھی۔ پردہ نشین عورتیں ہجوم اور بلوہ میں آگے آگے اور ان کے وارث پیچھے پیچھے حیدر گنج اور موسیٰ باغ کی طرف بھاگے جاتے تھے۔ فوج انگریزی بار بار گولے برسا رہی تھی۔ افسران فوج چاہتے تھے کہ ایک آدمی کو بھی زندہ نہ رکھیں۔ مگر گورنر جنرل کے نزدیک طرح دینی چاہئے تھی۔ لیکن اس وقت سب کچھ فوج کے اختیار میں تھا۔ حکام کی کون سنتا۔ گوروں نے قتلِ عام کیا۔ گھر بھی لوٹے، جان بھی لی۔ بہت سی عفیفہ عورتیں فوج اور گوروں کی شکل دیکھتے ہی کنوؤں میں گر کے مر گئیں۔

بہت سے آدمی لکھنؤ میں تیغِ اجل کے شکار ہوئے۔ نواب دولہا داماد منور الدولہ اپنے محل محلہ نہرے میں توپ کے گولے سے مر گئے۔ باورچی ٹولے میں میر محمد زکی نوجوان قتل کئے گئے۔

بھاگنے والوں کو بھی جہاں گورے پاتے تھے۔ مار ڈالتے تھے۔

اسی دار و گیر میں داروغہ محمد بخش بھی مبتلا تھے۔ جس طرف سینگ سمائے بھاگے جاتے تھے۔ بی بی راستے میں کھو گئیں۔ لڑکا بھی بھیڑ میں چھٹ گیا تھا۔ لیکن خدا کی شان وہ دوسرے قافلے میں ملا۔ بی بی کو ہر چند تلاش کیا۔ اس مجمع عام میں کہاں ملتی۔ لوگوں نے کہا انہیں تو راستے میں گورے نے گولی مار دی۔ بیچاری نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ کوئی پاس بھی نہ تھا نہ دفن ہوئی نہ کفن ملا۔ یہ سنکر بھی یقین نہیں آتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتے تھے۔ آخر معتبر رشتہ دار عورتوں سے تصدیق ہو گئی۔ کہ ایک مقام پر پورے قافلے پر گوروں نے بزن بولدیا تھا۔ لوگ جان لیکر بھاگے تھے۔ تو بھی سو پچاس بندوق کا نشانہ ہو گئے۔ اسی قافلہ میں تمہاری بی بی بھی تھیں۔ وہ بھاگ نہ سکیں۔ بندوق کا نشانہ بن گئیں۔

بہت روتے پیٹے۔ اور اسی مصیبت میں تیجہ اور فاتحہ بھی دلا دیا۔ یہ بھی خبر ملی۔ جو لوگ اس میں شہید ہوئے تھے

ان سب کو گاؤں والوں نے ایک ساتھ بے غسل وکفن گنج شہیداں میں دفن کر دیا۔ اس غم کا ان کے دل پر بہت سخت صدمہ پہنچا اور دماغ میں کچھ خلل آ گیا۔

اتنی مدت میں امن واماں ہو گیا۔ اور لوگ لکھنؤ میں آ کر اپنے مکانوں میں آباد ہونے لگے۔ مگر داروغہ صاحب نے خیال کیا جب اسباب لٹ گیا۔ بیوی مر گئی اور کس مکیبی کی موت مری۔ کہ نہ اپنی کہنے پائی نہ دوسرے کی سننے پائی۔ تو اب کس کے واسطے لکھنؤ میں گھر آباد کریں۔

بس اب پردیس میں بھیک مانگ کر مر جانا ہی ہمارے واسطے غنیمت ہے۔ اہل شہر کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے یہ خیال کر کے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر دشتِ غربت کی ہوا کھانے لگے۔ جب تک اپنے پاس پیسہ رہا۔ جز رسی سے خرچ کرتے ہوئے الہ آباد تک پہنچ گئے۔ یہاں ہر چند نوکری مزدوری تلاش کی۔ کسی نے نہ پوچھا۔ آخر فاقہ کرتے کرتے آنکھوں کی روشنی نے بھی جواب دیدیا۔ بالکل دیوار ہو گئے۔ اب صرف عصائے پیری ایک دس برس کا بچہ تھا۔ وہ اُن کو ایک درخت کے نیچے بٹھا دیتا تھا۔ اور دن بھر بھیک مانگ کر جو کچھ ملتا۔ ان کو بھی کھلاتا اور آپ بھی کھاتا۔ اور رات کو دونوں زیر سایہ درخت سو رہتے ایک دن ایسا ہوا کہ لڑکا سڑک پر جا رہا تھا۔ ایک بگھی جسکی گھوڑی گر ماگئی تھی۔ بے تحاشا دوڑتی آ رہی تھی۔ اسی کی جھپٹ میں یہ بھی آ گیا۔ بہت چوٹ آئی۔ بیہوش ہو گیا۔ دو گھنٹے تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ ہزاروں ہندو مسلمان عیسائی راستے سے گذرتے تھے۔ اور ایک نے ایک سے یہ جگر خراش واقعہ بیان کیا۔ مگر کسی بندۂ خدا کا دل اتنا نہ پسیجا۔ کہ اس بچّہ کی مصیبت میں شریک ہوتا

اتفاق سے شہر کے ایک رحمدل ڈاکٹر میر ناصر حسین اپنی بگھی پر جا رہے تھے۔ ان کے دل میں خدا نے رحم ڈال دیا۔ اس بیہوش لڑکے کو اپنی بگھی میں ڈال لیا۔ اور شفاخانہ میں لے گئے۔ یہی خدا کا فضل تھا کہ چوٹ بہت نہیں آئی تھی۔ تین دن کی مرہم پٹی میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ تو اس نے ڈاکٹر صاحب سے اجازت مانگی۔ کہ میرا باپ اندھا ایک درخت کے نیچے پڑا ہے۔ آپ اجازت دیجئے تو میں اسکی خبر لے آؤں۔ ڈاکٹر نے اوّل سے آخر تک اسکے خاندان کا حال پوچھا۔ اور جب اُسے معلوم ہوا کہ یہ لوگ لکھنؤ کے شریف خاندان سے ہیں اور حوادثات اور مصائب کا تھکا ہو کر اس شہر میں چلے آئے ہیں تو اُنہوں نے اجازت دی کہ اپنے باپ کو بھی اسپتال میں لے آؤ۔ اور اسپتال کا چپراسی ساتھ کر دیا۔ محمد بخش کا یہ حال تھا کہ کھانے کو تو خدا تھوڑا بہت شام تک پہنچا دیتا۔ لیکن بیٹے کا غم ایسا جانگسل تھا۔ جسکی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ دفعتہً جو بیٹے کی آواز سُنی۔ زار قطار رونے لگا۔ پھر حال پوچھا۔ جب معلوم ہوا کہ اسے ایک ڈاکٹر نے بلایا ہے۔ تو اس موقعہ کو غنیمت سمجھکر چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسکی آنکھیں غور سے دیکھیں تو معلوم ہوا پانی اُتر آیا ہے۔ اور ابھی بن سکتی ہیں۔ اس لئے انہیں اسپتال میں داخل کر لیا۔ اپریشن کیا گیا۔ کئی دن تک چارپائی پر بے حس وحرکت پڑے رہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا۔ کہ آنکھوں میں روشنی آ گئی۔

ڈاکٹر صاحب نے ان کے لڑکے کو اسکول میں لڑکوں کے پہنچانے کے واسطے دو روپیہ مہینہ اور کھانے پر نوکر رکھ لیا

اور داروغہ محمد بخش کو اپنی ڈیوڑھی کا داروغہ کردیا۔ پانچ روپیہ مہینہ ان کا مقرر ہوگیا۔

ذوالفقار علی ہمیشہ سے نیک لڑکا تھا۔ قرآن شریف اور اردو کی معمولی کتابیں تو ماں نے اِسے نو برس کے سن میں پڑھا دی تھیں۔ جب اسکول میں ڈاکٹر صاحب کے لڑکوں کے ساتھ جانے لگا۔ تو محمد بخش نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ اگر آپ اجازت دیں۔ تو میرا لڑکا بھی اسکول میں نام لکھالے۔ ڈاکٹر صاحب نے بخوشی اسکو منظور کیا۔ چنانچہ ذوالفقار علی پانچویں درجہ میں داخل ہوگیا۔ اور خدا کی مہربانی تھی کہ ہر درجہ میں اوّل پاس ہونے لگا۔ جب انٹرنس تک پہنچ گیا۔ تو داروغہ محمد بخش نے چاہا۔ کہ اب اسے کچہری میں کوئی نوکری دلوادوں۔ تو مصیبت کے دن کٹ جائیں۔ ہیڈ ماسٹر نے اس بات کو منظور نہ کیا۔ اور کہا کہ ہم سفارش کر کے تمہاری فیس معاف کرادینگے۔ اور کتابیں اپنے پاس سے دینگے۔ تم اسے کالج میں داخل کرادو۔ غرض اسطرح ذوالفقار علی کی تعلیم جاری رہی۔ گورنمنٹ نے وظیفہ بھی مقرر کردیا۔

ڈاکٹر صاحب کے دو لڑکے تھے۔ نصیر حسین اور امیر حسین۔ دونو بدشوق تھے۔ مکان پہ ماسٹر نوکر بھی تھا۔ مگر وہ کچھ ماسٹر کا دباؤ نہیں مانتے تھے۔ اسکول کے ماسٹر کی کچھ حقیقت بھی ان کے خیال میں نہ تھی۔

ڈاکٹر صاحب ایکدن اسکول میں گئے۔ اور ہیڈ ماسٹر سے شکایت کی کہ دونوں لڑکوں میں سے ایک بھی پاس نہیں ہوا۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا کہ اسٹوڈنٹ کے واسطے ضروری بات یہ ہے کہ اپنے ماسٹر کی عزت کرے۔ اس وقت جو بات ماسٹر کہے گا۔ اسے قبول کرینگے۔ آپکے صاحبزادوں کی نگاہ میں ماسٹر کی عزت بالکل نہیں ہے۔ اسلئے ان کی نصیحت بھی قبول نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دولت مند ہیں۔ اگر علم نہ آئیگا تو ہماری دولت کیا کم ہے۔ اسلئے ان کی تعلیم دل سے نہیں ہوتی۔ اور جو کام دل سے ہوتا ہے وہی پورا ہوتا ہے۔ دیکھئے ذوالفقار علی آپ کا خدمتگار ہے۔ سب لڑکوں کی کتابیں لے کر آتا ہے لیکر جاتا ہے۔ سکول کے ماسٹر کی عزت اسکی نگاہ میں اتنی ہے جتنی ایک بادشاہ کی ہونی چاہیئے۔ وہ ماسٹر صاحب کی ہر نصیحت کو کان لگا کر سنتا ہے۔ وہ دن بھر رٹتا نہیں صرف دو گھنٹہ روزانہ اپنا سبق یاد کرلیتا ہے۔ وہ ہمیشہ اوّل پاس ہوتا ہے۔ میرے خیال میں تعلیم کی کامیابی منحصر ہے ماسٹر کے حکم کی بجا آوری پر۔!

ڈاکٹر میر ناصر حسین کو معلوم ہوا کہ لڑکوں کو علم کی طرف رغبت نہیں ہے۔ اور ماسٹر صاحب کا حکم نہیں مانتے۔ مڈل تک مشکل سے پاس کر چکے ہیں۔ وہ زبردستی آگے پڑھنا بھی نہیں چاہتے۔ تو ایکدن دونوں لڑکوں سے پوچھا۔ تمہارا دل آخر کس کام کی طرف راغب ہے؟ انہوں نے کہا ہم تو تجارت کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اور نوکری کو بُرا جانتے ہیں۔ زراعت ہم سے نہیں ہوسکے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ کہ جس روزگار کو تم اپنے شوق سے کرسکتے ہو۔ کرو۔ چنانچہ دو دو ہزار روپیہ نقد دونوں کو دیا۔ اور کہا اگر محنت کرو گے۔ تو اتنی رقم سے لاکھوں کے آدمی بن جاؤ گے۔

دونو نے وہ روپیہ بساط خانہ اور کپڑے کی تجارت میں لگا دیا۔ کاروبار نے ترقی کی۔ حساب کتاب کیواسطے دو دو منشی نوکر ہوئے۔ مگر خود تعلیم یافتہ نہ تھے۔ اس سبب سے خرچ اور آمدنی خود نہ جانچ سکے۔ اور نہ مال کا جائزہ لے سکے

کچھ برسوں تک ترقی ترقی دکھائی دی۔ آخر یہ تجارتی ناؤ بھی ڈوب ہی۔ اور ایکدم سے ہزار بارہ سو کا قرضدار کرکے بیٹھ گئی۔

ذوالفقار علی کو گورنمنٹ سے وظیفہ ملتا تھا۔ کچھ ہیڈ ماسٹر حسب وعدہ کتابوں سے مدد کرتے تھے۔ بی اے پاس کر چکا۔ تو ڈاکٹری سیکھنے کیلئے آگرہ کالج میں چلا گیا۔ وہاں چار برس رہ کر ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔ محمد بخش اس کے ساتھ ہی تھا۔ سند لیکر دونوں باپ بیٹے پھر الہ آباد واپس آ گئے۔ اور ڈاکٹر میر ناصر حسین صاحب سے عرض کیا۔ ہم اتنی حیثیت نہیں رکھتے۔ کہ الگ کوٹھی لیکر مطب کھولیں۔ اس لئے اگر آپ اتنی مدد کریں کہ اپنی کوٹھی کے کسی کمرے میں مطب کا حکم دیں تو ہمارا کام چل سکتا ہے۔ دواؤں کی خریداری آپ ہی کے دواخانہ سے ہوا کرے گی۔ ہم کو اپنا الگ دواخانہ کھولنا منظور نہیں۔ یہ ایسی بات تھی جسے ڈاکٹر صاحب نے بخوشی منظور کر لیا۔ تھوڑے دن تک تو ڈاکٹر ذوالفقار علی مکھیاں مارا کئے پھر جو سردی کے بخار چلے۔ تو اللہ دے اور بندہ لے۔ دن دن بھر مریضوں کی کثرت سے کھانا کھانے کی بھی نوبت نہیں آتی۔ کچھ خود چلے، کچھ دلالوں نے نام روشن کیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر میر ناصر حسین کا بازار سرد پڑ گیا۔ اب الہ آباد میں کسی کی انگلی بھی دکھتی ہے تو ڈاکٹر ذوالفقار علی بلائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر حسین کو صرف اسپتال کی تنخواہ ملتی ہے۔ یا دواخانہ کی آمدنی ہے۔ ذوالفقار علی نے یہ چالاکی کی۔ کہ نصیر حسین اور امیر حسین کو چالیس چالیس روپیہ کا نوکر رکھ کے اپنا کمپونڈر بنا لیا۔ اپریشن کرنے جاتا تو نصیر حسین ساتھ جاتے اور دوسرے مریضوں کے یہاں امیر حسین ساتھ جاتے تھے۔

ہزار بارہ سو کی آمدنی ہو گئی۔ ڈاکٹر ناصر حسین صاحب کو انکی ترقی پر رشک آنے لگا۔ اور اپنے لڑکوں کی حالت پر افسوس کرکے کہنے لگے کہ اگر ہمارا ایک لڑکا بھی تعلیم حاصل کرکے ہمارا پیشہ اختیار کر لیتا۔ تو ہمارے رزق کا دروازہ بند نہ ہوتا۔ ہم تو اب چراغ سحری ہیں خدا جانے لڑکوں کا کیا انجام ہو؟

ایک چھوٹی لڑکی کی شادی کرنا تھی۔ کچھ سوچ سمجھکر اسکی شادی داروغہ محمد بخش کے بیٹے ڈاکٹر ذوالفقار علی سے کرکے آپ حج بیت اللہ کو چلے گئے ؛

ڈاکٹر ذوالفقار علی کو خدا نے غریب سے امیر بنا دیا۔ ڈاکٹر ہو گئے۔ شادی بھی اچھے خاندان میں ہو گئی۔ خود بھی ہزارہا روپیہ پیدا کیا۔ صاحب اولاد ہوئے۔ اور یہ سب تعلیم کی بدولت عزت ملی۔ ورنہ ایکدن وہ تھا کہ بھیک بھی مشکل سے ملتی تھی۔ آج دولت بھی ہے عزت بھی۔ شہر کے بڑے لوگوں میں گنے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب کہتے کہتے لوگوں کا منہ خشک ہوتا ہے۔ اور اس ڈاکٹر کے بیٹے جس کا الہ آباد میں طوطی بول رہا تھا۔ اسکی کمپونڈری کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ یہ سب کسکی بدولت۔ کاہلی جاہلی اور سستی کی برکت ہے۔ ورنہ ہاتھ پاؤں میں وہ دونوں ذوالفقار علی سے کم نہ تھے۔ دولت میں ان سے کہیں زیادہ۔ عزت میں بہت سوا۔ مگر ایک تعلیم کی کمی نے یہ برا دن دکھایا۔ سوچو اور سمجھو ؛

(از جناب لالہ پریم چند صاحب پریم سپالوٹی چیف ایڈیٹر رسالہ تشنہ)

اُس دن دھوتی پہنے ہوئے ایک آدمی نے آکر کہا " میں نے سنا ہے آپ اُردو میں کچھ چھپوانا چاہتے ہیں"۔ میں نے جواب بھی نہیں دیا تھا کہ اُنہوں نے پھر کہا " میں ابھی ابھی چندر گپت پریس میں بیٹھا تھا۔ وہاں آپ کی کتابیں چھپتی ہیں....... کہ ذکر آگیا۔ آپ اپنی کتابوں کا اردو ترجمہ کرانا چاہتے ہیں...... اگر در اصل آپ کا یہ ارادہ ہے تو میری خدمات؟......!

میں نے کہا " جی ارادہ تو ٹھیک تھا۔ پریس والوں سے ایک دن ذکر بھی آیا تھا۔ اور ایک اچھے مترجم کی تلاش کرنے کو بھی کہا تھا......"

میرے جواب کو سن کر وہ بیتاب سا ہو گیا۔ اور جب میں نے بتایا۔ کہ کسی وجہ سے یہ ارادہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ تو سوکھی ہنسی ہنسکر کہنے لگا " خیر تو کچھ کہنا ہی فضول ہے "

اور پھر اچھا تو آداب عرض " کہکر وہ واپس لوٹنا ہی چاہتا تھا۔ کہ میری دلی خصلت بیدار ہو گئی۔ بولا " جناب اپنی تعریف تو فرمائیے۔ کہاں سے آنا ہوا؟

جب جواب دیدینا چاہئے تھا۔ اس سے کوئی دو سکینڈ زیادہ دیر لگا کر وہ بولا " حضور میرا نام مکند لال ہے۔ الہ آباد کے ایک پریس میں ملازم ہوں۔ ہندی سے اردو اور اُردو سے ہندی میں تراجم کیا کرتا ہوں۔ بس یہی میری تعریف ہے"۔ آخری الفاظ ادا کرتے وقت اُسکے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ آدمی میں کچھ خاصیت معلوم ہوتی تھی۔ اسلئے میں نے بات چیت شروع کردی۔ کئی خاص باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک مشہور ڈرامہ نویس اس کے والد تھے۔ جب میں نے پُوچھا " آپ اُن کے پاس کیوں نہیں رہتے "؟ تو کہنے لگا کہ جب خود کما سکتے ہیں۔ تو انہیں کیوں تکلیف دیں "

اس نے اور میں نے ساتھ ہی محسوس کیا۔ کہ میں اسکی گفتگو سے متاثر ہوا ہوں۔ جب میری باتیں ختم ہو چکیں۔ تو اس نے کہا " آپ نے کچھ کتابیں بھی تو بنائی ہیں "

" جی ہاں " کہکر میں نے ملازم کو اشارہ کیا۔ اس نے میری تصنیفات کا سیٹ لاکر میز پر رکھدیا۔

" بڑی خوبصورت طباعت ہے " اُس نے دیکھتے ہی کہا۔ " اچھا دیکھئے میں اپنے کتب خانہ کیلئے ایک ایک جلد لینا چاہتا ہوں "

اب میں گھبرایا۔ فضول پچیس تیس روپے کا مال ہضم کرنا چاہتا ہے۔ بات ٹالنے کی غرض سے کہنے لگا "جی آپ۔ آپ کا کتب خانہ بھی ہے؟ نجی یا پبلک؟"

اُس نے میرا منشا پہچان کر کہا "ہے تو نجی، مگر اور لوگ بھی آ جاتے ہیں۔ آپ تمام کتابوں کا وی۔ پی کر دیجئے گا"

یہ سُنکر قدرے تسلّی ہوئی۔ سنبھل کر بولا "خیر وہ تو ہو ہی جائیگا۔ آپ یہ بتائیں کہ الہ آباد میں بازار کیسا ہے؟"

دلی منشا چھپانے کی غرض سے جیسا سوال کیا گیا تھا۔ اسی قسم کا جواب بھی دیدیا گیا۔ دو منٹ بعد ہی پتہ وغیرہ لکھوا کر وہ روانہ ہو گئے۔

(۲)

اگلے روز دس بجے وہ پھر آ موجود ہوئے۔ اس دفعہ کوٹ پتلون میں ملبوس تھے۔ چہرہ اُداس تھا۔ آ کر چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں ایک خریدار سے سودا بنا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں فیصلہ ہو گیا۔ اس نے پچیس روپے کے نوٹ مجھے دیدیئے۔ مینجر صاحب کسی کام کیلئے اندر تشریف لیگئے۔ تو ان کی خاموشی کا قفل ٹوٹا۔ کہنے لگے "وہ وی۔ پی ابھی بھیجا تو نہیں ہوگا"

میں ڈرا کہ آرڈر کینسل ہوا۔ فوراً کہنے لگا "بھیج ہی رہا تھا۔ کیا آپ خود اپنے ہمراہ لے جائینگے؟"

"خود؟" اس نے کچھ سوچکر کہا "خود ہی لے جاؤنگا۔ روپیہ منی آرڈر سے بھیجدوں؟"

"منی آرڈر سے"؟ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "آپ کب تک ٹھہرینگے؟"

"بس شام کو جا رہا ہوں"

"میرا مطلب ہے۔ دو کتابیں ابھی تک تیار نہیں ہیں۔ کل تک ...... ارے دفتری!"

دفتری آنے سے پہلے ہی اُس نے کہا "خیر تو آپ ریلوے پارسل کے ذریعہ بھیجئیگا۔ دیکھئے پوسٹ پارسل سے خرچ زیادہ آئیگا۔ ریل سے بھیجیں۔ بلٹی کی وی۔ پی کر دیں۔ اور ہاں پیکنگ اور رجسٹری کے دام ہم سے نہ لگانا"

"اچھا" میں نے تاجرانہ تبسم سے کہا "آپ کا حکم کیسے ٹالا جائے۔ اور ہاں دیکھئے کل ایک بات کہنا بھول گیا تھا۔ ہمارے ہاں باہر کی کتب کا سٹاک بھی رہتا ہے۔ کہئے تو کچھ دکھاؤں۔ اس پارسل کے ساتھ بھیجدی جائینگی۔ خرچ بھی کم آئیگا"

"نہ صاحب معاف کیجئے" اس نے نہایت منکسرانہ لہجے میں کہا "جو کتابیں جہاں چھپیں وہیں سے منگانی چاہئیں۔ میرا تو یہ اصول ہے!"

"ٹھیک ہے" میں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگا کر کہا "ہونا بھی یہی اُصول چاہئے۔ البتہ ہونے سے معمولی پبلشروں کی مناسب حوصلہ افزائی نہیں ہوتی" اس مضمون پر دو ایک باتیں اور ہوئیں۔ جب رنگ نہ جم سکا۔ تو میں نے پوچھا "آج آپ کچھ اُداس معلوم ہوتے ہیں!"

"جی کچھ نہیں" اُس نے چونک کر کہا "ہاں یہ بتائیے۔ وہ وی۔ پی آپ کس رقم کا کر رہے ہیں؟"
میں نے دریافت کر کے کہا "ستائیس روپے سات آنے کا۔ خرچہ نہیں لگایا ہے"

"شکریہ" اُس نے کہا "اچھا اب ایک تکلیف آپ کو دینا چاہتا ہوں۔ ہے تو افسوس کا مقام۔ مگر میری عادت رشتہ داروں کے سامنے جھکنے کی نہیں ہے۔ اگرچہ یہاں کئی جگہ تعلق ہے۔ آپ یوں کیجئے کہ مجھے پانچ روپے دیدیجئے۔ وہ رقم بھی اسی وی۔ پی میں شامل کر دیجئے گا"

اب تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا "روپے؟ روپے تو صاحب اسوقت فالتو نہیں ہیں!"

"تو جو کچھ فالتو ہو۔ وہ دیدیجئے۔ ڈھائی روپے میرے پاس ہیں۔ دو روپے تیرہ آنے اور چاہئیں" کہتے کہتے وہ زیادہ غمگین ہو گیا۔

"کیا مطلب" میں نے پوچھا "کیا ضرورت آپڑی؟"

"جی الہ آباد تک کیلئے کرایہ"

"کیا ہوا؟ بتلائیے تو؟" وغیرہ کے جواب میں اس نے کہا "صاحب کیا بتاؤں میری بیوقوفی"

میں نے اصرار کیا تو اُداس لہجہ میں کہنے لگا "کیا بتاؤں، میرا بٹوہ گم ہو گیا۔ آج آٹھ بجے تک تو تھا۔ کچھ پھل خریدے تھے۔ پھر نہیں ملا"

پھر بھی میں نے اُسے ٹالنا ہی چاہا۔ لیکن اٹھائیس روپے کی کتابیں بک رہی تھیں۔ یہ لالچ بڑا زبردست تھا۔ غور و خوض کے بعد میں نے کہا "آفس میں تو فالتو روپیہ ہے نہیں۔ کل ستر روپے کے قریب ہیں۔ اور شام کو سو روپے پریس میں بھیجنے ہیں۔ آپ ایک کام کیجئے۔ بازار میں ہماری دکان ہے۔ میں اُنہیں ایک رقعہ لکھے دیتا ہوں۔ وہاں سے روپے آپ کو مل جائینگے"

بغیر ایک خاص نشان کے وہ دکان والے میرے رقعہ پر بھی کسی کو پائی تک نہ دے سکتے تھے۔ ایسے ہی موقعوں کیلئے انہیں پہلے سے سکھایا ہوا تھا۔

اُس نے فوراً جواب دیا "اور جو دکان پر نہ ملے"

میں بولا "اجی ملیں گے کیوں نہیں۔ کیا دو چار روپے بھی نہ ہونگے"

لمحہ بھر ٹھہر کر اُس نے کہا "جناب شریف خاندان کا لڑکا ہوں۔ اسوقت مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ آپ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے شرم کے مارے گڑا جا رہا ہوں۔ اب مجھے دکان پر بھیجکر زیادہ ذلیل نہ کیجئے"

میں متاثر ہو گیا۔ تاہم چالاکی نے ساتھ نہ چھوڑا "تو اسمیں ہرج کیا ہے۔ دیکھئے نا، یہاں تو فالتو ہے نہیں۔ شام کو پریس بھیجنا ہے"

"آپ اسوقت یہاں سے دیدیجئے۔ شام تک آدمی بھیجکر دوکان سے منگوا لینا"
اب تو میں ہر طرح سے مجبور ہوگیا۔ ایک منٹ میں کئی باتیں دل میں چکر لگا گئیں۔ اٹھائیس روپے کا وی۔ پی ہے۔ دوکان پر نہ ملے تو پھر یہاں آئیگا۔ اتنے مشہور ڈرامہ نویس کا لڑکا۔ اتنا خوددار۔ مطالعہ کا اسقدر شوقین مستقبل میں مجھ سے فائدہ کی اُمید رکھنے والا۔ کیا چار پانچ روپوں کیلئے بے ایمانی کرے گا۔ اور پھر باتوں میں بھی کہیں شبہ کی گنجائش نہیں۔
اچھی طرح سے سوچ سمجھکر منیجر صاحب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ دلوا دیا۔ اور پوچھا" یہ وی۔ پی تو بھجوا دوں نا؟"
"واہ کیوں نہیں"! اس نے ہنسکر کہا "آپ کا یہ احسان عمر بھر فراموش نہیں کرسکتا"
اور چل دیا۔
وی۔ پی بھیجا گیا اور چار دن بعد واپس بھی آگیا۔ مجھے خبر ملی۔ تو ہاتھ مل کر رہ گیا۔ بلٹی الہ آباد کے ایک ایجنٹ کو بھیجدی۔ اور ساتھ ہی نہایت انکسارانہ لہجہ میں مکند لال صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا گیا۔ ایک ہفتہ گذرا اور کوئی جواب نہیں۔ دوسرا خط لکھا گیا۔ پھر بھی جواب ندارد۔ بات بہت معمولی تھی مگر طبیعت پریشان ہوگئی۔ یکے بعد دیگرے کوئی نصف درجن خط لکھے گئے۔ بالترتیب سخت سے سخت تر الفاظ سے۔ پھر بھی کچھ نتیجہ ہونا تھا نہ ہوا۔
پانچ روپے کی بات کسی دوست کو بھی تو نہیں لکھی جاسکتی۔ اور بھلا کون پانچ روپے کیلئے تکلیف اٹھاتا۔ بیوقوفی تو سراسر اپنی تھی۔
آخر دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاکر وہ بات بھول جانے پر مجبور ہوگیا۔ اور اسے بھی تجربہ نہیں تو حصول تجربہ ہی سمجھکر رقم بٹے کھاتے لکھوادی؛

(۴)

بہت دنوں کے بعد ایک روز الہ آباد جانے کا موقع ملا۔ اسٹیشن پر اُترے۔ تو اُن پانچ روپوں کی یاد بھی آگئی۔ ارادہ کرلیا کہ اگر وقت ملا۔ تو ان کی بھی خبر لینگے۔ اب نہ افسوس تھا نہ غصہ۔ نہ دل میں پیچ وتاب کھاتا تھا نہ دانت پیستا تھا۔ گذشتہ بے وقوفی پر جو ایک قسم کی شرمندگی دل میں پیدا ہوجاتی ہے۔ بس وہی میرے دل پر بھی قبضہ کئے ہوئے تھی۔
جن کے یہاں ٹھیرا تھا۔ وہ ادبی ذوق رکھنے والے تھے۔ صبح سے شام تک سینکڑوں شاعروں مضمون نگاروں، اور افسانہ نگاروں کا شرفِ دیدار حاصل ہوا۔ وہیں سب سے میرا بھی تعارف ہوگیا۔
شام ہونیوالی تھی۔ کہ مکان میں ایک صاحب داخل ہوئے۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو مکند لال تھے۔ باریک دھوتی۔ ریشمی قمیص، ریشم کا دوپٹہ، سر پر کھدر کی ٹوپی اور منہ میں پان!
اُس نے جتنے شوق سے میرا استقبال کیا۔ اتنے ہی روکھے پن سے میں نے جواب دیا۔ میری اس حرکت کو نظرانداز کرتے ہوئے اُس نے مسکرا کر کہا۔" کہئے خوش تو ہیں۔ مجھے ابھی خبر ملی تھی۔ اسی وقت دوڑا دوڑا آیا۔ آپ سے ملنے کی بڑی حسرت تھی"

ایک دفعہ تو پانچ روپے کا ذکر کرنے کو ہوا۔ مگر پھر ایک مختصر سا جواب دیکر خاموش ہو گیا۔

اس نے کہا "اچھا اب آپ میرے ساتھ چلئے۔ کوئی عذر نہیں سنونگا۔ آپ کو میری مہمانی قبول کرنی پڑے گی۔ چلئے فوراً کھڑے ہو جائیے!"

اُسکی بات نے مجھے متعجب سا کر دیا۔ اب تو جواب بھی سنبھل کر دینے لگا۔ مگر آہستہ آہستہ رنگ چڑھنے لگا۔ اور جن کے ہاں ٹھیرا تھا۔ اُن سے اجازت لیکر کندلال کے ساتھ ہولیا۔ لیکن اب وہ پانچ روپے رہ رہ کر یاد آنے لگے

باہر ایک نئی گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ جاکر اس میں بیٹھ گئے۔ ابھی مَیں اسی شش و پنج میں تھا کہ گاڑی کا مالک یہی ہے یا کوئی اور۔ کہ اُس نے خود ہی کہا "کیسی پسند آئی آپ کو؟ پرسوں ہی تو خریدی ہے۔ روپیہ تو زیادہ لگ گیا۔ مگر حسب منشا چیز مل گئی"

بات چیت زیادہ نہ ہوئی۔ میں تو اسی چکر میں تھا۔ کہ جس آدمی کے متعلق نہ معلوم کیا کیا سوچا تھا۔ اور دفتر میں کارکنان کے سامنے دی۔ پی واپس جانے پر جسکو ہزاروں بے نقط سنائی تھیں اور دنیا بھر کے اوصاف جس شخص میں سمجھے تھے۔ کیا وہ گھوڑا گاڑی پر (اور وہ بھی اپنی) چڑھتا ہے۔

گھر پہنچے تو آنکھیں کھُل گئیں۔ شاندار حویلی۔ درجنوں نوکر چاکر اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ حویلی کا کچھ حصّہ کرایہ پر دیا ہوا تھا۔ باقی میں آپ رہتے تھے۔ بیٹھک ایسی امیرانہ شان کی سجائی تھی۔ کہ آنکھیں چُندھیا گئیں۔

کچھ دیر کے بعد انگرکھا پگڑی پہنے ہوئے ایک ضعیف آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے معمولی طور پر مجھے دیکھا۔ مکندلال نے اُن سے کہا "میرے ایک دوست ہیں۔ الہ آباد سیر کیلئے آئے ہیں" اُن کا تعارف مجھ سے نہیں کرایا گیا اور دو ایک منٹ بعد ہی وہ مجھے لیکر کمرے سے باہر آگئے۔

دوسرے کمرے میں پہنچکر اُس نے نوکروں سے کھانا منگوایا۔ میں بڑا حیران تھا۔ اور خود کو دل ہی دل میں لعنت ملامت کر رہا تھا۔ کہ کیوں ایسے شخص سے ایسا قابلِ نفرت سلوک اور اتنی ذلیل خط و کتابت کی۔

اِس کے بعد اُس نے کہا "آج تھیٹر میں چلینگے۔ سیٹیں ریزرو کرالی ہیں"

میں نے خوش ہو کر کہا "اچھی بات ہے"

مجھے کچھ کام تھا۔ اسلئے کچھ دیر کے لئے جانا چاہا۔ اس نے روکا۔ مگر میں فوراً واپس آنے کا وعدہ کرکے چلا آیا۔ جن کے یہاں ٹھیرا تھا وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ کئی دوستوں سے بات چیت کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ہنسکر بولے: "کہئے صاحب! ان سے کب کی دوستی ہے"؟

میں نے فخر سے کہا "بہت پُرانے دوست ہیں"

ایک نئے متعارف دوست جو شاعر بھی تھے۔ کہنے لگے "شکر ہے۔ ایک دوست تو ملا"

"میں نے چونک کر پوچھا" کیا؟
"صاحب ان کا تو دوست بننا بھی دوزخ میں جانا ہے۔"
"کیوں"؟
اب اس کی جو کہانیاں سنیں۔ اُن سے دِل بھر آگیا۔ کس کس کو کیسے کیسے دھوکا دیا۔ سب کچھ سُنکر میں نے بھی پانچ روپے والی بات کہدی۔
اس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
جب اُس شاندار حویلی اور گھوڑا گاڑی کا ذکر کیا۔ تو وہ مذاق اُڑا۔ کہ الامان!
وہی شاعر صاحب سب کو مخاطب کر کے کہنے لگے "آج کل تو اُس بوڑھے مارواڑی پر جال پھینک رہا ہے۔ متبنیٰ بننا چاہتا ہے"
"اجی بوڑھے کا مطلب کچھ اور ہے تم نہیں جانتے" ایک اور نے جواب دیا۔
بس ناظرین! میں اپنا قصۂ غم یہیں ختم کرتا ہوں۔ اس سے آگے کا قصہ سناؤں تو ایک اچھا خاصہ ناول بن جائے۔

طبّی چٹکلے

ٹھنڈا پانی پینے سے کیسا ہی بڑھا ہوا غصہ ہو اُس میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔
آدھے سر کا (آدھا سیسی) درد روغن بادام ناک میں ٹپکانے سے جاتا رہتا ہے۔
لہسن کا عرق ناک کے نتھنوں میں ٹپکانے یا گرم جلیبیاں نہار منہ کھانے سے بھی آدھے سر کا درد جاتا رہتا ہے۔
سیاہ مرچ باریک پیس کر چوہوں کے بلوں میں ڈال دینے سے چوہے بھاگ جاتے ہیں۔
انڈے کی سفیدی اور اَن بجھا چونا ملا کر چینی کا ٹوٹا ہوا برتن جوڑ دو۔ بہت مضبوط جوڑ لگے گا۔
گائے کے دودھ (ایک پاؤ) میں ایک لیموں کا عرق ڈال کر پیو۔ دو تین مرتبہ میں بواسیر کا خون بند ہو جائیگا
شہد کی مقدار سے نصف سہاگہ لیکر اور ملا کر لگانے سے پھٹے ہوئے ہونٹوں کو آرام ہو جاتا ہے۔
زیادہ گرم غذا کھانے۔ یا زیادہ گرم دودھ یا چائے سے بصارت کمزور ہو جاتی ہے۔
شیر خوار بچوں کو ترش چیز نہ کھلاؤ۔ نقصان دہ ہے۔
اگر کسی کو ناگہانی غش آجائے تو اُسے پیٹھ کے بل فرش پر لٹانے سے جلد ہوش آجاتا ہے۔
جس کسی کو نیند نہ آتی ہو یا کم آتی ہو تو روغن خشخاش تالو پر ملیں۔ نیند آجائیگی۔

محترمی عیش صاحب کا یہ غم انگیز مگر دلچسپ فسانہ اس لحاظ سے خاص طور پر توجہ سے پڑھنے کے قابل ہے کہ اس میں موصوف نے اس امر کی انتہائی کوشش فرمائی ہے۔ کہ سوائے ایک دو مخصوص اصطلاحات یا اسمائے معرفہ کے سارا افسانہ ایسی صاف اور سلیس اردو میں لکھا جائے۔ جو عربی۔ فارسی یا سنسکرت کی مشکل ترکیبوں سے پاک ہو۔ اور اس کوشش میں بلاشبہ ممدوح بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ "فسانہ نمبر" کی دلچسپیوں کو بڑھانے اور اسکی گوناگوں خصوصیتوں کو پیش از پیش کرنے میں اس طرز کے فسانہ کا بھی حصّہ ہے ۔ اور ہم عیش صاحب کی اس جدت کی داد دیتے ہوئے شکر گذاری کے ساتھ فسانہ کو درج کرتے ہیں (اسماعیل)

ذیل کا واقعہ وداعِ ظفر سے لیکر ناموں کے سوا عربی فارسی کے لفظ نہیں آنے دیئے۔ بظاہر جو کوئی ایسا لفظ معلوم ہوگا۔ وہ دراصل معنوی یا لفظی تصرّف سے اپنے اصلی معنی پر نہ رہا ہوگا۔ اردو بنگیا ہوگا۔ ایسے لفظوں پر خط کھینچ دیا ہے۔ انہیں اردو سمجھنا چاہئے۔ (عیش امروہوی)

محمود مرزا سا گبھرو اپنے جوبن کے دنوں میں تو جیسا ہوگا ہوگا ہی۔ اس بڑھاپے میں بھی، اپنے جیسے سینکڑوں میں ایک تھا۔ سچ مچ سے جنھوں نے دیکھا ہے۔ ان کی آنکھوں میں انکا بانکپن اور کس بل اب تک پھرتا ہے۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں شربتی کا اکہرا انگرکھا پہنے ہوئے پیٹھ سے پٹی باندھے ہوئے۔ منہ پر لالی۔ کھڑی مونچھیں۔ چڑھی ڈاڑھی تنتے ہوئے ڈنڈ۔ گٹھی ہوئی کاٹھی پر ہر کسی کی آنکھ پڑتی تھی۔ تڑکے سویرے اکھاڑے میں گھسے۔ ڈنڈ پیلے۔ بیٹھکیں کیں۔ مگدر ہلاتے۔ ڈھائی تین گھنٹے تک کسرت کرکے پسینے پسینے ہوگئے۔ وہیں کڑھاؤ میں دس سیر دودھ چڑھا ہوا ہے۔ جو آدھ ٹتے اونٹتے مسا کر کے سیر تین پاؤ رہ گیا۔ اسکو پی پلا کر گھر آئے۔ اب منہ سلونا کرنے کو سیر بھر گھی ڈلی ہوئی روکھی روٹیاں چکھ گئے۔ پھر بھی اسکی کھانے میں کوئی گنتی نہ ہوتی۔ کپڑے بدلے، حضور کے مجرے کو چلے۔ تو اس روپ سے چلے کہ بڑے پائینچے کا پجامہ ڈالے۔ اسپر دودھ کا انگرکھا پہنے لیس دار ٹوپے اوڑھے، جدھر نکل گئے انگلیاں اٹھ گئیں۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا۔ اسکے چلتوں ڈیل بھی بھاری مسٹنڈ بنے پھرتے تھے۔ چکن اور شربتی چھوڑ کبھی بھولے بسرے ململ کا کرتا گلے میں ڈال لیا۔ تو پھوٹا پڑتا تھا۔ ان دنوں مرزا لال کنڈی

بنے ہوئے تھے کبھی کبھار سیر ڈیڑھ سیر تک گھی کی پتیلی منہ سے لگا کر ختم کر دیتے۔ سننے والے اچنبھا نہ کریں۔ تو کیا کریں۔ یہ جب کی بات ہے۔ جب دودھ پیسے سیر اور گھی پانچ سیر کا تھا۔ مجرے سے نمٹ کر گھر آتے۔ تو کھانا پکا ہوا پایا۔ بھنے ہوئے ڈھائی سیر کے بسیندے، سیر بھر گھی کے چار پراٹھے چورم چور سامنے آتے۔ یہ سب کو یوں اڑا گئے۔ کہ ٹکڑا تک نہ بچا۔ کھا چکے تو پلنگ پر لیٹے۔ ابھری ہوئی گڑگڑی آئی۔ مگر کیسا تو آ یہ سلفچیا تو انہیں کہ دو گھونٹوں میں بھڑک گیا۔ نہ تو اجس کے نیچے پاؤ سیر دور سے ٹکیا جمی ہوتی ہے۔ دھیمی دھیمی اپلے کی آنچ میں گھٹ کر سلگا تو کئی گھنٹے تک چلا۔ ایک ہی چلم نے دس بیس کو چھکا دیا۔

یہی محمود مرزا جسکی چھاتی چھاج کی سی پھیلی۔ جس کا اٹھان بوٹے سا اور جس کا ڈیل گینڈے سا ہوا۔ وہ جس کی مستی ہاتھی کے آگے خم ٹھوکتی تھی۔ بڑھاپے کے ایک ہی تھپڑے میں چور چور ہو گیا۔ دلدروں کی کیچڑ میں لت پت ہو کے دکھ کے گارے میں ایسا پھنسا اور دھنسا کہ نکل نہ سکا۔ مرے کو ماریں شاہ مدار۔ اک اکیلے مرزا کے سامنے جی ہرانے والی کھکھیڑوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ نہ جانے کون بری گھڑی میں بڑھاپا آیا تھا کہ جدھر تدھر سے بپتا ہی بپتا کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ جس کا روپ ہر گھڑی پھول ایسا کھلا رہتا تھا۔ اب اس کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی مسکراہٹ نہ آتی تھی۔ اور آسکتی بھی نہ تھی۔ جو رات آتی اپنے ساتھ کوئی نہ جھمیلا لاتی۔ اور ہر دن الجھتے الجھاوے بڑھتے ہی جاتے۔ دو پلے پلائے لڑکوں کو مٹی میں توپ دیا۔ ایک بچول والی لڑکی کو اپنے ہاتھوں سے گاڑ دیا۔ اسپر پچیس روپے مہینہ گھٹتے گھٹتے نو روپیہ پر آگیا۔ یہاں تک بھی لشتم پشتم بسر ہوتی رہی۔ ہاں بچوں والی ماں نے جو پچاس برس کی ساتھی تھی۔ خنگل لبا کے مرزا کی پیٹھ اور جھکا دی۔ اور اپنی جگہ مرگی کا چکر چھوڑ گئی۔ یہ پہلے پہل جب آیا ہے۔ تو ایک مرا ہوا مچھ مچھاتے ڈیل کا مرنے والا سامنے اور اسکی بھری چارپائی آنکھوں کے آگے تھی۔ پھر سب سے پیچھے اس دن آیا۔ جب بیوی یعنی سدا کے ساتھی نے سدھارنے کی ٹھان لی۔ اور چل بسی۔

مرزا کی ساری کمائی لے دے کے ایک لڑکی "فرخ سلطانہ" رہگئی تھی۔ اور ایک بنگالی مینا بچ گئی تھی۔ فرخ۔ دارو غہ توشے خانے کے جنوائی "مرزا احمد" کے لڑکے سے بیاہی گئی۔ جب تک سماں اچھا رہا اور بات بنی رہی سمدھیوں میں بڑا میل جول رہا۔ پر جب پاسا پلٹا۔ اور بگڑی تو مرزا میں سینکڑوں کیڑے نکل آئے۔ ان کے ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی۔ سجھائی تھوڑا دینے لگا رات کو تو گھر سے باہر نکل ہی نہ سکتے تھے۔ دن کو بھی مرگی کا ڈر رہتا۔ کیا جانے کب اور کہاں آجائے۔ اسلئے کوئی ایسی ہی بات ہوتی۔ تو کہیں آتے جاتے۔ ہاں اس اجڑے راج پر براجنے والے سے کچھ ایسا پیار تھا۔ جو مرزا کو کسی نہ کسی بہانے گھنٹہ آدھ گھنٹہ وہاں کھینچ لے جاتا تھا۔ ان کا جی بھی مرزا سے ملا ہوا تھا۔ یہ کبھی نہ جاتے تو گھڑی آدھ گھڑی دیکھ کر وہ بھی بے بلائے نہ رہتے۔

مرزا کا ٹھاٹھ دیکھنے والے دس بیس نہیں اب بھی بہت تھے۔ جن کے آنکھیں تھیں۔ انہیں انکی بپتی بہت کچھ سکھاتی تھی کون سی ایسی نئی گھڑی نہ آئی۔ جس کی چھری تلے مرزا انہیں پھڑ پھڑاتے۔ اور جس نے ان کے کلیجے میں چر کے نہیں لگائے۔

نہوت نے اور بھی دھجیاں اڑا رکھی تھیں۔ اب جو فرخ کا بیاہ آیا۔ تو پانچسو روپے پانچ روپیہ مہینے کے بیاج پر مہاجن سے اُدھار لیئے۔ جو زنی کے پھول پھل کو گنوا لیتا تھا۔

ہاں اس بات کا کسی اور کو پتہ نہ تھا۔ اک مرزا ہی کو گھُن لگ رہا تھا۔ رہا سہا جو کچھ تھا۔ وُہ تین تیرہ ہو رہا تھا۔ اک اک پیسے کو تکتے تھے۔ ٹکڑا تک نہیں جُڑ نا تھا۔ پر یہ انہیں بانکوں کا جگرا اور انہیں کی آن اور اگلے لوگوں ہی کی سج دھج تھی۔ کہ سب کچھ سہ گئے۔ اور مُنہ سے بھاپ نہ نکالی۔ مرزا کا بھرا پڑا گھر یوں ملیا میٹ ہوا کہ بات تک کرنے کو کوئی نہ رہا۔ اکیلے ٹوڑوں ٹوں رہ گئے۔ جہاں ادھم مچی رہتی تھی۔ وہاں سناٹا ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے۔ ان پر جتنا بھی ترس آئے تھوڑا ہے۔ سو برس کے لگ بھگ راج کیا۔ جو دن کاٹے آن بان سے کاٹے۔ دس پانچ آدمی کام کاج کو ڈیوڑھی پر رہتے۔ اب وہی مرزا ہیں۔ آج مرتے وقت ان کے پاس کوئی اتنا نہ ہوگا۔ جو دیا جلا کر ان کے منہ میں دو بوند پانی ٹپکا دے۔ سب دن کی پونجی دو جی تھے۔ وُہ بھی سُن لو کیسے تھے۔

ایک تو لڑکی سلطانہ وہ اپنی نہیں پرائے گھر کی۔ دوسری مَینا وہ بے سمجھ۔ مرزا احمد سلطانہ کے دُولھا۔ کبھی لہر میں آتے تو بہو کو باپ کے گھر دو ایک دن کو بھیجدیا۔ نہیں تو مرزا تھے۔ اور اتنا بڑا گھر جو کاٹے کھاتا تھا۔ یہ کٹھن دن اور دُکھ بھری راتیں بنگالن مَینا کے ساتھ باتیں کرتے کٹ جاتے تھے۔ اسلیئے ان دنوں مرزا کی چاہت سب کی سب سمٹ سمٹا کر اسی بنگالن مَینا پر آ گئی تھی۔

اَب تو یہ ریت ہی اٹھ گئی۔ مگر ۱۸۵۷ء کے بلوے سے پہلے اور اس کے پیچھے بھی بہت دن تک ایسا ہوتا تھا جب ساون آتا۔ لڑکیاں جھولا جھولنے میکے آتی تھیں۔ اب بھی برسات میں یہ گیت سُننے میں آتا ہے۔ جو اُسی ریت کا پتہ بتاتا ہے "کڑاری ہنڈولا مرے بابل گھر" مرزا احمد کسی ریت پر کیونکر چلتے۔ اور چلتے تو کس کے برتے پر چلتے۔ سُسرے ملے تھے، تو ایسے، جن کا دھن مایا سب تہس نہس ہو چکا تھا۔ اور جنہیں اُن کا آپا بھی رو چکا تھا۔ کسی گوں کے نہ رہے تھے۔ پر نہ معلوم کیا سوچکر احمدؔ نے اپنی فرخ سلطانہ کو چار دن کے لئے میکے بھیجدیا۔ "موتی مسجد" کے پاس پورب کو پیپل کا بھرا ہوا پیڑ تھا۔ اس میں جھُولا پڑا۔ اور لڑکی بالیاں اکٹھی ہوئیں۔ رات کے فرلٹے میں فرخ کا گانا نفیری سا گونج رہا تھا۔

مرزا محمود یوں تو اس جوگے بھی نہ رہے تھے۔ جو ان باتوں سے انہیں کچھ پھریری آتے۔ پھر بھی سماں کچھ ایسا بندھ گیا تھا جس سے جی میں گدگدی ہوتی تھی۔ بچی کا اُمنگ بھرا جی۔ سہیلیوں کی ہنسی دل لگی۔ اَل بَل چہل بل۔ تانیں لیتے ہوئے جب اُس نے جھُولتے جھُولتے پینگ بڑھائے۔ تو پیپل ناشُدنی نے دھوکا دیا۔ اور جانہار فرخ گری۔ گرتے ہی سر ایک پتھر سے جا ٹکرایا۔ اتنی کڑی چوٹ کھائی کہ آپے میں نہ رہی۔ وہاں سے اُٹھا کر لوگ گھر پر لائے۔ سویرا ہوتے ہی بچی کا منکا ڈھلنے لگا۔ مرزا اس گھڑی اکیلے تھے اور گھبرا رہے تھے۔

کیسی بُری گھڑی تھی۔ یونہی ستیاناسی کا ڈراؤنا بھوت جب دیکھو، چاروں طرف دکھائی دیتا رہتا تھا۔ بھلے دن بیتے

ہوئے برس ہو چکے تھے۔ اب تو گھر کے پاکھوں تک پرنیستی لِس رہی تھی۔ جس کے ہاتھ پہلے کتنی کلیجے کے ٹکڑوں کو مٹی دے چکے ہوں۔ اس کے ساتھ ابھی یہ ہونا اور بدا تھا۔ کہ اپنے بڑھاپے کی ٹیک ایسی سیانی سُندر لڑکی کو مرتے دیکھے آنکھ لہو سے لت پت سر کو دیکھ رہی تھی۔ اور ہاتھ پیاری فرخ کے منہ میں پانی کی بوندیں ٹپکا رہے تھے؛

بات ایسی ہی تھی۔ جو مرزا کو جس جوکھم میں ڈالتی تھوڑا تھا۔

تڑکے ہی تڑکے مرزا کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ جب باپ کی اندھی آنکھوں نے بچّی نے مکھڑے کو کملایا ہوا دیکھا تو گھائل کلیجے میں درد کی ہوکیں اٹھنے لگیں۔ بلبلا کر ہاتھ گلے میں ڈال دیئے۔ بچّی نے بھی آنکھیں کھولیں۔ چٹی ڈاڑھی کو چوما دیکھ آنسو پونچھنے لگی۔ اور ہلکے سے کہا" باوا جان جی نہ کڑھائیے" وہ مرزا جس نے کسی بیری کی کٹاری کا ڈیڑھ انگل پھل کھایا اور اُف نہ کی۔ اس سمے پاگل بنا ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔ اس کے کانوں نے" باوا جان" کی ہلکی سی پکار سنی۔ بیٹی کے ہونٹوں پُرھکا۔ تو گلا سوکھا ہوا اور جیب میں کانٹے پڑے ہوئے دیکھے۔ بچی نے جیبھ دکھائی۔ تو مرزا کلیجے پر گھونسے مارتے ہوئے اُٹھے اور تو کچھ نہ تھا۔ چلّو سے پانی کی بوندیں ٹپکائیں اور رو کر کہا:" بیٹی جو کام تیرے کرنے کا تھا۔ وہ مجھ سے لے رہی ہے"

اسکے پیچھے جو کچھ ہوا وہ دھیان میں نہیں آتا۔ اور میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ فرخ اس کے کتنے پیچھے مری۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ تیسرے چوتھے دن عید تھی۔ سویرے سویرے لوگ باگ عید منانے میں لگے ہوئے تھے۔ اور مرزا اپنی بچی کی جدائی میں بولا کر دیوار سے سر پھوڑ رہے تھے۔ جب جی زیادہ بگڑا۔ تو کہا چلو اس کے ڈھیر سے لیٹوں اور کلیجا ٹھنڈا کر لوں۔ ایکا ایکی نگاہ مینا کے پنجرے پر پڑی۔ اُٹھے۔ دانہ پانی ڈالا۔ پیار کیا۔ چمکارا۔ آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ اتنے میں بھاگ پھوٹے۔ سمدھی کے گھر میں مرزا احمد یہ کہتا ہوا سامنے آ گیا:-

" محمود! کیسے آدمی ہو۔ مرنے کو بیٹھے ہو۔ پر روپیہ کا لالچ اب بھی نہیں گیا۔ بہو جو چیز پہنکر آئی تھی۔ اسمیں چمپا کلی بھی تو تھی"

محمود۔" صاحب عالم" میں تو کچھ جانتا نہیں۔ گہنا بی بیوں ہی نے اتارا۔ انہیں نے بھیجا۔ مجھے چور چکارا نہ سمجھو"

احمد" لاؤ چمپا کلی دو"

محمود" بھلا" صاحب عالم" آپ کے کہنے کی باتیں ہیں۔ میں نے تو آنکھ سے بھی نہیں دیکھی۔ اتنی دھین دھوکڑی نہ کرو میں پہلے ہی بھاگوں کا ستایا ہوا ہوں۔ مجھے ستا کر کیا لو گے"

احمد" محمود بہت باتیں نہ کر چمپا کلی رکھوا لوں گا۔ چھوڑوں گا نہیں۔ یہ باتیں کسی اور سے بنا"

محمود" میاں گھر تمہارے سامنے پڑا ہے۔ دیکھ لو"

احمد" گھر کے اور میاں کے نیچے چمپا کلی رکھدے"

محمود" صاحب عالم" جی کے بھیدوں کو جاننے والا جانتا ہے۔ تمہاری چمپا کلی میں نے لی ہو تو مجھے سانپ ڈسیں"

احمد۔ سوگند سے کہتا ہوں چمپا کلی تجھ سے لوں اور تیرے باپ سے لوں۔"

احمد کی آنکھیں تنتے سے لال ہوگئیں۔ اس نے سامنے مینا کا پنجرا دیکھا۔ اتار کر کھڑکی کھول لی۔ مینا کو باہر نکال ٹانگیں پکڑ لیں اور کہا چمپا کلی دے۔ نہیں ٹانگیں چیر کر پھینکتا ہوں۔"

دکھیا محمود ہاتھ جوڑ کر اٹھا اور کہنے لگا "خدا کے واسطے کچھ ترس کھا۔" احمد کے تنتے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ کہا چمپا کلی؟" محمود نے قدموں پر گر کر کہا "مجھے پتہ نہیں۔" احمد نے نہ مانا۔ ٹانگیں چیرنے لگا۔ تو محمود نے کہا "سو برس میں میری پونجی یہ مینا رہ گئی ہے اس کا مرنا نہ دکھا۔" مگر احمد آپے سے باہر تھا۔ ٹانگیں چیریں۔ تو ادھر مینا چلائی۔ ادھر محمود چیخ مارتا ہوا یہ کہکر گرا۔ "ارے پاپی کیا کردیا۔"

محمود کو مرگی کی باری اب کے اسکو لینے آئی تھی۔ مردہ مینا اور بے آپ محمود دونوں آمنے سامنے پڑے تھے۔ احمد کے لڑکے نے آکر کہا "چمپا کلی مل گئی۔ گھر میں ہے۔"

مرزا محمود اس کلیجے کی چوٹ سے بچ نہ سکے۔ حضور کو خبر پہنچی۔ دانتوں میں انگلیاں دے لیں۔ وہی عید کی رات۔ اور رنگ رلیاں منا رہی ہیں۔ آدھی رات کے بعد "مشاعرہ" کا جمگھٹا ہوا۔ جو لوگ کچھ کہکر لائے تھے۔ اسکی واہ واہ لے رہے تھے۔ غالب و ذوق دونوں نے پڑھا۔

بادشاہ آج چپ تھے۔ ایکا ایکی سر اٹھایا۔ ذوق کی طرف دیکھا اور کہا "میاں محمود کے مرنے نے اس غزل کا مقطع کہلوایا ہے ؎

ظفر آدمی اسکو نہ جانئے گا، گو ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی۔ جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا۔"

بخار کس کس شخص کو اور کب آتا ہے؟

۱۔ کم محنت لڑکوں کو امتحان سے پہلے۔
۲۔ سینماؤں اور تھیٹر والوں کو فری پاسوں سے۔
۳۔ افیونیوں کو بارش سے۔
۴۔ بھلے مانسوں کو گھر کے دروازہ پر پولیس سے۔
۵۔ امیدوار وکالت کو نئے نئے ایکٹوں سے۔
۶۔ خریدار اخبار کو وی۔ پی سے۔
۷۔ دیہاتیوں کو چپڑاسیوں کی رسد سے۔
۸۔ اخباروں کو پریس ایکٹ سے۔
۹۔ خاوند کو مالدار جورو کی دھمکیوں سے۔
۱۰۔ نادہندوں کو ملازموں کے تقاضہ تنخواہ سے۔

موجودہ دور کے اردو شعراء میں جس قدر لطیف اور پُرلطف اشعار اکبر الہ آبادی کے ہوتے ہیں۔ نہ اُس کے بیان کرنے کی حاجت ہے۔ اور نہ اس کیلئے دلیل کی ضرورت۔ اہلِ ذوق کلیات اکبر کو پڑھتے ہیں اور لُطف اٹھاتے ہیں۔ فسانہ نمبر کیلئے جس وقت بلند پایہ افسانوں اور دلچسپ ترین نظموں کی تلاش زور شور سے ہو رہی تھی۔ تو میرے دل میں خیال آیا۔ کہ لاؤ کیوں نہ خان بہادر اکبر حسین اکبر الہ آبادی کو بھی ہم فسانہ نمبر کی زینت بنائیں۔ ممدوح کے اشعار جہاں اعلیٰ درجہ کے ناصحانہ اور اخلاقی ہوتے ہیں۔ وہاں سینکڑوں اشعار آپ نے ایسے بھی کہے ہیں کہ پڑھتے جاؤ اور ہنستے جاؤ۔ چونکہ فسانہ نمبر کا مقصد ہی ادبِ لطیف کا بہترین نمونہ پیش کرنا اور ناظرین کے لئے سامانِ تفنن و تفریح مہیا کرنا ہے۔ لہذا یہ اشعار ان مرغن اور چٹپٹے کھانوں کے ساتھ ادبی دسترخوان پر ایک مزیدار چٹنی کا کام دیں گے۔ ان اشعار میں خوبی یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی بھی موجود ہے اور نصیحت کی بھی۔ جہاں ان کو پڑھکر بے اختیار لب متبسم ہو جاتے ہیں۔ وہاں فوراً دل یہ بھی کہتا ہے کہ "بات تو پتے کی کہی" امید ہے کہ ناظرین اس انتخاب کو پُرلطف اور موقع کی چیز پائیں گے۔ اور اگر ان کو پڑھنے سے "ہنسوں کا بھلا" ہو جائے۔ تو ہم سمجھیں گے کہ محنت ٹھکانے لگی۔ (اسماعیل)

---

۱ مجھ سے سب یہ کہتے ہیں کہ نیچی رکھ نظر اپنی — کوئی اُن سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر

۲ پوچھا کہ شغل کیا ہے کہنے لگے گرو جی! — بس رام رام جپنا چیلوں کا مال اپنا

۳ شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں — میں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں

۴ گرجا میں تو کرنیل و کمشنر بھی ہیں موجود — مسجد میں کوئی ڈپٹی و منصف بھی نہیں ہے

۵ جب کہیں ملتا ہے کرتا ہے نہ ملنے کا گلہ — اور جو ملنے جاتا ہوں مردِ خدا ملتا نہیں

۶ جدِ امجد خود میں کرتے تھے یہ موسم بسر — ہم کو اپنے عہد میں پالا پڑا ارکنٹوپ سے

۷ جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل — ہیں نہایت خوشنما دو جیم اُن کے ہاتھ میں

۸ انہیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی — نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

۹ آبرو چاہو اگر انگریز سے ڈرتے رہو — ناک رکھتے ہو تو تیغِ تیز سے ڈرتے رہو

نہایت خوشنما پتھر پڑے ہیں عقل پر اُن کی ۱۰ جنہیں تسکین بے لعل و زمرد ہو نہیں سکتی

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں ۱۱ کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

تمہاری پالسی کا حال کچھ کھلتا نہیں صاحب ۱۲ ہماری پالسی تو صاف ہے، ایماں فروشی کی

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں ۱۳ کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

آئی ہو گی کسی کو ہجر میں موت ۱۴ مجھ کو تو نیند بھی نہیں آتی

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند ۱۵ کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں

میں تو آنکھوں میں جگہ دینے کو حاضر تھا جسے ۱۶ نیند ظالم سے یہ پوچھو کہ کبھی آئی بھی!

وضع مغرب کچھ کر دیکھا تو یہ کافور تھی ۱۷ اب میں سمجھا واقعی ڈاڑھی خدا کا نور تھی

تعجب ہے مجھے ان شاعروں کے شور و غوغا پر ۱۸ کوئی پوچھے کہ تم کو کیا جو کوئی خوبصورت ہے

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے ۱۹ اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے!

ہمارا خنجر بھی بدنما ہے اور ان کی سوئی بھی ہے وہ آفت ۲۰ کہ صاف بھی ہے چمک بھی رکھتی ہے گول بھی ہے مہین بھی ہے!

دیکھو جسے وہ پائنیر آفس میں ہے ڈٹا ۲۱ بہرِ خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے!

سدھائیں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے ۲۲ وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو ۲۳ طولِ شبِ فراق کو تو ناپ دیجئے

مسلمانوں کو لطفِ عیش سے جینے نہیں دیتے ۲۴ خدا دیتا ہے کھانا شیخ جی پینے نہیں دیتے

نہ کچھ انتظارِ گزٹ کیجئے! ۲۵ جو افسر کہے بس وہ جھٹ کیجئے

حاضر ہوا کروں گا میں اکثر حضور میں ۲۶ آج اچھی طرح سے مجھے پہچان لیجئے

پردہ درکی رائے سنکر بی بیاں کہنے لگیں ۲۷ اب ہم ہمارے وارث ایسے ہی لگوڑے رہ گئے

سمجھے جو کوئی بُرا یہ مضمون نہیں ۲۸ کوئی پہلو خلافِ قانون نہیں

ہر چند کہ یہ مزے چکھاتا ہے بہت شیطان کا کوئی شخص ممنون نہیں

حسرت بہت ترقیٔ دختر کی تھی انہیں ۲۹ پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی ۳۰ "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"

لیکن اخلاق نظر میں اس سے تو بہتر ہے وہ من ترا باجی بگویم تو مرا باجی بگو

کہ ہستم اسیرِ کمیٹی و چندہ ۳۱ کریما بہ بخشائے بر حالِ بندہ

جوانی کیا تھی نخرے نے مجھے بیگار پکڑا تھا ۳۲ اٹھانا پڑتا تھا دن رات بارِ الفتِ خوباں

۳۳ کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے کہ بیٹا! تو اگر کر لے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی! کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدردانی آپ نے کی! مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرنداس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود! نہیں منظور مغزِ سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس

۳۴ عمر گذری ہے اسی بزم کی طراری میں دوسری پشت ہے چندے کی طلبگاری میں

۳۵ تعجب سے کہنے لگے بابو صاحب گورنمنٹ سید پہ کیوں مہرباں ہے؟
اسے کیوں ہوئی اس قدر کامیابی کہ ہر بزم میں بس یہی داستاں ہے
کبھی لاٹ صاحب ہیں مہمان اس کے کبھی لاٹ صاحب کا وہ میہماں ہے
نہیں ہے ہمارے برابر وہ ہرگز دیا ہم نے ہر صیغے کا امتحاں ہے
وہ انگریزی سے کچھ بھی واقف نہیں ہے یہاں جتنی انگلش ہے سب بر زباں ہے
کہا ہنس کے اکبر نے اے بابو صاحب! سنو مجھ سے جو رمز اس میں نہاں ہے
نہیں ہے تمہیں کچھ بھی سید سے نسبت تم انگریزی داں ہو وہ انگریز داں ہے

۳۶ کیسہ خالی ہے بجس خالی جو کچھ ہے یہاں پلپیٹ میں ہے

۳۷ جب تک ہم میں ہے قومی خصلت باقی بیشک پردے کی ہے ضرورت باقی!
چالیس برس کی بات ہے یہ شاید بعد اس کے رہیگی پھر نہ حجت باقی

۳۸ حکام پہ بم کے گولے ہیں اور مولویوں پہ گالی ہے کالج نے یہ کیسے سانچوں میں لڑکوں کی طبیعت ڈھالی ہے

۳۹ یہ قومی ترقی بھی ہے پریوں کا فسانا کانوں سے سنا سب نے پر آنکھوں سے نہ دیکھا

۴۰ کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

۴۱ بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

۴۲ وہ مس بولی میں کرتی آپکا ذکر اپنے فادر سے مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے پاگل کا مافک ہے

۴۳ پانیر کے صفحۂ اول میں جس کا ذکر ہو میں ولی سمجھوں، جو اس کو عاقبت کی فکر ہو

کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس ہاں کی ۴۴ عہدوں سے آرہی ہے صدا دور دور کی

لگی لپٹی ہر اک سے یہ بری عادت تمہاری ہے ۴۵ مری جاں اسمیں اکدن احتمال فوجداری ہے

زمانہ کہہ رہا ہے سب سے پھر جا ۴۶ نہ مندر جا۔ نہ مسجد جا نہ گرجا

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا ۴۷ پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں ۴۸ جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

کہتے ہیں وہ کہ اکبر کچھ باؤلا ہوا ہے ۴۹ مذہب میں بات کیا ہے مسجد میں کیا دھرا ہے

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں ۵۰ یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے ۵۱ ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پا گئے

کچہریوں میں ہے پرستش گریجویٹوں کی ۵۲ سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور مٹیوں کی
نہیں ہے قدر تو بس علم دین و تقویٰ کی خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

ممبری سے آپ پر تو وارنش ہو جائیگی! ۵۳ قوم کی حالت میں کچھ اس سے جلا ہو یا نہو

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہدیا ۵۴ آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے،

امید چشم مروت کہاں رہی باقی ۵۵ ذریعہ باتوں کا جب ٹیلیفون ہوا

ہم تو انساں سے بنے جاتے ہیں بندر اے حضور! ۵۶ آپ خوش قسمت تھے بندر سے جو انساں ہو گئے۔

نگاہ گرم کرسمس میں بھی رہی ہم پر ۵۷ ہمارے حق میں دسمبر بھی ماہ جون ہوا

بے پاس کے تو ساس کی بھی اب نہیں ہے آس ۵۸ موقوف شادیاں بھی ہیں اب امتحان پر

میں کب کہتا ہوں اے واعظ! کہ میں نے راز دیں سمجھا ۵۹ فقط اتنا ہی سمجھا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا

کر لیا بی بی نے اُن کی انٹرنس اس سال پاس ۶۰ والدہ صاحبہ تو ہیں خاموش لیکن خوش ہیں ساس

آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں لیکن اک اکھاڑہ قائم ہے ۶۱ جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں

بنے بندر سے ہم انساں ترقی اس کو کہتے ہیں ۶۲ ترقی پر بھی نیٹو، بدنصیبی اس کو کہتے ہیں!

آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد ۶۳ لیکن اڑ جاتی ہیں ساری غفلتیں دو فیر میں

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے ۶۴ بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

کیا مشرقی کفن بھی وہ ترک کر سکیں گے ؟ ۶۵ اوضاع مغربی میں جو غرق سر بسر ہیں

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی ۶۶ یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی؟

مقبرۂ ہیر رانجھا واقع جھنگ

سید طالب علی صاحب طالب
بی۔اے۔ الہ آبادی
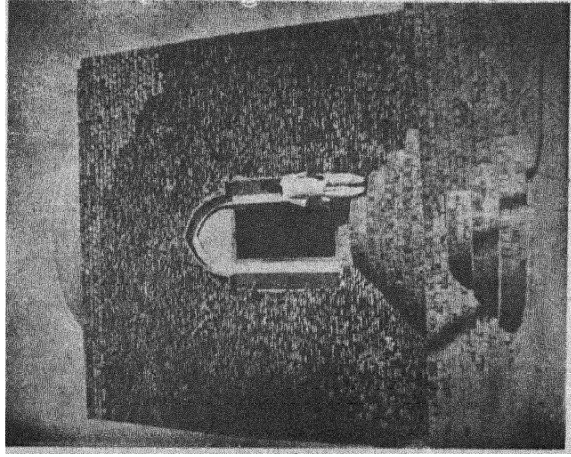
بابو نظام الدین صاحب
مہتمم گیلانی پریس

RISALA RAHNUMA-I-TALIM RAM GALI, LAHORE.

سید اشفاق حسین صاحب منشی فاضل ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔
(علیگ)

مولوی شاہ ولی یمینی صاحب بی۔ اے۔ (آنرز)

(۱)

ہم تینوں ایک عالیشان قدیم مصری محل کے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ محمود بے سابق جج قاہرہ (مصر) بمبو پنشن یافتہ میڈیکل آفیسر اور میں۔ مصر کی حکومت کے نئے دَور کے متعلق محمود بے کا سلسلۂ کلام جاری تھا۔ بمبو خاموش تھا۔ اور میں تاروں بھری رات کے مسحور کن منظر کی لطف اندوزی میں محو۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے موضوع کلام کو بدلنے کی خاطر کہا "ہاں محمود بے آپ نے کچھ اس لرزہ انگیز مقدمہ کے متعلق بھی پڑھا جس کا آجکل انگریزی اخبارات میں بہت چرچا ہے"۔

محمود بے۔ میں شاذ و نادر ہی غیر ملکی اخبارات کے مطالعہ کی زحمت گوارا کرتا ہوں۔ اس لئے کہ خود ہمارے اخبارات صحافت نگاری کے اعلےٰ معیار پر نکل رہے ہیں۔ ہماری سب ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ خبریں بھی تازہ بہ تازہ نو بہ نو ہوتی ہیں۔ نقد و نظر کافی سلیقہ سے کی جاتی ہے۔ وہ ہمارے احساسات اور خیالات کی نہایت صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ اور سیاسیت حاضرہ پر بے لاگ مضامین شائع کرتے ہیں۔ غیر ملکی مسائل کے مطالعہ کا موقعہ بھی ان کے کالموں میں مل جاتا ہے۔

میں۔ تو کیا آپ کو غیر ملکی عدالتوں کے مقدمات سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم ہمیشہ لوگوں کے خیالات و آرا۔ پیچیدہ مقدمات کے فیصلے خواہ وہ کسی ملک کے ہوں کیا وہ ایک لائق جج کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہیں کراتے۔

محمود بے۔ جس مقدمہ کا آپ ذکر کر رہے ہیں اس کے متعلق میں نے "اہرام" میں پڑھا ہے۔

ہم اس مقدمہ کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے رہے۔ میں نے واقعات مقدمہ کو اپنے حافظہ میں تازہ کرنے کے لئے نوکر کو کہا کہ میز کی دراز سے اخبار نکال لائے۔ وہ لایا اور میں نے فاضل جج کے فیصلہ کو باواز بلند پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ اس مقام پر پہنچا۔

"فطرتِ انسانی کی اعجوبہ کاریاں بھی فہم انسانی سے بالاتر ہیں۔ ممکن ہے کہ اس قتل کا ارتکاب قاتل کے انتہائی جذبات رحم و محبت پر مبنی ہو اور وہ مقتول کے ساتھ نہایت مشفقانہ سلوک روا رکھنا چاہتا ہو اور اس کا خاتمہ ضروری سمجھا گیا ہو۔"

بمبو نے میری طرف نگاہِ حیرت سے دیکھ کر کہا کہ جج کا ریمارک نہایت ہی دانشمندانہ ہے اور حیاتِ انسانی کے

نہایت گہرے مطالعہ کا شاہد۔

ایک عالمِ نفسیات کے واسطے اس سے زیادہ اور کیا دلچسپ مشغلہ ہوگا۔ کہ دورانِ سماعت میں جو کچھ جج کے دماغ میں گذرتا ہے اس کا مطالعہ بغور وخوض کرے۔ میں تو تصویرِ حیرت بن جاتا ہوں۔ جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ عالمِ خیال میں جج کس طرح مدعی اور مدعا علیہ کے دماغوں کی تیرہ وتاریک گلیوں میں گذر کرتا ہے۔ اس کی توجہ سے جزئیات بھی بچ کر نہیں جاتیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ایکٹر مجرم کی ہستی میں اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے لیکن جج اس سے بھی بڑھ کر مجرم کی روح تک اپنے لئے گذرگاہ نکالتا ہے۔

"جج اگر جذباتِ انسانی سے مجبور ہو کر اگر کچھ کرنا بھی چاہے تو قانون کا سنگین ہاتھ اسے نہایت سختی اور خشونت سے روک دیتا ہے۔"

محمود بے نے مسکرا کر کہا۔

بمبو۔ آج کی گفتگو سے مجھے اطالوی میاں بیوی کا مقدمہ یاد آتا ہے۔ شائد آپ کو بھی یاد ہو۔

محمود بے۔ ایک عالمِ تفکر میں آنکھیں بند کر لیتا ہے اور پیشانی پر شکن پڑ جاتے ہیں۔

بمبو۔ وہی جو آخر میں اٹلی کی قونصلی عدالت میں پیش ہؤا۔

محمود بے نے سر ہلا کر کہا۔ یاد نہیں آتا آپ ہی اس کے واقعات بیان کریں۔

بمبو نے مسکرا کر کہا کہ میں خود اس مقدمہ میں بطور گواہ پیش ہؤا تھا۔

ڈرامائی شادیاں اکثر ہوتی ہیں۔ لیکن وہ شادی اپنی نوعیت میں واقعی نرالی تھی۔ میاں ایک رومن شریف زادہ تھا۔ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب۔ میں نے کسی کو اتنا عمدہ لباس زیبِ بدن کرتے نہیں دیکھا متمول اور فیشن کے دلدادہ نوجوان بھی اس کی برابری نہ کر سکتے تھے۔ اس کی انگلی میں ایک عجیب اور خوشنما انگوٹھی تھی اُس پر ایک سانپ بنا ہؤا تھا جس کی آنکھیں لعل کی تھیں۔ اس کی کلائی پر ایک نہایت سُبک طلائی زنجیر ہوتی تھی۔ اُسے جواہرات کی وحشت تھی۔ اس کا سگرٹ رکھنے کا بکس سونے کا بنا ہؤا تھا اور اس میں نہایت بیش بہا لعل اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس کی چھڑی کی پوروں کی گرہیں بھی جواہرات سے مرصع تھیں۔

اس کی آنکھیں گہری سیاہ۔ ہونٹ پتلے اور چہرے سے عزم واستقلال برستا تھا۔ اُس کے بال سیاہ اور شفاف اور چمکدار تھے۔

اُس کی بیوی سے میں پہلی مرتبہ طبّی مشورہ کے سلسلہ میں ملا۔ وہ ایک مزمنہ مرض میں مبتلا ہوئی اور مجھے طلب کیا۔ بازدید ملاقاتوں میں وہ خاص مہربانی کا اظہار کرتی رہی اور مجھے اس سے یہ اندازہ ہؤا کہ وہ میری خدمات کو بہ نظرِ استحسان دیکھتی ہے۔ وہ اکثر مجھے بلا لیتی تھی۔ اور پہروں مجھ سے اپنی زندگی کی داستان بیان کرتی رہتی اور اپنے خاوند کے حالات

سُنائی رہتی۔

وہ نیک دل خاتون امریکہ کے ایک ارب پتی رئیس کی بیٹی تھی مگر اس کو حُسن وجمال سے بہرۂ وافی نصیب نہ تھا۔ اپنے خاوند سے عمر میں چند سال بڑی تھی۔ قدرے فربہ اندام۔ کلفت گردن اور بالا پیشانی تھی مگر آنکھیں حد درجہ حسین اور دلکش ہی تھیں۔

گو اُن کی شادی کو تین سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ ایک مصری عورت کے لئے یہ موجب ننگ وعار اور لجاجت رنجیدہ ہوتا لیکن اُسے اس کا قطعی کوئی افسوس کیا معنی بلکہ خیال بھی نہ تھا۔ میں آپ سے ہرگز یہ واقعات بیان نہ کرتا اس لئے کہ میں کبھی اپنے مریضوں کے پرائیویٹ حالات لوگوں کو نہیں بتایا کرتا لیکن چونکہ ان کے حالات الم نشرح ہو چکے ہیں۔ اس لئے میں افشائے راز کا مرتکب نہیں کہلایا جا سکتا۔

(۲)

جنوبی فرانس کے شہر کنیز کے ایک تاش گھر میں کاونٹ لوپی ایک میز پر بیٹھا ہے۔ تاش کی بازی میں ایک بڑی رقم ہار چکا ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسم لیکن دل میں سخت اضطراب اور قلق ہے۔ وہ اپنی غریب ماں کی ایک بڑی رقم جوئے میں ہار چکا ہے اور وہ بیچاری ایک ہوٹل میں بستر علالت پر پڑی تڑپ رہی ہے۔ اس سے اگلی سیٹ پر وہ رئیس زادی بیٹھی ہے جس کا میں ابھی ابھی آپ سے تذکرہ کر چکا ہوں۔ وہ داؤ پر داؤ جیتتی چلی جا رہی ہے اور شاید اپنی مسلسل جیت اور بے لطف تحصیل سے کچھ اُکتا گئی ہے۔ اُس نے رومن شریف زادہ کی پتلی پتلی اور لمبی انگلیوں پر ٹکٹکی لگا رکھی ہے۔ اس کی انگوٹھی کے سانپ کو بہ نظر حیرت دیکھ رہی ہے۔ ہارنے والا ظاہر میں بلا کسی پریشانی کے اپنی شریک کو ان الفاظ میں مبارک باد دیتا ہے۔

"تم بڑی خوش قسمت ہو"

ان الفاظ کا رئیس زادی پر نہایت گہرا اثر ہوا اور اُس نے جگہ بدل دینی چاہی لیکن اس نے نہایت حُسنِ خُلق سے کہا کہ آپ کی مبارک جگہ آپ کو مبارک رہے"۔ جُوا جاری رہا اور چند منٹوں میں لوپی کے پاس چند پیسوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ میز پر سے اُٹھا اور دوسری میز پر جا کر سگرٹ کا شغل کرنے لگا۔

وہ بھی اُٹھی اور مختلف میزوں پر کھیلنے والوں کو دیکھتی رہی لیکن بار بار اُس بدقمار پر نظر تھی جو ایک چال بھی موافق نہ چل سکا۔ بازی گاہ سے نکلتی ہوئی وہ پھر لوپی کے پاس سے گزری۔ ان کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ مودبانہ کھڑا ہُوا۔ اور وہ مسکرا کر رخصت ہوئی۔ جب نظر سے اوجھل ہوئی تو اسے لوگوں سے معلوم ہُوا کہ وہ ایک ارب پتی رئیس کی اکلوتی بیٹی ہے۔

(۳)

یہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان دونو کی شادی ہو گئی۔ کب۔ کہاں اور کس طرح ہوئی۔ ان کے تفصیلی جواب کچھ زیادہ

ضروری معلوم نہیں ہوتے۔ لوپی کا گھرانہ کوئی متمول گھرانہ نہ تھا۔ نئے رشتۂ ازدواج کی بنا پر وہ تمام دنیا کی مبارکباد کا مستحق تھا۔ بہت سے اُس سے حسد کرنے لگے تھے اور بہت سے نفرت۔ یہ جوڑا ہمیشہ اور ہر حال میں ساتھ رہتا تھا لوگوں کو یقین تھا کہ ان دونو کو ایک دوسرے کی جدائی ایک لمحہ کے واسطے بھی شاق ہے۔ وہ اس پر فدا ہے۔ یہ اُس پر قربان۔ یہ دور دراز کے سفر کرتے تھے۔ روم۔ پیرس اور مصر میں خاص طور پر جاتے رہتے تھے۔ مصر میں انہوں نے دریائے نیل کے کنارے ایک مختصر سا مکان بھی بنا لیا تھا۔

مصر میں سپیرے بہت زیادہ اور اپنے فن میں ماہر ہوتے ہیں اور قدیم الایام سے چلے آتے ہیں۔ فرعون کے جادوگروں نے بھی اگر شعبدے دکھائے تو سانپوں کے۔ حضرت موسےٰ کو فرعون کی طرف بھیجا گیا تو بھی اسی معجزہ کے ساتھ کہ انکا عصا افعیٔ جانگداز بن جائے۔

ان سپیروں کا یہ وطیرہ ہوتا ہے کہ وہ اِدھر اُدھر عجیب عجیب اقسام کے سانپوں کو پکڑتے پھرا کرتے ہیں اور غیر ملکی لوگوں کو اپنے فن کے شعبدے دکھاتے ہیں۔ ایک سپیرا اس فن میں خاص طور پر ماہر تھا۔ ہزار ہا قسم کے سانپ اس کے پاس جمع تھے۔ سانپوں کے پکڑنے میں اُسے کچھ ایسا ملکہ تھا کہ زہریلے سے زہریلے سانپ اس کی گردن۔ بازو کلائی کہنی اور سر پر ہر وقت لپٹے رہتے تھے۔ لوپی نے اس کو بلا کر تماشہ کرایا۔ لیکن بیگم لوپی سانپ کے نام سے اس قدر ڈرتی تھی کہ الاماں۔ تماشہ میں سانپ کی شکل دیکھتے ہی بیہوش ہو کر گر پڑی۔

مصر کے اگلے سال کے دورہ میں لوپی بیمار ہو گیا۔ اُس نے مجھے بلایا۔ مرض خطرناک نہ تھا۔ اس کی میز پر میں نے دو نہایت ضخیم کتابیں دیکھیں۔ ایک زہریلے سانپوں کی اقسام۔ شناخت اور دیگر متعلقہ اُمور کے متعلق اور دوسری مارگزیدہ کے علاج معالجہ کے متعلق۔ میں نے اُس سے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو کوئی مرض نہیں ہے۔ طبیعت بہت جلد روبراہ ہو جائے گی۔

لوپی۔ ڈاکٹر صاحب۔ کیا آپ نے کبھی کسی مارگزیدہ کا علاج کیا ہے۔

میں۔ اکثر۔

لوپی۔ کیا یہ سانپ اسی درجہ زہریلے ہوتے ہیں جتنے کہ وہ مشہور ہیں۔

میں۔ یقیناً۔

اس کے بعد اس نے مارگزیدہ کے علاج کے متعلق ایک نہایت لمبی چوڑی گفتگو کی۔ وہ پوچھتا رہا کہ کون کون سانپ نہایت زہریلے اور خطرناک ہوتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ کالا ناگ اور افعی کا کاٹا پانی نہیں مانگتا اور خاص طور سے موخر الذکر کا۔ میں نے اُسے بتایا کہ فن طبابت بھی (اس معاملہ میں) اپنی انتہائی ترقی کے بعد سو میں سے نوے حالتوں میں غیر معمولی غور و پرداخت کے معالجہ کے بعد کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اس نے سپیروں کے

متعلق گفتگو کی آیا یہ واقعی سانپوں کو پکڑتے ہیں یا پہلے سے انکے پاس سانپ ہوتے ہیں اور انہی سے لوگوں کو دھوکہ دیتے پھرتے ہیں۔ آیا انہیں اس بات کا صحیح علم ہوتا ہے کہ فلاں جگہ سانپ ملیگا۔ میری بیوی کو سانپ سے بیحد ڈر لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے باغ میں سانپ موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی مشہور سپیرے کو بُلاکر انہیں پکڑوا دوں۔ یہ سب گفتگو لوپی نے اس بے اعتنائی سے کی کہ مجھے اس کے متعلق بعد میں بھول کر بھی خیال نہ آیا۔

مجھے اکثر مرتبہ وہ کھانے پر بُلاتا تھا اور میں بہت جلد ان دونو کی صحبت کو پسند کرنے لگا۔ لوپی کو اپنی بیوی کی صحت و تندرستی کا خیال کیا جنون تھا وہ ہروقت اسی کے تذکرہ اور اس کی صحت کو عمدہ بنانے کی تگ و دو میں لگا رہتا تھا۔ ہر شخص اس کو بیوی کی محبت میں انتہا درجہ کا مبتلا پاتا تھا۔ لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ بیگم لوپی اپنے خاوند کو ہروقت اپنی نظروں کے نیچے رکھنا چاہتی ہے۔ ہوٹل میں کھانے کے بعد میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لوپی کسی اور عورت کے ساتھ گفتگو کرتا پایا گیا ہو یا کسی تقریب میں وہ اکیلا شریک ہوسکا ہو۔

آہ! روپیہ کس قدر بے بسی کا موجب ہے اور امیر بیوی محبت کی دُنیا میں کس قدر زبردست لعنت!

لوپی کی رگوں میں قاتلوں کا خون تھا۔ اس کے آبا و اجداد کی زندگیاں قتل اور زہرخورانی کی مسلسل اور لرزہ انگیز داستانیں پیش کرچکی تھیں۔ یہ خود یا اس کے خاندان کا کوئی فرد بھی کبھی بڑی دولت کا مالک نہ ہوا۔ خود اس کی بیوی نے کبھی کوئی بڑی رقم اس کے ہاتھوں میں نہ دی اور نہ کبھی اپنی دولت پر اس کو اختیار دیا۔ لیکن اس کی امیرانہ زندگی کے واسطے کبھی کسی چیز کی خرید سے اس نے دریغ بھی نہیں کیا۔ اعلےٰ سے اعلےٰ موٹریں اس کی سواری کے واسطے مہیا تھیں۔ اس کے شوق فرس رانی کے واسطے نایاب سے نایاب گھوڑے اس کے اصطبل میں موجود تھے۔ غرضیکہ اس کی زندگی کو پرلُطف بنانے کے واسطے کبھی اُس نے روپے کا مُنہ نہ دیکھا۔ اس کے علاوہ ہر سال وہ دو ہزار پونڈ کی معقول رقم اس کے جیب خرچ کے واسطے بنک میں اُس کے نام سے جمع کرادیتی تھی۔

باوجود میرے دونو سے بے تکلفانہ مراسم کے میں نے کبھی کوئی ایسا واقعہ نہ دیکھا جس سے معلوم ہوتا کہ اُن دونو میں کبھی روپیہ کے معاملہ میں بدمزگی پیدا ہوئی ہو۔ جو کچھ بھی رقم اُسے بیگم سے مل جاتی تھی وہ اس سے زیادہ کبھی اس سے نہ مانگتا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تیس ہزار سے زیادہ کا مقروض ہوچکا تھا۔ یہ بھی مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ اس صورت حالات سے بیگم کو بھی آگاہی تھی یا نہیں۔ باوجود سخت سے سخت نگرانی کے لوپی کو اس کی بیگم حسینوں کی صحبت سے لطف اندوز ہونے سے محروم نہ کرسکی۔

(۴)

اس سال یوروپ واپس جانے سے کچھ قبل وہ چمڑے کے فینسی سامان کی ایک مصری دوکان پر آیا اور اُس نے

ایک چمڑے کا بکس اتنا کافی گہرا بنوایا کہ جس میں ایک وقت میں تین درجن سخت کالر سما سکیں۔ اس کی تہ میں ایک چھوٹا گول مین المونیم کا لگوایا جو ایک پیچ سے بند ہوتا تھا اور جس میں بہت سے چھوٹے سوراخ تھے۔ اس بکس میں وہ افعی کا ایک جوڑا رکھتا تھا جس کو اس نے چار اشرفیاں دیکر مصر کے مشہور ترین سپیرے سے پکڑوایا تھا۔ اس لئے کہ سپیرے کے دل میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو۔ اس نے ایک دو ہفتہ بعد سانپ کے چمڑے کی بنی ہوئی ایک مجلد نوٹ بک اس کو دکھائی اور اسے یقین دلادیا کہ یہ اسی افعی جوڑہ کی کھال سے بنوائی گئی ہے۔

بعد میں سپیرے سے معلوم ہوا کہ اس نے ٹوپی کو بہت کچھ مارگیری اور مارپروری کے فن کے متعلق سکھایا تھا۔ اس نے خاص طور سے بتایا تھا کہ سانپوں کو کس طرح کھلاتے ہیں اور کس طرح اُن کے ساتھ کھیلتے ہیں تاکہ وہ بند رہنے سے مر نہ جائیں۔ دماغ کے پیچھے سے انکو پکڑنا۔ اور انگلیوں کے دباؤ سے ان کو ایک دو منٹ کے واسطے بےحس کر دینا تاکہ اس سے گزند سے محفوظ رہیں۔ گرہ دار لکڑی سانپ کے مارکر بغیر اُسے جان سے مارے عارضی طور سے بےہوش کر دینا۔ اگر زہر آلود لعاب ہاتھ وغیرہ پر لگ جائے تو اس کا علاج کرنا وغیرہ وغیرہ سب گر ٹوپی نے سپیرے سے سیکھ لئے تھے۔ اس سفلی علم کو اُس نے کتابوں کے مطالعہ سے اور بہت بڑھا لیا تھا۔

(۵)

اس عجیب کالر بکس کو لے کر ٹوپی معہ اپنی بیگم کے یورپ کو روانہ ہوا۔ اُس نے اپنے نوکر کو بھی علیحدہ کر دیا اور بیگم سے کہدیا کہ جب کبھی واپس مصر جاؤنگا تو وہیں سے ایک واقفکار نوکر رکھ لونگا اور یہاں بلا نوکر ہی گذارہ کرونگا۔ اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں کالر نکالتے وقت نوکر اس کے بکس کے راز کو فاش نہ کردے۔

وہ روم۔ پیرس اور دیگر شہروں کی سیر کرتے ہوئے سپین پہنچے۔ اس دوران میں ٹوپی کبھی کبھی کمرہ کو مقفل کرکے ایک آہنی آنکڑے والی لکڑی سے سانپوں کو باہر نکال کر ان کی تفریح کرتا تھا اور پھر انکو بےحس کرکے ایک خالی ٹرنک میں چھوڑ دیتا تھا جس میں اُس نے پہلے سے زندہ چوہے اور مینڈک رکھے ہوتے تھے۔ اس کے بعد پھر انہیں بےحس کرکے انکے قید خانہ یعنی کالر بکس میں بند کر دیتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد اُس نے اپنی بیوی کو کامیابی سے ترغیب دی کہ وہ مراکو اور الجیریا میں سے ہوتے ہوئے موٹر سے واپس مصر پہنچیں۔ دوران سفر میں وہ مراکش میں ٹھہرے اور سفری زندگی کا لطف اُٹھانے کے واسطے ایک جنگل میں خیموں میں رہنے لگے۔ صحرا میں سلسلہ کوہ اطلس کے برابر وہ خیمے ڈالتے اُٹھاتے چلے جا رہے تھے کہ ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ بیگم ٹوپی کی طبیعت علیل ہوگئی اور اس وجہ سے انہیں ایک ہی جگہ خیمہ میں دو دن اور دو رات قیام کرنا پڑا۔ ٹوپی ان ایام میں خاص طور پر بیگم کی دلجوئی میں محو تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کو نئے سرے سے اس کا عشق پیدا ہو چلا ہے۔ ایک شام کو جب ٹوپی غسل کر رہا تھا بیگم نے نوکر سے کہا کہ خیمہ سے ذرا دُور کرسی ڈال دے

تاکہ وہ غروب آفتاب کے نظارہ سے لطف اندوز ہو سکے۔ اُدھر خادمہ نے ایسا کیا اور اِدھر اس سنگدل انسان صورت شیطان سیرت خاندانی مجرم لُوپی کی شیطانی کارروائی شروع ہوئی۔ جب خادمہ اپنی مالکہ کا بستر کر چکی تو اُس نے اسے حکم دیا کہ مفرح شربت سنترہ تیار کرکے بیگم کے پاس لے جائے تاکہ اس کی طبیعت کو سکون حاصل ہو۔ جب خادمہ اس کام میں مصروف ہوئی تو جھٹ اس نے سرافعی کو باہر نکال بے ہوش کر کمبل کے نیچے بیگم کے بستر میں اسے سلا دیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ خوفناک جانور اس میں داخل ہوتے ہی اُبھرنے لگا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد بستر کی نرمی اور گرمی کے اثر سے خاموش ہو کر دبک گیا۔ اس کارروائی کے بعد اس نے اپنی مہین قمیض پہنی اور بیگم کے پاس جا بیٹھا۔ اُس کے ضمیر نے اُسے لعنت ملامت کی۔ جب اُس نے اس کے معصوم چہرہ پر نظر ڈالی ممکن ہے اُسے رحم آیا ہو۔ بہرحال اُس نے اُس سے غیر معمولی محبت کا اظہار کیا اور اسکی تسلی تشفی کی کہ اگلی صبح کو وہ مرض سے شفائے کلی پا جائیگی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ خود تو تاروں بھری رات کے منظر سے لطف اُٹھانے کی خاطر باہر ہی رہ گیا لیکن بیگم خوابگاہ میں چلی گئی۔ لُوپی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دل میں ایک ہیجان تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ وہ خوابگاہ میں جا پہنچی۔ بیگم نے اُسے بُلایا۔ دونو خوش ہوگئے، اور اُس نے رخصت ہوتے وقت اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اور برابر کے کمرہ میں سونے کے واسطے داخل ہُوا۔ دونو کمروں کے لیمپ بجھا دیئے گئے اور لُوپی انتہائی انتظار کے کرب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ منتظر تھا کہ اب بیگم کی چیخ نکلی اور میں پہنچا۔ اس نے کئی مرتبہ اُٹھ اُٹھ کر سُنا کہ اس کے سانس زیادہ لمبے اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ رات گذرتی رہی لیکن بیگم کے کمرہ سے کوئی چیخ سُنائی نہ دی۔ وہ پھر ہمہ تن گوش بن گیا کہ کوئی آواز بیگم کے کمرہ سے آئے۔ اُسے یقین تھا کہ اس کو افعی ڈس گیا ہوگا اور وہ صبح ہوتے ہی اپنے آپ کو ارب پتی رئیس پائیگا اس لئے کہ اس ملک کے قانون کے مطابق وہ اپنی بیوی کے ترکہ کا واحد وارث ہوگا۔ عالم تخیل میں حسین دوشیزہ لڑکیوں کے غول کے غول اس کے آگے سے گذر رہے تھے جو اس کی نگاہ التفات کی متمنی تھیں۔ پھر اُسے یہ خیال آتا تھا کہ بیگم کی لاش کو واپس مراکش لے جانے کے واسطے اُسے کیا کیا اہتمام کرنا پڑیگا۔ لیکن یہ سب زحمتیں اسے گوارا ہونگی۔ اس لئے کہ ان کے بعد دولت کی دیوی اُس کے پاؤں پر سربسجود ہوگی۔ اُس نے پھر خاموشی سے ادھر کان لگائے۔ ایک منٹ دو منٹ پاؤ گھنٹہ۔ نصف گھنٹہ۔ پورا گھنٹہ گذر گیا۔ وہ پسینہ میں شرابور ہو رہا تھا۔ چہرہ غم و غصہ سے تمتما رہا تھا۔ بے اختیار اس کے مُنہ سے نکلا ملعون افعی کب اپنا کام کریگا۔ بیگم کے کروٹیں بدلنے کی ذرا ذرا سی آہٹ پر وہ بستر سے اُٹھ بیٹھتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ بس ایک لات لگی اور اس کا کام تمام ہُوا۔ اس اضطراب میں آدھی رات گذر گئی۔ لیکن سانپ نے بیگم کو نہ ڈسا۔ غالباً گرمی سے سانپ سو گیا۔ لیکن نہیں وہ ضرور تھوڑی دیر میں جاگے گا۔ کیا اس کی لاتیں کھا کر بھی اس کو غصہ نہ آئیگا۔ صبح کو تو ضرور اُسے سردی محسوس ہوگی۔ اور وہ ضرور اس وقت ڈسیگا۔ اس قسم کی باتیں وہ دل ہی دل میں کر رہا تھا کہ اچانک اس کی بیوی نے اُسے بُلایا۔ پیارے لُوپی کیا تم سو گئے۔ میری تو تمام رات آنکھوں میں کٹی ہے۔ یہ سُنکر

وہ خاموش ہو رہا تاکہ وہ سمجھے کہ سو رہا ہے۔ بیگم نے پھر کروٹ بدلی مگر بستر سے اُٹھی نہیں۔ لیکن کیا اس سنگدل کو رحم نہ آیا؟ انسان کی طبیعت بھی ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔ صحیح اندازہ لگانا قطعی طور پر ناممکن ہے کہ اس کے جذبات محبت میں کوئی تموج پیدا ہوا یا نہیں۔ کرب انتظار نے اُس کے ہوش و حواس کو مختل کر دیا تھا۔ وہ مُردہ سا بستر میں پڑا تھا۔ اتنے میں پو پھٹی۔ کتوں نے بھونکنا شروع کیا۔ اونٹ بغبغانے لگے۔ دُنیا میں از سرِ نو زندگی کے آثار نمایاں ہو گئے لیکن لُوپی زرد رُو لُوپی۔ مضطرب لُوپی۔ نیم مُردہ لُوپی بستر میں پڑا رہا۔ چھ بجے بیگم اُٹھی۔ خادمہ نے چائے سامنے رکھدی۔ لُوپی سہما ہوا تھا۔ لرزہ اس کے بدن پر طاری تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ رسمی بات چیت کی۔ لُوپی معذرت کر کے علیحدہ ہو گیا۔ کہ رات کو مجھے نیند خوب آئی لیکن تمام بدن ٹوٹا جا رہا ہے۔ اگلی صبح کو وہاں سے چلنے کا فیصلہ ہو گیا وہ باہر سیر کے واسطے نکل گئی اور یہ بیقرار ہو کر اس کی خوابگاہ میں پہنچا۔ اُس نے چادر کو جھٹکا۔ کمبل کی تہوں کو کھولا۔ تکیہ کو اُٹھا کر دیکھا۔ لیکن افعی وہاں نہ تھا۔ کمرہ کے کونہ کونہ کو دیکھا تو فرش کے نیچے چھپا ہوا ملا۔ واقعہ یہ تھا کہ سانپ کی فطرت ہے کہ وہ آدمی سے ڈرتا ہے اور خود کبھی وار نہیں کرتا جبتک کہ ارادتاً یا بلا ارادہ اس پر حملہ نہ کیا جائے۔ جب اچانک اُس پر پاؤں وغیرہ پڑ جاتا ہے تو وہ اسکو ارادی حملہ سمجھ کر مدافعت کے واسطے حملہ کرتا ہے۔ سانپ کو باہر نکالنے کی کوشش کی گئی۔ اس کا زہر آلود لعاب لُوپی کے کپڑے پر لگا اور اس پر ایسے نشانات پڑ گئے جیسے کہ سگرٹ سے جل جاتے ہیں۔ ناکام قاتل غضبناک ہُوا۔ ایک لاٹھی سے اس کا کام تمام کر دیا اور وہ بندھن جن سے اس کی روح جکڑی ہوئی تھی وہ ٹوٹ گئے۔ جس کرب و اضطراب کی حالت میں اُس نے رات گذاری تھی اُس سے نجات مل گئی۔ سانپ کو اپنے خیمہ میں دفن کر کے وہ بیگم کے پاس گیا۔ اور مسکرا کر پھر اس سے گفتگو شروع کر دی۔

جب کوئی مجرم اپنے بُرے ارادہ میں ناکام ہو جاتا ہے تو وہ ایک بڑے عرصہ تک اپنی دوسری کوشش شروع نہیں کیا کرتا۔ اس رومن نوجوان نے بھی چار ماہ تک نہایت صبر و سکون سے انتظار کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی آخری اور کامیاب کوشش کرے۔ یہ واقعہ کینیا میں پیش آیا۔

شدید گرمی کی ایک سہ پہر کو نوکر وغیرہ ادھر اُدھر مصروف تھے۔ بیگم کی خادمہ اپنی مالکہ کے کپڑوں کو استری کر رہی تھی۔ کوئی نوکر سو رہا تھا۔ کوئی کہیں گیا ہُوا تھا۔ بیگم ایک کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ لُوپی مادہ افعی کو دونو ہاتھوں میں پکڑے نمودار ہُوا۔ ایک سے جبڑہ کا پچھلا حصہ پکڑا ہُوا تھا۔ دوسرے سے باقی حصہ۔ سانپ نے بیحد کشمکش کی کہ اس قید سے نجات پائے۔ لیکن طاقتور لُوپی نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ پنجوں پر آہستہ آہستہ وہ کرسی کے پاس آیا اور دائیں طرف جا کر بیگم کے ننگے بازو کے برابر اس کا پھن رکھ کر سر کو دبا دیا لیکن اُس نے نہ کاٹا۔ لُوپی نے اپنی گرفت کو نرم کر دیا۔ سانپ نے ایک ہلکا سا دانت بازو پر لگایا۔ بیگم چیخ اُٹھی۔ اِدھر اُدھر گھبرا کر دیکھا۔ خاوند سے آنکھیں چار ہوئیں تو اس کی بے ساختہ ایک اور چیخ نکلی۔ اُس نے پانچ مرتبہ اس کا نام لے کر پکارا لیکن اس سے

پہلے کہ وہ جواب دے۔ خود اس کے دائیں ہاتھ میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ دوسرے سیکنڈ میں پھر تکلیف محسوس ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ سانپ کی کچلیاں اس کے گوشت کے اندر تھیں۔

ایک لمحہ میں وہ بے ہوش تھا۔ بیگم چلائی۔ ڈاکٹر ڈاکٹر ہم دونو کو سانپ ڈس گیا۔ دو سہمے ہوئے ملازم سرکاری ہسپتال میں پہنچے میں فوراً اُن کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑا سا ماء الجبن میرے پاس تھا۔ اس علاقہ میں سانپ کے ڈسنے کے حادثات بہت کم ہوتے تھے۔ اس لئے میں تمام راستہ نہایت حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔

میں نے جاکر دیکھا کہ خادمہ ایک کچا پیاز اپنی مالکہ کے بازو پر رکھے کھڑی ہے۔ ٹوپی بے حس وحرکت بستر پر پڑا ہے۔ میں نے سہارا دیکر اُسے بٹھا دیا۔ اس نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا۔ چار زخم اس کے ہاتھ پر موجود تھے۔ وہ چلایا خدارا۔ ڈاکٹر ہمیں بچاؤ۔

میں۔ میرا خیال ہے کہ حادثہ کو گھنٹہ بھر کے اوپر ہوگیا ہے۔ میں انتہائی کوشش کرونگا۔ سانپ دیکھا ہے کیسا تھا۔

ٹوپی۔ افعی!! افعی!! افعی!!!

میں جانتا تھا کہ اس کا جانبر ہونا ناممکن تھا۔ میں نے بیگم کو دیکھا۔ اس کے بازو کے بالائی حصہ میں دو ہلکی سی خراشیں تھیں۔ ورم شروع ہو گیا تھا۔ رنگ پھیکا پڑنے لگا تھا۔ میں نے خادمہ سے پانی منگوایا تاکہ پرمگنیٹ آف پوٹاش اس میں ملا لوں۔

ٹوپی کی بُری حالت تھی اس کے حواس مختل ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے ارتکابِ قتل کی تمام ہولناک داستان بیان کردی وہ بدمست آدمی کی طرح لڑکھڑا رہا تھا۔

بیگم کو غفلت سی ہو چلی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ دونو جانبر نہ ہوسکینگے۔ اگر میں نے انتہائی کوشش نہ کی اور کافی ماء الجبن بذریعہ انجکشن اندر نہ پہنچایا۔ میں نے اُسے بستر پر لٹا دیا۔ اور ہسپتال میں ٹیلیفون کیا۔ بیگم کے محض خراش تھی اس لئے وہ آسانی سے بچ سکتی تھی۔ اب فرائض منصبی کا بار میری گردن پر تھا۔ میرا کام تھا کہ ان دونو کو موت کے پنجے سے چھڑا لوں۔ لیکن انجکشن کی دوائی میرے پاس بمشکل ایک کے واسطے کافی تھی۔ اس لئے صرف ایک کی جان بچائی جا سکتی تھی۔ میں نے مانا کہ ٹوپی کی حالت زیادہ خطرناک تھی لیکن خدا نے آدمی کو ضمیر دیا ہے میں نے فوراً فیصلہ کرلیا کہ بیگم اس دوا کی زیادہ مستحق ہے۔ اس لئے میں نے اس کے انجکشن کیا۔ چھ گھنٹہ بعد کینیا کے سرکاری ہسپتال سے اور ماء الجبن آگیا۔ میں نے بہت بڑی مقدار ٹوپی کو دی لیکن اس کا بدن سوج کر کپا ہوگیا تھا تشنج شروع ہوگیا تھا۔ بیگم کو میں نے پھر ایک مقدار دی۔ چھ گھنٹے بعد وہ جانبر ہوگئی اور ٹوپی افسران پولیس کی موجودگی میں خون کا دورہ بند ہو جانے کی وجہ سے مرگیا۔ میں نے ازراہ حزم و احتیاط اطالوی قونصل اور افسران پولیس کو فوراً بلالیا تھا۔ انہوں نے میرے، اور بیگم ٹوپی کے بیانات قلمبند کئے۔ سپنیرے کو بُلایا گیا اُس نے اس افعی کو پکڑا اور مار ڈالا۔

اُسی شام کو تین بڑی گاڑیاں قبرستان کی طرف چلیں ایک میں ایک بڑا سیاہ تابوت۔ اطالوی قونصل اور ایک مامور۔ دوسری میں پھول اور تیسری میں ہم۔ بیگم ٹوپی جو خاموش مگر پریدہ رنگ اور رنجیدہ تھی۔ ایک خادمہ جس کی ہچکیاں بندھی تھیں۔

بیگم ٹوپی کو گو حسنِ صورت سے بہرہ وافی نہ ملا تھا لیکن حُسنِ سیرت کا جہاں تک تعلق ہے قدرت نے اس کے ساتھ بیحد فیاضی برتی تھی۔ متانت اور عالی ظرفی کو اس نے کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ واپسی میں اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب اگر کافی مقدار مارالجبن کی مل جاتی تو کیا آپ ہم دونوں کی جانیں بچا سکتے تھے ؟

میں ۔ بیگم صاحبہ اس کی جان کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتی تھی۔

بمبو خاموش ہو گیا۔ پہلے محمود بے کی طرف اور پھر میری طرف اُس نے نظر ڈالی اور پھر سلسلۂ کلام کو جاری کیا۔

اس نے اس کا تمام قرضہ ادا کر دیا اور ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا۔ ایک اطالوی سنگ تراش نے خالص سنگ مرمر سے اس کا بُت تیار کیا جس کے ایک ہاتھ میں صلیب تھی اور بائیں پاؤں کے نیچے ایک افعی سانپ دبایا ہوا تھا۔ (ترجمہ)

عبرت

کالج کے ہال میں لکچر ہو رہا تھا۔ جسم کی ساخت سمجھانے کے لئے ڈاکٹر صاحب کو مردہ انسان کی ہڈیوں کے پنجر کی ضرورت پڑی۔ چپڑاسی کو لانے کا حکم دیا گیا۔ وہ اس کو لے کر ہال میں داخل ہوا۔ تو میرے ساتھیوں نے اُس پنجر کو دیکھ کر مضحکہ اُڑانا شروع کر دیا۔ اُن کی اس کوتاہ اندیشی سے مجھے سخت ملال ہوا۔ میں خاموش نہ رہ سکا۔ میری زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے۔

دوستو! کیوں ہنس رہے ہو۔ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ آج جس شخص کے پنجر کا مضحکہ تم اُڑا رہے ہو۔ خدا معلوم اپنی زندگی میں وہ خود کس کس کا مضحکہ اُڑا چکا ہو گا۔ اس پیکر سے عبرت پکڑو۔ مبادا مرنے کے بعد کل ہمارا بھی یہی حال ہو غرور و تکبر سے بچو۔ کہ زندگی کا کھیل چند روزہ ہے۔

میری ان معقول باتوں کو وہ مان گئے اور اپنے کئے پر اُنھوں نے کسی قدر پشیمانی کا اظہار بھی کیا۔ (فیض محمد فیض لدھیانا)

فلسفۂ حیات

(از جناب اجمل صاحب انبالوی)

گرچہ یہ داستان تمام لغو ہے واہیات ہے — پھر بھی یہ لغو داستاں راہبر نجات ہے

چونکہ فلاسفی تمام اس میں بھری ہے کوٹ کر — اس لئے اس کا نام بھی فلسفۂ حیات ہے

جب بنایا حق نے عرش و فرش و نور و نار کو — مرحمت کی ایک عمر خاص ہر جاں دار کو

پر گدھے کتے بشر بندر کو دی اللہ نے — زندگی چالیس سال انجام کاروبار کو

جب ملی یہ عمر تو سب نے بعد عجز و نیاز — سرنگوں ہو کر پکارا ایزد غفار کو

پہلے کتے نے کہا اے خالق کون و مکاں — عمر تھوڑی سی عطا ہو اس ذلیل و خوار کو

آہ یہ ظلم و ستم مجھ سے نہ دیکھا جائیگا — ٹھوکریں مالک کی کھانا جھیلنا آزار کو

رات بھر کرنا مکاں کی چوکی اور بھونکنا — پاسباں کی طرح دن بھر دیکھنا گھر بار کو

خدمت آقا میں چلنا سائیکل کے ساتھ ساتھ — اور کبھی موٹر کے پیچھے دوڑنا بازار کو

پھر کہا بندر نے اے رب کریم کارساز — مختصر سی زندگی کافی ہے اس بدکار کو

جنگلوں میں رات دن مجھ کو پڑیگا گھومنا — شہر میں گھڑ دوڑ کرنا پھاندنا دیوار کو

ناچ و مجرا دیکھ کر میرا ہنسیں گے مرد و زن — جب نچائیں گے قلندر مجھ خدائی خوار کو

پھر گدھا بولا کہ اے چارہ گر بیچارگاں — عمر تھوڑی سی ملے اس عاجز و ناچار کو

مار مار اہل جفا کوٹھے سجادیں گے مرے — بے طرح پیٹیں گے لادیں گے کمر پر بار کو

پس نہایت مختصر سی عمر اے بندہ نواز — مرحمت ہو جائے اس کم بخت و ناہنجار کو

جب کبھی آئی حضرتِ انسان کی باری حضور سے — دست بستہ ہو کے یوں کھولا لبِ گفتار کو

اے حضورِ فیض گنجور اے خداوندِ جہاں — یہ ذرا سی عمر اور مجھ جیسے دنیادار کو

علم و فن ہی میں گذر جائیں گے یہ پچیس سال — اک زمانہ چاہیئے پھر اور کاروبار کو

باقی ہے شادی ابھی تو اور تعمیرِ مکاں — پرورش دختر کو کرنا اور برخوردار کو

میں بنوں گا فلسفی و منطقی و مولوی — میں پڑھاؤں گا سبق شیر و پلنگ و مار کو

میں بہاؤں گا سنان و تیغ سے دریائے خوں — میں بچھاؤں گا سرِ میدان صفِ کفار کو

میں ہلاؤں گا زمیں کو توپ اور بندوق سے — میں گراؤں گا بموں سے آہنی دیوار کو

میں اڑاؤں گا جہازِ ہوائی چرخ پر — میں چلاؤں گا زمیں پر ریل۔ موٹر کار کو

میں لگاؤں گا جہاں میں تارِ برقی جا بجا — میں کروں گا مشتہر اخبار پر اخبار کو

آہ یہ چالیس سال اور وہ ہزاروں مشغلے — ایک مدت چاہیئے ہر شغل اور ہر کار کو

حق نے فرمایا کہ کتے کو بہت ہیں دس برس — تیس سال اسکے بھی دو اس شوخ اور طرار کو

عمر بندر و گدھے کی کافی ہے پچیس سال — پندرہ پندرہ سال دو ان کے بھی اس عیار کو

پس ملی انسان کو عمرِ طبیعی سو برس — تاکہ دے انجام اپنے جملہ کاروبار کو

لیکن اس کے ساتھ ہی فرما دیا اللہ نے — کر کے شاد ساکنانِ عالمِ انوار کو

یعنی کتے اور گدھے بندر کے بد اوصاف بھی — ہم نے بخشے حضرتِ انسان نیک اطوار کو

اب یہ جس حیوان کی خصلت کریگا اختیار — آخرش پہنچے گا اس کے کیفرِ کردار کو

جو رہیگا پیٹ پوجا ہی میں کتے کی طرح — عمر کتے کی ملے گی ایسے بدکردار کو

جو پھریگا مثلِ بندر کے اچھلتا کودتا — عمر بندر کی ملیگی ایسے ناہنجار کو

جو گدھے کی طرح خرمستی کریگا رات دن — پس گدھے کی عمر دی جائیگی اس مردار کو

جو کہ انسانی خصائل پر رہیگا کاربند — عمرِ انسانی عنایت ہوگی اس دیندار کو

اے اجل کتا۔ گدھا۔ بندر نہ بن انسان بن
کر درست اپنے تمام اخلاق کو اطوار کو

(اجل انبالوی)
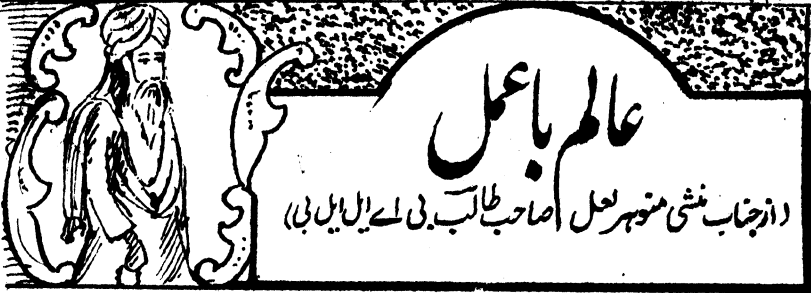
ماسٹر لکشمیداس شریف آدمی تھے۔ مرنجاں مرنج کے مسئلے کے قائل اور پیرو۔ آپ گورنمنٹ سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ نہایت ہردلعزیز اور قابل۔ نہ ہندو ناخوش نہ مسلمان ناراض۔ نہ ان کے خلاف ہندو اخبارات میں مضامین چھپے نہ مسلم جرائد میں شکایتی خطوط شائع ہوئے۔ وہ بلوضع اور خوش اخلاق تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس ہندو مسلم رسہ کشی کے زمانے میں بھی پانچ سال اپنی جگہ پر قائم رہے۔ نہ وہ تبادلہ کے خواہاں تھے نہ انکے مخالف کوشاں۔ ان کے نتائج نہایت شاندار اور تسلی بخش تھے۔ اسی لئے انکا شمار پنجاب کے کامیاب ترین ہیڈ ماسٹروں میں ہوتا تھا۔

ماسٹر صاحب جب شام کو بازار میں نکلتے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہوتی۔ ہر ملنے والے سے اظہار اخلاق۔ ہندو شرفا سے رام رام یا نمستے اور مسلم رؤسا سے سلام علیکم ہوتی۔ وہ سوسائٹی میں ایک مشہور ہستی تھے۔ اُس کے رتن، اُس کے رکن۔ وہ سوسائٹی کے سنگار تھے۔ پبلک کاموں میں دلچسپی لیتے اور حتی المقدور چندہ بھی دیتے۔ وہ پرلے درجہ کے کفایت شعار اور دیانتدار مشہور تھے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ دیانتداری بہترین طرز عمل ہے اور "امداد باہمی" بہترین اصول۔

(۲)

ڈاکٹر غلام احمد شہر کے چوٹی کے ڈاکٹر ہیں، نہایت خلیق اور ملنسار۔ دوستوں کے دوست اور زندہ دل انسان ہیں۔ پرلے درجے کے شریف اور دینی کاموں میں حصہ لینے والے، یتیم خانہ کے مینیجر اور مسلم سکول کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر۔ پبلک کا ان پر اعتماد ہے اور وہ اس اعتماد کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ پبلک کا روپیہ اُنہی کی تحویل میں رہتا ہے یا یوں کہئے کہ وہ پبلک کے روپے کو اپنی تحویل میں رکھتے اور اس کی مناسب نگہداشت اور درست استعمال کرتے ہیں۔ پبلک کے روپیہ کے لئے ان سے زیادہ موزوں محافظ ہو بھی کون سکتا ہے؟ ورنہ ان کو تو کچھ غرض نہیں (بقول) نشہ کام سیوا ہے!

بعض ناتجربہ کار سرپھرے نوجوان اُن پر معترض ہوتے ہیں مگر یہ ان کی ناتجربہ کاری پر دال ہے۔ کوئی شخص ان کے سامنے اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ سلامے کے آگے چراغ نہیں جلتا۔ غیر حاضری میں تو لوگ بادشاہوں کو بھی گالیاں دیتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب پر غبن کا الزام لگائیں تو انہیں کیا پروا۔ کتے بھونکیں، ہاتھی کو اس سے کیا!

ڈاکٹر صاحب اور ماسٹر صاحب دوست تھے۔ سوسائٹی دونو کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ دونو ایک دوسرے کو اچھی طرح

جلتے تھے۔

دو سال ہوئے اتوار کا دن تھا۔ ڈاکٹر صاحب کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ ماسٹر لکشمی داس ڈرائنگ روم میں آدھمکے۔ ڈاکٹر صاحب خبر پاکر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ دیر تک خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ باتوں باتوں میں ماسٹر صاحب نے کہا

"اگر تکلیف نہ ہو تو دو ہزار روپیہ کا انتظام پرسوں تک کر دیں۔ نئے مکان کی تعمیر میں اندوختہ خرچ ہو گیا ہے مہینہ دو مہینہ تک واپس کر دونگا۔ مہاجنی سود بھی ادا کرونگا۔"

ڈاکٹر صاحب ماسٹر صاحب کی مالی حالت سے خوب واقف تھے۔ تین ساڑھے تین سو تنخواہ، ایک نیا مکان جس کے نصف کا تیس روپیہ ماہوار کرایہ آتا ہے، دس بیگھہ اراضی زرعی امپیریل بنک کے بیس حصے، بستی شوگر ملز کے چالیس۔ اس جائداد کے مالک کے لئے دو ہزار روپیہ کوئی چیز نہیں۔ آپ نے دوسرے ہی دن دو ہزار کا چک ماسٹر صاحب کو بھیج دیا۔ ماسٹر صاحب نے دو ہزار روپیہ کا پرونوٹ سود کی شرح ۶ فیصدی سالانہ لکھ کر ڈاکٹر صاحب کو بھجوا دیا۔

(۳)

مسٹر اینڈریوز "گلوب بک شاپ" کے مالک اور منیجر ہیں۔ شہر میں پانچ ہائی سکول ہیں، چھ پرائمری۔ مسٹر اینڈریوز اس درجہ خلیق اور ملنسار ہیں کہ ان میں سے اکثر سکولوں کے ہیڈ ماسٹر انہی کی کتابیں اپنے سکولوں میں پڑھاتے ہیں۔ وہ ان کے ذاتی دوست ہیں۔ ماسٹر لکشمی داس بھی اُن کے مہربان تھے۔ یہ کون کہتا ہے کہ وہ کتابوں پر دوسرے لوگوں کی طرح کمیشن لیا کرتے تھے۔ البتہ مسٹر اینڈریوز جانتے ہیں کہ وہ بھی ان کی کمائی میں شریک تھے اور اُنہیں بھی کسی نہ کسی طرح اپنا نصف پہنچ جاتا تھا۔ لیکن اس کا علم مسٹر اینڈریوز کے سوا اور کسی کو نہ تھا نہ ہی ماسٹر لکشمی داس کی شہرت اور شخصیت کسی کو شک و شبہ کی اجازت دے سکتی تھی۔

اسی نئے مکان کی تعمیر کے سلسلہ میں مسٹر اینڈریوز نے بھی پانچ ہزار روپیہ کی امداد کی تھی۔ یہ قرضہ تھا جس کے عوض ماسٹر صاحب نے باقاعدہ پرونوٹ لکھ کر مسٹر اینڈریوز کے حوالے کیا ہوا تھا۔ وہ ان کی جائداد اور مالی حالت سے آگاہ تھے اور کون تھا جو ماسٹر صاحب کی مالی حالت سے بے خبر ہو۔ سب جانتے تھے کہ سرکاری نوکر ہیں، صاحب جائداد ہیں، امیر آدمی ہیں۔

(۴)

دس بارہ دن ہوئے ہونگے ماسٹر صاحب شام کو سیر سے واپس آئے۔ چھاتی میں درد ہوا اور آدھ گھنٹہ میں وہ آواز جو پانچ سو لڑکوں کا دم خشک کر دیتی تھی۔ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے متفقہ فتویٰ دیا۔ حرکت قلب بند ہو گئی۔"

(۵)

ڈاکٹر صاحب ماسٹر صاحب کے بہترین دوست تھے اور وہی قرضہ کے مطالبہ میں اوّلین۔ لیکن جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے راز افشا کر دیا۔ عوام میں چرچا ہونے لگا۔ بے فکرے زبان چلانے لگے۔ اور ماسٹر صاحب کے قرضخواہ برساتی بیر بہوٹیوں کی طرح نمودار ہونا شروع ہوئے۔ مسٹر اینڈریوز نے اپنا پرونوٹ نکالا۔ مسٹر قریشی کا سیمنٹ اور ٹائیلوں کا بل بارہ سو سے کم نہ تھا۔ مسٹر ساآہنی ٹمبر مرچنٹ نے ایک ہزار کی عمارتی لکڑی دی تھی۔ ابھی آٹھ سو ماسٹر صاحب کے ذمے تھا۔ غرضیکہ تمام رقوم کا میزان بیس ہزار دو صد بائیس (۲۰۲۲۲) روپیہ تھا لیکن ماسٹر صاحب کی جائداد "موچی کی بھینس" تھی۔ بنک اور شوگر مل کے حصّے اور اراضی پانچ ہزار میں رہن تھی سود اس کے علاوہ تھا جو پونے دو ہزار سے کم نہ تھا۔ یہ روپیہ نئے مکان کے لئے "سفیدہ" خریدنے میں صرف ہوا تھا لیکن جائے سفید کا بیعنامہ ماسٹر صاحب کی بیوی کے نام تھا۔ گویا نیا مکان ماسٹرانی صاحبہ کا تھا۔ تنخواہ سے جو کچھ بچتا تھا وہ بیمہ کمپنی کے پاس چلا جاتا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اپنی زندگی کا پندرہ ہزار کا بیمہ کرایا ہوا تھا باقی اللہ اللہ اور خیر صلّا۔

ڈاکٹر صاحب نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر بیمہ کا روپیہ ماسٹرانی صاحبہ کو ملنا تھا انہیں کو ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجبوراً یہ روپیہ یتیم خانہ کے نام لکھا۔ آخر وہ بھی پبلک کے آدمی ہیں اور ماسٹر صاحب بھی "پبلک مین"۔

آہ! کسے یاد نہیں کہ ماسٹر صاحب ہمیشہ مسئلہ "امداد باہمی" پر زور دیا کرتے تھے! کیا یہ "امداد باہمی" کا عملی مظاہرہ نہیں؟ کون کہہ سکتا ہے وہ عالم باعمل نہ تھے؟

جہالت

شالامار کا میلہ تھا۔ لاہور میں جابجا رونق تھی۔ سڑک پر چند جاہل جاٹ سرور کی حالت میں کھڑے تھے۔ ادھر سے ایک انگریز کی موٹر آئی۔ ڈرائیور نے الارم پر الارم دیا۔ لیکن یہ بدمست انسان بدستور اپنے شغل میں مشغول رہے۔ اب موٹر عین اُن کے سر پر آپہنچی تھی۔ تین چار سفید فام چہرے کھڑکیوں سے باہر نکلے۔ پیشانیوں پر شکن پڑے ہوئے تھے۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا:۔ "ڈیم فول لوگ۔ باز نہیں آتا"۔ جاہل جاٹوں کی آنکھ کھلی۔ اور وہ مینڈک کی طرح پھدک کر سڑک سے ایک طرف ہو گئے۔ میں اپنے مکان کی بالائی منزل پر بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مشرقی تہذیب کے اس بدنما مظاہرہ نے مجھے سخت صدمہ پہنچایا۔ افسوس! وہ مغربی لوگ ہماری نسبت اپنے دل میں کیا خیال کرتے ہونگے۔

(فیض محمد فیض لدھیانوی)

شیوۂ سُہیل

فغاں! کہ شوق مرا ننگِ سازوساماں ہے
فغاں! کہ خاک پہ میری وہ دامن افشاں ہے

فغاں! کہ زخمِ جگر ناپسندِ خاطر ہو
اُسے ہوائے تماشائے باغ و بستاں ہے

فغاں! کہ جوششِ فریاد کا مزہ نہ رہا
ستم! کہ مشقِ ستم سے بھی وہ پشیماں ہے

فغاں! کہ کاہشِ غم میں ہوئی کمی واقع
دلِ فسردہ کو پروائے سازوساماں ہے

فغاں! کہ کاوشِ ہجراں میں اب وہ لطف نہیں
کہ موت بھی مری جانِ حزیں کو آساں ہے

فغاں! کہ عشرتِ نظّارگی ہوئی مفقود
کہ ذرّے ذرّے میں روداد چشمِ حیراں ہے

فغاں! کہ دشنۂ غم کی عنایتیں نہ رہیں
فغاں! کہ درد ہی اب میرے دل کا درماں ہے

فغاں! کہ بادۂ الفت میں اب وہ کیف نہیں
فغاں! کہ بیخودیوں میں خودی کا ساماں ہے

مجھے تو جامۂ ہستی سے ہو چکی نفرت.
عجب یہ ہے کہ تجھے نازِ جیب و داماں ہے

مسافرانہ وطن میں بھی وہ رہا اکثر
دلِ غریب کہ مجبورِ وضعِ دوراں ہے

(خاص برائے افسانہ نمبر)
(سہیل مالیگانوی)

(۱)

کملا ایک غریب گھر کی لڑکی تھی - نہایت خوبصورت اور تمیزدار حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے مرصع - پاس پڑوس کے سب لوگ اُس کے گُن گاتے تھے - ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی - اس لئے باپ کو جان سے زیادہ پیاری تھی اُس نے اُسے اسکول میں داخل کرادیا - کملا ذہین تھی - پندرہ برس کی عمر میں انٹرنس کا امتحان پاس کرلیا - اب باپ کو کملا کے بیاہ کی فکر ہوئی - مگر دُنیا کے رسم و رواج ایسے بُرے ہیں کہ جہاں کوشش کرنا ناکامی ہوتی - ہر جگہ روپے کا سوال سامنے آتا - دو ایک جگہ لوگ تیار ہوئے تو عورتوں نے بہت مخالفت کی - کوئی کہتی میم ہے اُسے گھر میں لاکر کون دھرم کو ناس لگائے کسی کا یہ اعتراض کہ پڑھی لکھی ہے - بھلا ہماری کیا عزت کریگی - غرض کہ کملا میں سب گُن تھے لیکن عیب تھا تو یہی کہ اُس نے انگریزی کیوں پڑھی - نہ جانے دُنیا کو کیا ہوگیا ہے -

بہاری لال کے لئے بیٹی کے غم میں کھانا پانی حرام ہوگیا - نہ دن کو چین نہ رات کو نیند - خیر ایشور نے اُنکی سُن لی اور کملا کا بیاہ کسی نہ کسی طرح ونود سے ہوگیا - سب خوش تھے مگر کرم کے لکھے کو کوئی کیا جانے -

(۲)

کملا جب سے سُسرال آئی دُنیا تو اُس کے گُن گاتی تھی مگر کملا کی جٹھانی کا یہ حال کہ دن میں چُلو بھر خون سوکھتا تھا - جہاں کسی نے کملا کو اچھا کہا اور اُس کے آگ لگی - دل کی بھڑاس نکالنے کو رادھا کے سوا اور کون مِل سکتا تھا - رادھا اُسی پڑوس میں رہتی تھی مگر عورت کیا تھی اچھی خاصی ڈائن تھی - جس گھر میں سُکھ چین ہو اُس سے دیکھا نہیں جاتا تھا - ہر طرح چاہتی کہ کسی طرح دوسروں میں پھُوٹ کرادے - یہی تو بات تھی کہ خود اُس کے گھر میں چین کسی کو نصیب نہیں تھا - اُس نے بھی اپنی زندگی روپی رو کر کاٹی -

رادھا ایک دن کملا کی جٹھانی کے یہاں آئی اور کملا کی بُرائیاں کرنی شروع کردیں - بھلا شاردا تو بھری بیٹھی تھی اُس نے بھی نہ جانے کیا کیا کہہ کر اپنا کلیجا ٹھنڈا کیا - چلتے چلاتے رادھا نے شاردا سے کہا کہ "بہن دیکھو کملا کو ویسا نہ سمجھنا - وہ ناگن ہے - دیکھنے میں سُندر ہے لیکن کسی دن تمہیں ایسا ڈسے گی کہ جینا دوبھر ہو جائیگا" جلتی ہوئی

میں تیل پڑ گیا۔ شاردا نے دل میں سوچ لیا کہ ڈسنے سے پہلے اس ناگن کا سر کچل ڈالونگی۔

(۳)

ونود کو کملا دیوی معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ ایک پڑھی لکھی اور سندر استری کے مِل جانے کے بعد آدمی کو کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ پھر اِدھر کملا کا یہ حال کہ جیٹھ جٹھانی کی اتنی خدمت کرتی کہ کیا کوئی لونڈی باندی کریگی ہنستی تو پھول جھڑتے۔
ونود نے ایک دن ایک بہت سندر ہار لاکر دیا۔ کملا خوش تو ہوئی پر بولی کہ بھابی کے لئے بھی کچھ لائے ہو؟ ونود چُپ ہو رہا۔ کملا نے کہا تو اس میں شوک کی کونسی بات ہے یہ میں بھابی کو دیدونگی میرے پہننے سے پہلے اُنہیں پہننا چاہئے۔ ونود بولا کملا یہ تم رکھ لو بھابی کے لئے دوسرا آ جائیگا۔ کملا —— مگر دیکھو سوامی جب تک بھابی کا ہار نہیں آجائیگا میں اسے نہ پہنونگی۔ —— بات گئی گذری ہوئی۔ ہار زیور کی صندوقچی میں رکھ دیا۔ چار پانچ دن بعد صبح کے وقت کملا نے صندوقچی جو کھولی تو ہار ندارد۔ پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سوچی کہ اب کیا کروں۔ ونود سے کہنے سے پہلے اپنی جٹھانی کے پاس گئی اور بولی بھابی میرا ہار نہ جانے کہاں کھو گیا ہے۔ —— شاردا بظاہر گھبرا گئی۔ دوڑی ہوئی ونود کے کمرے میں آئی۔ ہار بہت ڈھونڈا مگر نہ ملنا تھا نہ ملا۔ کملا کا بُرا حال کہ سوامی اب کیا کہیں گے، کہیں گے کیسی لاپروا ہے اتنا قیمتی ہار کھو دیا۔ مگر ونود کو اپنی بیوی ہار سے زیادہ پیاری تھی "ہو گا۔ جانے دو۔ اور آجائیگا" کہہ کر چپ ہو رہا۔ مگر کملا کا یہ حال جیسے کسی نے گھڑوں پانی ڈالدیا ہو۔ اُدھر شاردا خوش کہ اچھا ہُوا۔ جب دیکھا کہ ونود پر اُس کا ذرا بھی اثر نہیں۔ بڑے پیار سے اپنے پاس بُلایا اور کہا "بھیا ونود جانتے ہو ہار کہاں گیا؟ ونود نے کہا "بھابی بھلا میں کیا جانوں"۔
ہاں تم تو بھولے بھالے ہو ذرا سی چھوکری نے تمہیں اپنے پھندے میں پھنسا لیا ہے۔ تھوڑے دن میں لوٹ لوٹ کے باپ کا گھر بھر دے گی تب معلوم ہوگا —— ونود پر جیسے پہاڑ گر پڑا۔ چپ کھڑا رہا اور اُس کے بعد نہ جانے کیا کیا سوچتا ہُوا گھر سے باہر نکل گیا۔

(۴)

ونود نے اپنے بہت سے دوستوں کی دعوت کی۔ سب کھانے کملا نے اپنے ہاتھ سے پکائے۔ اِدھر ونود کا یہ حال کہ اپنے دوستوں سے ہنس ہنس کے کہہ رہے ہیں۔ آج دیکھنا میری استری کتنا اچھا کھانا پکاتی ہے۔ کھانا آیا تو کسی سے ایک نوالہ سے زیادہ نہ کھایا گیا۔ ہر چیز میں اتنا نمک کہ کھانا زہر ہو گیا —— ونود کو جیسی شرمندگی اُٹھانی پڑی اُسکا حال اُسکا دل جانتا تھا۔ اِدھر کملا حیران کہ ہے ایشور میں نے ہر چیز میں نمک بالکل ٹھیک ڈالا تھا کیا بھید ہو گیا۔
مگر اس بھید کو ونود اور کملا کے سوا کوئی تیسرا ہی آدمی جانتا تھا۔
اس دن سے ونود کملا سے کچھ کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ نہ پہلا سا پریم نہ پہلی سی بات چیت۔ کملا کی زندگی دوبھر ہو گئی جٹھانی کو بڑا سمجھ کر اس سے کچھ کہتی تو وہ ایسی اُلٹی سیدھی باتیں کرتی کہ دل اور اُداس ہو جاتا۔ ایسے وقت باپ کا

گھر رہ کر یاد آیا۔ مگر استری دھرم نے یہی کہا کہ "ونود کی سیوا کرو یہی تیرا سوامی ہے۔" کملا اپنی سعی کرتی رہی مگر خوشی اب اس سے دور رہنے لگی۔

(۵)

شاردا کی پڑوسن رادھا نے جب دیکھا کہ کملا کا اثر لوگوں کے دل سے ہٹ گیا تو اب سوچا کہ شاردا اور بسنت میں بھی لڑائی ہونی چاہئے جب وہ کملا کو خوش نہ دیکھ سکی تو بھلا شاردا اور اس کے پتی کے پریم کو کیسے دیکھ سکتی تھی۔ ایک دن آئی اور کہا بہن شاردا کتنا شوک ہوتا ہے کہ تمہارے کوئی اولاد نہیں۔ ہمارے گاؤں کے باہر ایک سادھو آکر ٹھہرے ہیں وہ ایسا منتر جانتے ہیں کہ تھوڑے دن میں تمہاری گود میں بھی ایک ہنستا کھیلتا بالک ہوگا۔ اولاد کی آس بُری ہوتی ہے۔ شاردا باباجی کے پاس گئی۔ ان سے اپنی مراد مانگی۔ انہوں نے آشیرباد دینے کے بعد کہا کہ پتری۔ دیوی جی سوکھی باتوں سے پرسن نہیں ہو سکتیں۔ وہ تو مایا چاہتی ہیں۔ مایا لاؤ تو تمہارا کام سپھل ہو جائیگا۔ شاردا جو آگیا کہ کر آگئی۔ بسنت کی کمائی تھوڑی تھوڑی کر کے باباجی کی کٹیا میں جانے لگی۔ دیوی کو جتنا ملا مایا کا موہ اور بڑھا۔ شاردا کو اولاد کی ضرورت تھی۔ وہ دولت کی پروا نہیں کرتی تھی وہ برابر دولت کی دیوی پر اپنی مایا قربان کر رہی تھی۔ روزمرہ باباجی کو کچھ نہ کچھ لاکر دیا کرتی۔ ایشور جانے ابھی بیٹے کی قیمت پوری ہوئی تھی کہ نہیں۔ ہماری آنکھیں ان بھیدوں کو کیسے دیکھ سکتی ہیں۔ یہ گُن تو باباجی ہی کے پاس تھے۔۔۔۔

۔۔۔۔اُف دُنیا کتنی اندھی ہے۔

(۶)

ایک دن بسنت نے اپنی تجوری کھولی تو دھک سے رہ گیا۔ شاردا کے گہنوں کا بکس نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ہزاروں کا مال منٹوں میں غائب ہو گیا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ شاردا کو معلوم ہوا۔ دوڑی ہوئی آئی اور رونا چلانا شروع کر دیا۔ گھر بھر بسنت کے کمرے میں اکٹھا ہو گیا۔ غریب کملا بھی دوڑی ہوئی آئی۔ جٹھانی کے پاس بیٹھ کر انہیں تسلی دینے لگی۔ شاردا نے اس کی صورت دیکھی۔ برس پڑی چھوکری تو نے میرا سارا گھر لوٹ کر اپنے باپ کے یہاں پہنچا دیا۔ اب پوچھنے آئی ہے کہ کیوں روتی ہو وہ تو کل رات کو میں نے تیرے پاؤں کی آہٹ اس کمرے میں سُنی تھی جب ہی سمجھ گئی تھی کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ ایسی باتیں بھلا چھپانے سے کہیں چھپ سکتی ہیں؟" یہ کہہ کر اور زور زور سے چلا کر رونے لگی کہ ہائے مجھے تو اس ناگن نے ڈس لیا۔ اب کیا کروں سارا گھر سمجھا کہ کملا غریب گھر کی بیٹی ہے کیا تعجب کہ اس نے یہ کیا ہو۔ شاردا کے کہنے سے اور زیادہ یقین ہو گیا۔ ادھر غریب کملا کا یہ حال کہ کاٹو تو خون نہیں۔ شرم کے مارے زمین میں گڑی جاتی تھی۔ بات سچ ہوتی تو کچھ نہیں۔ جھوٹی بات پر سارا گھر اُسے بُرا بھلا کہہ رہا تھا اس کا کیا علاج۔ سناٹے میں آگئی۔ وہیں بیہوش ہو کر گر پڑی۔

شام کو ونود گھر آیا تو سارا حال معلوم ہوا۔ شاردا نے رو رو کر گھر کو سر پر اُٹھانا شروع کر دیا۔ ونود کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ کملا کو اس طرح گھور کر دیکھا کہ اس کی آدھی جان نکل گئی۔ بولی "سوامی! مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ مجھے اس سے بڑا رنج ہوتا ہے۔ ایشور جانتا ہے کہ اس میں میرا بالکل قصور نہیں۔"

یہ سُننا تھا کہ ونود اور آپے سے باہر ہوگیا۔ جھپٹ کر کملا کی چوٹی پکڑلی اور بولا "ناگن زہریلی ناگن مجھے سب معلوم ہے۔ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ پہلے تو ہار باپ کے گھر بھجوایا۔ تجھے شرم بھی نہیں آئی کہ بھائی بسنت کا سارا مال چرا کر وہاں پہنچا دیا گیا جانتی نہیں تھی؟ کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا" بھولی کملا کے آنسو جاری تھے۔ بڑی مشکل سے صرف اتنا کہہ سکی "سوامی! کیا بتاؤں"

کڑاکے کے جاڑوں میں ونود نے کملا کو گھر سے دھکا دیکر نکال دیا۔ اُس نے چلتے وقت چرنوں پر سر رکھنا چاہا۔ اُسے وہ بھی نہ کرنے دیا۔ ونود نے زور سے دروازہ بند کیا اور کملا کی دُنیا اندھیری ہوگئی۔ دُکھ کی ماری پھر اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔

(۷)

کملا چلی گئی۔ شاردا کے دِل کا کانٹا نکل گیا۔ اب اولاد کی پیاس اَور بھڑکی۔ باباجی کے یہاں کا جانا برابر جاری رہا۔ بسنت نیک تھا وہ اُسے کہیں جانے سے نہیں روکتا تھا۔ لیکن اِن سادھو سنتوں سے اُسے ہمیشہ جلن سی رہی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بنے ہوئے بھگت ہوں۔ مایا کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اور وہ دُنیا دار لوگوں سے بھی زیادہ پاپ کرتے ہیں شاردا باباجی کی پوجا کرتی تھی۔ اور بسنت کو اُن کی صورت سے نفرت تھی۔ اُس نے کئی دفعہ اُسے وہاں جانے سے روکا مگر شاردا نہ مانی۔ چوری چھپے جاتی ضرور۔ بسنت کا نیک دل اس سے اتنا گھبرایا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر چل دیا۔ شاردا پر پہاڑ گر پڑا۔ اُسے پتی کے جانے سے جو دُکھ ہُوا۔ اُس کا بیان آسان نہیں۔ اپنی مصیبت کو دیکھ کر کملا کی مصیبت کا دھیان آیا اور سوچا کہ میں نے بڑا پاپ کیا۔ کہ اُس کے ساتھ ایسا بُرا برتاؤ کیا۔ یہ سوچتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ونود کے کمرے میں گئی۔ اور رو رو کر کہنے لگی کہ "بھائی ونود! میرے دُکھوں نے مجھے آنکھیں دے دیں۔ میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ میں نے تم پر اور کملا پر بڑا ظلم کیا ہے۔ کملا بالکل بے قصور ہے۔ یہ سارا جرم میرا ہے۔ ہار بھی میں نے چُرایا۔ کھانے میں نمک بھی میں نے ڈالا۔ اور اپنے پتی کی تجوری میں سے بکس بھی میں نے نکالا۔ ایشور میرے پاپوں کو معاف کرے تم بھی معاف کردو۔

ونود چُپ تھا اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے!

(۸)

کملا اب پھر ونود کے ساتھ ہنسی خوشی رہتی ہے۔ ونود کے علاوہ شاردا بھی اب اُس سے محبت سے ملتی ہے کملا نے بھی اپنے گنوں سے سب کو موہ لیا۔ علم کی دولت نے اُس میں سارے گُن بھر دیئے ہیں۔ وہ ونود کی سیوا تو کرتی ہی ہے۔ اُس سے زیادہ وہ شاردا کے کاموں میں لگی رہتی ہے۔ اس لئے کہ دکھیاری شاردا اب بھی اکیلی ہے۔ نہ اُس کا پتی واپس آیا اور نہ اُسے دیوی نے کوئی اولاد دی۔ دولت البتہ سب کی سب باباجی کے پیٹ میں چلی گئی +

کلغی والا

(ابوالفصاحت پنڈت لبھورام صاحب جوش ملسیانی)

جی میں ہے حسنِ عقیدت کا بیاں ہو جائے
دسویں شاہی کی ثنا وردِ زباں ہو جائے

آج کچھ طرۂ مضموں کی دکھانی ہے پھبن
کلغی والا مرا عنوانِ بیاں ہو جائے

اے گورو! تو نے یہ چاہا کہ خزاں دیدہ وطن
ایک گلدستۂ گلزارِ جناں ہو جائے

رائج الوقت نہ ہو شرک و دوئی کا زرِ قلب
سکۂ توحیدِ عیانی کا رواں ہو جائے

کہدیا تو نے کہ ہر دل میں ہو وہ شوقِ جمال
سات پردوں میں جو پنہاں ہے عیاں ہو جائے

ڈھونڈلو اس بتِ رعنا کو صنم خانوں میں
دل میں آکر جو خدائے دو جہاں ہو جائے

اے گورو! تجھ کو تمنا تھی کہ آزاد ہوں سب
دُور دنیا سے غلامی کا نشاں ہو جائے

تُو نے ہر دل میں وہ جرأت و بسالت بھردی
جس سے اک روبۂ شل شیرِ ژیاں ہو جائے

تیرے پیمانۂ دل میں وہ بھرا تھا امرت
زالِ دنیا اسے پی لے تو جواں ہو جائے

منجمد قوم کو تو نے وہ روانی بخشی!
جس کے مذکور سے ہر نظم رواں ہو جائے

آہ پھر قوم ہوئی جاتی ہے بیگانۂ ہوش
کیوں نہ ہر نالۂ غم برقِ طپاں ہو جائے

معبدوں کا بھی تو اب پاسِ تقدس نہ رہا
کیوں نہ ہر نغمۂ ناقوس فغاں ہو جائے

آج پھر باغِ وطن خشک نظر آتا ہے
پھر وُہی ابرِ کرم فیض رساں ہو جائے

تیرے ہاتھوں نے یہ سینچا تھا خبر لے اسکی
کہیں ایسا نہ ہو پامالِ خزاں ہو جائے

جوش ملسیانی

بلا اب اُن کی سُنتی ہے کسی کے غم کا افسانہ

از عمدۃ الشعرا ناثر الملک افضل الشعرا پروفیسر نارائن پرشاد ورما مہر
جانشین فصیح الملک حضرتِ داغ دہلوی رح

کہوں کیا بار بار اُن سے دلِ پُر غم کا افسانہ
وہ کہہ دیں گے کہ ہم سُنتے نہیں ہر دم کا افسانہ

یہ کاغذ ہی کہیگا۔ تو نہ کہنا اُن سے اے قاصد
لکھا ہے میں نے اپنے خط میں اپنے غم کا افسانہ

ہزاروں آفتیں گزری ہیں اُن پر غمگساری میں
بڑا ہے میرے قصّے سے مرے ہمدم کا افسانہ

دلائی یاد واعظ اُس لبِ جاں بخش کی تُو نے
سُنا کر آج مجکو عیسیِٰ مریم کا افسانہ

پیامی کی ضرورت کیا۔ خبر ایسی نہیں چھپتی
ہوا پر اُڑ کے پہنچیگا مرے ماتم کا افسانہ

ہمارے زخمِ دل تو اور بھی رِسنے لگے سُن کر
زباں پر چارہ گر کی ہے مگر مرہم کا افسانہ

جوانی کی امنگیں ہیں مسرت کا زمانہ ہے
بلا اب اُن کی سُنتی ہے کسی کے غم کا افسانہ

گلوں کو داستانِ الفتِ بلبل سے کیا مطلب
سُنا کرتے ہیں وُہ تو رات بھر شبنم کا افسانہ

جو کھا کر ٹھوکریں ہم نکلے کوئے جاناں سے
تو ہم کو یاد آیا حضرتِ آدمؑ کا افسانہ

(مہر)

(۱)

خدیجہ نہایت نیک نفس، نیک خصال اور پاک طینت خاتون تھی۔ بچپن کا زمانہ والدین کی اطاعت اور فرماں برداری میں بسر کرنے کے بعد عنفوان شباب میں شوہر کے سپرد کر دی گئی۔ وہ پیدائش کے دن سے محبت پرستی اور وفا کوشی کی عادی بنائی گئی تھی۔ اُس نے شوہر کے گھر میں آکر نہ صرف خانہ داری کے امور ہی کی دیکھ بھال کی بلکہ خلیق اور نازبردار شوہر کے دل پر بھی پورا پورا قابو حاصل کر لیا۔

رفیق کوئی بڑا امیر آدمی نہ تھا۔ اُس کی حیثیت سو روپیہ ماہوار کی تھی۔ جس میں جائداد کی آمدنی کے ساتھ آفس کی تنخواہ بھی شامل تھی۔ اس کا دستور تھا کہ مہینے کی پہلی تاریخ کل روپیہ لا کے خدیجہ کے حوالے کر دیتا تھا اور خدیجہ اُس سے مہینہ بھر کا خرچ چلانے کے بعد کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیتی تھی۔

جس گھر کے مالک اور مالکہ میں موافقت ہو وہ گھر جنت سے کم نہیں۔ میاں بیوی کی زندگی بڑے آرام سے بسر ہو رہی تھی آنے والی صبحیں اُن کے واسطے مسرت اور شادمانی کا تحفہ لاتی تھیں۔ روشن راتیں اُن کے کیف اور سرور میں غیر معمولی اضافہ کرتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ اور وہ دونو خدا کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

(۲)

خدیجہ کی آدھی عمر عیش اور آرام میں بسر ہو گئی تھی۔ شوہر کی بے انتہا محبت اور نازبرداریوں نے میکے کی فراغت بھلا دی تھی اللہ کا دیا گھر میں سبھی کچھ تھا۔ سو روپے سلیقے سے صرف ہونے کی وجہ سے ہزار روپے کے برابر ہو گئے تھے۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ در و دیوار سے شادمانیاں ٹپکی پڑتی تھیں۔ پھر بھی ایک خلش تھی جو میاں بیوی کے دلوں کو بے چین رکھتی تھی۔ جب دُنیا کے کاموں سے فارغ ہو کے دونو میاں بیوی بیٹھتے تھے تو گھنٹوں اس خیال سے مغموم اور سرنگوں رہتے تھے۔ اس خلش کی وجہ یہ تھی کہ ہنوز خدیجہ کی گود خالی تھی۔ یوں تو گھر میں سب چیزیں موجود تھیں۔ صرف کسر تھی تو ایک شمع کی تھی۔ جو ان کی آنکھوں میں نور اور دلوں میں حقیقی سرور کی لہریں پیدا کرتی۔ پڑوسیوں کے بچے اپنے اپنے مکان کے صحن میں کھیلتے کودتے اور خوش فعلیاں کرتے تھے۔ اُن کے ماں باپ اُن خوب صورت تیلیوں کے نظر کش کرشموں سے محظوظ ہوتے تھے۔ لیکن خدیجہ اس نعمت سے

محروم تھی، وہ صرف اس لالچ میں مٹھائی رکھ چھوڑتی تھی کہ شاید پڑوس کا کوئی بچہ کھیلتا ہوا آنکلے اور وہ اُسے کلیجے سے لگا کے دل ٹھنڈا کرے۔

(۳)

خدیجہ کی یہ تمنا پوری تو ہوئی لیکن کسی قدر تاخیر سے۔ جب اُس کی عمر کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ چکا اور اُس نے اہل اللہ اور پیروں سے لو لگائی، ہزاروں منتیں مرادیں مانیں۔ فقیر فقرا کی دعائیں لیں۔ ولیوں کے مزاروں کی جاروب کشی کی اور جس قدر تدبیریں امکان میں تھیں اُن سب پر عمل کر چکی تو رحمت الٰہی جوش میں آئی۔ گوشۂ قلب سے نکلی ہوئی دعائیں باب اجابت تک پہنچیں۔ نہالی عمر میں ثمر آیا یعنے خدیجہ کا سن تیس اور چالیس سال کے درمیان میں تھا تو خدا نے ماہ پارہ فرزند عطا کیا۔ اِس موقعہ پر اُن دونو کو جو خوشی حاصل ہوئی لفظوں میں اس کا اعادہ ممکن نہیں۔ رفیق تو ولادت کا مژدہ سُنتے سجدے میں گر پڑا۔ سارا گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ ڈولیوں پر ڈولیاں اُتر رہی تھیں۔ اس خوشی میں قدیم رنجشیں بھی مٹ گئی تھیں۔ خاندان میں جن جن لوگوں سے ملال تھا وہ بھی گذشتہ کدورتیں فراموش کر کے تہنیت دینے چلے آئے تھے۔ اِن موقعوں پر جتنی مناسب خوشیاں منائی جاتی ہیں وہ سب تمام و کمال عمل میں لائی گئیں۔ بڑے چلے کے نہان (غسل) تک چہل پہل رہی۔ خاندان کے تمام چھوٹے بڑے مہمان رہے۔ برادری کی ضیافتیں ہوئیں۔ اگرچہ رفیق رسموں کا حامی نہ تھا لیکن مستورات سے بس نہ چلا۔ کچھ نہ کرتے پر بھی بیسیوں رسمیں ادا کی گئیں۔ کچھ اوپر ایک مہینے شادی کا ہنگامہ گرم رہا۔ پھر یکے بعد دیگرے مہمان رخصت ہونا شروع ہوئے۔ آخر مکان میں میزبانوں کے سوا کوئی نہ رہا۔

(۴)

خدیجہ اور رفیق لخت جگر کو دیکھ دیکھ کے باغ باغ ہوئے جاتے تھے۔ بچے نے تلقاری ماری اور دونو کی باچھیں کھل گئیں۔ بچہ ہمکا اور اُن دونو کے کلیجے ہاتھ بھر کے ہوئے۔ خدیجہ کو تو گویا بچے کی دیکھ بھال کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ اُسے اتنی بھی تو خبر ہوتی تھی کہ دن کدھر آیا؛ اور کدھر نکل گیا؟ رفیق نے بیوی کی سہولت کے خیال سے ایک کھلائی رکھ دی تھی لیکن وہ ماما کے مارے بچے کے کل کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھی۔

زمانہ گذرنے لگا۔ جس طرح باغ کے پودے باغبان کی آبیاری سے لہلہانے لگتے ہیں۔ بچہ اپنی محبت والی مہربان ماں کی غور پرداخت سے نشو نما پانے لگا۔ سال بھر کا بچہ باتیں تو کیا کرتا کچھ یونہیں سی غوں غاں کرنے لگا تھا۔ اُس کی معصومانہ ادائیں والدین کے روحانی سرور کا باعث تھیں۔ کاش! وہ سمجھ سکتے کہ خالق حقیقی نے جو امانت ان کے گھر میں ودیعت رکھی ہے، وہ بہت تھوڑے دنوں کے لئے اُن کے ہاتھ کا کھلونا، گھر کا اُجالا اور دل کا سرور ہے۔

(۵)

گرمیوں کی فصل، آندھیوں کا زمانہ اور رات کا وقت تھا۔ رفیق اپنی ڈیوٹی پوری کر کے مکان آگیا تھا۔ رات کے کھانے سے

فراغت ہوگئی تھی - بچہ ماں باپ کی گود میں کھیل کود کے سوگیا تھا - خدیجہ نے اُسے چھوٹے سے بستر پر لٹادیا اور تھوڑی دیر میاں سے باتوں میں مشغول رہی - گھنٹہ گھر سے دس بجنے کی آواز آئی - یہ دونو بھی آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹ گئے - ماما کھلائی تو کھاپی کر نو ہی بجے سے غافل سوگئی تھیں، اب مکان میں بالکل سکوت تھا۔ انگنائی میں ایک طرف پھونس کا چھپر پڑا تھا - یہیں ماما گھر کا کھانا پکاتی تھی۔ سوئے اتفاق سے آج لکڑیاں بجھاتے وقت خیال نہ رہا اور ایک لکڑی جلتی رہ گئی - ایک بجے رات کو ہوا تیز ہوگئی - لکڑی سے کچھ پتنگے نکل کے پھونس تک پہنچ گئے - مئی جون کا تپا ہوا چھپر بارود کی طرح جل اُٹھا - شعلے بھڑک بھڑک کے آسمان تک جانے لگے - مگر سونے والوں کی آنکھ نہ کھلی - اگر چھپر ہی پر بلا ٹل جاتی تو غنیمت تھا - لیکن اِن شعلوں نے یہ غضب ڈھایا کہ کہ سارے مکان میں آگ لگادی - اور سب کمرے دھڑا دھڑ جلنے لگے - ایک تو گرمی اس پر آگ کی حدّت - سب سے پہلے رفیق بیدار ہوا مگر کب؟ جب موت کا فرشتہ کچھ ہستیوں کو جلا کے خاکستر کر دینے کی نیت سے اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا - آنکھ کھلتے ہی گھر کو آتشبازی کے قلعے کی طرح جلتے دیکھا - واقعہ سمجھ میں نہ آیا اور غور کرنے کی مہلت نہ تھی - فی الفور بیوی کا شانہ جھنجھوڑ کے جگایا - وہ عورت ذات اس ہولناک نظارے کی تاب نہ لاسکی، ہوش و حواس گم ہوگئے - رفیق نے کہا -

"اُف! آگ کا اثر یہاں تک پہنچ چکا ہے، جلد گھر سے نکل چلو ورنہ ہم سب جل بھن کر خاک ہوجائیں گے۔"

خدیجہ گھبرا کے اُٹھ کھڑی ہوئی - رفیق آگے آگے ہوا اور دونو بدحواسی کے عالم میں مکان سے باہر نکل گئے - اب تک دونو میں سے کسی نے بھی بچے کو دریافت نہیں کیا تھا - رفیق نے سمجھا تھا کہ خدیجہ نے گود میں اُٹھالیا ہوگا - اور خدیجہ کا خیال تھا کہ رفیق پہلے جاگا تھا اُس نے بچے کو محفوظ کرلیا ہوگا - امن کی جگہ پہنچ کے خدیجہ نے رفیق کی گود خالی پائی - کلیجہ سُن سے ہوگیا - گھبرا کے پوچھا - "میرا بچہ کہاں ہے؟"

اس سوال نے رفیق کے استقلال پر کاری ضرب لگائی مگر جواب کیا دیتا؟ وہ دونو اپنی ننھی سی جان کو موت کے مُنہ میں چھوڑ آئے تھے - دونو بجائے خود مجرم تھے - بڑھتے ہوئے سکوت نے حقیقت فاش کردی - ماں کا دل تھا تاب نہ رہی - بچے کے لانے کو دیوانہ وار جلتے ہوئے گھر کی طرف لپکی - بھڑکتے ہوئے شعلوں نے صف بندی کرکے روکنا چاہا - موت کی ہیبت عنان گیر ہوئی - لیکن جانباز پروانے کو شمع کی لو تک پہنچنے سے کوئی قوت نہیں روک سکتی - اُسے کوئی پُر زور کشش کھینچے لئے جاتی تھی - سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ رُکنا بھی چاہتی تو نہ رُک سکتی -

(۶)

رفیق کئی منٹ تک دم بخود رہا - جب خدیجہ شعلوں کے قریب پہنچ گئی تو بڑی بیتابی سے یہ کہتا ہوا جھپٹا -

"ٹھہرو، ٹھہرو، میں آتا ہوں تم خطرے کی جگہ نہ جاؤ۔"

بچے کی ماں ممتا نے یہ الفاظ اُس کے کانوں تک پہنچ دیئے۔ وہ جو ہمیشہ شوہر کے جملہ احکام پر سرِ اطاعت خم کرنے کی خوگر رہی ہے اِس وقت میاں کی طرف پھر کے بھی نہیں دیکھتی۔ اُس کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو رہی ہے۔ بچے کی ممتا نے کلیجے میں آگ بھڑکا رکھی ہے۔ اُس آنچ کے سامنے اِن شعلوں کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ رفیق چیختا چلاتا رہا لیکن وہ شعلوں کے اندر گھستی چلی گئی اور سیدھی اُس خواب گاہ میں پہنچی جہاں اُس کا نونہال طفلانہ نیند کے مزے لوٹ رہا تھا آگ کی گرمی نے پیاری پیاری نازک جبین کو عرق آلود کر دیا تھا۔ اُس نے بچے کو گود میں اُٹھا کے اُس کے پھول سے رُخسار چومے اور کلیجے سے چمٹائے ہوئے کمرے سے نکلنا چاہا۔ دروازے ہی پر رفیق بھی مل گیا جو اپنی جان پر کھیل کے اُس کی مدد کے لئے یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ چھت میں آگ لگی تھی۔ دھنیاں، چھانیں، کھڑکیاں اور دروازے جل رہے تھے۔ دیواروں سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور گویا ایک اہل رسیدہ خاندان کو آتشیں غسل دینے میں کمال کدوکاوش کر رہے تھے۔ دھواں گھٹنے کی وجہ سے راستہ نہ ملتا تھا۔ جدھر قدم بڑھتا تھا لپکتے ہوئے شعلے سدِراہ ہوتے تھے۔ وہ دونوں کئی دفعہ بھاگ بھاگ کر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آئے گئے لیکن نکاس کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ ان کا وقت پورا اور حکم قضا نافذ ہو چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دھنیاں اور چھانیں جل جل کے گریں۔ ساتھ ہی اڑاڑا کے چھت بھی آرہی اور آن کی آن میں یہ تین ناشاد اور پُرارمان ہستیاں جل بھن کے خاکستر ہو گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مرزا فدا علی خنجر لکھنوی

موت

میرے رشتہ داروں کے ہاں ایک عزیز کا انتقال ہو گیا تھا۔ تعزیت کے لئے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ایسی محفلوں میں عموماً "موت" پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ گفتگو کے دوران میں ایک کہنہ سال بزرگ نے کہا: "ہستی کا کچھ اعتبار نہیں۔ ہر دم موت و زندگی کی کشمکش میں گذر رہا ہے۔ انسان فانی ہے۔ آخر فنا ہو جاتا ہے۔ اِسکی زندگی بالکل ناپائدار ہے۔" کچھ دیر کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے۔

دوسرے دن سڑک پر ایک جنازہ جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ ہمراہ تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ جنازہ اُسی کہنہ سال بزرگ کا ہے جس نے ایک روز پہلے بھری محفل میں مندرجہ بالا فقرے کہے تھے۔ میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ ملکِ عدم کے اِس مسافر کو رخصت کرنے کے لئے میں بھی جنازہ کے ہمراہ ہو لیا۔ راستے میں کندھا دیتے ہوئے مجھے مرنے والے کے وہ فقرے بار بار یاد آرہے تھے۔ جو دم دینے سے ایک روز پہلے ناصحانہ انداز میں اُس نے کہے تھے۔ آج اُس نے خود فنا ہو کر انسانی زندگی کی ناپائداری کا ایک اور ثبوت دے دیا تھا۔ فیض محمد فیض کھیواڑی

ایک ہسپانوی عورت کا گیت

(جناب پروفیسر تاثیر ایم-اے)

مجھ سے الفت تجھ کو کرنی ہے تو کر میرے لئے — وقف کر دے اپنا دل اپنا جگر میرے لئے

تیری اُلفت کا اگر ہے حسنِ صورت پر مدار — حُسن کی مانند ہوگا عشق بھی ناپائدار

چار دن کی چاندنی ہے یہ جوانی کچھ نہیں — کچھ نہیں ہے کچھ نہیں ہے حسنِ فانی کچھ نہیں

یہ مرا جوبن تو رفتہ رفتہ ڈھلتا جائیگا — تیرا دل بھی ساتھ ساتھ اُس کے بدلتا جائیگا

تجھ کو الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے

مجھ سے اُلفت غمگساری کیلئے بھی تو نہ کر — دردمندی سوگواری کیلئے بھی تو نہ کر

آنسوؤں کو میرے رخسار پہ ڈھلتے تو نہ دیکھ — سوزشِ غم سے مرے سینے کو جلتے تو نہ دیکھ

برگِ گُل پر قطرۂ شبنم رہیگا تابکے — آکے پہلو میں ترے یہ غم رہیگا تابکے

خشک ہو جائیگا میرا دیدۂ پُرآب جب — پُرسکوں ہو جائیگا میرا دلِ بیتاب جب

جب تری اُلفت کا سرچشمہ فنا ہو جائیگا — آنسوؤں کے ساتھ تو بھی ہوا ہو جائیگا

مجھ سے اُلفت تجھ کو کرنی ہے تو کر میرے لئے

(ترجمہ از مسز براؤننگ)

خمخانۂ سخن

(لسان الملک خیام العصر حضرت ریاض خیرآبادی مدظلہٗ)

بھول جائیں گے خدائی کا مزہ میرے بعد
یاد آئے گا بتوں کو بھی خدا میرے بعد

کام آئی ہے مرے۔ میری دعا میرے بعد
سب جفا پیشہ بنے اہلِ وفا میرے بعد

مفتیٔ شرع کو پینے میں تکلّف نہ رہا
ہوئی پانی یہ مئے ہوش ربا میرے بعد

نہ رہا میں تو بنی حشر پر اس کوچے میں
کہ جنازے کی طرح حشر اُٹھا میرے بعد

آشیانے ہیں قفس۔ خانۂ صیاد چمن
ہو گئی اور زمانے کی ہوا میرے بعد

گزرے کتنے ہی جم و خسرو و پرویز کے دور
کبھی خالی نہ رہا جام مرا میرے بعد

آئے ہیں مہندی لگائے وہ مرے ماتم میں
رنگ لائی ہے قیامت کا حنا میرے بعد

نہ وہ عشوہ نہ کرشمہ نہ وہ غمزہ نہ وہ ناز
نہ وہ قاتل ہے نہ قاتل کی ادا میرے بعد

خاک برسی اگر آیا بھی کبھی ابرِ بہار
کیا سے کیا ہو گئی گلشن کی ہوا میرے بعد

اب کہاں نقشِ کفِ پائے حنائی کا چراغ
میرے گھر آئے حسینوں کی بلا میرے بعد

موجِ مے لاکھ بنے موجِ تبسم ساقی
نہ رہا ہائے کسی شے میں مزا میرے بعد

بنتی جنّت نہ مرے واسطے تربت میری
میرے کام آئی حسینوں کی دعا میرے بعد

سوکھے کانٹے مرے صحرا کے ہرے ہو جاتے
آ نکلتا جو کوئی آبلہ پا میرے بعد

خدمتِ شمع فروزی میرے دم تک تھی ریاض
کیسی تاریک ہے بزمِ شعرا میرے بعد

آہِ نارسا

(جناب منشی شاہد احمد صاحب شاہد بی اے آنرز)

سنہری بالوں کا ایک لہریں مارتا ہؤا سمندر، کھلے ہوئے سُرخ گلاب کا سا تمتمایا ہؤا چہرہ، خوشنما سیپی جیسا تنگ دہانہ، انتہائی معصومیت بات بات پر محجوب ہوجانے سے ہویدا، شرمائی لجائی جنبش، سمجھدار بچّوں کے سے بھولے بھالے سوالات ــــ صرف یہی وہ خصوصیات نہیں تھیں جنہوں نے ریاض کا دل موہ لیا تھا۔ اس کے پہلو میں عجیب وغریب دل دھڑکتا تھا۔ بندشوں سے وہ ڈرتا تھا۔ اور پابندیوں سے اُسے اُلجھن ہوتی تھی۔ فطری تلوّن کے باعث وہ اکثر لالچوں کا شکار آسانی سے ہوجاتا تھا۔ اس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ کسی ایک بات پر عرصہ تک قائم و دائم رہے۔ عورتوں سے پے درپے تعلقات نے اس کے دل پر اتنے بھی نقوش نہ چھوڑے تھے جتنی کہ سمندر کی لہریں ساحل کی ملائم ریت پر چھوڑ جاتی ہیں۔

یہ محبت آمیز زندگی کا خوشگوار خواب نہیں تھا، کسی کو چاہنے اور کسی سے چاہے جانے کی آرزو نہیں تھی جو عموماً ہر قلبِ انسانی میں کروٹیں لیتی ہے۔ کثرتِ عیش ونشاط سے یہ متبرک جذبے تھک چکے تھے۔ مجرّد دوستوں نے جب ایک ایک کرکے تاہل (گرہست) کی زندگی اختیار کی تو ریاض نے اپنی زندگی میں رخنہ پڑتے دیکھے۔ دوستوں کی اس حرکت کو پہلے تو اپنی خود غرضی سے بیوقوفی سمجھتا رہا۔ لیکن بعد میں اُنکو دیکھ کر دل ہی دل میں اُنکی متاہل زندگی پر رشک کرنے لگا۔ کچھ تو یہ جذبہ متحرک ہؤا اور کچھ بڑھیا ماں کی مُسلسل استدعائیں اور دعائیں تھیں کہ ریاض شمسہ سے شادی کرنے۔ لیکن اِن دونو سے زیادہ جس خیال نے اُسے شادی کرنے پر آمادہ کیا یہ تھا کہ اس طرح وہ ایسی زندگی گذارے گا جو گھر کی پُرامن زندگی کہلاتی ہے۔ جس میں قہقہہ اور گیت گونجتے ہیں حقیقی مسرت اپنی برکتیں بکھیر دیتی ہے۔ ماں اپنے ننھے ننھے سے بچوں پہ بوسوں کی بوچھاڑ کرتی ہے اور اس چونچال ننھی مخلوق کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں خوشی اور جائز غرور وناز سے چمکنے لگتی ہیں، اور پھر اس کی وہ باتیں جو احساسِ مسرت اور اندیشۂ خطر سے چھلکتی رہتی ہیں۔ جس طرح کی صرف ایک ممتا بھرے دل ہی سے چھلک سکتی ہیں۔ ریاض نے انہی جاذبیتوں سے اپنے ذہن میں گھریلو زندگی کی ایک خوش رنگ تصویر بنائی۔ اور اس کی دلپذیری سے مغلوب ہوکر شمسہ سے شادی کرلی۔

در حقیقت اُسے بچّوں سے ایسی ہی محبّت تھی جیسی کہ بعض آدمیوں کو پالتو جانوروں سے ہوتی ہے۔ وہ بچّوں میں ایسی ہی دلچسپی لیتا تھا۔ جیسی کہ کسی خوشنما منظر میں۔ بچّوں میں وہ اپنے لئے خاص کشش پاتا تھا۔ اُنکے ساتھ وہ بہت محبّت اور شفقت سے پیش آتا تھا۔ اُن کے لئے نئے نئے کھیل نکالتا۔ انہیں اپنے گھٹنوں پر کھلاتا اور اُن کی بے معنی باتوں سے گھنٹوں نہ اُکتاتا۔ اُن کی سمجھ میں اضافہ ہوتا غور سے دیکھتا۔ ذہن تبدیلیوں کا مشاہدہ گہری نظر سے کرتا۔ ان کی ننھی ننھی سی روحوں کی نشو و نما کا بغور مطالعہ کرتا رہتا۔ روزانہ پارک میں جا بیٹھتا تاکہ انہیں اُچھلتا کودتا اور باتیں کرتا دیکھ سکے۔ بعض دوست اسے یوں دل بہلاتا دیکھ کر اس کی ہنسی اُڑاتے مگر وہ اس کی بھی پروا نہ کرتا۔

شمسہ سے شادی کرنے کے بعد وہ ایک نئی دُنیا میں پہنچ گیا۔ اور وہ مسرتوں کی دُنیا تھی۔ وہ بیوی کی اُلفت میں محو تھا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ دن بیوی کے پاس بیٹھے گذر جاتا اور رات اُس سے باتیں کرتے ختم ہو جاتی۔

مہینے گذر گئے اور ریاض کے طرزِ عمل میں کوئی فرق نہ آنے پایا اور نہ اُن کی محبت میں کمی واقع ہوئی شعلۂ محبّت بدستور بھڑک رہا تھا اور دونو دلوں میں اس کی گرمی طاری و ساری تھی۔

لیکن یکایک ریاض کی مسرتیں ختم ہو گئیں اور اپنی افسردگیٔ خاطر کو پوشیدہ رکھنے کے باوجود بھی وہ ایک نیا آدمی بن گیا۔ بات بات پر اُلجھتا بے چین رہتا۔ تُنک مزاج و متلوّن۔ ہر رگ و پے میں بیقراری حلول کر گئی۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ ہر سانس بے اطمینانی میں ڈوبا ہوُا۔

لیکن کوئی نہ کوئی چیز ضرور تھی جو اس محبت کو مسموم کر رہی تھی جو اس کے لئے سرمایۂ مسرت تھی جو روز بروز اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان شدّت سے حائل ہوتی جا رہی تھی۔ اور جو اسے گھر سے متنفر کر رہی تھی۔

اس نا معلوم اذیت نے رفتہ رفتہ اُس کے دل میں ایک مستقل شکل اختیار کر لی' اس میں جم گئی جس طرح ایک کیل جم جاتی ہے۔ وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر سکا اور اب زنجیروں کا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ سمجھ گیا تھا کہ اس نوع کی زندگی اُسے راست نہیں آسکتی۔ وہ ایک ایسی عورت سے محبت نہیں کر سکتا تھا جس میں ماں بننے کی صلاحیت نہ ہو' جو اُس کی محبّت کا ثمر ایک بچہ کی صورت میں پیش کرنے سے عاجز ہو۔

افسوس !! اپنے خواب سے چوکنا خود سے یہ کہنے کے لئے کہ اب صرف اوروں کی خوش قسمتی پر رشک کرو۔ اسے خود یہ سعادت کبھی حاصل نہ ہوگی کہ ایک ننھے گھونگر والے سر اور مُسکرائے چہرے پر بوسوں کی بوچھاڑ کرے' جس کی معصوم حرکتیں' روز افزوں عقل کی باتیں انسان کے دل کو باغ باغ کر دیتی ہیں بلکہ

اب اُسے مجبوراً اپنا سفرِ حیات تنہا طے کرنا پڑیگا یا خاموش یا دل شکستہ اور کس مپرسی میں بڑھاپے کی بیمار آغوش میں۔ خاندانی شجرہ سے اور کوئی شاخ نہ نکلے گی۔ اور مرتے وقت بھی اُن عزیز ترین ہستیوں کو اپنے سینہ سے لگا کر سکونِ قلب حاصل نہ کر سکیگا جن کے لئے وہ ساری عمر مصیبتیں اُٹھاتا اور ایثار کرتا رہتا اور جو غم و اندوہ سے اس کے لئے دھاڑیں مار کر روتیں۔ بجائے اُن کے وہ بہت جلد غیر مستحق لالچی حقداروں کا شکار بن جائیگا۔ جو اس کے جیتے جی ہی اس کی مقبوضات کو اپنے مصارف کی بہترین ضمانت تصور کرنے لگیں گے۔

ریاض نے شمسہ سے اِن احساسات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا جو اس کے لئے سوہانِ روح بن گئے تھے۔ اور اُس کی بھی احتیاط کی کہ اسے اس ناخوش حالت کا گمان بھی نہ ہو۔ ریاض نے اس سے شکایتاً بھی کبھی کچھ نہیں کہا سُنا۔ کیونکہ عموماً ایسی باتوں کا انجام بُرا ہی دیکھا گیا ہے۔ لیکن شمسہ اس قدر سادہ لوح نہیں تھی کہ پہچان نہ جاتی کہ اس کے محبوب شوہر کو آخر کیا چیز اس درجہ افسردہ اور اس کی محبت کو اس قدر مضمحل بنا رہی تھی۔ ہر مہینے ایک تازہ نامرادی رُونما ہوتی۔ اور اُمید پیچھے ہٹ جاتی۔ لیکن شمسہ کو اصرار تھا اُن کی آرزو ضرور پوری ہوگی۔ اس صبر آزما انتظار سے اس کی صحت بگڑ گئی مگر اس نے اس پر یقین کرنے سے قطعی انکار کر دیا کہ وہ کبھی ماں نہ بن سکے گی۔

برخلاف دوسری مایوس عورتوں کے شمسہ کسی طبیب سے رجوع کرنے کو اپنی ہتک یا کسی مقدس مزار پر منت ماننے کے لئے جانے کو اپنی توہین سمجھتی تھی۔ اس کی "خودداری" اور وفادار فطرت نے بالآخر اُس ناجائز دباؤ سے بغاوت کی جس نے کبھی خفگی، کبھی تکلیف دہ خاموشی، اور کبھی مغرورانہ سرد مہری کی صورت اختیار کی۔ حالانکہ محبت اور نرمی سے بھی ہر کام نکالا جا سکتا تھا۔

احساسِ حقارت نے شمسہ کی روح میں موت کا سا جمود پیدا کر دیا۔ محبت کا روشن ستارہ اب بجائے طلوع ہونے کے غروب ہو رہا تھا۔ غصہ کی باتیں، خوفناک لڑائیاں اور وہ ناموزوں طریقے جو محبت کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ معرضِ ظہور میں آنے لگے تھے۔

آخر کار ایک رات کو جب ریاض نے اپنی بدمزاجی اور ناگفتہ بہ الفاظ سے اس کے دل کو مجروح کر دیا تھا۔ شمسہ نے ہوائیاں اُڑتے چہرے اور غم سے بھری آواز میں کہا:۔

"چونکہ اب تم کو مجھ سے محبت باقی نہیں رہی ہے تو تم صاف صاف مجھ سے اس کا اقرار کیوں نہیں کرتے۔ بجائے اس کے کہ بات بات پر مجھے یوں کچوکے دیا کرو اور طرح طرح سے جھگڑے نکالو۔ اس بدمزہ زندگی کو یوں کب تک جاری رکھو گے۔ ایک دفعہ مجھ سے کیوں نہیں کہدیتے کہ تمہارا میرا نباہ نہیں ہو سکتا! تم آزادی کے خواہش مند ہو میں تمہیں آزادی دیتی ہوں۔ تمہاری قسمت تمہارے ساتھ ہے

اور میرا نصیب میرے ساتھ۔ ہم ایک دوسرے سے جُدا ہو سکتے ہیں۔ بغیر جگ ہنسائی کے بغیر کسی قانونی چارہ جوئی کے میں اس شہر کو چھوڑ دونگی اور اپنے گاؤں میں اپنی والدہ کے پاس چلی جاؤنگی۔ خدا گواہ ہے ریاض۔ مجھے تم سے اب بھی ویسی ہی محبت ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ اور میں تمہاری ویسی ہی بیوی رہونگی خواہ میں تمہارے ساتھ رہوں یا تم سے علیحدہ"

ریاض جواب دینے سے پہلے کچھ دیر تک خاموش رہا چہرہ پر پریشانی اور آنکھوں میں غم کی جھلک تھی۔ پھر اپنا منہ پھیر کر بولا۔ "ہاں! شائد یہی ہم دونو کے لئے بہتر ثابت ہوگا"

ان دونو میں جدائی ہوگئی۔ شمسہ نے انتہائی ہمت سے استقلالِ عمل کا ثبوت دیا۔ شہر چھوڑ کر گاؤں میں چلی گئی۔ گمنامی میں دن گزارنے لگی۔ جدائی کی بھیانک سختیاں صبر سے جھیلنے لگی۔ ریاض کی محبت کی خاطر اس نے اسے بھی برداشت کیا۔

اِن دونو میں خط و کتابت کا سلسلہ قائم تھا۔ اور شمسہ اس آس پر زندہ تھی کہ ریاض ایک نہ ایک دن اپنی حرکت پر نادم ہو کر پھر اُسے بُلا لیگا۔ بُرے دوستوں کی صحبت سے بچ جائیگا۔ پھر محسوس کریگا کہ کیسے آرام و راحت سے اس نے اپنے آپ کو محروم کر لیا تھا۔ اور اُس سے پھر ویسی ہی محبت کرنے لگیگا جیسی کہ پہلے کرتا تھا۔ اپنی سہیلیوں اور ہمجولیوں کے صلاح مشورہ پر اس نے مطلق توجہ نہیں کی جنہوں نے اسے سمجھایا بجھایا کہ ایسے مردوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ طلاق لیلے۔ مہر کا دعوٰے کرے۔ جیت قطعی اس کی ہوگی مگر شمسہ نے ایک نہ سُنی اور خوشگوار اُمیدوں پر جیتی رہی۔

چند روز کی تنہائی کے بعد ریاض پھر بُری صحبتوں میں پڑ گیا۔ محبت کے معرکے سر ہونے لگے۔ خانہ خالی را دیو میگیرد کے مطابق آخر جلد ہی ایک عورت نے شمسہ کی خالی جگہ پُر کرنے کے لئے اُس کے دل پر مضبوطی سے قبضہ پا لیا اور باقاعدہ بیوی کی حیثیت میں وہ اُس کے گھر میں داخل ہوگئی۔

شمسہ بھی اس واقعہ سے لاعلم نہ رہی۔ اس جلاپے اور رنج کو اس نے یہ کہہ کر دبا دیا کہ ریاض کی تلوّن مزاجی اس نئے رشتہ کو بھی اُسی طرح توڑ دیگی جس طرح کے سینکڑوں عورتوں کے دام حسن کو شکست کر چکی تھی۔ اس عورت کا بھی وہی حشر ہوگا جو خود اُس کا ہُوا تھا۔

شمسہ خوش تھی کہ اب ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ ریاض کو اب معلوم ہو جائیگا کہ اس نئی بیوی میں اور پہلی بیوی میں کیا فرق ہے۔ اُسے معلوم ہو جائیگا کہ محبت بھرا دل کسے کہتے ہیں۔ جس کی ہر ضرب سے لغزشوں کی معافی، عیوب سے چشم پوشی اور نیکی ہی نیکی کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ موازنہ سے شمسہ کی خوبیاں ریاض پر آئینہ ہو جائینگی۔ اور وہ ایک بار پھر اس کی طرف رجوع کرے گا جس کا دل پہلے ہی صدائے طلب

پر لبیک کہنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

شمسہ کے خطوط کے جواب میں ریاض نے حقارت آمیز خاموشی اختیار کرلی تھی۔ بڑی بڑی خبریں اُس کے کانوں میں پہنچتی رہتی تھیں مگر اِس فرشتہ خصلت عورت کے دل پر کوئی ناگوار اثر نہ ہوا۔ ریاض اب بھی اس کا معبود خیال تھا۔ اس کے ساتھ ہمدردی کرنے والے اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ اور اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اُس کی آنکھوں پر ریاض کی محبت نے اتنا دبیز پردہ ڈال دیا تھا کہ سوائے خواب محبت کے اُسے اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔

شمسہ کی المناک جدائی کو دو طویل سال گزر گئے۔ ریاض اور دوسری بیوی کی خیر خبر بھی مفقود ہوگئی تھی اس پر بھی اُس کی آس یاس سے نہ بدلی اور وہ بھی سوچتی رہی کہ ایک نہ ایک دن ریاض کا دل پھر اُس کی مٹھی میں ہوگا۔ یہ کوئی نہ بتا سکتا تھا کہ کب اور کس اعجاز سے ریاض اس کی جانب مُلتفت ہوگا۔ لیکن اُسے یقین تھا کہ اُس کے آنسو بیکار نہ جائینگے۔ اور اس سے پیشتر کہ اس کی آنکھیں تھک کر آنسو بہانا چھوڑ دینگی۔ اور اس سے پہلے کہ اُس کے بال سفید ہو جائینگے وہ ریاض کی توجہ دوبارہ حاصل کریگی۔

شمسہ کسی غرض سے شہر جا رہی تھی اور جلدی میں ریل کے ایسے ڈبہ میں جا گھسی جس میں صرف ایک عورت تھی کوئی ملازمہ۔ اس کی گود میں ایک بہت خوبصورت سُرخ سفید بچہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بچہ مُسکراتا تھا تو چہرہ پر بے شمار دلکش نشیب و فراز نمایاں ہو جاتے تھے۔ بظاہر وہ عورت اس بچہ کی دوا تھی۔ بچہ کسمساتا تو وہ اُسے ہنسانے کی ترکیبیں کرتی اور جب ہنس پڑتا تو خوب پیار کرتی۔ اس پر بچہ ہاتھ پاؤں مارتا۔ غرض شمسہ کو اس پر کچھ ایسا پیار آیا کہ دوا کی گود میں سے بچہ لے کر اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ پہلے پہل تو بچہ ایک اجنبی کا چہرہ دیکھ کر بھونچکا سا ہو گیا۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ رونے کا ارادہ کر رہا ہے مگر پھر ایک دم سے ہنس دیا اور اس کے گلے سے لپٹ گیا۔

دونوں عورتوں نے باتیں شروع کردیں اور باتوں باتوں میں شمسہ نے دوا سے پوچھا کہ کہاں سے آرہی تھی اور کہاں جائے گی۔ دوا نے یہ دیکھ کر کہ اس خاتون نے بچہ کو پسند کیا تھا۔ اس سے اچھی طرح باتیں کر رہی تھی۔ خوش ہو کر جواب دیا کہ وہ اپنے شوہر کے پاس گئی تھی۔ اور گاؤں سے شہر جا رہی تھی۔ وہ خود بچہ کی دوا تھی اور چھٹی کا دن گاؤں میں گزار کر اپنے آقا کے پاس جا رہی تھی۔ آقا کا نام دریافت کرنے پر اس نے کہا "شائد آپ نے نام سُنا ہو مسٹر ریاض!"

ریاض کا نام سُنکر شمسہ کی آنکھیں تعجب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رنگ ہلدی سے زیادہ زرد پڑ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی زخم سے اس کا سارا خون بہا چلا جا رہا ہے۔ پھر یہ خیال کر کے کہ شائد سُننے میں کچھ غلطی ہوئی ہو۔ اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں اور کانپتے ہوئے لبوں سے اس طرح پوچھا گویا ایک ایک لفظ اس کے گلے میں پھنس رہا ہے:۔

"تم نے مسٹر ریاض کا نام بتایا تھا؟"

"جی ہاں - کیا آپ انہیں جانتی ہیں؟"

ہیں ؟ ہاں ــــ پہلے واقف تھی ــــ "مگر اُسے بہت مدت ہوگئی"

شمسہ نے بمشکل تمام یہ الفاظ ادا کئے - موت کی زردی چہرہ پر کھنڈ گئی تھی - اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کچھ کہہ رہی ہے - نظریں اس بچہ پر جمی ہوئی تھیں - جسے ریاض خدا جانے کس قدر چاہتا ہوگا -

اُس کے سامنے گویا کھڑکی کھل گئی - اس جگہ پہلے تاریکی تھی جس میں اُس نے اُن دونو کو دیکھا - خوش و خرّم ایک دوسرے کے گلے میں باہیں پڑی ہوئیں اور اُن دونو کے درمیان وہ خوبصورت ننھا سا سر - محبّت کا جیتا جاگتا، کھیلتا مالتا ثبوت -

وہ ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہونگے - اِن بندھنوں کو وہ کبھی نہ کاٹ سکے گی - یہ ایک ایسی تباہی تھی کہ کشتی میں سے کچھ بھی نہ بچا - خوفناک طوفانی موجوں نے کوئی ٹوٹا ہُوا تختہ بھی بہاکر ساحل تک نہ پہنچنے دیا -

موٹے موٹے آنسو آنکھوں میں سے ڈھلکے اور رُخساروں پر سے بہتے ہوئے نقاب میں جذب ہوگئے -

شہر کے اسٹیشن پر ریل ٹھہری وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس اجنبی خاتون سے بچہ واپس لیلے - جو اُسے سینہ سے لگاکر پیار کر رہی تھی - دیوانہ وار اُس کا منہ چوم رہی تھی -

"شائد اس بچہ کو دیکھ کر آپ کو اپنا بچہ یاد آیا ہوگا جو آپ کی گود خالی کر گیا - مگر اس عمر میں تو اس نقصان کی تلافی ممکن ہے - دوسرا بچہ یقیناً پہلے بچہ کا نعم البدل ثابت ہوگا - اور آپ انشا اللہ ــــ"

شمسہ نے بچہ اس کی گود میں واپس دیا اور اسٹیشن پر جلدی جلدی قدم اُٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی - نہ معلوم پھر اُسکو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا - کہ اس کا کوئی پتہ نہیں چلا +

تجارت

مَیں چند کتابیں خریدنے کے لئے ایک کتب فروش کی دکان پر گیا - اُس نے نئی نئی دکان کھولی تھی - اسلئے اُسے کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا - سودے کے دوران میں اُس نے کسیقدر بدمزاجی اور تُند خوئی کا اظہار کیا - میں نے کہا - "بھائی! ایک دکاندار کو اسقدر بدمزاج اور تُند خو نہیں ہونا چاہئے" - اس پر وہ اور چمک اُٹھا - اور واہی تباہی بکنے لگا - اُس نے اپنی پوری قابلیت کے ساتھ مجھے بے شمار گالیاں دیں - مَیں بالکل خاموش تھا - اور سوچ رہا تھا کہ جس بات پر اُسے غصّہ آیا ہے - اُس کا ثبوت وہ خود دے رہا ہے - نزدیک ہی ایک دکان پر دو سن رسیدہ بزرگ بیٹھے تھے - یہ ماجرا دیکھ کر ایک نے دوسرے سے کہا - "ہندوستانی تجارت میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے"

(فیض محمد فیض لدھیانوی)
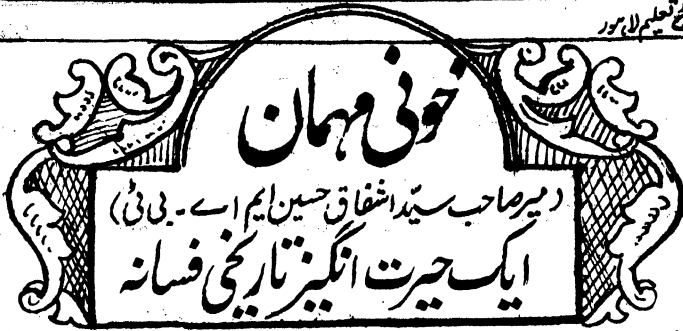
بنو اُمیہ اپنی درپردہ سازشوں۔ خفیہ تدبیروں اور سیاسی چالوں سے اپنی سلطنت کو بہت عرصہ تک قائم نہ رکھ سکے۔ دولت اور سلطنت کے مرد افگن نشے نے انکو غافل اور بدمست کر دیا تھا۔ اسلام نے جو مساوات قبیلوں کے باہمی امتیاز کو مٹاکر قائم کی تھی۔ امویوں نے اپنی مصیبت کے ہاتھوں اس کی جڑ کاٹ دی۔ جس اصل الاصول جمہوریت پر حکومتِ اسلامی قائم کی گئی تھی۔ اس کی جڑوں کو اموی بیعہدی کی دیمک کھا گئی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ بنو اُمیہ کی حکومت کا قصرِ عالیشان ایسا منہدم ہُوا کہ گرد سی اُڑ گئی۔ خدا کا قہر عباسیوں کے ظلم و تشدد کی صورت میں اُن پر نازل ہُوا۔ ان کی لاشوں کو قبریں نصیب نہ ہوئیں۔ راستہ میں پڑے پھکتے تھے جنہیں مدتوں کتے کھاتے رہے۔ تمام ممالک محروسہ میں اعلان عام تھا کہ جو بنو اُمیہ نظر پڑے بیدریغ تہِ تیغ کر دیا جائے۔ جس طرح درندوں کا شکار کرنے لوگ گھروں سے نکلتے ہیں۔ اسی طرح روزانہ گھر گھر سے آدمی امویوں کو قتل کرنے نکلتے تھے۔ ان کے واسطے خدا کی زمین اس قدر تنگ ہوگئی تھی کہ کوئی گھر کوئی محلہ کوئی گاؤں اور کوئی شہر جائے پناہ نہ تھا۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ انتہا یہ ہوئی کہ جس شخص پر ان کی حمایت اور قرابت کا شبہ بھی ہوتا تھا وہ بھی تلوار کے گھاٹ اُتار دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ بھیس بدل بدل کر اپنی قومیت کو چھپا چھپا کر دُور دُور اطراف و اکناف عالم میں روپوش ہوگئے بعض نے سندھ۔ کشمیر اور پنجاب کا رُخ کیا اور یہیں آباد ہوگئے اور اپنی قومیت کو یہاں تک چھپایا کہ انکی نسلیں بیخبری کے عالم میں یہ بھی بھلا بیٹھیں کہ وہ عربی النژاد ہیں بعض لوگ سرزمین عرب میں ہی کس مپرسی کے عالم میں اوروں کی خدمتیں کر کے اپنا پیٹ پالنے لگے۔ انہیں آوارگانِ وطن میں اموی خلیفہ سلیمان ابن عبدالملک کا چھوٹا بیٹا ابراہیم بھی شامل ہے۔

(۲)

عباسیوں کی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ خلیفہ ابو العباس سفاح تختِ خلافت پر متمکن ہے۔ سفاح گو خونریز تھا لیکن دل کا فیاض اور طبیعت کا بے انتہا تیز تھا۔ حاضر جواب اور بذلہ سنج تھا۔ شجاع آزمودہ کار اور جری سپاہی تھا۔ خراسان کی بغاوت کو فرو کیا۔ خارجیوں کے فتنے کو دبایا۔ سندھ کے حاکم نے سر اُٹھایا اُسے کچلا۔ غرضیکہ عباس کی نئی سلطنت کو مستحکم کرنے میں اُس نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

(۳)

دربارِ خلافت میں ایک نوجوان شخص پیش کیا جاتا ہے جس کے چہرہ بشرہ سے شرافت ٹپکی پڑتی ہے۔ پیشانی کو بلند اختری چوم رہی ہے۔ حسن و جمال روئے منور کی بلائیں لے رہا ہے۔ اس نوجوان نے مؤدب خلیفہ کو سلام کیا۔

ایک درباری ۔ حضور ایک گوہر بے بہا خدمتِ عالی میں پیش کیا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ قدر شناسی سے بیدرہ نوازا جائیگا۔

خلیفہ ۔ کون ابراہیم۔ اموی خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کا چھوٹا بیٹا۔

درباری ۔ ہاں حضور۔ وہی بدقسمت جس سے قسمت نے منہ پھیر لیا۔ ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ علم و فضل میں یگانہ ہے۔ بے مثل ادیب ہے۔ اور لاثانی جنگجو۔ گویا تیغ اور قلم دو تو اس کے دستِ تصرف میں ہیں۔

خلیفہ ۔ لیکن.....

درباری ۔ ہاں حضور بس اس کا یہی قصور ہے کہ اموی ہے۔ ورنہ خاتم شرافت کے واسطے یہ بے بہا نگینہ ہے۔

خلیفہ ۔ اچھا آپ لوگوں کی سفارش قبول کی جاتی ہے۔ اس کی جان بخشی کرتا ہوں اور وابستگانِ خلافت میں اس کو جگہ دیتا ہوں۔

(۴)

ابراہیم نے ذاتی قابلیت سے خلیفہ کے مزاج میں اسقدر دخل پا لیا ہے کہ کسی وقت سفاح اس کو اپنے سے علیحدہ نہیں کرتا۔ خلوت اور جلوت کا وہ رفیق ہے۔ اہم اُمور میں اس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ میدانِ رزم میں اُس کی فرس رانیاں اور بزم میں اس کی طبیعت کی جولانیاں اپنا رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ دبستانِ علم و فضل میں اس کے سامنے لوگ زانوئے ادب تہ کرتے ہیں۔ اور اس لئے کہ وہ خلیفۂ وقت کا معتمد علیہ ہے۔ اُسے ہر جگہ آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔

(۵)

ایک دن اس انیسِ خلوت سے خلیفہ یوں گویا ہوتا ہے۔

ابراہیم تمہیں وہ دن یاد ہیں کہ جب تم اپنی جان بچاتے اِدھر اُدھر پھرتے تھے اور کہیں امان نصیب نہ ہوتی تھی۔

ابراہیم ۔ ہاں امیر المومنین خوب یاد ہیں۔ مصیبت کے دن کبھی نہیں بھولتے۔

خلیفہ ۔ کوئی ایسا واقعہ بھی اُن ایام میں پیش آیا ہو جو حیرت خیز اور عبرت انگیز ہو۔ تو بیان کرو۔

ابراہیم ۔ ہاں حضور۔ ایک واقعہ ایسا عجیب اُس زمانہ میں پیش آیا کہ اب تک اس کا اثر میرے دل پر باقی ہے اور اُمید ہے کہ مرتے دم تک رہیگا۔ نہ ایسا واقعہ کبھی دیکھا نہ سُنا۔

خلیفہ۔ ضرور بیان کرو۔ جس واقعہ کو تم اتنا عجیب گردانتے ہو وہ تو واقعی سُننے کے قابل ہوگا۔

ابراہیم۔ حضور جب ہم پر آفتوں کا پہاڑ ٹوٹا۔ تو سب پریشان ہو کر اِدھر اُدھر نکل کھڑے ہوئے۔ عمر بھر کے ساتھ چھوٹ گئے۔ سایہ تک بھی دشمن ہو گیا۔ دن کو روپوش رہتے۔ رات کو سفر طے کرتے کہ ہمیں بچ کر نکل جائیں۔ میں تن تنہا حیرہ کے ایک جنگل میں پناہ گزیں تھا۔ ایک بلندی پر چڑھ کر دیکھا تو چند سیاہ جھنڈے نظر پڑے میں سہم کر رہ گیا۔ سمجھا کہ ملک الموت اپنے پر پھیلائے میری طرف اُڑا چلا آرہا ہے۔ بعض دفعہ جان کا خوف پاؤں باندھ دیتا ہے لیکن بعض دفعہ پر لگا کر اُڑا دیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ کوفہ سے حیرہ آرہے ہیں۔ جس طرح مجرم کو سایہ بھی حکومت کی طرف سے ماخوذ کرنے والا نظر آتا ہے۔ مجھے بھی یہ دکھائی دے رہا تھا کہ ہو نہ ہو انکو تیرے حیرہ میں روپوش ہونے کی خبر لگ گئی ہے اور یہ ادھر تیری ہی تلاش میں آرہے ہیں۔ میں بلندی سے نیچے اُترا اور رُخ بدل کر کوفہ کی طرف ہو لیا۔ میں جانتا تھا کہ کوفی لایوفی کہ کوفے والے وفا نہیں کرتے لیکن مرتا کیا نہ کرتا کدھر جاتا اور کہاں پناہ ڈھونڈتا۔ کوفہ میں بالکل غریب الوطن تھا۔ کوئی واقف کار نہ تھا جس کے پاس جاکر اپنا دکھڑا روتا اور پناہ مانگتا۔ میں مایوس نگاہیں چاروں طرف دوڑا رہا تھا کہ ایک بڑے دروازہ پر نظر پڑی۔ منہ چھپانے کی خاطر دروازہ میں ہو لیا۔ اندر سے ایک نہایت وسیع اور خوشنما صحن نظر پڑا۔ لیکن میرا خون سوکھ گیا جب اندر سے میں نے ایک نہایت حسین جمیل دوہرے بدن کے شخص کو گھوڑے پر سوار آتے ہوئے دیکھا۔ خادم رکاب تھامے ساتھ تھے۔ میرے پاس آکر گھوڑے سے اُترا اور پوچھا۔

نوجوان۔ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو۔

میں۔ میں ایک غریب الوطن آدمی ہوں اور جان کے خوف سے مارا مارا پھرتا ہوں۔ آپ کے دروازہ میں منہ چھپانے کو داخل ہو گیا تھا۔ کیا ممکن ہے کہ آپ مجھے اپنی پناہ میں لے لیں۔ نوجوان نے نہایت خندہ پیشانی سے مصافحہ کیا اور مجھے اندر مکان میں لے گیا۔ زنانخانہ کے برابر میں ایک نہایت آراستہ کمرہ میرے واسطے مخصوص کر دیا اور مجھے نہایت آرام و آسائش سے مہمان رکھا۔ الوان نعمت میرے کھانے کے واسطے بھیجے جاتے تھے۔ متعدد ملازم میری خدمت کے واسطے ہر وقت کمر بستہ رہتے تھے۔ وہ کبھی کبھی میری مزاج پُرسی کے واسطے میرے پاس چلا آتا تھا۔ اور یہ پوچھ کر کہ کوئی تکلیف تو نہیں چلا جاتا تھا۔ اس طرح میں ایک عرصہ تک بے تکلفی اور آسائش سے وہاں رہتا رہا۔ لیکن میں روزانہ دیکھتا تھا کہ وہ نوجوان ہر روز صبح سویرے گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں چلا جاتا اور ظہر کے قریب واپس آتا۔

جب روزانہ اس کا یہی معمول دیکھا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک روز میں نے پوچھا۔

میں۔ آپ ہر روز کہاں جاتے ہیں اور کس غرض سے۔

نوجوان - بھائی - میرے باپ کو سلیمان بن عبد الملک کے بیٹے ابراہیم نے بلاوجہ قتل کر ڈالا - مجھے معلوم ہؤا کہ وہ حیرہ میں روپوش ہے - میں روزانہ اس کی تلاش میں جاتا ہوں کہ قاتل سے اپنے مرحوم باپ کا انتقام لے لوں -

یہ سُنکر میرے ہوش اُڑ گئے - کاٹو تو بدن میں لہو نہ تھا - موت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا - مجھے یقین ہو گیا کہ موت ہی مجھے یہاں کھینچ کر لائی ہے - سبحان اللہ کیا خدا کی شان ہے کہ جو شخص میرے خون کا پیاسا ہے - اسی کے ہاتھ میں مجھ کو پہنچا دیا - امیر المومنین میں نے سمجھ لیا ہے کہ بھاگ کر نکل جانا ناممکن ہے - اس لئے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ خود ہی اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دوں - زندگی سے بیزار تو ہو ہی چکا تھا - اب میں نے اُس سے اصل حال صاف صاف کہدینے کا مصمم ارادہ کر لیا -

میں - بھائی - آپ کی میزبانی مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں بھی آپ کا اس تلاش میں ہاتھ بٹاؤں -

نوجوان - مجھے صرف اس کا حلیہ بتادو اور اگر ٹھیک پتہ ہو تو یہ بھی کہ وہ کہاں ہے - میرے ساتھ چلنے کی تکلیف گوارا نہ کریں -

میں - میں اس کو آپ کے سامنے لاکر کھڑا کر دونگا - آپ مطمئن رہیں -

نوجوان - کیا آپ کو اس کی جائے پناہ معلوم ہے -

میں - ہاں ضرور معلوم ہے -

نوجوان - تو آپ اُسے یہاں کس طرح لے آئینگے ؟

میں - آپ دیکھتے جائیں میں اُسے ابھی یہاں لے آتا ہوں - آپ نے پہلے سے مجھ سے نہ کہا اور خواہ مخواہ سرگردان و پریشان اس کی تلاش میں پھرتے رہے -

نوجوان - مجھے کیا خبر تھی کہ گوہر مقصود آپ کی توجہ سے اس قدر آسانی سے مل جائیگا -

میں - آپ یقین کریں فلاں وقت اور فلاں مقام پر آپ کے والد کو میں نے ہی قتل کیا تھا - یہ قاتل سامنے ہے - تلوار لو اور اُس کی گردن اُڑادو -

نوجوان - تعجب ہے کہ آپ مجھے بنا رہے ہیں -

میں - نہیں - میں مذاق نہیں کرتا بلکہ سچ عرض کرتا ہوں کہ وہ گردن زدنی میں ہی ہوں -

نوجوان - معلوم ہوتا ہے کہ آئے دن کی روپوشی اور اہل و عیال سے علیحدگی کے رنج و غم نے تمہارا دماغ اُلٹ دیا ہے جو اپنی جان سے بیزاری ظاہر کر رہے ہو -

میں - نہیں - میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ہی تمہارے باپ کا قاتل ہوں -

نوجوان کو یقین آگیا۔ اس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوا۔ آنکھیں سُرخ ہو گئیں چہرہ تمتما گیا۔ غصہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔ بولنا چاہتا تھا لیکن مُنہ سے لفظ نہ نکلتے تھے۔ میں موت کا منتظر خاموش کھڑا تھا کہ کب اس کا ہاتھ نیام پر جائے اور کب میری گردن دھڑ سے علیحدہ ہو۔ اچانک اس کے ہونٹ ہلے اور وہ بولا۔ نوجوان۔ اگر تم ہی میرے باپ کے قاتل ہو۔ تو میں ضرور خون کا بدلہ لونگا۔ لیکن اس دُنیا میں نہیں بلکہ منتقمِ حقیقی کے سامنے۔ میں نے تم کو امان دی ہے اور میں اپنے عہد سے نہ پھرونگا۔ لیکن اب تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے تمہاری صورت دکھائی نہ دے۔ کیونکہ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنے مرحوم باپ کی یاد تازہ ہو گئی ہے اور اگر تم یہیں رہے تو ممکن ہے کہ جوشِ انتقام میں مجھ سے کوئی ایسی حرکت صادر ہو جائے جو آئینِ مہمانداری اور آئینِ اخلاق و مروت کے خلاف ہو۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ ایک ہزار اشرفیاں اسے دیکر رخصت کر دیا جائے۔ چنانچہ خزانچی نے فوراً ایک ہزار اشرفیوں کا توڑا لاکر میرے سامنے رکھدیا۔

میں نوجوان کی شرافت جوانمردی اور پاسِ عہد پر کھڑا سردھن رہا تھا اور غیرت کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ میں نے اشرفیوں کا توڑا تو بعد شکریہ واپس کر دیا۔ اور اس کو دعائیں دیتا ہُوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

امیر المومنین نے یہ قصہ سُن کر کہا۔ واقعی ابراہیم! تم نے بڑا عجیب و غریب واقعہ سُنایا۔ اُس نوجوان کے تحمل، پاسِ عہد اور شرافت کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ (اشفاق حسین ایم اے بی ٹی)

غرور کا سر نیچا

میں نے گنّے سے پوچھا۔ بھئی! تم سے کیا خطا سرزد ہوئی ہے۔ جو تمہیں جڑ سے اُکھاڑ کر باہر پھینک دیا گیا ہے اور اب لوگ ہیں کہ تمہاری کھال اُتار کر تمہارے جسم کو بے رحمی کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ تمہارے ٹکڑوں کو بھی دانتوں میں چچوڑا جا رہا ہے۔ میری یہ باتیں سُنیں تو گنّے کے ایک بڑے ٹکڑے نے اپنی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے زبانِ حال سے کہا:۔

"کیا پوچھتے ہو۔ میں نے کھیت میں غرور سے کام لیتے ہوئے اپنا سر بلند کیا تھا۔ اس قصور کی پاداش میں آج میرے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔ جو تم نے خود بیان کیا ہے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں۔ جب میں بیج کی صورت میں زمین کے اندر "خاکسار" تھا۔ اور کسان ہر روز میری آبیاری کیا کرتا تھا۔ اے کاش میں اپنا سر غرور سے بلند نہ کرتا۔ تاکہ لوگ آج اِس طرح میری ہستی کے درپے نہ ہوتے۔ (فیض محمد فیض لدھیانوی)

تجربہ!

(از طاہر غلام ناصر خاں۔ سیکنڈ ایئر کلاس گورنمنٹ کالج لاہور)

جسوقت میں پروفیسر چیلنجر کے کمرے کے پاس پہنچا۔ تو اندر سے میں نے پروفیسر کی آواز سے اندازہ لگایا۔ کہ وہ اسوقت بہت غصہ میں ہے اور کسی سے ٹیلیفون پر بات کر رہا تھا۔ (رہے تھے)

"ہاں یہ دوسری مرتبہ ہے کہ کسی نے غلطی سے مجھے فون کیا۔ آپ خود نہیں سمجھ سکتے۔ کہ اگر ایک سائینسدان کی توجہ اسکے کام سے ہٹالی جائے تو اسکا کتنا نقصان ہوگا۔ فوراً منیجر کو ٹیلیفون پر بلاؤ۔ . . اچھا آپ ہی منیجر ہیں۔ . . تو آپ انتظام کیوں نہیں کرتے . . . . کہاں کرتے ہیں؟ کیا آپ یہ انتظام کہتے ہیں۔ کہ ایک ضروری کام سے میری توجہ ہٹائی جائے؟ . . . سپرنٹنڈنٹ کو بلایئے . . . کیا کہا؟ وہ موجود نہیں ہیں؟ . . . . خیر تو گویا آپ تحریری معافی مانگتے ہیں؟ . . . میں اس پر غور کرونگا۔"

دروازہ کھولکر میں اندر داخل ہوا۔ یہ بڑا ہی منحوس لمحہ تھا۔ پروفیسر کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اس کی سیاہ داڑھی کانپ رہی تھی۔ اور اس کی بھوری آنکھوں سے غصہ صاف نمایاں تھا۔

"وہ کمبخت کہیں کے" اس نے کہنا شروع کیا "پیٹ کو بلجاتا ہے تو بدتمیزیاں کو مستیاں اور شرارتیں سوجھتی ہیں بھلا دیکھو تو جسوقت میں ٹیلیفون پر شکایت کر رہا تھا۔ تو وہ ہنس رہے تھے۔ انہوں نے بھی ملکر مجھے ستانے کی سازش کی ہے کمبختوں نے . . . (میری طرف دیکھکر) کہو میلون تم اسوقت کیسے آئے۔ غالباً تم بھی انہیں لوگوں سے ملے ہوئے ہو اور مجھے پریشان کرنے آئے ہو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم ایک دوست کی حیثیت سے آئے ہو؟ یا اخبار کے نمایندہ کی حیثیت سے؟ دوست ہوتے ہوئے تم مجھ سے ملسکتے ہو لیکن نمایندہ کی حیثیت سے تمہیں اتنی زحمت کرنے کی جرأت نہیں کرنی چاہئے"

میں اپنی جیب میں میکارڈل کا خط تلاش کر رہا تھا۔ پروفیسر نے اپنی میز پر سے ایک اخبار کا صفحہ اٹھایا۔ اور کہنے لگا "اپنی کسی گذشتہ اشاعت میں تم نے میرے بارے میں لکھا تھا۔ کہ پروفیسر جی۔ ای چیلنجر ملک کے بہترین سائینسدانوں میں سے ہے"۔ میں نے متعجب ہوکر کہا "پھر؟"

"لیکن جناب یہ تو فرمایئے" پروفیسر کہنے لگا۔ "آپ نے میری قابلیت کو محدود کیوں کر دیا؟ کیا آپ کسی سائینسدان کا نام لے سکتے ہیں جو میرے ہم پلہ ہو؟"

"یقیناً یہ کسی غلطی کا باعث ہے" میں نے جواب دیا۔ "آپکے بارے میں تو ملک کا بہترین سائینسدان موزون ہے" پروفیسر کچھ خوش ہوگیا۔ بولا "اسکا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے منہ میاں مٹھو بنتا ہوں لیکن تم خیال کرو۔ کہ مجھے اپنی عزت و ناموری کا بھی تحفظ کرنا چاہیے۔ اچھا اب یہ بتاؤ۔ کہ تمہارا کیا مقصد ہے؟"

میں نے جواب میں خط نکالا۔ جو اخبار کے ایڈیٹر میکارڈل نے مجھے بھیجا تھا اور پڑھنا شروع کیا۔ "مسٹر میلون آپ بڑی مہربانی ہمارے معزز دوست پروفیسر چیلنجر کے پاس جائیں اور ذیل کے معاملہ میں انکی رائے لیں؟ ۔ وایٹ فرائیرز کے ایک مکان میں تھیوڈور نیمر نامی ایک شخص جو کسی دوسرے ملک کا رہنے والا ہے ٹھہرا ہوا ہے اسکا دعوٰی ہے کہ اس نے ایک ایسی مشین ایجاد کی ہے جو چیزوں کے تمام اجزا جدا کر سکتی ہے اور انکو ذروں میں تبدیل کر سکتی ہے۔ اگر ایک دوسرا پیچ گھمایا جاوے تو چیزیں پھر اپنی اصلی حالت پر آجائینگی اگرچہ اسکا دعوٰی مہمل معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ کہ سیاسی دنیا میں اس مشین کی کیا اہمیت ہوگی۔ اسکے ذریعے بڑے سے بڑا جنگی جہاز فوجوں کی فوجیں لمحہ بھر میں ذروں میں

میں تبدیل ہوکر فنا ہوجایا کریگی۔ اور کسی کو پتہ بھی نہ لگیگا۔ کہ وہ کہاں ہیں۔ کیونکہ ذرّے تو ہوا میں ملکر غائب ہوجائینگے۔

اس مشین کے موجد کا ارادہ ہے کہ وہ اس مشین کو کسی سلطنت کے ہاتھ بیچدے۔ اگر آپ پروفیسر صاحب کو ہمراہ لیکر جائیں۔ تو غالباً اسے آپکو مشین دکھانے میں اعتراض نہ ہوگا۔ آپ اس ایجاد کے بارے میں کوئی ایسا مضمون لکھیں۔ جو ہم اپنے گزٹ میں شائع کر سکیں۔"

میں نے خط کو تہ کرتے ہوئے کہا "تو کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ تشریف لیچلینگے کیونکہ سائنس کے علم میں میری جو واقفیت ہے۔ آپ پر ظاہر ہے اور میں اکیلا کچھ بھی نہ کر سکونگا۔"

پروفیسر نے کچھ سوچکر جواب دیا۔ "میلون سائنس ایک ایسا مضمون ہے جسمیں تم کچھ نہیں کر سکتے یقیناً میں تمہارے ساتھ چلونگا کسی پاجی نے ٹیلیفون سے میری توجہ ہٹاکر میرے تمام کام کا ستیاناس کر دیا۔ چلو"

چلنے سے پہلے میں نے ٹیلیفون پر تھیوڈور نیمر کو اطلاع دیدی تھی۔ کہ ہم لوگ آ رہے ہیں جب ہم اسکے مکان پر پہنچے تو ہمیں آدھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ کیونکہ وہ اندر چند آدمیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ جو روسی معلوم ہوتے تھے رخصت ہونے وقت ہم نے ان کی ایک جھلک دیکھی تھی وہ امیر طبقہ کے افراد تھے۔ کیونکہ ان کا لباس نہایت بیش قیمت تھا۔

دروازہ کھلا۔ تھیوڈور داخل ہوا۔ اور ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔ تھیوڈور پستہ قد اور موٹا شخص تھا اسکے چہرہ پر بہت سے بدنما دھبے تھے اور اسکی آنکھیں بلی کیطرح تھیں۔ اسکا ماتھا بہت ہی چوڑا تھا۔ الغرض اسکے جسم کو دیکھکر ہر شخص اندازہ لگا سکتا تھا۔ کہ یہ کوئی آوارہ شخص ہے۔ لیکن اس کا چہرہ ایسا تھا۔ گویا وہ بہت ہی قابل اور فلسفہ دان شخص ہے۔

"صاحبان" اس نے کہنا شروع کیا "ٹیلیفون پر جو بات ہوئی ہے اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ کہ آپ میری ایجاد کردہ مشین کو دیکھنے آئے ہیں"

"درست" پروفیسر نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔ "تو میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں۔ کہ آیا آپ گورنمنٹ کیطرف سے آئے ہیں یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" "جی نہیں میں گزٹ کا نمائندہ ہوں اور یہ صاحب پروفیسر چیلنجر ہیں۔"

"تب تو یہ مشہور آدمی ہیں۔ میں نے ان کی بہت تعریف سنی ہے ۔ ۔ ۔ ہاں میں یہ کہنے کو تھا۔ انگریزوں نے اپنا موقعہ کھو دیا۔ اور میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ اپنی سلطنت بھی کھو دی میں اپنی مشین کسی ملک کے ہاتھ بیچنے کو تیار تھا۔ بشرطیکہ وہ مجھے منہ مانگی قیمت دیں۔ اور اب اگر یہ مشین میں نے بیچ دی ہو تو آپ مجھ پر الزام نہیں لگا سکتے۔" "تو کیا آپنے یہ مشین بیچ دی؟" میں نے پوچھا۔

تھیوڈور نے مسکراکر جوابدیا "ہاں اپنی منہ مانگی قیمت پر"۔ پروفیسر نے کہا "ممکن ہے کہ کوئی اور اس مشین کا بھید معلوم کر لے!" "قطعاً ناممکن دنیا بھر میں سوائے میرے کوئی بھی اس بھید سے واقف نہیں۔"

"گستاخی معاف" پروفیسر کہنے لگا۔ "جب تک کہ میں اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لوں مجھے یقین نہیں آسکتا بھلا یہ کسطرح ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی چیز کے ذرّے بنجائیں۔ اور پھر وہی ذرّے بجنسہ اپنی اصلی حالت پر آ جائیں"۔ تھیوڈور مسکرایا۔ "اگر آپ میں اتنی ہمت ہے تو میں آپ پر ہی تجربہ کرونگا۔ وہ ہمیں ایک دوسرے کمرہ میں لیگیا جہاں وہ مشین رکھی تھی مشین کے برابر ہی ایک عجیب قسم کی کرسی رکھی تھی۔ تھیوڈور نے اس کرسی کیطرف اشارہ کرکے کہا۔ "پروفیسر صاحب آپ اس پر بیٹھ جایئے۔"

پروفیسر نے غصہ میں چیخ کر کہا۔ "جناب یہ اگر کیسا؟ کیا آپ کو میری جرأت میں شبہ ہے؟"

درحقیقت پروفیسر میں شیر کا سا حوصلہ تھا۔ وہ فوراً مشین کی طرف جھپٹا اور کرسی پر بیٹھنے کو تھا کہ میں نے اسکا ہاتھ پکڑ لیا۔ "پروفیسر کیا کرتے ہو؟ یہ کرسی تو اس قسم کی ہے جس پر کہ امریکہ میں ملزموں کو موت کی سزا دیتے ہیں اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچ گیا۔ تو کون ذمہ دار ہوگا؟"

پروفیسر نے کہا۔ "تم یہاں موجود ہو اگر مجھے ذرا بھی نقصان پہنچ گیا۔ تو اس شخص کو خونی کی حیثیت سے گرفتار کرا دینا۔"

"لیکن اگر تمہیں نقصان پہنچ گیا۔ تو سائنس کا کام کون پورا کریگا؟ پہلے مجھے جانے دو۔ اگر تجربہ بخیر ثابت ہوا۔ تو پھر تم بھی آ جانا۔" پروفیسر مانتا تو ہرگز نہ تھا لیکن سائنس کے خیال سے وہ رک گیا۔ میں جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک آواز "ٹک" ہوئی۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب مجھے ہوش آیا۔ تو پروفیسر کی صورت پر استعجاب ظاہر تھا۔ تھیوڈور کھڑا ہنس رہا تھا۔

میں نے پوچھا "لیکن ہوا کیا؟"

پروفیسر کہنے لگا۔ "خدا کی قسم تم غائب ہو گئے تھے۔ کچھ دیر تک دھند رہا۔ پھر کرسی خالی تھی۔ دو یا تین منٹ کے بعد ایک اور پیچ گھمانے سے تم پھر واپس آ گئے۔" اس نے رومال سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ اور خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ پہلے کی طرح "ٹک" سی آواز ہوئی۔ اور دوسرے لمحہ پروفیسر غائب تھا۔

تھیوڈور کہنے لگا۔ "کتنا دلچسپ تجربہ ہے۔ پروفیسر اب میرے قبضہ میں ہے۔ اگر میں چاہوں۔ تو اس کو اسی طرح رکھ سکتا ہوں۔ اور دنیا میں کوئی بھی مجھے نہیں روک سکتا"

"لیکن میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دونگا!" میں نے کہا۔

تھیوڈور ہنس کر کہنے لگا۔ "پروفیسر نہایت گستاخ اور بدتمیز آدمی ہے۔ اسے کچھ سبق دینا چاہیئے مثلاً یہ میرے اختیار کی بات ہے۔ کہ پروفیسر کے سر پر بال ہوں یا نہ ہوں۔ دیکھو"

اس نے پیچ گھمایا۔ اور پروفیسر کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اور بے اختیار ایک قہقہہ مارا۔

پروفیسر کا سر بالکل ایک چھلے ہوئے کسیرو کی طرح تھا۔ اس کی ڈاڑھی صاف تھی۔ اور وہ ایک گلیڈی ایٹر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جبڑے بالکل بل ڈاگ کی طرح ہو گئے تھے۔

تیر کی مانند پروفیسر کا ہاتھ سر پر پہنچا۔ پھر اس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔ لیکن ایک بال بھی نہ تھا۔ کرسی سے کود کر وہ ایک دم تھیوڈور پر جا پڑا۔ اور اس کا گلا پکڑ کر زمین پر دے مارا۔ پروفیسر کے غصہ اور طاقت کو دیکھ کر مجھے یقین تھا۔ کہ پروفیسر موجد کو مار ڈالیگا۔ چنانچہ میں نے کہا "پروفیسر اگر تم اس کو مار ڈالو گے۔ تو عمر بھر اسی طرح رہو گے۔"

پروفیسر نے تھیوڈور کو چھوڑ دیا۔ وہ بیچارہ کانپ رہا تھا۔ پروفیسر کہنے لگا۔ "اگر پانچ منٹ کے اندر میں اپنی اصلی حالت پہ نہ آگیا۔ تو تمہاری خیر نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

تھیوڈور اپنی گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں تو تمہیں اس مشین کا کمال دکھانا چاہتا تھا۔ تو میں ابھی تمہیں اصلی حالت پہ واپس لے آتا ہوں۔ پروفیسر مجھ سے کہنے لگا۔ "میلون ذرا محتاط رہنا"۔

تھیوڈور نے پیچ گھمایا۔ اور پروفیسر غائب ہو گیا۔ ایک اور پیچ گھمانے پر وہ پھر کرسی پر بیٹھا نظر آیا۔ اب وہ اپنی اصلی حالت پر تھا۔ اس نے اپنے سر اور داڑھی پر ہاتھ پھیر کر خوب اطمینان کر لیا۔ پھر تھیوڈور سے کہنے لگا۔ "جناب آپ نے تجربہ کرنے میں بڑی آزادی سے کام لیا۔ مگر خیر!" میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں"

موجد بولا "پوچھیے۔ میں جواب دینے کو تیار ہوں"

پروفیسر کہنے لگا۔ "تو سوائے آپ کے یہ بھید کسی کو معلوم نہیں؟" موجد نے سر ہلا دیا۔ اور کہنے لگا "یہ تو صرف نمونہ ہے۔ اصلی مشین نہایت آسانی سے بنائی جا سکتی ہے۔ اس میں بڑی بڑی طاقتیں ہیں۔ اگر اس کا ایک کھمبا ایک جہاز میں لگا دیں۔ اور دوسرا دوسرے جہاز میں۔ تو ان کے درمیان جو جہاز آئیگا۔ غائب ہو جائیگا۔ یہی حال فوجوں کا ہوگا"۔

پروفیسر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "کیا میں مشین کو دیکھ سکتا ہوں" موجد نے سر ہلا کر اجازت دیدی۔ پروفیسر چاروں طرف پھر کر مشین کا معائنہ کرنے لگا۔ یکایک وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور بولا "اس میں کچھ بجلی نکل رہی ہے کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں۔"

"ناممکن"، کہہ کر موجد بڑھا۔ اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ "ٹک" سے آواز ہوئی۔ اور موجد غائب ہو گیا۔ میں نے پروفیسر کو دیکھا۔ جو کھڑا ہوا ہنس رہا تھا۔ "اف پروفیسر یہ تم نے کیا کر دیا؟" وہ مسکرایا "اگر تھیوڈور زندہ رہتا۔ تو بنی نوع انسان کو اس مشین سے بہت نقصان پہنچتا۔ چنانچہ اب یہ مشین بے کار ہے"۔ وہ دروازہ کی طرف جانے لگا۔

میں نے کہا "لیکن اس کو اسی طرح ......"

پروفیسر کہنے لگا "نہیں نہیں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ تمہیں اخبار کے لئے کافی مضمون مل گیا۔ چلو"

([illegible])

گھر کا حکیم

دانتوں کی صفائی مندرجہ ذیل سفوف بنا کر بر روز صبح انگلی پر لگا کر دانتوں پر ملیں۔ دانتوں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ کوئلہ نیم یک چھٹانک۔ دارچینی یکتولہ۔ نمک سانبھر یکتولہ۔ مرچ سیاہ یکتولہ۔

صفائی بدن سرسوں کا کچا تیل پانچ تولہ لیکر ایک تولہ نیم کے پتوں کا پانی ڈالکر شیشی میں بند رکھیں ہر روز نہا چکنے کے بعد مالش کریں۔ بدن مضبوط شیشے کی مانند صاف نظر آئیگا۔ اور بدن پر کوئی پھوڑا پھنسی نہ ہوگا۔

آنکھوں کا ڈاکٹر سرد پانی میں پھٹکری سہ ماشہ ڈالکر آنکھوں کو صاف کرنا نہایت فائدہ بخش ہے۔

سر درد کا حکیم سر کو گرم نمکین پانی سے دھو کر اپنے بازو کو دو تین دفعہ چکر لگانے سے آرام ہو جاتا ہے۔ تھکاوٹ بھی دور ہو جاتی ہے۔

پھول کی فریاد

(حضرت شوق قدوائی - مرحوم و مغفور علیہ الرحمۃ)

کیا خطا میری تھی ظالم کس لئے توڑا مجھے
کیوں نہ میری عمر ہی تک شاخ میں چھوڑا مجھے

جانتا گر اس ہنسی کے دردناک انجام کو
مَیں ہوا کے گدگدانے سے نہ ہنستا نام کو

شاخ نے آغوش میں کس لطف سے پالا مجھے
تُو نے ملنے کیلئے بستر پہ لا ڈالا مجھے

میری خوشبو سے بسائیگا بچھونا رات بھر
صبح ہو گی تو مجھے تو پھینک دیگا خاک پر

پتّیاں اُڑتی پھریں گی - منتشر ہو جائینگی
رفتہ رفتہ خاک میں مل جائینگی کھو جائینگی

تُو نے میری جان لی - دم بھر کی زینت کیلئے
کی جفا مجھ پر فقط تھوڑی سی فرحت کیلئے

دیکھ میرے رنگ کی حالت بدل جانے پہ ہے
پتّی پتّی ہو چلی ہے - آب مرجھانے پہ ہے

جس کی رونق تھا مَیں بے رونق وہ ڈالی ہو گئی
حیف ہے بچے سے ماں کی گود خالی ہو گئی

تتلیاں بے چین ہونگی - جب نہ مجھ کو پائینگی
غم سے بھونرے روئینگے اور بلبلیں چلائینگی

دودھ شبنم نے پلایا تھا - ملا وہ خاک میں
کیا خبر تھی یہ کہ ہے بے رحم گلچیں تاک میں

مہر کہتا ہے مری کرنوں کی سب محنت گئی
ماہ کو غم ہے کہ میری دی ہوئی رنگت گئی

دیدۂ حیراں ہے کیاری باغباں کے دل پہ داغ
شاخ روتی ہے کہ ہے ہے گُل ہوا میرا چراغ

میں بھی فانی - تو بھی فانی - سب ہیں فانی دہر میں
اِک قیامت ہے مگر مرگِ جوانی دہر میں

شوقؔ کیا کہتے ہیں یہ سن لے - سمجھ لے - مان لے
دل کسی کا توڑنا اچھا نہیں تو جان لے

خوش انجام

(از مولوی عابد حسین خاں صاحب ایچ پی شاہجہانپور)

وہ گریں بجلیاں دیکھو وہ ہوا خانہ خراب — آسماں تاک رہا تھا مرے کاشانہ کو

محمد علی کی موت معمولی موت نہیں ایک قیامت تھی جس نے شہر بھر میں کہرام مچا دیا۔ اِن کا دم مجموعۂ کرم تھا۔ اِنکی ہستی بیکسوں کی بستی تھی۔ اِن کا سایہ زخموں کا پھاہا تھا۔ خبرِ موت جس نے سُنی ہائے کرکے رہ گیا۔ آدمیوں کا ہجوم دوپہر تک اتنا تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ خلقت اِن کی میت پر پروانہ وار گری۔ یتیموں نے سر پھوڑے۔ مظلوم قربان اور جاں نثار ہوئے۔ احمد ٹکٹکی باندھے باپ کا جنازہ دیکھ رہا تھا۔ ماں کلیجہ پر گھونسے مارتی تھی مگر آنکھ سے آنسو نہ نکلتا تھا۔ دفعتاً کچھ خیال آیا ایک چیخ ماری اور بیہوش ہوکر گر پڑی۔ احمد بھی ساتھ ہی یہ کہتا ہوا کہ "یتیموں کے ابا احمد کو یتیم نہ کر" باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ پاؤں چومے اور پھر خاموش کھڑا ہوگیا۔ ۹ برس کے بچے کی بساط ہی کیا صدمہ برداشت نہ ہو سکا۔ اِدھر ماں کو بیہوش جو دیکھا خود بھی بیہوش ہوکر گر پڑا۔ دو گھنٹہ کامل بیہوشی کے بعد ماں کو جو ہوش آیا تو دیکھا کہ احمد کی بُری حالت ہے۔ ہائے احمد کہہ کر دوڑی اور اِس کو ہوش میں لاکر پہلو میں لے کر بیٹھ گئی۔ صبر و شکر سے کام لیا۔ بیحواس تھی مگر ضبط پاس تھا۔ عقل زائل خود گھائل۔ دل تاش تاش کلیجہ پاش پاش لیکن سنبھلی ہوئی۔ دِل کا جو کچھ حال تھا اندر جیسی گذرتی تھی۔ مگر زبان اور آنکھیں دونو خاموش۔ گو وقت نے اِس دماغ کو جس نے کشمکش حیات کی پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیاں دن رات سلجھائیں۔ قریب قریب معطل کردیا مگر بہ لحاظِ ضرورت اور بہ تقاضائے مصلحت لب پر اُف اور زبان پر آہ نہ تھی۔ چند منٹ کے بعد احمد کی پیشانی پر لبوں سے دیکر اِس طرح گویا ہوئی۔ "بیٹا! آزردہ نہ ہو۔ صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ بیکسوں کی خدا سُنتا ہے۔"

الغرض قریب چار بجے جنازہ بالکل تیار ہوگیا۔ باہر سے آواز آئی پردہ کرو۔ مرد آتے ہیں۔ یہ کہہ کر آدمی اندر گھس آئے اور کہرام و واویلا چھوڑ کر جنازہ کو لے کر چل دیئے۔ میت کے آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی اُس پاک بیوی یعنی احمد کی ماں نے کلام اللہ کی تلاوت شروع کی اور جب یہ سُنا کہ سرتاج پیوندِ زمین کردیا گیا تو سجدہ میں گر پڑی اور مغفرت کے لئے دعا مانگی جسدِ خاکی کا پیشِ نظر رہنا تھوڑی دیر کا منظر تھا۔ جب محمد علی ہزاروں من مٹی کے نیچے جا چھپا تو ایک یا دو نہیں بلکہ سینکڑوں بندگانِ خدا روتے پیٹتے اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے۔ دفن کے

بعد احمد گھر لوٹا۔ اُسکی حالت عجیب تھی۔ چاروں طرف نظر دوڑاتا تھا اور کہتا تھا کہ کدھر ڈھونڈوں۔ کہاں جاؤں۔ اِسی خیال میں مستغرق گھر میں داخل ہوا۔ تو سب سے پہلے اُسکی نگاہ ماں پر پڑی جو سجدہ میں پڑی ہوئی تھی۔ سکینہ نے سجدہ سے سے سر اُٹھایا۔ بچّہ کو دلاسا دیا اور کہنے لگی "بیٹا! تمہارے باپ کی وصیّت تھی کہ کسی طرح سے میں تم کو پڑھاؤں۔ تم جانتے ہو کہ میرے پاس تین عدد زیورات کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ تمہارے باپ (خدا انکو غریق رحمت کرے) اظہر من الشمس ہے کہ کہ بہت سخی تھے۔ یہی باعث ہے کہ اِس وقت کوئی ایسی پونجی نہیں ہے جو تمہاری تعلیم میں صرف کی جائے۔ اس لئے میرا ارادہ ہے کہ دو عدد زیور فروخت کر کے بکریاں خرید لوں۔ خدا اس میں برکت دیگا تو میں تم کو پڑھا سکونگی۔ بیٹا! جب تک میرے دھڑ میں سانس ہے اور ہاتھ پاؤں چلتے ہیں محنت سے مزدوری سے جیسے بھی ہو سکیگا میں تم کو پڑھانے کی کوشش کرونگی۔

(۲)

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو — سوزنِ تدبیر ساری عمر گو سیتی رہے

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ احمد نے ماں کی بات کو گرہ میں باندھ لیا۔ اور پہلے سے زیادہ محنت و مشقت سے کام کرنے لگا۔ محمد علی مرحوم کو اپنے پیارے بچّے کی تعلیم کا بہت زیادہ خیال تھا۔ اپنے جیتے جی انگریزی مڈل تک کی قابلیت کرادی تھی۔ چنانچہ اُس نے پرائیویٹ آٹھویں جماعت کا امتحان دیدیا۔ بچّہ تھا بلا کا ذہین۔ اس کی ذہانت دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ٹیچر صاحبان اس کی قابلیتِ خداداد دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ آٹھویں جماعت میں اوّل درجہ میں پاس ہونے پر چھ روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوگیا۔ دوسرے سال نویں جماعت میں بھی اوّل آیا۔ انٹرنس میں صوبہ میں اوّل نمبر پر کامیاب ہوا۔ الغرض احمد کے لئے اب تعلیم کا دروازہ کھل گیا تھا۔ کالج میں داخل ہونے پر مبلغ ۱۶؎ روپیہ وظیفہ مقرر ہوا۔ پروفیسر احمد کی بہت عزت کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہونہار لڑکا ہے۔ احمد نے ایف۔ اے اور بی اے بھی بحسن و خوبی پاس کرلئے۔ بی اے میں انکو ۲۵؎ روپیہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس لئے خیال کیا کہ لاؤ دو سال اور سہی۔ ایم اے بھی پاس کرلوں۔ پہلا سال گذر گیا۔ اب ایم اے فائنل کی باری آئی۔ امتحان دیا۔ ہر طالب علم اسٹیشن نتیجہ دیکھنے جاتا ہے۔ دوست بضد ہوتے ہیں کہ چلو یار۔ لیکن احمد رنج و غم میں مبتلا ہے۔ الغرض بصد اصرار احمد کو چلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اخبار ہاتھ میں آتا ہے اور احمد کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ دوست کہتے ہیں کہ یہ مقام خوشی ہے۔ کیوں روتے ہو۔ کیا انکی ڈویژن گر گیا۔ اے مرد خدا سیکنڈ ڈویژن بھی تو اچھا ہوتا ہے۔ احمد کہتا ہے کہ میاں اب ۲۵؎ روپیہ ماہوار مجھے کون دیگا۔ ملازمت کا حال آپ سب پر روشن ہے کہ مختصر بات یہ ہے کہ امتحان کی کامیابی کے معاملہ میں احمد کی قسمت جتنی کھری تھی اتنی ہی ملازمت کے حق میں کھوٹی تھی۔ درخواست پہ درخواست بھیجتا لیکن جواب یہی ملتا کہ کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ بیچارہ پریشان ہو کر ہر چند چاہتا تھا کہ کوئی ٹیوشن ہی مل جائے۔ لیکن بدنصیبی اس مقام پر بھی پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ دعا کرتا تھا کہ الٰہی ماں کی حین حیات تک ہی کوئی سلسلہ ہو جاتا۔ تو کیا اچھا ہوتا لیکن تمام کوشش بے سود۔ اتفاق وقت کہ کچھ ایسی بیماری پھیلی کہ [illegible]

مرنا شروع ہو گئے۔ احمد کے گھر میں تو گلہ کا گلہ صاف ہو گیا۔ صرف دو بکریاں بیس بکریوں میں سے بچیں۔ احمد کی بیکاری کے زمانہ میں انکو فروخت کر کے کھایا۔ بعد ازاں فاقوں پر فاقے ہونے لگے۔

پندرہ دن سے سکینہ بخار میں مبتلا ہے۔ احمد دن بھر کوچہ گردی کرتا ہے لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ماں کا علاج تو علیحدہ ان پندرہ دنوں میں تین وقت کھانا ملا ہے ہر طرف نگاہ دوڑاتا ہے۔ دل میں سوچتا ہے کہ ڈاکخانہ کے دروازہ پر جا بیٹھوں۔ ممکن ہے کچھ خط لکھنے کی اُجرت مل جائے۔ جاتا ہے اور دو گھنٹہ کامل بیٹھے رہنے پر بھی کوئی اِس طرف رُخ نہیں کرتا۔ نہایت مایوس ہو کر لکڑیوں کی ٹال پر جاتا ہے۔ اور انتہائی جانکاہی کے بعد من بھر لکڑیاں چیرتا ہے اور اس کی اُجرت سے ماں کے لئے دوا لے جاتا ہے۔ ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ لیکن احمد ہنوز صابر و شاکر ہے۔ جمعہ کا روز ہے۔ احمد نہایت پریشان ہے۔ بار بار پوچھتا ہے کہ اماں کیا حال ہے؟

ماں۔ بیٹا چند لمحوں کی مہمان ہوں۔ افسوس ایک حسرت سینہ میں رہی تمہارا سہرا نہ دیکھ سکی۔

احمد۔ اماں! ایسی باتیں نہ کیجئے۔ دِل ٹوٹا جاتا ہے۔

ماں۔ بیٹا! مشیت ایزدی یہی تھی۔

پانچ ہی منٹ کے اندر سکینہ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔ پھر ساتھ ہی سنبھالا لیا جس سے احمد کو ڈھارس بندھی۔ اور وہ سمجھا کہ اب مریضہ کچھ اچھی ہے۔ لیکن ماں نے احمد کو پاس بُلایا بلائیں لیں اور دعائیں دیتی ہوئی کلمہ پڑھتی ہوئی ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو گئی۔

احمد کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ اور "اماں! یہ کیا ہوا" کہتا ہوا زمین پر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس بے کسی اور بے بسی میں احمد کا کوئی پُرساں حال نہیں اور نہ اس کے پاس اتنا ہے کہ ماں کی تجہیز و تکفین کر سکے۔ ناچار مکان کا اثاثہ وغیرہ فروخت کر کے تجہیز و تکفین سے سبکدوش ہوا۔ بعد ازاں دل میں خیال کرتا ہے کہ اب میرے جینے سے کیا فائدہ۔

(۳)

کوئی حد بھی ہے آخر اے فلک آفات پیہم کی ۔۔۔ رہیگا نذرِ بربادی ہمارا آشیاں کب تک

احمد دریائے گومتی کے کنارے جاتا ہے اور پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے۔ دل میں خیال کرتا ہے۔ کہ اب میرے لئے ڈوب مرنا بہتر ہے۔ یہ سوچ کر چاہتا ہے کہ دریا میں کود پڑے کہ یکدم ضمیر لعنت ملامت کرتا ہے کہ ہیں! احمد یہ کیا کرتا ہے۔ حرام موت مرنا کیا۔ اللہ تعالےٰ کے یہاں تو کیا مُنہ دکھائیگا۔ دوسرے جان دیدینا تو بزدلوں کا کام ہے۔ اتنی سی مصیبت پر ہمت ہار دی۔ خدا بھی دیکھتا ہوگا اور کہتا ہوگا کہ واہ احمد! ؎

کہدو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال ۔۔۔ مر مر کے ہجر یار میں جینا کمال ہے

لہٰذا احمد نے یہ عزم بالجزم کر لیا کہ حرام موت نہ مرونگا اور جس طرح بھی ہو سکیگا اِس حیات مستعار کو کاٹ دونگا۔

سوچا کہ کیا سلسلہ کروں اور اس آتش شکم کو کہاں بجھاؤں ؟ چونکہ سردست سب سے زائد تکلیف قوت لایموت کی ہے۔ لہذا کسی نان بائی کی دکان پر چل کر دیکھنا چاہئے۔ ممکن ہے اس کو کسی نوکر کی ضرورت ہو۔ یہ خیال آتے ہی احمد لڑکھڑاتا ہوا ایک نان بائی کی دکان پر جا پہنچا۔

احمد۔ بھائی میں بہت مصیبت زدہ ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں توانا ہیں۔ اس لئے مُفت نہیں مانگتا بلکہ میرے لئے کوئی خدمت متعین کیجئے تاکہ اس کو میں انجام دے کر پیٹ بھر کر کھانا کھا سکوں۔

نان بائی۔ اچھا تم پہلے پیٹ بھر کر کھانا کھا لو۔ بعدہٗ اس ٹوکری کو بنگلہ نمبر ۱۰ا پر پہنچا آنا۔

احمد۔ پہلے خدمت انجام دونگا بعد کو کھانا کھاؤں گا۔

نان بائی۔ برادر! اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ خیر جیسی تمہاری رائے۔

احمد ٹوکری کو بمشکل تمام سر پر رکھ کر آہستہ آہستہ بنگلہ پر گیا۔ اور ٹوکری خانساماں کو دیکر چلا آیا۔ جس کے عوض میں نان بائی نے چار روٹیاں مع سالن اور کچھ چاول دیئے۔ لیکن احمد نے جس کی آنتیں خشک ہو گئی تھیں دو روٹیاں کھاکر ہاتھ سمیٹ لیا۔ اور کہنے لگا بھائی خوش رہو۔ خوب پیٹ بھر گیا۔

نان بائی۔ ارے یہ سب تمہاری اُجرت ہے

احمد۔ خیر میرا تو پیٹ بھر گیا۔

الغرض احمد سے نان بائی نے چار کپڑے ماہوار بنانے کا وعدہ کیا اور دونو وقت کھانا دینا بھی طے ہوا۔ نان بائی دن بدن احمد کی محنت و ایمانداری سے خوش ہوتا جاتا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے تمام اقسام کا کھانا پکانے کے علاوہ احمد کو روٹی نہایت عمدہ پکانا آتی تھی۔ جس کے سبب سے نان بائی اور بھی احمد کی قدر کرتا تھا۔ احمد کو دیانتداری کے ساتھ اپنی خدمت انجام دیتے تقریباً ایک ماہ ہو گیا۔ اسی ماہ میں جناب حمید اللہ خانصاحب سہارنپور سے تبدیل ہوکر اس شہر میں بارونق افروز ہوئے۔ آپ نہایت لائق اور رحمدل تحصیلدار ہیں۔ آپ کی اِس نان بائی سے خوب ملاقات تھی۔ چنانچہ خود اُس کی دکان پر تشریف لے گئے اور کہنے لگے بھائی ہم کو آئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہُوا ہے۔ ہم کو کھانا پکانے کی سخت تکلیف ہے۔ اِس لئے اگر کوئی شخص ایماندار تمہاری نگاہ میں ہو تو خیال رکھنا۔ تنخواہ کی پرواہ نہ کرنا۔ چونکہ نان بائی کی تحصیلدار صاحب سے پُرانی ملاقات تھی۔ اس لئے اس نے احمد سے دریافت کیا کہ کیا تم کو تحصیلدار صاحب کی ملازمت قبول ہے۔

احمد۔ زہے قسمت۔ بسروچشم۔ **تحصیلدار صاحب۔** تو ابھی میرے ہمراہ چلے چلئے۔ **احمد۔** بہتر ہے۔

تحصیلدار صاحب (راستہ میں) کہو احمد تم کیا تنخواہ لوگے۔

احمد۔ جناب میرے نہ بال ہیں نہ بچے۔ میں صرف تن تنہا ہوں۔ تنخواہ کیا کرونگا۔ صرف روٹی اور کپڑا کافی

بیٹے - اور جو مزاج مبارک میں آئے وہ دیدیا کیجئے گا -

تحصیلدار صاحب - جیسی تمہاری مرضی -

تحصیلدار صاحب نہایت شریف آدمی تھے - احمد کی دیانتداری دیکھ کر تمام روپیہ پیسہ کا حساب اسی کو سونپ دیا - احمد کو اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے دو سال ہو گئے - اور تحصیلدار صاحب کو شمہ برابر بھی علم نہ تھا کہ احمد انگریزی بھی جانتا ہے - وہ صرف اسقدر جانتے تھے کہ معمولی اُردو لکھ پڑھ لیتا ہے اور خوشنویس ہے - تحصیلدار صاحب پُرانے وقتوں کے انٹرنس پاس تھے - ایک روز سرکار بالا سے کوئی حکم آیا جو اس قدر شکست میں لکھا تھا کہ تحصیلدار صاحب باوجودیکہ انگریزی شکست پڑھنے میں بڑے ماہر تھے - ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا ڈالا - لیکن مطلب برآری نہ ہوئی - اسی دھن میں ایک کُرسی پر دراز ہو گئے اور احمد سے کہنے لگے - کہ ذرا چلم بھر لاؤ - احمد چلم بھر لایا اور اس کو پھونکنے کے بعد کرسی کے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا - اور دیکھنے لگا کہ وہ کونسی اور کیا تحریر ہے جسے تحصیلدار صاحب پڑھنے کے لئے اسقدر جانفشانی کر رہے ہیں - تحصیلدار صاحب نے بھی تاڑ لیا کہ کُرسی کے پیچھے احمد کھڑا ہے - پیچھے ہاتھ بڑھا کر ہنسی کے طور پر احمد کے آہستہ سے مُنہ پر ایک تھپڑ مار کر کہا کہ تو کیا دیکھتا ہے - احمد نے جواب دیا کہ شائد میں کچھ پڑھ سکوں - تحصیلدار صاحب نے کہا اچھا لو پڑھو - احمد نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام پڑھ کر سُنا دیا تب تو تحصیلدار صاحب کی حیرت کی کوئی حد نہ تھی - پوچھنے لگے احمد تم نے انگریزی کہاں پڑھی !

احمد - جناب کی دُعا سے بندہ نے انگریزی میں ایم اے پاس کیا ہے -

تحصیلدار صاحب - مجھے کس طرح باور ہو - احمد - میرے پاس تمام اُسناد موجود ہیں -

یہ کہہ کر احمد نے اپنی تمام سندیں تحصیلدار صاحب کے سامنے ڈال دیں - یہ دیکھ کر تحصیلدار صاحب دنگ رہ گئے اور احمد کو گلے سے لگا لیا - فوراً نوکروں کو حکم دیا کہ احمد کو نہا کر خاص میری پوشاک جو آج ہی درزی سی کر لایا ہے پہناؤ - احمد ہر چند منع کرتا تھا کہ یہ کیا - میں وہی احمد ہوں لیکن تحصیلدار صاحب کہتے تھے کہ اب تک جو کچھ ہم سے غلطی ہوئی وہ ناواقفیت کے باعث ہوئی - اس کے بعد تحصیلدار صاحب نے احمد سے تمام حسب و نسب دریافت کیا اور اس وقت سے اس کو اپنا بیٹا تصور کرنے لگے - اسی عرصہ میں تحصیلدار صاحب کے لڑکے کو جو پولیس میں انسپکٹر تھا - چند ڈاکوؤں نے ہلاک کر دیا جس کے عوض میں احمد کو تحصیلدار صاحب نے پیش کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی لڑکی کی شادی بھی ان کے ساتھ کر دی ۔ ہنوز احمد علی خانصاحب اس عہدہ پر سرفراز ہیں - لیکن والدہ کی موت کا زخم کاری انکے جگر پر اب تک باقی ہے اکثر یہ شعر پڑھتے رہتے ہیں -

سہ

آئی بہار گلشن گُل سے بھرا ہے لیکن ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بُلبل

جذباتِ درد

کسی کی بزمِ دلکش تک میں اس صورت سے پہنچا ہوں — گماں ہوتا تھا جیسے رہروِ وادیِ سینا ہوں

یہاں تک وسعتِ نیرنگیِ جلوہ سمجھتا ہوں — نظر کو کچھ نہیں آتا مگر محوِ تماشا ہوں

رہے انجام نظروں میں اگر پامال کرنے ہو — ابھر آتا ہے جو مٹ کر میں وہ نقشِ کفِ پا ہوں

ستم کیسا جفا کیسی کوئی کیوں ہو وفا دشمن — سرشتِ عشق پامالی ہی میں پامال ہوتا ہوں

دلِ مضطر نظر کے سامنے ہی کونسی منزل — تڑپ اٹھتے ہیں شعلے اب جہاں میں سجدہ کرتا ہوں

نہ و بالا ہوئی جاتی ہے اب تو ہوش کی دنیا — یہی احساس رہنے دو کہ محرومِ تمنا ہوں

خدا معلوم کیا مفہوم ہے اب پردہ داری کا — کہ افشا اور ہوتا ہی جو رازِ دل چھپاتا ہوں

فریبِ التفات اب تک سکونِ دل کی دنیا تھا — یہ تم نے کیا کہا بیگانۂ شرحِ تمنا ہوں

فسانہ جب مکمل ہو جو یہ بھی امتیاز اٹھے — ابھی تک اے جنوں زنداں کو میں زنداں سمجھتا ہوں

بڑھی جب حد سے مایوسی کوئی پیشِ نظر آیا — رہِ پُرشوق میں میں تو سمجھتا تھا کہ تنہا ہوں

اٹھایا انتہائے شوق نے ہر پردۂ حائل — فضا خاموش ہے لیکن تری آواز سنتا ہوں

نظر کے سامنے اے دردؔ جب وہ آستاں آیا
پکار اٹھا یہ ہر ذرّہ کہ میں ہنگامہ آرا ہوں

درد شاہجہانپوری

آصف حسین اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اگرچہ ماں باپ کو اُس سے بیحد محبت تھی۔ لیکن پھر بھی اُنہوں نے کبھی اُس کا بے جا لاڈ پیار نہیں کیا۔ اور ذراسی عمر سے اس کو علمی مشاغل میں لگا دیا۔ بچہ چونکہ ذہین اور سمجھدار تھا۔ لائق اُستادوں کی تعلیم اور ماں باپ کی نگرانی سے بہت جلد ترقی کرنے لگا۔ آصف کی پھوپی جو بیوہ ہو چکی تھی اپنے بھائی کے پاس ہی رہتی تھیں اُن کی ایک لڑکی تھی جس کا نام ناہید جہاں تھا۔ ناہید آصف سے صرف دو سال چھوٹی تھی۔ ناہید اور آصف ایک ساتھ کھیلتے اور ایک ساتھ پڑھتے۔ اگر اتفاق سے کسی وقت آصف کھانا نہ کھاتا تو ناہید بھی اس وقت کھانے سے انکار کر دیتی۔ ہرچند اس کی ماں چاہتی کہ وہ کچھ کھالے۔ لیکن وہ یہی کہتی کہ اماں! بھائی جان نے تو کھایا ہی نہیں۔ پھر بھلا میں کیسے کھاؤں۔" اور جب تک آصف کھانا نہ کھالیتا۔ ناہید بھی اس کے ساتھ بھوکی رہتی۔

ایک روز آصف اسکول سے گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ ناہید جہاں گھر میں نہیں ہے۔ پہلے تو اس نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن جب اُسے ناہید نظر نہ آئی تو گھبرا کر پوچھا "پھوپی جان! ناہید کہاں ہیں"؟ اس کی پھوپی نے کہا بیٹا! وہ ابھی مجھ سے اجازت لے کر باغ میں چلی گئی ہے۔ آتی ہو گی۔" لیکن بھلا آصف کو اتنی دیر صبر کیسے ہوتا وہ فوراً باغ میں پہنچا۔ اور چاروں طرف ناہید کو تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ ناہید انگوروں کی بیل کے پاس کھڑی ہے۔ اور پکے کچے انگور توڑ توڑ کر اپنی گود میں اکھٹے کر رہی ہے۔ آصف کو دیکھتے ہی ناہید چلا کر بولی۔ "دیکھئے بھائی جان! میں نے آپ کے لئے کتنے انگور اکھٹے کر لئے ہیں۔ آصف بھی اتنے میں ناہید کے پاس جا پہنچا۔ ناہید بولی۔ دیکھئے کتنے پکے رسیلے آڑو لگے ہوئے ہیں۔ لیکن میرا ہاتھ نہیں جاتا۔ کوئی لکڑی لے آیئے تو توڑیں۔" آصف بولا۔ نہیں دیکھو میں ابھی درخت پر چڑھ کر سب آڑو توڑے لاتا ہوں۔ ورنہ زمین پر گر کر سب خراب ہو جائینگے۔ ناہید نے کہا کہ کہیں خدانخواستہ آپ گر پڑے تو کیا ہوگا۔ آصف نے کہا کہ نہیں اس میں گرنے کی کیا بات ہے۔" اور یہ کہہ کر آصف درخت پر چڑھ ہی گیا۔ لیکن جیسے ہی اُس نے چاہا کہ درخت کے ایک گدّے پر اپنے پاؤں جما کر آڑو توڑے کہ یکایک وہ ڈال جس پر وہ بیٹھا تھا ٹوٹ گئی۔ اور آصف ڈال کے گرنے سے پہلے زمین پر آرہا ــــ زمین پر گرتے گرتے وہ بیہوش تھا ــــ ناہید کا کلیجہ دھک

سے ہوگیا ـــ ایک طرف تو آصف کے چوٹ لگنے کا خیال دوسری طرف اپنی ماں اور اپنی مامی کی خفگی کا اندیشہ ـــ آخر کار آصف کو سہارا دیکر بٹھانے لگی۔ لیکن آصف کو ہوش ہی نہ تھا۔ اور ناہید میں اتنی قوت کہاں جو آصف کے جسم کو سنبھال سکے۔ وہیں بیٹھ گئی اور اُس کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور آصف کو ہوش میں لانے کے لئے آوازیں دینے لگی کہ بھائی جان! ـــ بھائی جان! ـــ اُٹھئے ـــ اُٹھئے بھائی جان! ـــ کیا حال ہے؟ ـــ بھائی جان کہاں چوٹ لگی ہے ـــ ناہید کی اِن آوازوں کا بھی جب آصف پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور آصف نے آنکھیں نہیں کھولیں تو ناہید نہایت گھبرائی ـــ اور رونے لگی ـــ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسوؤں کا ایک تار بندھ گیا۔ باغ کا بڈھا مالی جو کچھ فاصلہ پر پود لگا رہا تھا۔ ناہید کے رونے کی آواز سے چونک پڑا وہ گھبرایا ہوا دوڑا ـــ اور ناہید سے پوچھنے لگا کہ بٹیا! یہ کیا ہوا ـــ آصف میاں گر پڑے ـــ؟ ناہید نے بمشکل روتے ہوئے سارا قصہ مالی سے کہا ـــ مالی نے آصف کی نبض دیکھی ـــ اور اپنا اطمینان کر کے ناہید کی طرف جھکا۔ اور اُس کو تسلی و دلاسہ دیکر خود آصف کو اُٹھا کر ڈیوڑھی میں لے آیا ـــ اندر سے زلفی آئی اور آصف میاں کو لے گئی۔ ـــ آصف کی حالت دیکھکر آصف کی ماں اور پھوپی دونو پریشان و سراسیمہ ہو گئے ـــ فوراً آصف کے والد میر نجف حسین کو بُلوایا گیا ـــ اُنہوں نے آکر بیٹے کی حالت دیکھی ـــ تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ اُسی وقت سول سرجن کے لئے موٹر بھیجی گئی ـــ اور سول سرجن نے آکر اچھی طرح دل اور جگر اور پھیپھڑوں کا معائنہ کرنے کے بعد سب گھر والوں کا اطمینان کیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے محض دھمک سے قلب پر اثر پڑا ہے اور قلب کے اثر سے دماغ پر ـــ اس لئے بچہ بیہوش ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر نے دوائیاں سنگھا کر اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں۔ آصف نے آخر کار پندرہ بیس منٹ بعد آنکھیں کھول دیں ـــ آصف کے ہوش میں آجانے سے سب کی جان میں جان آئی ـــ اس عرصہ میں یوں تو سب ہی پریشان اور بدحواس تھے۔ لیکن ناہید کی حالت بالکل غیر تھی۔ اس کے کسی طرح آنسو نہ تھمتے تھے۔ اس کو رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ میری وجہ سے بھائی کی یہ حالت ہو گئی غرضکہ ڈاکٹر نے آصف کے ہوش میں آجانے کے بعد کسی ٹانک (قوت بخش دوا) کی ایک خوراک پلائی۔ اور چند خوراک اور دوا دے کر ہدایت کی کہ مریض بالکل چاق چوبند ہو جائیگا۔ یہ کہکر ڈاکٹر تو چلا گیا۔ اور آصف کو اس کے آرام کمرہ میں لٹا دیا گیا۔

رات کو جب کھانے پر سب جمع ہوئے تو ناہید نہ تھی۔ وہ اس وقت بھی آصف کے کمرے میں اس کے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھی تھی۔ جب کھانے کے لئے شکورن بُلانے آئی تو ناہید نے منع کر دیا کہ بُوا! مجھے تو بھوک نہیں ہے ـــ شکورن نے ہر چند اصرار کیا کہ بٹیا! تھوڑا سا تو کھا ہی لے ـــ لیکن ناہید نے کچھ نہ کھایا ـــ

بلانے پر بھی جب ناہید کھانے پر نہ آئی تو خود اُس کی مامی زرینہ بیگم کمرے میں آئیں ——— اور اپنے ساتھ ناہید کو بلاکر لے گئیں ——— ناہید اپنی ماں سے زیادہ اپنی مامی کا ادب و لحاظ کرتی تھی ——— ناہید کے اُٹھ آنے پر شکورن آصف کے پاس رہ گئی ——— ناہید آنے کو تو آ گئی اور دسترخوان پر بھی بیٹھ گئی۔ لیکن نوالہ اس کے منہ میں نہ چلتا تھا۔ اور نہ چلا۔ دو چار نوالے مامی ماموں کے کہنے سے ناہید نے لئے اور دسترخوان سے اُٹھ بیٹھی ——— اور آصف کے کمرے میں آ گئی ——— آصف کو تھوڑا دُودھ دیا ——— اور پھر کچھ دیر بعد دوا ——— اور پھر کُرسی پر بیٹھ گئی۔
——— رات زیادہ بھیگتی جارہی تھی ——— گھر بھر میں سنّاٹا طاری ہو چکا تھا۔ زرینہ بیگم ابھی جاگ رہی تھیں۔ ۱۲ بج چکے ہونگے ——— کہ زرینہ بیگم آصف کو دیکھنے آئیں ——— ناہید اُسی طرح کُرسی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے آنسو خاموش دریا کی طرح بہہ رہے تھے اور شکورن فرش پر بے خبر پڑی سو رہی تھی ——— مامی نے اپنی بھانجی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تشفی آمیز لہجہ میں ڈھارس بندھائی کہ بیٹی! اس قدر رونے اور گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اب خدا کے فضل سے تمہارا بھائی اچھا ہے۔ صرف کمزوری باقی ہے۔ جو جاتی رہے گی ——— ناہید ابھی کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ آصف نے آنکھیں کھولیں تو ناہید کو روتے اور اپنی والدہ کو اس کے پاس کھڑے دیکھا۔ آصف کی ماں فرطِ محبت سے آصف کے چہرہ پر جُھک گئی اور اُس کی روشن جبیں کو چوم کر مشفقانہ لہجہ میں پوچھا۔ بیٹا! اب کیسی طبیعت ہے۔

آصف نے کہا کہ امّاں جان! اب اچھا ہوں۔ تھوڑا دُودھ اور دے دیجئے۔ بھوک محسوس ہوتی ہے۔ ناہید بڑھی اور جگ میں سے دُودھ انڈیل کر پیالی میں نکالا۔ آصف کی ماں نے اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹے کو دُودھ پلایا اور آرام کرنے کی ہدایت کی۔

زرینہ نے ناہید سے بھی کہا کہ بیٹی! اب رات زیادہ ہو گئی ہے۔ تم بھی جاکر سو رہو۔ اب میں یہاں آصف کے پاس بیٹھی ہوں۔

ناہید (نہایت ادب سے) مامی جان! آپ کیوں تکلیف فرماتی ہیں۔ آپ آرام فرمائیں۔ میں یہاں رہوں گی۔ شکورن بھی یہاں سو رہی ہے ——— اگر ضرورت ہوئی تو اُسے اُٹھالونگی۔

نہیں بیٹی! تم ابھی بچی ہو ——— اور رات بھر جاگنا تمہارے لئے مضر ہوگا ——— خدانخواستہ اگر تکان سے تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تو ——— ! زرینہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

مامی جان! نہیں ——— آپ فکر نہ فرمائیں ——— مجھے نیند ہی نہیں معلوم ہو رہی ——— جب نیند آئیگی تو میں خود اپنے کمرے میں جاکر لیٹ رہونگی۔ آپ آرام فرمائیں ——— " ناہید نے کہا۔

زرینہ بیگم نے یہ سمجھ کر کہ ناہید کا دل اپنے بھائی کی وجہ سے بے چین ہے زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا۔

کیونکہ دونوں بہن بھائیوں میں جو گہری محبت و اُنسیت تھی وہ اُسے خوب سمجھتی تھی ــــ اس لئے زرینہ بیگم ناہید کو آصف کی تیمارداری کے لئے چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئیں ــــ

زرینہ کے جانے کے بعد آصف نے آنکھیں کھولیں اور ناہید سے پوچھا ــــ ناہید! تم کیوں رو رہی تھیں ؟

ناہید کیا جواب دیتی ــــ اور رونے لگی ــــ ہچکی کے ساتھ ــــ آصف نے پھر یہی سوال کیا ــــ اور ناہید کا یہ حال تھا کہ جیسے بھرے ہوئے ساغر میں ایک ٹھیس لگ گئی اور وہ چھلک اُٹھا ہو ــــ اسی طرح ناہید کے دل کا ناسُور جو آصف کی تکلیف سے اب بالکل پک چکا تھا۔ آصف کے اس دردمندانہ فقرہ سے بہ نکلا ــــ آصف حیران تھا ــــ اور رنجیدہ ــــ کہ میں نے ناہید کو اور تکلیف دی ــــ وہ اُٹھا ــــ مشکل سے ــــ اور اپنے کمزور ہاتھوں سے ناہید کے آنسو صاف کئے ــــ اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا کہ ناہید بتاؤ تو آخر کس بات کا تم کو اتنا رنج ہے ــــ جو تم روئے جا رہی ہو ــــ"

ناہید (مشکل سے) بھاری جان! آپ میری وجہ سے گر گئے ــــ

آصف (تسلی آمیز لہجہ میں) واہ ناہید! اتنی سی بات! اس کے لئے اتنا رونا ــــ میں گر بھی گیا تو کیا ہُوا ــــ یہ کوئی رونے کی بات تھی ؟ ــــ اور یہ کوئی نئی بات تو تھی نہیں ــــ آخر اس سے پہلے بھی تو آڑو اور لیچیاں درخت پر سے توڑ توڑ کر تم کو دیتا رہا ہوں۔ اس وقت یہ اتفاقی وقت تھا جو ڈال ٹوٹ گئی ــــ

"یہ تو آپ کا کہنا درست ہے ــــ لیکن کل تو آپ میرے ہی کہنے پر درخت پر چڑھے تھے ۔"

تو اس میں کیا ہُوا ــــ اور تم نے تو مجھے درخت پر چڑھنے سے منع بھی کیا تھا ــــ اور پھر میرے چوٹ بھی تو کہیں نہیں آئی ــــ دیکھو اب میں بالکل اچھا ہوں ــــ لو اب جاؤ۔ دو بج رہے ہیں ــــ جا کر سو رہو۔ صبح پھر باغ چلینگے ۔"

"نہیں! مجھے آپ کو ہر دو گھنٹہ بعد دوا اور دُودھ دینا ہوگا۔ میں آج ساری رات یہاں ہی رہونگی ــــ اب جس طرح آپ کو میری خاطر اتنی تکلیف اُٹھانی پڑی اُسی طرح اب مجھے آپ کی تیمارداری میں بھی حصّہ لینا ضروری ہے ــــ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ آج مجھے نیند بھی نہیں آ رہی ــــ آپ اب نیند کا خیال کریں ــــ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ابھی نہیں آرام لینے دیا جائے۔"

اتنے میں گھڑی نے گھنٹہ بجایا۔ اور ناہید نے گلاس میں دوا کی ایک خوراک نکال کر آصف کو دی ــــ آصف دوا پی کر لیٹ رہا۔ اور دیکھتے دیکھتے اُسے نیند آ گئی ــــ لیکن ناہید ــــ اسی طرح جاگتی رہی ــــ اُف گیارہ برس کی جان ــــ رات بھر یوں ہی بیٹھی رہی ــــ صبح کی نماز کے بعد آصف کے والدین اور اُس کی پھوپی اُس کے دیکھنے کو اس کے کمرے میں آئیں۔ تو ناہید کو پلنگ کے پاس اسی طرح کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ ناہید ادب سے کھڑی ہو گئی اور سلام کر کے کمرے سے باہر آ گئی۔ آصف صبح جب اُٹھا تو اُس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ معمولی ضعف تھا۔ جو دوسرے دن تک وہ بھی جاتا رہا۔

اس واقعہ سے آصف کے ماں باپ اور ناہید کی ماں نفیسہ بیگم کے دلوں پر دونوں بہن بھائیوں کی محبت کا بڑا اثر ہوا اور ان

تینوں کو اب یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اگر ان دونو کی شادی آپس میں ہو جائے تو دونو کی زندگی نہایت خوشی و مسرت اور اخلاص و پیار میں گذرے ۔ لیکن نہ تو زرینہ بیگم ہی نند سے کچھ کہہ سکیں اور نہ نصیرہ بیگم نے ہی اپنے دل کی بات بھائی یا بھاوج پر ظاہر کی تھی آصف اب ۱۵ سال کا تھا ۔ انٹرنس کا امتحان دے چکا تھا ۔ انٹرنس کے امتحان میں اُسے اعلےٰ کامیابی حاصل ہوئی اور یونیورسٹی بھر میں اول رہا ۔ نجف حسین نے اُسے اعلےٰ تعلیم کے لئے علیگڈھ بھیجدیا ۔ اور اب وہ وہاں اپنی تعلیم کی تکمیل میں مصروف تھا ۔

ادھر ناہید جہاں ۱۳ سال کی ہوگئی تھی بُشرہ سے ذکاوت و ذہانت کی چمک نمایاں تھی سینے پرونے اور کھانا پکانے میں خاص طور پر وہ مشاق تھی اور مشرقی اور مغربی طرز کے کھانے ' مٹھائیاں ' حلوے ' مربّے وغیرہ بنانے میں اُسے ابھی سے کمال حاصل تھا ۔ اسی طرح کپڑوں کی قطع و بُرید اور اُن کی تیاری میں بھی اُسے مہارت تھی ۔ اور اُس کی خوش سلیقگی اور ہنرمندی سے گھر اور کنبہ والے اُس کی تعریف میں رطب اللسان رہا کرتے تھے اُس کی خوش اخلاقی اور ادب و لحاظ کے باعث ہر چھوٹے بڑے کے لئے وہ نہایت ہر دلعزیز ہو رہی تھی ـــــ اُس کا اگر کوئی ساتھی تھا یا رفیق ـــــ تو وہ اُس کا بھائی تھا ـــــ آصف ـــــ لیکن اب آصف علیگڈھ جا چکا تھا ۔ اس لئے ناہید اُس کی مہجوری کی وجہ سے اکثر اُداس رہتی اور مغموم ـــــ اور اُس کی کامیابی اور جلد واپسی کی دعائیں مانگا کرتی تھی ـــــ

ناہید اب ناسمجھ نہ تھی ـــ اُس کا بچپن کا دور ختم ہو چکا تھا ۔ اگرچہ اُس کی باضابطہ تعلیم اب ختم ہو چکی تھی ۔ لیکن اُس کا "مطالعہ" اب بھی جاری تھا ـــــ اور اب زیادہ وقت "مطالعہ" میں ہی گزرتا تھا ـــــ آصف کی مہجوری کی بے چینی اگر کچھ دور ہو سکتی تھی تو "مطالعہ" سے اور اس مفارقت میں کچھ تسلی بخش چیز اُس کے لئے اُس کی "کتاب" تھی ـــــ اور اسی لئے وہ اس میں محو رہا کرتی تھی ـــــ یا پھر خط و کتابت میں ـــــ آصف کے خطوط تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن دریافت خیریت کے آیا کرتے تھے جو ناہید کے لئے نہایت تسلی بخش ہوتے تھے ـــــ ناہید نے اس مفارقت سے تنگ آ کر ایک خط میں آصف کو لکھا کہ اگر کسی طرح علیگڈھ میں میری بھی تعلیم کا انتظام ہو جاتا تو بہتر تھا ۔ اس طرح میں علیگڈھ آ سکتی ہوں ـــــ اور ہم دونو ایک جا رہ سکتے ہیں ۔ اور میں کچھ اور لکھ پڑھ بھی سکونگی ۔ جس کا مجھ کو ہمیشہ سے شوق ہے ۔"

آصف کو خود ناہید کی مہجوری شاق تھی ۔ برسوں کا ساتھ برسوں کی محبت ' خون کا اثر ۔ اُسے خود بھی ناہید کی اس تحریک سے مسرت ہوئی اور اُس نے ناہید کو لکھا کہ اب کی موسمی تعطیلات میں جب آؤنگا تو میاں جان سے اس کے متعلق عرض کرونگا تم مطمئن رہو تمہاری تجویز موزوں ہے ۔

چنانچہ آصف تعطیلات میں جب مکان پر آیا تو اُس نے اپنے والدین سے ناہید کے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنے کی تجویز پیش کی اور بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد سمجھایا کہ جس قدر مواقع لڑکیوں کو حصولِ علم و تعلیم کے بآسانی ممکن ہو ضرور دینے چاہئیں کہ علم اور تعلیم ہی سے انسان کے جوہر کھلتے ہیں ۔ اس لئے اگر آپ ناہید کو تعلیم کے لئے علیگڈھ گرلس کالج بھیجنے کے لئے تیار نہیں تو پھر ایک

قابل اُستانی ہی دیکھ کر اس کی مزید تعلیم کا انتظام فرما دیجئے ـــــ چنانچہ ایک عیسائی اُستانی مس روزا کو ناہید کی تعلیم کے لئے مقرر کرا کے آصف مطمئن ہو گیا۔ اور خود تعطیلات کے اختتام پر اپنی تعلیم گاہ پہنچ گیا اور ادھر ناہید اپنے علمی مشاغل اور تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئی۔ ناہید بلا کی ذہین تھی۔ اور غضب کی شوقین ـــــ اگر شاگرد شوقین ہو اور ذہین تو اُستاد کا بھی ایسے شاگرد کی درس تدریس میں دل لگ جاتا ہے اور اُسے ایک خاص کیف اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہی حال مس روزا کا تھا کہ وہ ناہید کو پڑھانے میں ناہید کے پڑھنے سے زیادہ شوقین ہو گئی تھی اور اپنے مقررہ اوقات سے بھی زیادہ وقت ناہید پر صرف کیا کرتی تھی ـــــ بلکہ اب مس روزا کو اپنی ذہین و شوقین شاگرد سے ایک خاص اُنسیت و محبت ہو گئی تھی ـــــ

ناہید کی اِس تعلیم کو کچھ عرصہ اسی طرح گزر گیا ـــــ جاڑے کے دن تھے ـــــ چائے سے سب فارغ ہو چکے تھے۔ ناہید چائے پی کر اپنے تعلیمی کمرہ میں جا چکی تھی ـــــ نند بھاوجیں صحن میں میٹھی دھوپ کی فرحت بخش اور سردی دور کن گرمی کے مزے لے رہی تھیں ـــــ کہ نجف حسین بھی وہاں آ گئے ـــــ

اپنی بہن سے مخاطب ہو کر نجف حسین بولے کہ نصیرہ! کیا خلیل مرحوم (ناہید کے والد) کے کوئی بھائی تھے جلیل احمد؟

اُن کے تو کوئی بہن بھائی تھے نہیں۔ یہ تو آپ کو بھائی جان! معلوم ہی ہے۔ ہاں رشتہ کے ایک بھائی تھے ـــــ ہاں اُن ہی کا نام تھا جلیل احمد ـــــ بمبئی میں اُن کا کاروبار تھا۔ اور بہت بڑے تاجر اور رئیس سمجھے جاتے ہیں" نصیرہ نے کہا۔

"ہاں تو وہ اس وقت آئے ہیں۔ اور اُن کے ساتھ ایک صاحبزادے بھی ہیں جن کو وہ اپنا لڑکا بتاتے ہیں اور انکا نام جمیل احمد ہے" نجف حسین بولے۔

ناہید کے باپ کی زندگی میں تو میں نے انہیں ایک دو بار دیکھا ہے۔ جب انکی بیوی بچہ ان کے ہمراہ تھیں۔ اس وقت میری ناہید کوئی سال بھر کی ہوگی۔ جمیل اس وقت چھ سات سال کا تھا۔ خیر! آپ انکو بلا لیجئے۔ (بھاوج کی طرف دیکھ کر) بھائی جان! آپ اندر پردہ میں چلی جائیں۔ اگرچہ میرا دل بھی اب اُنکے سامنے ہونے کو نہیں چاہتا۔ لیکن جب آئے ہیں تو بلا لینا ہی مناسب ہے"

زرینہ بیگم تو اندر کمرے میں چلی گئیں اور نجف حسین باہر جا کر اُن دونو باپ بیٹوں کو اپنے ساتھ اندر لے آئے۔ جلیل احمد نے اپنی بھاوج کو سلام کیا۔ اور جمیل احمد نے اپنی چچی کو۔ اور دونو پلنگ کے پاس ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

نصیرہ نے سلام کے جواب میں دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ کہئے بھائی! کب آئے۔ گھر پر تو سب خیریت ہے۔ بھابی کو ساتھ نہ لیتے آئے۔

جلیل احمد۔ آپ کی بھابی! اُنکو تو مفارقت کا داغ دیئے آج کئی سال ہو گئے ـــــ بس گھر کی رونق ـــــ اور گھر کا کام

سب اُنکے میاں جمیل کے دم سے ہے۔ اب تو یہی میری زندگی ہیں اور زندگی کا ماحصل ہے۔ میں اس وقت تو بمبئی سے آرہا ہوں۔ اور کل واپسی کا قصد ہے۔"

نصیرہ۔ بھائی جلیل۔ بڑا رنج ہُوا۔ بھائی کی رحلت سے۔ برسوں گزرے میں اگرچہ دُو دفعہ ہی اُن سے ملی تھی۔ لیکن آج تک اُنکی محبت اور اُن کے اخلاق کا اثر میرے دل پر ہے۔ خدا مغفرت کرے۔ بڑی نیک بی بی تھیں ۔۔۔ آپ نے بھی تو ہمیں اپنے بھائی کے انتقال کے بعد سے بالکل ہی بھلادیا۔ کبھی ایک پرزہ بھی خیریت کا نہیں لکھا ۔۔۔ پھر بھلا کیا خبر ہوتی ۔۔۔ ناہید نے تو آپ کو دیکھا بھی نہیں ہے۔"

جلیل۔ ۔۔۔ "بھابی! کیا کہوں میں خود بھی اس عرصہ میں برابر پریشانیوں میں ہی مبتلا رہا۔ کہ نہ تو خود آپ کے پاس آسکا۔ نہ خط خطوط لکھ سکا ۔۔۔ اب خدا کا شکر ہے کہ کچھ سکون ہُوا ہے اور کاروبار کی طرف سے بے فکری ہوئی ہے ۔۔۔ آپنا کہئے آپ کا کیسا مزاج ہے۔ اور کیا احوال ہے؟"

نصیرہ۔ خدا کا شکر ہے ۔۔۔ اچھی ہوں۔ اور اچھی گذرتی ہے۔ ناہید کے باپ نے ہی اوّل تو کافی روپیہ اور جائداد چھوڑی تھی ۔۔۔ ایک سالم گاؤں تھا۔ جو ہم دونو ماں بیٹیوں کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ پھر میرے بھائی جان نے مجھے مجبور کیا کہ میں اُنکے پاس ہی رہوں اور کوٹھی کا کرایہ سَو روپیہ ماہوار آتا ہے۔ وہ سب ناہید کے نام سے بنک میں جمع ہوجاتا ہے اور کل اخراجات کے میرے بھائی ذمّہ دار ہیں۔ میں نے ہر چند چاہا کہ وہ اس قدر بار اپنے اوپر برداشت نہ کریں لیکن وہ نہیں مانتے۔"

جلیل۔ "بے شک لائق بھائی ایسے ہی ہوتے ہیں ۔۔۔ اور اخوّت و محبت کا مقتضا یہی ہے ۔۔۔ اور ناہید کہاں ہے وہ تو اب سیانی ہوگئی ہوگی ۔۔۔؟

نصیرہ بیگم نے یہ کہتے ہوئے کہ "ہاں لیجئے! میں ناہید کو بُلانا بھُول ہی گئی۔ وہ اس وقت اپنے تعلیمی کمرہ میں ہوگی۔" شکورن سے آواز دے کر کہ ناہید جہاں سے جاکر کہہ آؤ کہ تمہارے چچا اور بھائی آئے ہیں۔ اُن سے آکر مل جاؤ۔"

شکورن۔ "جی۔ سرکار" کہہ کر ناہید کے پاس پہنچی۔ ناہید حسب معمول پڑھنے میں مشغول تھی۔ اور مس روزا اُسے سبق پڑھا رہی تھیں۔

شکورن نے ناہید سے کہا "چلئے چھوٹی بیگم! بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔ آپکے چچا آئے ہیں۔ اُن سے مل جائیے۔"

ناہید (حیرت سے) "میرے چچا! میرے تو کوئی چچا ہیں نہیں ۔۔۔ اور ہوتے تو میں اُن کو کبھی تو دیکھتی۔"

شکورن۔ نہیں بیگم! بات یہ ہے کہ یہ آپ کے رشتہ کے چچا ہیں۔ اور عرصہ سے بمبئی میں رہتے ہیں۔ اب آپ سب سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔"

ناہید۔ اچھا تو چلو تم ۔۔۔ میں آتی ہوں۔"

یہ کہکر مس روزا سے ناہید نے انگریزی میں کہا کہ چند منٹ کے لئے مجھے معاف فرمائیگا۔ میں آتی ہوں۔" مس روزا

نے مسکرا کر اجازت دیدی۔ اور ناہید کمرے سے نکل کر برآمدہ میں آئی۔ جہاں اُس کی ماں تھیں۔

ناہید اپنی ماں کے پاس پہنچی ہی تھی کہ اپنے بزرگ چچا کے پاس ایک نوجوان کو دیکھ کر ذرا ٹھٹکی اور رُکی۔ لیکن ماں نے آواز دی کہ "ناہید۔ بیٹی۔ آؤ۔ تمہارے چچا اور تمہارے بھائی آئے ہیں۔ انکو سلام کرو" نصیرہ کے اِن الفاظ پر ناہید آگے بڑھی اور اپنے چچا اور بھائی کو سلام کر کے ماں کے پاس پلنگ پر پائنتی کی جانب بیٹھ گئی۔ جلیل احمد اور جمیل احمد نے جو ناہید کو دیکھا تو ششدر سے رہ گئے ــــ سلام کے جواب میں جلیل احمد نے بھتیجی کو دعائیں دیں۔ لیکن جمیل کا مُنہ کُھلا کا کُھلا ہی رہ گیا۔

جمیل احمد اگرچہ زیادہ حسین اور شکیل نہ تھا۔ تاہم وہ بدشکل بھی نہ تھا ــــ البتہ اُس کی تربیت اچھی نہ تھی اور نہ طینت ہی بھلی تھی ــــ اس کی صحبت ہمیشہ آوارہ منش لڑکوں میں رہی۔ باپ کا پیسہ خرچ کرنے کو کافی سے زیادہ تھا۔ اور ماں مر چکی تھی۔ اس لئے باپ کو کچھ پروا نہ تھی ــــ اس لئے اُس کا باطن بہت ہی خراب تھا۔ اُس کی طبیعت بدی کی طرف زیادہ راغب تھی۔ شراب و کباب کا بھی کچھ کچھ چسکا تھا۔ اور ناچ گانے کی محفل میں بھی کبھی کبھی شرکت ہو جاتی تھی۔ اب اس نے جب سے اپنی چچی کی زبانی اس جائداد کا حال سُنا تھا جو ناہید کے نام لکھوا دی گئی تھی تو وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کسی طرح یہ سب کچھ میرے قبضہ میں آجائے۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا تھا کہ جب ناہید سے اس کی شادی ہو جاتی۔ لہٰذا اس نے تہیہ کر لیا کہ اگر ناہید سے شادی نہ کی تو کچھ نہ کیا۔

جلیل احمد بھتیجی کو دیکھ کر نہایت مسرور ہوئے۔ اور اُن کے دل میں بھی یہ اُمنگ پیدا ہوئی کہ واقعی ناہید بہو بنانے کے قابل ہے۔ محبت سے بھتیجی سے مخاطب ہوئے۔ "بیٹی ناہید! اچھی تو ہو۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ اب تک تمہیں دیکھ بھی نہ سکے۔ کہو کیا مشغلہ ہے"

ناہید (نظریں نیچی کئے ہوئے) مجھے بھی افسوس ہے کہ آپ کی قدمبوسی سے محروم رہی۔ آج کل مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنیکا شوق ہے۔ خدا کے فضل سے اب میں انٹرنس کا کورس دیکھ رہی ہوں۔ اللہ کو منظور ہے تو اس سال انٹرنس کا امتحان پرائیویٹ دونگی۔ اِس وقت بھی میں تعلیم ہی میں مصروف تھی۔ میری اُستانی میں روزانہ آکرے ہی میں ہیں۔ مجھے نہایت محبت اور شفقت سے پڑھاتی ہیں۔ اور تصویر کشی میں بھی مجھے مدد دیتی ہیں۔ اسی شغل میں صبح و شام گزر جاتی ہے۔

جلیل (مسرور ہو کر) خوش رہو بیٹی! تم سے مل کر بڑا جی خوش ہُوا۔ خدا تمہارے شوق کو پورا کرے اور کامیابی دے۔

نصیرہ نے ادھر جمیل احمد سے سوال کیا کہ "میاں جمیل تمہاری تعلیم کہاں تک ہے۔ بمبئی کالج میں پڑھتے ہو یا کہیں اور؟"

"چچی جان! مجھے نوکری تو کرنی نہیں ہے جو خواہ مخواہ وقت خراب کروں اور کالج کی زندگی میں تضیع اوقات

کروں۔میرے یہاں تو تجارت ہی ہوتی چلی آرہی ہے۔تجارت کے قابل بہت کچھ پڑھ لکھ لیا ہے۔والد زندہ ہیں۔انکی زندگی بھر تو بس تفریح اور دلچسپیوں اور دوست احباب کی صحبتوں میں سطف کے ساتھ اور آزادی کی ہوا میں گزار رہا ہوں۔پھر تجارتی کاروبار سنبھالنا پڑیگا۔

نصیرہ بیگم جمیل احمد کا یہ جواب سُنکر پھر کچھ نہ کہہ سکیں۔اور ناہید بھی چونک پڑی۔ اُس نے ایک نظر جمیل پر ڈالی ــــ اور اپنے دل میں اُسکی جہالت اور پست خیالیوں پر افسوس کرنے لگی ــــ ناہید کا دل وہاں گھبرانے لگا۔وہ علم کی دیوانی تھی ــــ اور علم کی پرستار ــــ جمیل "علم" سے منکر تھا ــــ "تعلیم" کو بُرا سمجھتا تھا ــــ اور ناہید کو اس سے گھِن تھی۔ادھر مس روزا کا خیال بھی تھا کہ وہ وہاں انتظار کررہی ہیں۔اس لئے ناہید اپنی ماں سے بولی:- امّاں ! اب میں جاؤں ؟ مس روزا بیٹھی ہوئی ہیں۔سبق کا ہرج ہوگا ــــ"

ماں بیٹی کے چہرہ کے رنگ کے تغیر سے ہی سمجھ گئی تھی ــــ اجازت دے دی۔کہ ہاں بیٹی ! اب تم جاؤ۔" ناہید اُٹھی اور چچا کو سلام کرکے اپنے کمرے میں چلی گئی۔میاں جمیل احمد کو البتہ ناہید کا یوں چلا جانا نہایت شاق گزرا ــــ

اُس کے چلے جانے کے تھوڑی دیر بعد دونو باپ بیٹے باہر مردانے میں آگئے۔نجف حسین نے بہت خاطر مدارات کی اور پورے طور پر حق مہمانداری ادا کیا۔

اسی رات کو جلیل احمد اور جمیل احمد دونو میں باتیں ہوئیں اور طے ہؤا کہ جمیل کا پیام ناہید کو دیا جائے۔ کیونکہ جمیل نے اپنے باپ سے صاف طور پر کہدیا تھا کہ اگر ناہید سے اُسکی شادی نہ ہوئی تو وہ زندہ نہ رہ سکیگا۔اور خود جلیل بھی ناہید کو دیکھ کر اُس کے گرویدہ ہو چکے تھے۔اور اُن کی بھی یہی خواہش تھی کہ اپنے چہیتے بیٹے کے لئے ایسی ہی لائق اور خوبصورت بہو ملے۔دوسرے انکی جائداد پر بھی اسکا دانت تھا۔وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ جو کچھ مرحوم بھائی نے چھوڑا ہے وہ دوسری جگہ نہ جانے پائے۔

دوسرے روز جلیل احمد جب نصیرہ کے پاس گئے تو تنہا ہی آئے اور نجف حسین بھی اس وقت گھر میں ہی موجود تھے۔جلیل احمد نے پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور اس کے بعد بھاوج سے بولے کہ بھابی ! ناہید جہاں کی کہیں نسبت وغیرہ بھی ہوئی ہے ؟ اب ماشاءاللہ وہ جوان ہے۔آخر آپ کا ارادہ کب اس کا بیاہ رچانے کا ہے۔"

نصیرہ بیگم۔جلیل میاں ! بات یہ ہے کہ اول تو مجھے ابھی اس طرف خیال ہی نہیں ہؤا۔کیونکہ ابھی اسکی کچھ زیادہ عمر بھی نہیں ہے۔دوسرے وہ ابھی پڑھ رہی ہے۔اور وہ ابھی اور پڑھنا چاہتی ہے ــــ بھائی ! تم جانتے ہو میرے ایک ہی اکیلی بچی ہے ــــ اور میں اُسے کسی طرح سے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی۔جب وہ پڑھکر فارغ

ہوگی۔ اُس وقت دیکھا جائیگا۔

جلیل - بھابی لڑکی کو اس قدر پڑھانا کیا ضروری ہے۔ جتنا اُس نے پڑھ لیا ہے وہی اُس کے لئے بہت کافی ہے میری خواہش ہے کہ آپ جمیل کو اپنی فرزندی میں قبول کریں اور ناہید جہاں کو میری بہو بنادیں۔ خدا کے فضل سے روپیہ پیسہ کی کمی نہیں ہے۔ میں ناہید کو اپنی آنکھوں کا تارا بناکر رکھونگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پہلے حق بھی ہمارا ہی ہے۔

یہ فقرہ کہ "حق بھی ہمارا ہی ہے" نصیرہ اور نجف حسین دونو کو بہت ناگوار ہوا۔ کیونکہ جبسے بھائی کا انتقال ہوا کبھی بھاوج بھتیجی کی خبر تک نہ لی۔ اور اب جائداد اور لڑکی لینے کے لئے حقدار بن گئے۔ لیکن نصیرہ بیگم بہت دوراندیش اور سمجھدار تھیں انہوں نے مصلحتِ وقت یہ ہی سمجھا کہ حکمت عملی سے اس قصہ کو ٹال دیا جائے۔ وہ بھلا کب اسے پسند کر سکتی تھیں کہ اُنکی ناز پروردہ لاڈلی حسین وسعید ناہید جاہل جمیل سے منسوب کی جائے۔ پھر آصف کے مقابلہ میں نصیرہ کو کوئی لڑکا اچھا نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اُنہوں نے سوچا کہ اگر اس وقت میں صاف صاف انکار کرونگی تو یہ بھی ٹھیک نہ ہوگا۔ اور وہ اسی کشمکش و پیچ میں تھیں کہ جلیل احمد نے پھر چھیڑا :-

"بھابی جان! آپ تو بالکل خاموش ہوگئیں۔ کیا جمیل احمد آپ کو ناپسند ہیں۔ یا کہیں اور ارادہ ہے۔

نصیرہ بیگم (اپنے دلی جذبات کو دباکر مسکراہٹ کے ساتھ) نہیں جلیل میاں! بات یہی ہے جو میں پہلے کہہ چکی کہ ابھی میں اس کی شادی نہیں کرونگی۔ کیونکہ اس کا خیال ابھی اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کا ہے۔ اس کے بعد دیکھا جائیگا ـــــ رہا روپیہ پلیسہ تو بھائی! اس کی تو میں اگر بالکل نادار اور کم مایہ بھی ہوتی جب بھی پروا نہ تھی۔ اور اب تو خدا کے فضل سے اتنا ہے کہ میری ناہید کسی کی محتاج نہیں۔

جلیل - نہیں میرا یہ مطلب نہ تھا۔ جو آپ نے خیال کرلیا۔

نصیرہ بیگم ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ ملازم لڑکے (عبداللہ) نے ایک تار کا لفافہ لاکر نجف حسین کو دیا۔ انہوں نے رسیدہ پر دستخط کرکے لفافہ کھولا اور تار پڑھنے لگے ـــــ

نصیرہ بیگم تار کا لفافہ دیکھ کر ہی اندر ہی اندر مضطرب سی ہوگئی تھی۔ اور آخرکار بول ہی اُٹھی کہ بھائی جان! کس کا تار ہے؟ کیا لکھا ہے؟

نجف حسین - نصیرہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ آصف حسین ایف اے میں بھی اوّل آیا ہے ـــــ اور شب کی گاڑی سے آرہا ہے۔

نصیرہ - خدا کا شکر ہے۔ خدا ایسا ہونہار اور نیک بیٹا سب کو عطا کرے۔

جلیل - بھابی! یہ آصف حسین کون ہیں۔

نصیرہ - میرا بھتیجہ ہے۔ علیگڈھ میں پڑھتا ہے۔ بڑا تیز اور بڑا ذہین ہے۔ اس وقت تک جس قدر بھی امتحان ہوئے

سب میں اوّل رہا ہے۔ اور ماشاءاللہ ابھی سترھواں ہی سال ہے۔

جلیل احمد یہ سُنکر دل میں نہایت ہی افسردہ خاطر ہوئے۔ اور انہیں اب یہ یقین ہو گیا کہ ان کا منشاء اپنے بھتیجہ ہی سے شادی کرنے کا ہے۔ اور اسی لئے اتنی تعریفیں ہو رہی ہیں۔

نجف حسین نار لئے ہوئے اپنی بیوی کے پاس گئے انہیں خوشخبری سُنائی۔ ناہید نے بھی سُنا۔ بہت خوش ہوئی۔ اور اس کو تو دوہری خوشی تھی۔ ایک تو ایف اے میں اوّل آنے کی اور پھر اُس کے گھر واپس آنے کی۔

جلیل احمد کچھ دیر اپنی بھاوج کے پاس بیٹھ کر چلنے لگے تو بولے کہ بھابی میں آج شام کو چھ بجے والے اکسپرس سے بمبئی جاؤنگا —— لیکن میری بات کا آپ نے کوئی ٹھیک جواب نہیں دیا ——"

نصیرہ۔ جلیل میاں! ایسی بھی جانے کی کیا جلدی ہے۔ اب آپ آئے ہیں تو دو چار روز رہئے۔ پھر چلے جائیے گا۔ اور نسبت کے معاملہ میں تو میں کہہ چکی کہ ابھی میرا کوئی ارادہ نہیں ——

جلیل۔ تو میں اسے انکار سمجھوں یا اقرار۔

نصیرہ۔ یہ تو آپ کے سمجھنے کی بات ہے۔ میں کیا کہوں۔

جلیل احمد اس جواب سے اور بھی خاموش ہوئے —— اُٹھ کر باہر آئے اور چلنے کی طیاری شروع کر دی۔

نجف حسین اور نصیرہ نے ہر چند روکا۔ لیکن وہ ایک نہ مانے۔ کیونکہ جلیل احمد کو نصیرہ کے اس خشک جواب کا بہت ہی رنج تھا۔ اور غصہ بھی —— اسی رنج اور غصہ میں دونو باپ بیٹے آصف کے دشمن ہو گئے اور یہ طے کر لیا کہ ناہید کی شادی آصف سے بھی نہ ہونے دینگے —— سچ ہے جہالت اور دولت کا نشہ یہ دونو چیزیں مل کر انسان کو پست اخلاق بنا دیتی ہیں۔ انسانیت کے تمام جوہر مفقود ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ آج یہ دونو اپنی اس [illegible] بغض و حسد [illegible] تھے کہ آصف سے کُھلی دشمنی کے لئے آمادہ ہو گئے۔

شام کو روانگی سے قبل باپ بیٹے رخصتی ملاقات کے لئے زنانہ حصۂ مکان میں آئے۔ اور جمیل نے بہت چاہا کہ کسی طرح ناہید کو ایکبار اور دیکھ لے۔ لیکن ناہید نے اپنی ناسازیٔ طبع کا ایسا عذر کیا کہ وہ نہ آتی تھی نہ آئی اور دُور ہی سے سلام کرا کے اپنے بھائی کو رخصت کر دیا۔ جمیل کو اس کا بھی نہایت صدمہ ہُوا۔ اور ان دونو کے غصہ کی آگ بھڑک اُٹھی اور تاؤ پیچ کھاتے ہوئے دونو بمبئی روانہ ہو گئے۔

آصف شب کو پنجاب میل سے بھوپال پہنچا۔ اس کے ماں باپ اور پھوپی سب بیحد خوش ہوئے۔ آصف اب سترہ سال کا ہو گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیر خوب کُھل گئے تھے۔ جوانی اُس کی ہر ادا اور ہر انداز سے ٹپکی پڑتی تھی۔ مردانہ حُسن کا وہ ایک حسین مجسمہ تھا۔ مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں۔ ہر عضو نور کے سانچے میں ڈھلا تھا۔ چہرہ بھی عجیب دلکش تھا۔ اس کے ماں باپ

اس کے حسن اور اُس کی خوبی و رعنائی کو دیکھ کر اور اُسے علم و اخلاق جیسی دولت سے مالا مال دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے اور اپنے پروردگار کی اس نعمتِ غیر مترقبہ کے احسان مند اور شکر گزار تھے۔

آصف اور ناہید دونو اب جوان ہو گئے تھے اور دونو کو آپس میں بات چیت کرتے اور ایک جا بیٹھتے اُٹھتے اب شرم سی محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ اب بچپن کی بے تکلفی کا دور ختم ہو چکا تھا — ہاں جب کبھی ایسا اتفاق یکجہتی کا ان دونو کو ہوتا تو محض تعلیمی گفتگو کے سوا کوئی اور گفت و شنید ہی نہ ہوتی۔

صبح کو مس روزا آئیں اور آصف نے اُن سے ناہید کی تعلیم کے متعلق سوالات کئے۔ مس روزا نے اپنی ذہین شاگرد کی بہت تعریف کی اور کہا۔

مسٹر آصف! میں نے ایسی ذہین اور شوقین لڑکی آج تک نہیں دیکھی اور مجھے اپنی اس شاگرد پر بیحد فخر ہے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو انٹرنس میں یہ بھی تمام لڑکیوں میں آپ کی طرح اوّل آئے گی۔ فوٹوگرافی، کشیدہ کاری اور کروشیا کے کام میں بھی خوب ماہر ہے۔

آصف (فرطِ مسرت سے) مس صاحبہ۔ یہ سب آپ کی محبت اور کوشش کا نتیجہ ہے کہ ناہید جہاں نے اتنی جلد یہ سب کام سیکھ لئے۔ (ناہید جہاں سے مخاطب ہو کر) کیوں ناہید! تم نے ہمارا تو آج تک ایک بھی فوٹو نہیں لیا۔ یہ تو ہمیں خبر بھی نہ تھی کہ آپ فوٹوگرافر بھی ہیں۔ ورنہ کاہیکو ہمارے دس پانچ روپیہ علیگڈھ میں خرچ ہوتے۔

ناہید (شرمندہ سی ہو کر) بھلا بھائی جان! آپ کیوں مجھے بناتے ہیں۔ یہ سب آپ کی اور مس صاحبہ کی کوشش اور عنایتوں کا نتیجہ ہے۔ جو مجھے اتنا کچھ آ گیا ہے۔

مس روزا: — نہیں پیاری ناہید! یہ بات نہیں ہے۔ اگر تم کو شوق ہی نہ ہوتا تو پھر ہم ہزار کوششیں بھی کرتے تم کو کچھ بھی نہ آتا۔

آصف کی تعطیلات کا زمانہ ختم ہو گیا — اور اب آصف کے علیگڈھ جانے میں دو تین روز ہی باقی تھے۔ نصیرہ بیگم کی طبیعت آج کئی روز سے اچھی نہ تھی۔ ان کو بخار رہتا تھا اور کھانسی کی بھی شکایت تھی۔ ناہید اپنی ماں کی علالت سے نہایت پریشان اور اُداس تھی۔ کیونکہ ایک ماں ہی کا دم تھا جو اُس کے لئے سب کچھ تھا — اور جب کبھی اُس کی ماں کی طبیعت خراب ہوتی تھی تو ناہید تمام تمام دن اور ساری ساری رات انکی تیمارداری میں گزار دیتی اور ایک گھڑی کو بھی اپنی ماں کے پاس سے نہ ہٹتی۔ پانچوں وقت کی نماز کے بعد درگاہ مستجاب میں انکی صحت و زندگی کے لئے دعائیں مانگا کرتی — یہ ہی اس کا معمول تھا۔ نجف حسین بھی متردّد تھے اور بھوپال کے مشہور اور لائق ڈاکٹروں کو بلا کر دکھایا تھا۔ عبدالرحمان بہاری کا علاج ہو رہا تھا۔ ایک دن شام کو بخار تیز ہو گیا۔ اور بخار کی تیزی سے نصیرہ کو اختلاج و اضطراب بہت تھا۔ ناہید پاس بیٹھی ہوئی تھی اور نہایت پریشان تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ہونٹ دل کے بمثل تار کے ساتھ آہستہ آہستہ دعاؤں کے لئے ہل رہے تھے —

کبھی کبھی نظر اُٹھا کر آسمان کی جانب دیکھ لیتی۔ کہ اتنے میں ماں نے آنکھیں کھولیں اور ناامیدی کی اشک آلود آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی ـــ بیٹی ناہید! رونے اور گھبرانے کی کیا بات ہے۔ بیماری سب ہی کو ہوتی ہے۔ خدا نے چاہا تو میں جلد اچھی ہو جاؤنگی۔ تم جاؤ اور اپنے پڑھنے لکھنے میں دل لگاؤ۔ تمہاری مس رونا آتی ہونگی۔ لیکن ذرا اپنی ماموں جان کو میرے پاس بھیجتی جانا۔"

ناہید کا دل ہرگز نہ چاہتا تھا کہ وہ ماں کے پاس سے ایک لمحہ کو بھی ہٹے۔ لیکن ماں کے اصرار کو بھی وہ ٹال نہ سکتی تھی۔ اس لئے دل پر جبر کر کے اُٹھی اور ماموں کے کمرے میں جا کر انہیں اپنی ماں کے پاس بھیجا۔ اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئی جہاں اُسکی استانی منتظر تھیں۔ ادھر ناہید اپنے کمرے میں آئی۔ اُدھر آصف پھوپی کے پاس آیا۔ اور سلام کر کے مزاج دریافت کرنے لگا۔ پھوپی جان! کیسی طبیعت ہے اب آپ کی" اُس نے دریافت کیا۔

نصیرہ۔ اس وقت بخار کچھ تیز ہو گیا ہے اور طبیعت پر گھبراہٹ زیادہ ہے۔ دل بیٹھا سا جاتا ہے۔ بیٹا! تم جاؤ ذرا بھیا کو باہر سے بھیجدو۔

آصف فوراً باہر گیا اور نجف حسین کو ساتھ لئے ہوئے پھوپی کے پاس پہنچا۔ نجف حسین نے بہن کی طبیعت زیادہ خراب دیکھ کر آصف سے کہا آصف میاں! جلد موٹر لے کر جاؤ۔ اور ڈاکٹر صاحب کو اپنے ساتھ ہی لوا لاؤ"

آصف تو فوراً باہر چلا گیا اور بھائی نصیرہ کے پاس بیٹھ گئے۔

نصیرہ بھائی کی طرف دیکھ کر بولی کہ بھائی جان! موت زندگی کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ خدا جانے میں اس بیماری سے جانبر ہو سکوں یا نہیں۔ ناہید میری اکلوتی بچی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اس کی خوشی زندگی ہی میں دیکھ لیتی اور . . . . . "

زرینہ بیگم (بات کاٹ کر) "بہن! آخر خدانخواستہ اس قدر نااُمید کیوں ہو رہی ہو۔ بیماری تو سب ہی کو ہوتی ہے۔ آپ خدا نے چاہا جلد اچھی ہو جائینگی۔ پھر ناہید جہاں کی شادی اپنے ہاتھوں ہی سے کرینگی۔ ہمارا خود یہی ارمان ہے"

نصیرہ۔ بھابی جان! یہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ اگر شادی نہ ہو سکے تو کم سے کم وہ نامزد ہی ہو جائے۔ اور مجھے تو پیارے آصف کے مقابلہ میں کوئی نظر نہیں آتا۔ مجھے خود اس سے اس قدر محبت ہے کہ اس کے مقابلہ میں ناہید کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتی۔ اور مجھے اُمید ہے کہ آپ اور بھائی جان اپنی غمزدہ اور بدنصیب بہن کی اس درخواست کو ضرور منظور کرینگے"

نجف حسین۔ نصیرہ! تم کیا کہہ رہی ہو۔ اوّل تو یہ نااُمیدی ہی کیوں ہے کہ تم اچھی ہو سکو گی۔ اور پھر یہ تو ہم دونوں کے دل کی بات تم نے کہی ہے۔ ہمارے دل میں تو شروع ہی سے یہی ارمان ہے کہ ناہید ہمارے آصف کی دلہن بنے۔ ناہید ہماری آنکھوں کا تارا اور دل کی ٹھنڈک ہے۔ ہم دونو اس میں بہت خوش ہیں۔

نصیرہ بیگم۔ آپ دونو کی باتوں سے اس وقت مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے میری خواہش کو منظور کر لیا ہے۔ مجھے عجلت یہ ہے اور آپ کو خود بھی معلوم ہے کہ جلیل نے اپنے لڑکے جمیل کا پیام ناہید کو دیا ہے۔ انکا منشاء تو دراصل بھائی کی جائداد پر قبضہ کرنے کا ہے۔ بھلا میرا دل کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ ایک جاہل اور آوارہ مزاج کے ساتھ اپنی بچی کی قسمت پھوڑ دوں۔

دوسرے یہ کہ ناہید اور آصف میاں میں بچپن سے جو محبّت و اُنسیت ہے۔ وہ بھی ہماری آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اگر میں مرگئی تو جلیل احمد ضرور کوئی فساد اُٹھائینگے۔ اور خدا جانے انکی وجہ سے میری بچی کو کیا صدمہ اُٹھانا پڑے۔

زرینہ بیگم :۔ بہن ! جو آپ کی خوشی ہے اس میں ہم بھی خوش ہیں۔ اور ہم تو اسے اپنی خوش قسمتی ہی سمجھتے ہیں کہ ناہید جہاں جیسی لائق بچی ہمارے آصف کی دلہن بنے۔

ناہید جہاں پڑھنے کے بعد اپنی ماں کے پاس آرہی تھی۔ ابھی کمرے سے باہر برآمدہ ہی میں تھی کہ ماں اور مامی کی اس گفتگو کا آخری حصہ سُن لیا۔ اور جس وقت اس نے جمیل کا پیام اپنی نسبت سُنا تو وہ کانپ سی گئی۔ لیکن اُسے ماں اور مامی کے فیصلہ سے اطمینان ہوگیا۔ مگر شرم کے باعث کمرے میں نہ آسکی۔ اور اپنے کمرے ہی میں واپس لوٹ گئی۔

آصف نے آکر ڈاکٹر کے آنے کی اطلاع دی۔ نجف حسین نے فوراً پردہ کرکے اُن کو اندر بلا لیا۔ اُنہوں نے اچھی طرح مریضہ کو دیکھا اور دوائیں دے کر معمولی ہدایات کیں اور واپس ہوگئے۔

اگلے روز شام کو نصیرہ بیگم کی طبیعت کچھ بہتر تھی۔ تو انہوں نے ناہید کی تینوں سہیلیوں کو چائے پر مدعو کیا۔ گلنار اور شمیم اور مِس ایلن مائیکل۔ تینوں اس کی سہیلیاں تھیں۔ گلنار تو مولوی محمد اصغر صاحب بی اے تحصیلدار کی لڑکی تھی اور شمیم کے والد مسٹر رحم الٰہی بی اے ایل ایل بی شہر کے ایک بلند پایہ ایڈوکیٹ تھے۔ اور مس ایلن مِس روزا کی بھتیجی تھی۔ اگرچہ ناہید کسی کے یہاں آتی جاتی نہ تھی لیکن ان تینوں کو اس کی بیحد محبّت تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سب مس روزا کی شاگرد تھیں اور مس روزا ہی نے ناہید کی تعریفیں کرکر کے ان لڑکیوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اکثر یہ ہوتا کہ مس روزا کو موٹر لینے جاتا اسی میں وہ ان تینوں کو اپنے ہمراہ لے آتیں اور چاروں ایک ساتھ پڑھ جاتیں۔ اور ویسے بھی اکثر شمیم اور گلنار آتی رہتی تھیں۔ مس ایلن چونکہ اسکول میں پڑھتی تھی اس لئے اُسے فرصت کم ہوتی تھی۔ یہ چاروں لڑکیاں تقریباً ہم سِن تھیں اور ہم لیاقت۔ اور چاروں میں آپس میں حقیقی محبت تھی۔ چونکہ آج اتوار تھا۔ اسکول میں تعطیل بھی تھی۔ اس لئے تینوں سہیلیاں آگئیں۔ چاروں میں ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ لیکن ابھی تک کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ نصیرہ بیگم نے کس لئے ان لڑکیوں کو بُلوایا تھا۔

نصیرہ بیگم نے لڑکیوں کے آجانے کے بعد پہلے اپنی بھاوج سے تذکرہ کیا کہ بھابی جان ! میری تمنا ہے کہ آج ناہید کی منگنی کی رسم ہو جائے۔ کیونکہ کل آصف میاں بھی علیگڈھ چلے جائینگے ۔"

زرینہ بیگم :۔ بہن جو آپ کی خوشی ہو۔ میں تیار ہوں۔

زرینہ بیگم نے اپنے شوہر سے جاکر کہا کہ "آپا کی خوشی ہے کہ آج نامزدگی کی رسم ہو جائے۔ اگرچہ ہم دونوں کی بھی یہ ہی خواہش ہے۔ تاہم لڑکے سے بھی پوچھ لیا جائے اور ناہید کا بھی عندیہ لے لیا جائے تو اچھا ہے۔

نجف حسین :۔ ہاں بہتر اور مناسب تو یہ ہی ہے۔ تم ہی آصف کو اپنے کمرے میں بُلاکر اُس سے دریافت کرلو۔ اور ناہید کا

زرینہ - بہن دریافت کریں !
آصف حسین - نہیں ! نصیرہ نے آج ناہید کی سہیلیوں کو بُلایا ہے - اُن ہی کے ذریعہ ناہید کا عندیہ بآسانی لیا جاسکتا ہے"
چنانچہ عبداللہ کو زرینہ نے آواز دی - اور کہا کہ "آصف میاں کو باہر سے بُلالا"
آصف حسین ماں کی طلبی پر فوراً باہر سے آیا اور سیدھا ماں کے کمرے میں چلا گیا -
آصف میاں ! تمہاری پھوپی کی مرضی اور خوشی یہ ہے کہ تمہارا رشتہ ناہید جہاں سے قائم کردیا جائے - اگرچہ میں اور تمہارے ابا جان دونو اس رشتہ سے بہت خوش ہیں - لیکن پھر بھی تمہاری مرضی معلوم ہونی ضروری ہے - زرینہ نے بیٹے سے کہا -
یہ تو آصف کے دل کی بات تھی - لیکن شرم او رحیا کے باعث مُنہ سے کچھ کہہ نہ سکا - گردن جُھکی کی جُھکی ہی رہ گئی -
"خاموش کیوں ہو رہے - کل تم علیگڈھ جاؤگے - اور تمہاری پھوپی اس لیئے آج ہی یہ رسم ادا کرنا چاہتی ہیں -
اماں جان ! آپ کی خوشی - لیکن ابھی تو پھوپی جان کی خود طبیعت اچھی نہیں ہے - ادھر ابھی دو سال میری علیگڈھ کی تعلیم کو بھی باقی ہیں - اور میرا ارادہ تو ولایت جانے کا بھی ہے - جب میں تعلیم سے فارغ ہوکر کسی قابل ہو جاؤنگا - جب یہ سب کرلیجئے گا
آصف نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا -
زرینہ بولی ــــ "بیٹا تم نے تو بڑی لمبی داستان کہہ ڈالی - تمہاری پھوپی جان کی طبیعت خراب ہے جب ہی تو وہ اتنی عجلت کر رہی ہیں ــــ اور اگر تم ابھی کسی قابل نہیں ہو تو ہم جہاں لڑکے کا بوجھ اُٹھا رہے ہیں وہاں اپنی بہو کا بھی بوجھ اُٹھانے کے قابل ہیں - اور پھر ناہید کے پاس خود اتنا ہے کہ وہ کسی کی محتاج نہیں -
"خیر ! آپ کی خوشی - میں تو آپ ہی کا بیٹا ہوں" آصف نے نیچی نظریں کئے ہوئے کہا -
زرینہ بیگم بیٹے کی سعادتمندی سے نہایت خوش ہوئی اور اپنی نند اور اپنے شوہر سے جاکر آصف کی رضامندی کا اظہار کیا -
ادھر گلنار کو نصیرہ بیگم نے پہلے ہی سمجھا بجھا کر ناہید کے پاس بھیجدیا تھا کہ وہ ناہید کی مرضی معلوم کرے - گلنار نے کمرہ میں جاکر ناہید اور ناہید کی دو تو سہیلیوں کے سامنے اس کا اعلان کردیا - پھر کیا تھا - ایک دل لگی اور ایک مذاق کا سلسلہ جاری ہوگیا - ناہید اس تفریح کا اصل نشانہ تھی - لیکن ناہید نے کسی طرح کوئی جواب ہی نہ دیا - اور کسی طرح ناہید کا عندیہ جب نہ معلوم ہوسکا تو مس ایلین نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ ناہید سے کہا "ناہید تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تمہاری والدہ اور تمہارے ماموں اس قدر روشن خیال ہیں ورنہ میں نے تو یہی سُنا ہے کہ ہندوستانی لڑکے اور لڑکی کو اس کی کانوں کان خبر ہی نہیں ہوتی اور شادی ہو جاتی ہے - ناہید ! دیکھو اگر تم نے یہ موقع ہاتھ سے کھو دیا تو پھر عمر بھر پچھتاؤ گی" گلنار نے شرارت آمیز انداز میں آصف کی تصویر ناہید کی آنکھوں کے روبرو لاتے ہوئے کہا -
گلنار ! تم کو تو بس مذاق ہی ہر وقت سوجھتا ہے" شمیم نے دخل انداز ہوکر اور آصف کی تصویر گلنار کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا -
"ناہید ! یہ بے شک ایک حقیقت ہے کہ ایسے مواقع زندگی میں کم آتے ہیں اور عقلمند وہی ہے جو موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی

فکر رکھے۔ آصف جہاں حسین و جمیل ہے وہاں تعلیم یافتہ اور نہایت خوش اخلاق ہے۔ مس روزا تو اُن کی بیحد تعریف کرتی رہتی ہیں۔ اس وقت ناہید! تمہارے لئے بہتر یہ ہی ہے کہ تم اپنی مرضی کا اظہار کردو۔ ورنہ تمہاری بیمار و نحیف والدہ کو بھی رنج ہی ہوگا۔"

والدہ کی علالت اور اُن کے رنج کے خیال نے ناہید کے جذبات میں ایک تغیر پیدا کردیا اور وہ آخرکار بول اُٹھی:- "نہیں شمیم! ابتک اماں جان کی طبیعت آج کل بہت خراب ہے۔ کل شام تو بخار نہایت تیز تھا۔ اور یہ بھی اُن کی محبت ہے کہ انہوں نے میری خوشی دریافت کی۔ میں بھی تو اُن کی خوشی کی بندی ہوں۔ گلنار! اماں جان سے کہدینا کہ ناہید آپ کی بیٹی ہے۔ اور آپ کی فرمانبردار۔ میں بھی اُسی میں خوش ہوں جس میں اماں جان کی خوشی ہو۔"

گلنار اُچھل پڑی اور نصیرہ کے پاس جاکر ناہید کی مرضی کا اظہار کردیا۔ زرینہ بیگم اندر گئیں اور کپڑوں کے بکس میں سے اپنی سُرخ پھولدار جارجٹ کی ساڑی جس کے کنارے پر زری کا بے نظیر کام ہورہا تھا نکال کر لائیں اور ایک انگوٹھی سونے کی خوبصورت ساخت کی جس میں نہایت نفیس اور قیمتی ہیرا جڑا ہوا تھا ایک خوبصورت نیکلس اور ایک ناک کی لونگ جس پر زمرد کا ایک نگ جڑا ہوا تھا زیورات کے بکس میں سے نکال کر لائیں۔ شمیم اور گلنار کو بُلاکر یہ سب سامان دیا کہ ناہید کو لے جاکر پہنادیں۔ ادھر ایک نیلم جڑی ہوئی انگوٹھی اور ایک گھڑی جس کا کیس سونے کا منقش تھا اور جس میں ایک طلائی زنجیر پڑی ہوئی تھی اور کوئی ڈھائی سو روپیہ نقد نکال کر رکھے۔

ناہید کو اس کی سہیلیوں نے دُلہن بنایا۔ دُلہن بن کر اس لباس اور زیور میں حقیقت میں وہ ایک ارمنی حور نظر آرہی تھی دُلہن بناکر اُس کی سہیلیاں اُسے باہر لائیں۔ جہاں اس کے ماموں اور مامی اور والدہ تھیں۔ ناہید شرم سے گردن جُھکائے ہوئے تھی۔

بیٹی کو دیکھ کر ماں اُٹھ بیٹھی اور ناہید سے مخاطب ہوکر بولی:- "بیٹی! یہ تمہارے ماموں مامی ہیں ان کو سلام کرو۔"

ناہید نے اسی شرمیلے انداز میں سر جھکائے ہوئے دونو کو سلام کیا۔ دونو نے دعائیں دیں۔ ماموں آگے بڑھے اور رنٹو روپیہ کا توڑا ناہید کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ جو سہیلیوں نے فوراً اُچک لیا۔ ناہید کے ماموں اب باہر چلے گئے۔ تو مامی بڑھیں اور اُنہوں نے پہلے تو ناہید کو سینہ سے لگایا اور دعائیں دیں۔ پھر وہ خوبصورت گھڑی ناہید کی کلائی پر باندھ دی۔ اور بقیہ ڈیڑھ سو روپیہ بھی ناہید کے ہاتھوں میں رکھ دیئے۔ یہ بھی اُس کی سہیلیوں نے ناہید کے ہاتھوں میں سے لے لئے۔ اس کے بعد ماں نے ناہید کو گلے سے لگایا۔ اور مسرت کے آنسو نصیرہ کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ سہیلیاں ناہید کو کچھ دیر بعد اُس کے کمرے میں لوا لے گئیں۔ اور اب آصف گھر میں بلائے گئے۔ نصیرہ نے اپنے بھتیجے کو ایک خوبصورت طلائی پاکٹ واچ جو ناہید کے والد کی یادگار اب تک محفوظ تھی۔ اور جس کی زنجیر جڑاؤ جواہرات کی تھی۔ آصف کے کوٹ کی جیب میں ڈال کر زنجیر لگادی۔ اور چار گنیاں آصف کے ہاتھ پر رکھیں۔ غرضیکہ اس طرح دونو کی منگنی کی رسم ادا ہوگئی۔ رات کو کھانے پر ناہید کی سہیلیاں موجود تھیں۔ جو رہ رہ کر ناہید پر تفریح کی فقرے چُست کرتی جارہی تھیں۔ شب کو یہ سہیلیاں واپس ہوگئیں اور صبح کو نجف حسین نے اچھی قسم کی مٹھائی تیار کراکے اپنے ملنے والوں اور شہر کے شرفاء میں تقسیم کردی۔ اس طرح اس منگنی کا اعلان بھی ہوگیا۔ اور اسی شام کو مدراس میل سے آصف حسین علیگڑھ روانہ ہوگئے۔

نصیرہ بیگم کی طبیعت خراب ہوتی ہی چلی گئی۔ ایک دن اگر کچھ افاقہ ہوتا تو دوسرے دن اُس سے زیادہ بدتر حالت ہو جاتی۔ طبیعت کسی طرح اندر سے صاف نہ ہوتی تھی۔ نقاہت اور ضعف بڑھتا ہی جاتا تھا۔ نجف حسین نے کوئی دقیقہ بہن کے علاج میں نہ اٹھا رکھا۔ اور ڈاکٹروں کے مشورہ پر تبدیل آب و ہوا کے لئے نصیرہ کو لے کر کچھ دن اور منصوری بھی گئے۔ منصوری میں اگرچہ نصیرہ کو کچھ آرام ملا۔ لیکن حرارت اور کھانسی ایسی مستحکم ہو گئی تھی کہ رفتہ رفتہ اس علالت نے دق کی صورت اختیار کر لی۔ کچھ دنوں کو افاقہ ہو جاتا۔ لیکن پھر چند دن بعد وہی حالت ہو جاتی۔ غرض نصیرہ کی علالت کو اسی طرح کم و بیش دو سال ہو گئے۔

ماں کی علالت سے ناہید کا بُرا حال تھا۔ اُس کی تعلیم پر جو کچھ اثر پڑا تو پڑا۔ لیکن ماں کی تیمارداری میں دن رات جاگنے اور علالت کے باعث دن رات کی فکر میں وہ بالکل مضمحل اور دُبلی ہو گئی تھی۔ پھر انٹرنس کے امتحان میں وہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئی —— تاہم ماں کی علالت سے اس کا دل کسی خوشی میں خوش نہ ہوتا۔ ہر وقت اپنی ماں کی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگا کرتی تھی۔ اور اکثر و بیشتر روتی رہتی۔ کہ اُس کے لئے صرف ایک ماں کا ہی دم باقی تھا۔

ادھر آصف نے بی اے کا امتحان دیدیا۔ اور ناہید نے ایف اے کا۔ اگرچہ اُس نے ماں کی بیماری کے باعث کچھ زیادہ اسٹڈی نہیں کی تھی۔ تاہم دن رات میں گھنٹہ دو گھنٹہ کو کتابیں ضرور دیکھ لیا کرتی تھیں۔ دونو نتیجہ کے منتظر تھے کہ یکایک ناہید کی ماں کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی —— ناہید کی ماں پر جس دن سے علالت نے زور کیا تھا وہ برابر آصف کو یاد کیا کرتی تھی۔ چنانچہ آصف کو تار دیکر بھوپال بُلا لیا گیا۔ جس دوپہر آصف بھوپال پہنچا ہے اُس دن نصیرہ بیگم کی حالت بہت ہی زیادہ خراب تھی۔ اُنہوں نے آصف کو اس لئے بُلایا تھا کہ اپنی زندگی ہی میں ناہید کا نکاح آصف سے کر دیں اور ناہید کا ہاتھ اپنے سامنے آصف کے ہاتھ میں دیدیں۔ کیونکہ نصیرہ بیگم کو خود بھی اپنی مسلسل علالت اور اس زبون حالت سے یہ اُمید نہیں تھی کہ اب وہ کچھ دنوں اور زندہ رہ سکے گی۔

جس روز آصف علیگڈھ سے بھوپال پہنچا۔ اُسی شام کی ڈاک سے جلیل احمد کا خط نصیرہ بیگم کے نام آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ

"بھابی جان! آپ کو یاد ہو گا کہ جب میں نے جمیل میاں کا پیام ناہید جہاں کے لئے دیا تھا تو آپ نے دو سال کی قید لگائی تھی۔ اور میں نے آپ کی خوشی پر زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔ اب یہ دو سال کا زمانہ بھی گزر چکا۔ اس لئے آپ کو یہ وعدہ یاد دلاتا ہوں۔ اور اُمید ہے کہ آپ جواب باصواب سے مطلع کریں گی۔ جو ہماری آپ کی مسرتوں کا باعث ہو گا۔"

آپ کا بھائی جلیل

نصیرہ بیگم جب سے بیمار تھیں کئی خط اپنے حال کے جلیل احمد کو لکھوا چکی تھیں۔ لیکن اُنہوں نے کبھی کسی خط کا جواب نہ دیا۔ نہ خیریت دریافت کی۔ اب اس خط کو دیکھ کر انہیں بہت ہی غصہ آیا۔ اور اُنہوں نے آج علالت کی اس سختی میں خود ہی اس خط کا جواب لکھا کہ

برادرم جلیل میاں! خوش رہو!

میں تقریباً دو سال سے علیل ہوں۔ اور اپنی علالت کے کئی خط تمہیں خود بھی لکھے اور بھابی جان سے بھی لکھوائے۔ لیکن آج تک

تم نے یا جمیل میاں نے پوچھا تک نہیں۔ اگرچہ میں تمہارے روپیہ پیسہ کی بھوکی نہ تھی۔ میرے بھائی جان کو خدا انہیں ہمیشہ شاد و آباد رکھے میری اس بیماری میں روپیہ پانی کی طرح بہایا اور بہا رہے ہیں۔ لیکن موت کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکونگی۔ اور جلد ہی اپنے بچھڑے ہوئے شوہر سے جا ملونگی۔ اور اسی کی مجھے بہت خوشی ہے۔ میں ناہید کی شادی ضرور جمیل میاں کے ساتھ کرتی۔ لیکن بھلا آپ ہی بتلائیے کہ ایک پڑھی لکھی تعلیم یافتہ اور پابند دین و مذہب اور اپنے بزرگوں کی فرمانبردار بچی کو کیونکر ایک جاہل کے ساتھ وابستۂ زندگی کر دوں۔ دیکھتے بھالتے تو کسی کو جہالت کی آگ میں نہیں دھکیلا جا سکتا۔ اگر اس کی شادی جمیل میاں سے ہوتی تو مجھے قبر میں بھی چین نہ ملتا۔ میں نے اسی لئے اس کی شادی اپنے بھتیجے آصف حسین سے کر دی ہے جو ناہید کی طرح صاحب علم اور صاحبِ دین اور سعادتمند لڑکا ہے۔ اور مجھے یقین و اطمینان ہے کہ ناہید میرے بعد آصف کی دُلہن بن کر سُکھ اور چین سے اس دُنیا میں رہ سکے گی۔ الحمدللہ کہ لائق شوہر اُسے مل گیا ہے۔ اور اب میں اطمینان اور مسرّت سے جان دونگی۔ امید کہ تم میری اس صاف بیانی کو معاف کروگے تم تو خدا رکھے روپیہ والے ہو۔ ایک نہیں ہزار بہوئیں لے آؤ گے۔ لیکن میری اکلوتی بچّی اس روپیہ کی اہل نہیں تھی جمیل میاں کو دعائیں۔ فقط

تمہاری قریب المرگ بھاوج

اس خط کو روانہ کرنے کے بعد نصیرہ کی حالت اور بھی ابتر ہونے لگی تو اس نے بھائی اور بھاوج سے کہا کہ ناہید اور آصف کو بھی بُلا لیں۔ جب دونو بچّے آ گئے تو نصیرہ ایک درد بھرے انداز میں بولی:۔ بھائی جان! مجھے اب اپنی زندگی کی کوئی اُمید نہیں۔ اور یقین ہے کہ کل تک میری رُوح اس قفسِ عنصری سے ضرور پرواز کر جائے گی۔ اس لئے اب میری آخری تمنّا یہی ہے کہ ان دونو کا نکاح بھی میرے ہی سامنے ہو جائے تو میں اطمینان سے جان دوں۔"

نصیرہ بیگم کے ان درد بھرے الفاظ سے سب کے دل بھر آئے اور بے اختیار رونے لگے۔ ناہید کی حالت نہایت ابتر ہو گئی۔ روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ نجف حسین نے بمشکل اپنے دلی جذباتِ رنج و غم کو ضبط کرتے ہوئے نصیرہ کو سمجھایا کہ "نصیرہ اس قدر نا اُمید نہ ہو۔ خدا میں سب کچھ قدرت ہے۔ وہ تنکے میں جان ڈال سکتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ ایک نیا سول سرجن اندور سے آیا ہے۔ اور وہ بہت تجربہ کار اور ہوشیار ہے۔ میں ابھی اس کو بُلواتا ہوں۔ ممکن ہے کہ اُسی کے ہاتھ سے خدائے کریم تم کو شفا دے دے اور تم اچھی ہو جاؤ۔"

نصیرہ نے نحیف و کمزور آواز میں کہا: "نہیں بھائی! اب دوا کا وقت ختم ہو گیا۔ میں اپنی حالت خوب سمجھتی ہوں۔ اور میں خوش ہوں کہ اپنے بچھڑے ہوئے شوہر سے عنقریب جا ملونگی۔ ہاں اگر کچھ خیال تھا تو ناہید کا۔ کہ اس دُرِّ یتیم کے سر سے ماں کا سایۂ شفقت بھی اُٹھ جائیگا۔ لیکن پھر بھی میں اِسے تمہارے اور آصف کے ہاتھوں میں سونپ کر خوش ہوں۔ اور خدا تمہارا سب کا محافظ ہے۔"

نجف حسین کا دامنِ ضبط نصیرہ کے ان درد انگیز الفاظ پر اُس کے ہاتھوں سے چھُوٹ گیا۔ اور مُنہ پر رومال رکھ کر

وہ بھی رونے لگا۔

نصیرہ بیگم کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ لیکن وہ بھائی کو سمجھانے لگی کہ بھائی جان! یہ وقت رونے کا نہیں ہے۔ ہاں اگر بہن کی کچھ محبت ہو اور آخری سلوک کرنا چاہتے ہو تو اُٹھو جاؤ۔ قاضی کو ابھی بلاکر ان دونو کا نکاح میرے سامنے پڑھوادو۔ اور پھر میرے لئے دعائے حُسنِ خاتمہ و مغفرت کرو۔"

نجف حسین نے فوراً موٹر بھیج کر قاضی صاحب کو بُلوا لیا۔ لیکن آہ! یہ شادی بھی کیا تھی۔ ایک غم کا دیباچہ تھا اور رنج و الم کا سرورق۔ کہ ایک مرنے والی کی آرزو پوری کرنی تھی۔ شمیم اس روز ناہید کی والدہ کو دیکھنے کے لئے آئی تھی جب اس نے یہ حال دیکھا تو گلنار کو بھی بلوا بھیجا۔ قاضی صاحب کچھ دیر بعد آ گئے۔ اور مردانے میں نکاح ہو گیا۔ اب نصیرہ نے ناہید کا ہاتھ آصف کو بُلاکر اُس کے ہاتھ میں دے کر کہا "پیارے آصف! میں اپنی اکلوتی اور ناز پروردہ بچی کو تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ پیارے یہ بہت غمزدہ بچی ہے۔ اس کے سر سے باپ کا سایہ تو پہلے ہی اُٹھ چکا تھا۔ اب اس کی ماں بھی اس سے جدا ہو رہی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اس کی دلجوئی میں کسر نہ اُٹھا رکھو گے۔ اچھا آصف! وعدہ کرو کہ تم میری ناہید کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دو گے۔ بس بیٹا! یہ ہی تمہاری شفیق و عزیز پھوپی کی آخری وصیت تم سے ہے۔

آصف (روتے ہوئے۔ اور بڑے ضبط سے) پھوپی جان! یہ آپ کیا فرما رہی ہیں۔ اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں عہد کرتا ہوں کہ ناہید جہاں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھونگا۔ اور کوئی صدمہ اُس کو کبھی نہ ہونے دونگا۔ آپ اس کا قطعی غم نہ فرمائیں۔ اللہ آپ کو جلد صحت عطا فرمائے۔ اور آپ کا سایۂ شفقت ہمارے سروں پر قائم رکھے۔

آصف یہاں تک کہنے پایا تھا کہ نصیرہ کو ایک ہچکی آئی۔ اور آصف اپنی پھوپی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ نصیرہ نے پانی مانگا زرینہ نے فوراً عرق دیا۔ اور نصیرہ آصف سے کہنے لگی۔ "پیارے آصف! خوش رہو۔ مجھے اطمینان ہے اور اطمینان ہو گیا۔ (ناہید کی طرف دیکھ کر) ناہید بیٹی! میری جان سے زیادہ عزیز ناہید۔ روؤ نہیں۔ رونے سے کیا حاصل۔ تمہارے رونے سے میرا دل دُکھتا ہے۔ اور مجھے مرتے وقت تم کو روتا دیکھ کر اور تکلیف سی ہوگی۔ دیکھو میں نے تمہارا ہاتھ تمہارے قدردانوں کے ہاتھوں میں دیا ہے۔ اور انشاء اللہ تمام زندگی تم سُکھ اور چین سے بسر کر سکوگی۔ یہ تمہارے ساس سُسر نہیں۔ کہ ماں سے زیادہ مامتا رکھنے والی ساس اور باپ سے زیادہ شفقت والے سُسر ہیں۔ اور شوہر تو تمہیں ایسا لائق ملا ہے کہ دُنیا میں میری نظروں میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ خدا کا شکر کرو اور اپنی مرنے والی ماں کی مغفرت کی دُعائیں مانگو۔ دیکھو ناہید! تم سمجھدار ہو، ذی ہوش ہو اور ذی علم۔ تم اس قدر رو رہی ہو۔ ضبط کرو اور طبیعت کو سنبھالو۔ مجھے اب ہنسی خوشی میرے اس آخری سفر میں الوداع کہو۔ دیکھو۔ بیٹی ناہید! اپنے سرتاج اپنے آصف کی خوشنودی کا ہر طرح خیال رکھنا۔ اپنے ساس اور سُسر کی مرضی پر چلنا۔ تو لالوں کی لال بنی رہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے ماں باپ دونو کے شفیق ان سے شرمندہ نہ ہونے دوگی۔ اگر بہ تقاضائے بشریت کبھی کچھ شکایت کسی کو پیدا بھی

ہو جائے تو صبر و رضا کو ہاتھ سے نہ دینا اور وفاداری سے منہ نہ موڑنا۔ اچھا ناہید! میری بچی! اب تیرا خدا حافظ و ناصر ——— یہ کہہ کر نصیرہ نے اپنے دونو ہاتھ ناہید کی طرف پھیلا دیئے اور اُسے اپنے سینہ سے لگا لیا۔ اب نصیرہ کے ضبط کا بھی تار ٹوٹ گیا۔ اور وہ ناہید کو سینہ سے چمٹائے زار و قطار رونے لگی۔ ادھر ناہید کی آنکھوں سے بھی شدتِ غم میں اشک ہائے خونیں کے چشمے اُبل رہے تھے۔ ناہید۔ نازک اندام ناہید کو اب تک بھلا کہاں ایسے صدمات دیکھنے پڑے تھے۔ اُس کا نازک قلب اور دماغ اس صدمہ کی تاب نہ لا سکا اور دفورِ غم سے وہ بیہوش ہو گئی۔ زرینہ نے ناہید کو اُٹھا کر اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔ جہاں اُسکی دونو سہیلیاں اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگیں۔ ادھر نصیرہ بیگم بھی ناہید کے بیہوش ہو جانے کی ساتھ ہی ساتھ بیہوش ہو گئیں تھیں۔ بیماری نے ویسے ہی نصیرہ کو بالکل گھُلا دیا تھا۔ یہ صدمہ ہی کیا کم تھا۔ پھر بھی اُنہوں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ چند منٹ بعد نصیرہ بیگم کو ہوش آیا اور انہوں نے آنکھیں کھولیں اور پانی مانگا۔ آصف نے پانی دیا۔ پانی پی کر خود ہی آصف سے بولیں کہ بیٹا آصف! یٰسین پڑھو"

غم اور رنج کے مارے آصف کیا۔ نجف حسین اور زرینہ کے منہ سے بھی آواز تک نہیں نکلتی تھی۔ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ بہرحال بیوی کے اشارے پر آصف حسین نے یٰسین شریف پڑھنی شروع کی۔ لیکن ہر لفظ پر زبان دفورِ غم سے بلکنت کرتی تھی۔ ادھر نصیرہ نے خود بھی کلمہ کا ورد شروع کیا۔ ابھی مغرب کی اذاں نہیں ہوئی تھی کہ ہچکی کا تار لگ گیا۔ اور اذاں ہوتے ہوتے نصیرہ کی روح اِس جسدِ خاکی کو چھوڑ کر پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

آنکھیں اور منہ خود بخود بند ہو گئے۔ ہاتھ پیر سیدھے ہو گئے۔ اور آن کی آن میں گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ ناہید کی حالت جو کچھ تھی وہ ظاہر ہے۔ غش پر غش آتے تھے اور زبان سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا۔ آنسو کی جھڑی جو لگی تھی سو لگی تھی۔ غرضیکہ ہر شخص اشکبار و سوگوار تھا۔ بارہ بجتے بجتے تجہیز و تکفین سے بھی فراغت ہو گئی۔

ناہید جہاں کی حالتِ غم تو دیکھ کر سب کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس صدمہ سے اس کے قلب کو مہلک صدمہ لاحق نہ ہو جائے۔ اس لئے سب کی یہی ایک کوشش تھی کہ اس کا دل کسی طرح بہلایا جائے۔ اور اس کی دلجوئی کی جائے۔ آصف ہر وقت اُس کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ کبھی لکھنے پڑھنے کے مشاغل میں، کبھی باغ میں، کبھی قدرتی مناظر کی سیر میں غرض ہر طرح اُس کی تالیفِ قلب کرتا اور بے ثباتئ دُنیا کا عکس دُنیا کی ہر شے میں دکھا کر ماں کی رحلت کے غم کو اُس کے دل سے دُور کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔

اب ناہید کی ماں کے انتقال کو بھی دو ڈھائی ماہ ہو چکے تھے۔ آصف کی دلجوئی اور ماموں مامی کی شفقتوں نے اُس کے دل پر بہت کچھ اثر کیا تھا۔ اور ہر صدمہ کا قاعدہ ہے کہ خدا اس کا صبر جلد یا بدیر اپنے بندہ کو دے ہی دیتا ہے۔ اور انسان رفتہ رفتہ اپنی اصلی حالت پر آ ہی جاتا ہے۔ اسی طرح اب ناہید کی حالت بہت کچھ سنبھل گئی تھی۔ وہ خاموشی‘

وہ گوشہ نشینی اور سروقت کی اشکباری اب نہ تھی ۔ اب وہ ہنس بھی لیتی تھی ۔ اور ہنسی کی ایک آدھ بات خود بھی کہہ دیتی تھی اسی زمانہ میں آصف کے بی اے کے امتحان کا اور ناہید کے ایف اے کے امتحان کا نتیجہ بھی نکل آیا ۔ آصف اسبا بھی یونیورسٹی بھر میں اوّل رہا ۔ لیکن ناہید اس مرتبہ سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوئی ۔ تاہم دونو دولہا دُلہن اپنی اپنی کامیابی پر خوش تھے اور امتحان کے نتیجہ نے ناہید کی سوگواری کو ایک حد تک کم کر دیا تھا ۔ آصف کو اور نجف حسین کے جتنے ملنے والے تھے سب نے آ آکر مبارکباد دی ۔ اور آصف کے دوستوں اور اُستادوں نے مبارکباد کے تار بھیجے مقامی دوستوں نے دعوت مانگی ۔ کیونکہ آصف کی شادی ایسی ہوئی تھی کہ وہ کسی خوشی کا موقع ہی نہ تھا ۔ اس لئے نجف حسین نے اس موقع پر ایک شاندار دعوت اپنے احباب و اعزا کو دی اور سارے شہر میں شیرینی بھی تقسیم کی ۔

اس خوشی کو ایک ہفتہ ابھی نہ گزرا تھا کہ یو۔پی گورنمنٹ کے ڈائرکٹر تعلیمات کی جانب سے امتیازی وظیفہ کا حکم آیا ۔ جو ولایت کی تعلیم کے لئے آصف کے نام منظور ہوا تھا ۔ آصف نے باپ سے انگلینڈ بغرض حصول تعلیم قانون جانے کی اپنی خواہش ظاہر کی ۔ کہ میں بیرسٹری کرونگا ۔ ملازمت سے تو کچھ یہ ہی آزاد پیشہ بہتر ہے ۔

نجف حسین خود بھی بھوپال کے مشہور اور سربرآوردہ وکیل تھے ۔ اُنکی قابلیت و راستبازی کے باعث عدالتوں میں انکا بڑا اعزاز تھا ۔ کافی آمدنی تھی ۔ اور تمام عمر کی کمائی صرف ایک یہی بچہ تھا ۔ روپیہ کافی تھا اور کئی کوٹھیاں اور جائداد وغیرہ کافی خرید چکے تھے ۔ اپنے بیٹے کی یہ آرزو سُن کر وہ پہلے تو خاموش ہوئے ۔ پھر کچھ سوچ کر بولے :۔ آصف ! اب ہمارا بڑھاپا ہے ۔ اور تم اب چار پانچ سال کے لئے انگلینڈ چلے جاؤ گے ۔ اگر ہم تمہاری مہجوری میں مر گئے تو تمہارے دیدار کی بھی حسرت رہے گی اور پھر تمہاری ماں بھی اس جدائی کو کس طرح گوارا کریگی ۔

"ابّا جان ! آپ تو اپنی ذات سے اجازت دیدیجئے ۔ امّاں کو تو میں راضی کر لونگا"۔

باپ ۔ "بیٹا ۔ اگرچہ دل نہیں چاہتا کہ تم کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کروں ۔ لیکن تمہارے شوقِ علم سے دل بہت خوش ہوا ۔ میری عمر وکالت کرتے گزر گئی ۔ تم ایک اکیلے ہو جو کچھ روپیہ یا جائداد ہے سب تمہارا ہی ہے ۔ جب تمہارا دل چاہے تم شوق سے جاؤ ۔ میری اجازت ہے ۔

آصف یہ سُنکر بہت خوش ہوا اور باپ کا شکریہ ادا کر کے ماں کے پاس گیا ۔

امّاں جان ! میں آپکے پاس اس وقت ایک آرزو کے ساتھ آیا ہوں ۔ اگر آپ اُسے پورا فرماویں" آصف نے ایک خاص اور مؤثر پیرایہ میں کہا ۔

"بیٹا ! کیا بات ہے ۔ کہو ۔ تمہاری خوشی سے زیادہ مجھے اور کیا ہوگا"۔

امّاں جان ! آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ میں اب بی اے پاس ہو گیا ہوں ۔ اب میری یہ آرزو ہے کہ میں ولایت جاؤں اور بیرسٹری پاس کروں اور ابّا جان کی طرح وکالت کرنے لگوں ۔

"آصف میاں! ولایت جاؤ گے تم" گھبرا کر ماں نے کہا۔ "نہیں تم کو تو وکالت کی بھی ضرورت نہیں۔ اللہ رکھے جائداد اور گاؤں ہی کا کام اتنا ہے کہ وکالت سے زیادہ اُس میں تم کو آمدنی ہوگی۔ تم مجھے اس عمر میں یوں تنہا چھوڑ کر ولایت چلے جاؤ گے۔ اور دُلہن کا کیا حال ہوگا۔ ابھی ماں کا غم بھی اُسے تازہ ہے۔ پھر تمہاری جدائی اور اُسے رنجیدہ اور گراں گزرے گی۔ تم نے اپنے ابا جان سے بھی تو دریافت کیا ہوتا"

امّاں جان! آپ ناہید کی فکر نہ کریں، اور نہ ابا جان کی۔ آپ تو اپنی ذات سے مجھے اجازت دے دیجئے۔ مجھے تو یہی شوق ہے کہ میں کسی طرح بیرسٹری پاس کروں" آصف نے کہا۔

آصف کی ماں کے لئے عجب مشکل تھی۔ ایک طرف تو وہ اپنے چہیتے بیٹے کو بیرسٹر بنا دیکھنا خود بھی چاہتی تھی۔ اور دوسری طرف اُس کی جدائی کا بھی خیال تھا۔ کچھ دیر سوچتی رہی۔ آخر کار اُس نے اجازت دے ہی دی۔ کہ "اچھا بیٹا! تمہیں بیرسٹری پاس کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو میری طرف سے بھی اجازت ہے۔ خدا تمہارے شوق کو پورا کرے۔ اب اپنے ابا جان سے بھی تو دریافت کر لو"

"میں نے امّاں جان! پہلے ہی اُن سے اجازت لے لی ہے۔ اور اب میں اگلے ہفتہ کے جہاز سے روانہ ہو جاؤں گا سرکار سے بھی تو وظیفہ مل گیا ہے"

زرینہ کے چہرے پر بیٹے کے تعلیمی شوق سے ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی اور دل سے بیٹے کی کامیابیوں کے لئے دعائیں نکلنے لگیں۔

اب آصف کے سفر کی طیاریاں ہونے لگیں اور آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب آصف بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ نجف حسین اور آصف کے چند دوست اُس کو بمبئی تک پہنچانے گئے اور جہاز پر ان سب نے اُسے الوداع کہا کہ ۵

بہ سفر رفتنت مبارک باد   بہ سلامت روی و باز آئی

بمبئی میں مالابار ہل پر برج روڈ کے قریب ایک عالیشان کوٹھی بنی ہوئی ہے جس میں مشہور مسلمان تاجر سیٹھ جلیل احمد اور اُن کے صاحبزادے جمیل احمد رہتے ہیں۔ اس کوٹھی کے اندر باہر ایک رونق نظر آتی ہے ڈرائنگ روم میں باپ اور بیٹے دونو صوفوں پر بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے ہیں۔ کہ جمیل احمد نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! دیکھئے چچی نے بھی کیسی چال چلی۔ چچا کی ساری کمائی پہلے تو ناہید کے نام لکھ دی۔ اور اب ناہید کا نکاح بھی اپنے مرنے سے پہلے اپنے بھائی کے بیٹے سے کر دیا۔ چچی نے سوچا ہوگا کہ یوں تو چچا کی ساری کمائی میں اپنے بھائی کو نہیں دے سکتی۔ لاؤ۔ اس ترکیب سے اپنے بھائی کو مالا مال کر دوں۔ ابا جان! ان چچی کی اِس چالبازی کا کچھ تو مزا اُن کے بھائی کو چکھانا ہی چاہئے"

اب کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ ناہید کا نکاح بھی ہو چکا۔ اور جائداد املاک کی بھی لکھا پڑھی ہو چکی —— اب تم اس خیال کو چھوڑ دو۔ یہاں بمبئی میں ایک سے ایک بڑھکر خوبصورت اور روپ والی لڑکیاں موجود ہیں اور پھر تم خود روپیہ پیسہ والے ہو۔ تمہیں دلہنوں کی کیا کمی ہے ناہید میں ہی ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں" باپ نے کہا۔

ابا جان! مجھے تو بہت ہی غصہ آرہا ہے۔ اور میرا تو یہ ہی جی ہے کہ کسی طرح ناہید کو آصف سے چھڑا لایا جائے۔

نہیں جمیل! اب بیکار ہے۔ اس میں سوائے رسوائی اور بدنامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میں اس کے خلاف ہوں اور آصف تو اسی ہفتہ کے جہاز "سٹی آف پیرس" سے انگلینڈ گیا ہے۔ مجھے نجف حسین ملے تھے جو اُنہیں پہنچانے آئے تھے۔

تو پڑھنے ہی گیا ہوگا۔ دو تین سال سے کیا کم عرصہ میں واپس ہوگا" جمیل نے ایک اُمید بھرے لہجہ میں کہا "بیرسٹری پڑھنے گیا ہے۔ چار سال بعد آئیگا" جلیل احمد یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اب چلو۔ آرام کرو" "اچھا تو گویا مجھے پانچ سال انتظار کرنا پڑیگا" جمیل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

جلیل احمد ڈرائنگ روم سے نکل کر خوابگاہ میں آ گئے اور جمیل بھی جلیل احمد کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آصف کو ولایت گئے کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ مہینے ہوئے ہونگے کہ ناہید جہاں کے لڑکا پیدا ہوا۔ جو بالکل ہُو بہُو آصف کی شکل کا تھا۔ پوتہ پاکر دادا اور دادی کی خوشی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ گویا ایک دولت مل گئی۔ آصف کے ولایت چلے جانے سے جو اثر ان سب کے دلوں پر تھا وہ اس گل نورس کی شگفتگی سے دور ہو گیا۔ بحری تار کے ذریعہ آصف کو بچہ کی ولادت کی اطلاع دی گئی۔ ناہید کو بھی یک گونہ تسکین ہو گئی تھی۔ اور بچہ کے شغل میں وہ آصف کی یاد میں جو بے چینی اُسے رہتی تھی اُسے دور کر لیا کرتی تھی۔

بچہ کے دادا نے ایک نہایت قابل اور شریف خاندان نرس بچہ کے لئے ملازم رکھ دی۔ نجف حسین نے بچہ کا عقیقہ بھی بڑی دھوم دھام سے کیا۔ اور خوب دل کھول کر غرباء اور مساکین میں صدقات اور خیرات تقسیم کی۔ بچہ کا نام اُس کے حُسن و جمال کی مناسبت سے یوسف حسین رکھا گیا۔ ادھر آصف کو جب سے یوسف حسین کی ولادت کی اطلاع ملی تھی تو وہ بھی اپنے نونہال کے دیکھنے کے لئے بیتاب ہو گیا تھا۔ لیکن مجبور تھا۔ اور جس قدر اُس کو جلد ہندوستان واپس آنے کی آرزو تھی۔ اُسی قدر شوق اور مستعدی سے وہ تعلیم کی تکمیل میں مصروف تھا۔

ناہید جہاں نے ادھر یوسف حسین کے کئی فوٹو کھینچ کر آصف کو بھیج دیئے تھے اور ہر ہفتہ ایک نئی تصویر اپنے بچہ کی تیار کر کے خط کے ساتھ بھیج دیا کرتی تھی۔ جس سے آصف کو بیحد تسکین رہتی تھی۔

دن گزرتے چلے گئے۔ اور اب آصف کی واپسی کا زمانہ بھی قریب ہوتا جا رہا تھا۔ آصف بیرسٹری کے امتحان سے بھی فارغ ہو چکا تھا۔ اور اب صرف نتیجہ کا منتظر تھا۔ اُسکی واپسی میں اس لحاظ سے ایک ماہ کا اور عرصہ باقی رہ گیا تھا۔ ناہید جہاں بھی ادھر خوش

تھی اور برابر آصف کی کامیابی اور خیریت کے ساتھ واپسی کے لئے دعائیں مانگ رہی تھی ۔ آصف کے ماں باپ بھی آصف کی بخیر واپسی کے لئے ادھر مصروف دعا تھے ۔ اور برابر انتظامات جاری تھے ۔ نجف حسین کی کوٹھی نئے سرے سے سجائی جا رہی تھی ۔ تمام فرنیچر پر نیا رنگ و روغن کیا جا رہا تھا ۔ باغ کی بھی نئے سرے سے درستی ہو رہی تھی ۔ غرض ایک کارخانہ اور ایک انتظام جاری تھا ۔ یوسف بھی اب ماشاء اللہ ساڑھے تین سال کا تھا ۔ اس قدر غضب کی باتیں کرتا تھا کہ بس سُننے ہی جایئے ۔ ناہید نے اسکی زبان کھلتے ہی باتوں باتوں اور کھیل ہی کھیل میں اس کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا تھا ۔ یوسف بھی باپ کی طرح بیحد ذہین تھا ۔ جو بات ایک مرتبہ سُن لیتا وہ لوح دل پر نقش ہو جاتی ۔ ناہید نے یوسف سے کہہ رکھا تھا کہ اُس کے ابا جان ولایت گئے ہوئے ہیں ۔ بیرسٹری پاس کرنے ۔ یوسف کو آصف کی تصویریں بھی دکھا دی تھیں اور یوسف اکثر اپنے ابا جان کا ذکر بھی کیا کرتا ــــ اور اُسے معلوم تھا کہ اب اُس کے ابا جان جلد ہی آنے والے ہیں ــــ وہ کہا کرتا کہ ابا جان ہمارے لئے اچھے اچھے کھلونے اور اچھی اچھی چیزیں کیا لائینگے ۔ خود ہی جو آ جائینگے ــــ مجھے تو ابا جان کے آنے کی خوشی ہے ــــ ناہید اور اُس کے دادا دادی یوسف کو دیکھ دیکھ کر اور اُس کی باتیں سُن سُن کر باغ باغ ہو جاتے تھے ۔

جمیل احمد شام کو اپنی کوٹھی کے سامنے والے پارک میں اپنے دوست نظیر کے ساتھ مصروف گفتگو تھا ۔ دونو ٹہلتے جاتے تھے اور نہایت سرگرمی سے باتیں کر رہے تھے ۔ گویا کسی خاص مسئلہ پر یا خاص موضوع پر مشورہ ہو رہا ہے ۔

جمیل نے چاروں طرف ایک متجسانہ نظر ڈال کر کہا ۔ "یار نظیر اوہ بشیر تو اب تک نہیں آئے ۔"

آتا ہی ہوگا ــــ اس کا مزاج ہی ایسا ہے ۔ کہ وہ جس کام کا وعدہ کر لیتا ہے ۔ کر ہی کے چھوڑتا ہے ۔" نظیر نے کہا ۔

بشیر اور نظیر دونو چھٹے ہوئے بدمعاش تھے ۔ بمبئی جو ایک مکار شہر ہے ان دونو کی مختلف قسم کی بدمعاشیوں اور شرارت کے لئے اچھا خاصا میدان تھا ۔ اور پھر جمیل جیسے مالدار احباب کی ایسے بدمعاش دوستوں کی سرپرستی کے لئے بھی کمی نہ تھی ۔

اتنے میں سامنے سے ایک نوجوان جس کے چہرے سے شیطنت اور خباثت نمایاں تھی اور جو نہایت فطرتی معلوم ہوتا تھا ۔ لمبے لمبے قدم بڑھاتا ہوا ان دونو کے پاس آ پہنچا ۔

یار بشیر! بڑی عمر ہے تمہاری بھی واللہ ۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا ــــ کہو کیا کر آئے ؟ جمیل نے بشیر کی پشت پر دوستانہ انداز میں ہاتھ مارتے ہوئے کہا ۔

کیا پوچھتے ہو ۔ بس ٹھاٹ ہی ٹھاٹ ہیں ۔ تدبیر سوچ لی ہے ۔ جمیل میاں! بس نشانہ کا تیر ہے ۔" بشیر نے کچھ پھول کر اور کچھ تن کر کہا

اجی! یہ تو پہلے ہی میں ان سے کہہ چکا ہوں ۔" نظیر نے کہا ۔

ارے میاں! کچھ کہو گے بھی ــــ یہ تو معلوم ہو گیا کہ تمہاری تدبیر ایسی ویسی نہیں ۔ لیکن معلوم تو ہو کہ کیا کرنے کا ارادہ ہے اور کیا سوچا ہے ۔" جمیل نے بے تابی سے کہا ۔

"آپ کو تو بے تابی لگی ہے۔ اچھا لیجئے سُنئے۔ پرسوں جو جہاز آرہا ہے اُسی میں آصف ہے اور اُس کا دوست الگزنڈر۔ یہ جہاز یوں تو پرسوں دوپہر ہی یہاں پہنچ جاتا۔ لیکن عدن پہنچتے پہنچتے جہاز کے انجن میں کچھ خرابی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے کچھ لیٹ ہوگیا ہے۔ شام کو یا شب میں کسی وقت یہ جہاز بمبئی میں لنگر انداز ہوسکیگا۔" بشیر نے کہا۔

جمیل نے بیتابی سے کہا" تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آصف اپنے گھر بلا خوف و خطر پہنچ جائیگا۔ اور ہم دیکھتے رہ جائینگے۔"

"جمیل میاں! پہلے پوری بات تو سُن لی ہوتی۔ کل صبح کے اسٹیمر سے اپنے ایک خاص آدمی کو عدن روانہ کردیا ہے۔ کہ وہ وہاں سے ایک تار آصف کے والد کے نام اس مضمون کا دیدے کہ آصف نے جہاز میں انتقال کیا۔ اور اُسکی لاش کو جہاز کے قاعدے کے بموجب سمندر میں غرق کردیا گیا ہے ۔۔۔ یہ تار آصف کے دوست الگزنڈر کی جانب سے ہوگا۔ اس طرح یہ تار آصف کے والد کو بمبئی آنے سے پہلے ہی وصول ہوجائیگا اور وہ بمبئی آنے سے باز رہینگے۔ اور ہم تینوں ملاح کے لباس میں بندرگاہ پر اپنی اپنی کشتیوں پر مستعد رہینگے اور کوشش کرینگے کہ آصف اور الیگزنڈر کو ہم ہی اپنی کشتیوں پر لے آئیں۔ کیونکہ خوش قسمتی سے اس ہفتہ بھر کوئی جہاز پائر (ساحل؟) تک نہیں لگے گا۔ اور جہاز کے تمام مسافر کشتیوں ہی سے کنارے پہنچائے جائینگے۔ پی اینڈ او کمپنی کے سرکاری ملاحوں سے مل کر میں نے طے کرلیا ہے کہ وہ اپنی اپنی کشتیاں ہمیں دیدینگے۔" بشیر نے بیان کیا۔

جمیل اور نظیر دونو نہایت شوق سے بشیر کی تمام تدبیر اور تجویز سُنتے رہے۔ جمیل کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمایاں تھے وہ وہ بہت خوش تھا۔ خوشی میں بول اُٹھا۔" شاباش بشیر! ہاں تو پھر ہم اُن کو اپنی کشتیوں پر لاکر اُنہیں غرق کردینگے ۔۔۔ اور پھر ناہید ہماری ہی ہوجائیگی"۔۔۔

آصف! ذرا سُن تو لو ۔۔۔ ہمارے سب کے پاس کلوروفارم کی شیشیاں ہونگی ۔۔۔ بشیر نے کہا۔

"اور ہاں بشیر! یہ تو بتاؤ کہ ہم آصف کو کیسے پہچان سکینگے ۔۔۔ اور الگزنڈر کو ۔۔۔" نظیر نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

بشیر نے ذرا خشمگیں ہوکر کہا:۔ پھر وہی "دخل در معقولات" ۔۔۔ تم کو خبر بھی ہے ہم کیا کیا انتظام کرکے آیا ہوں ۔۔۔ پی اینڈ او کمپنی کے دفتر میں جہاز کے تمام مسافروں کے نام اور پتے، حُلئے اور فوٹو آچکے ہیں۔ اور اُن کے سامان پر جو شناخت کے نمبر ہیں وہ بھی درج ہیں۔ میں اُن سب کا ایک نوٹ لے آیا ہوں۔ اور اُس کی تصویر کی بھی کاپی کرالی ہے۔ لو دیکھو! بشیر نے جیب میں سے ایک نوٹ بک اور دو چھوٹے چھوٹے فوٹو نکال کر جمیل کو دکھائے ۔۔۔ اسی میں تین ہزار روپیہ صرف ہوچکا ہے ۔۔۔ بغیر پیسہ کے کوئی کام نہیں بنتا اور پیسہ ہو تو سب آسان ہے ۔۔۔"

روپیہ کی کیا پروا ہے۔ ایک تین ہزار کیا ۔۔۔ بشیر! ایسے تو تین ہزار خرچ ہوں تو پروا نہیں لیکن میں اپنی تذلیل کا انتقام ناہید سے ضرور لونگا ۔۔۔ جمیل نے بشیر کی پشت پر تھپکی دیتے ہوئے اور آصف کے فوٹو پر حقارت خیز نظر ڈالتے ہوئے کہا ۔۔۔

ہاں تو جب ہم الگزنڈر اور آصف کو کشتیوں میں سوار کریں تو غلط طور پر کشتی چلاکر پہلے کلوروفارم سے اُن کو بیہوش کریں۔ اور پھر سمندر میں دُور لے جاکر غرق کردیں ۔۔۔ تاکہ ہمیشہ کے لئے اُنکا قصہ ہی پاک ہوجائے ۔۔۔ بشیر نے کہا۔

جمیل اور نظیر دونو نے بشیر کی کارروائیوں کی بڑی داد دی۔ اور تینوں کوٹھی میں آئے۔ جہاں تینوں نے خوب شربت اور برف کے گلاس اڑائے۔

جمیل نے اپنا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا "بشیر! آصف تو اس طرح ٹھکانے لگ جائیگا لیکن پھر ناہید کس طرح تمہارے دوست کے پہلو میں لائی جاسکے گی۔"

بشیر نے جمیل پر ایک معنی خیز نظر ڈالی۔ "یہ بھی آپ ہی کے ہاتھ بات ہے۔ ایک چک ۲۵ ہزار کا اور میرے نام لکھ دیجئے ـــــ پھر دیکھ لیجئے ناہید اسی کوٹھی کی حور بنتی ہے یا نہیں ـــــ

جمیل نے اسی وقت ملازم کو اشارہ کیا اور وہ منیجر کو بُلا لایا ـــــ

منیجر:ـــ "جی جناب!"

جمیل:۔ "ایک چک پچیس ہزار کا لکھ لاؤ مسٹر بشیر احمد کے نام"

"بہتر جناب" کہہ کر منیجر دفتر میں گیا اور ایک چک ۲۵ ہزار کا لکھ کر لے آیا۔

جمیل نے وہ چک تو بشیر کے حوالہ کیا اور ایک چک پندرہ ہزار کا نظیر کے نام کا بھی منیجر سے لکھ لانے کے لئے کہا ـــــ کیونکہ جمیل نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر نظیر کو کچھ نہ دیا تو ممکن ہے اُسے بشیر سے رشک و رقابت پیدا ہو جائے ـــ حالانکہ بشیر اور نظیر دونو بدمعاشوں کی ملی بھگت تھی۔

چک پاکر بشیر دیر تک جمیل کی تعریف میں ریمارک کستا رہا۔ اور پھر بولا:ـــ

آصف کے انتقال کی اطلاع مشتہر ہو جانے کے بعد ہم دونو بھوپال جائینگے زنانہ نمائش کے زمانہ میں۔ جو نومبر کے مہینہ میں ہوگی ـــ اور اپنے ساتھ ایک دو عورتیں بھی ساتھ لے جائینگے۔ ایک تو وہی عظیماً جس کے کارنامے آپ بھی دیکھ سُن چکے ہیں ـــ اور بس زنانہ نمائش میں جب ناہید آئیگی تو اپنی موٹر جو بالکل ایسی ہی ہوگی جیسی نجف حسین کی ہے نمائش گاہ کے دروازہ پر لگا دینگے۔ اور اپنی ان عورتوں کے ذریعہ ناہید کو اُس میں سوار کرا کے اُڑا لائینگے ـــ

جمیل بشیر کی اس چالاکی اور اس تمام تدبیر سے بہت ہی خوش ہوا۔ اس وقت بھی وہ ناہید ہی کے تصوّر میں غرق تھا۔ اور اُسے یہ ہی خواب نظر آرہے تھے۔

اب بشیر نے جمیل سے کہا۔ کہ مجھے اجازت دیجئے۔ اس سلسلہ میں مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں ـــ نظیر! چلو تم بھی ذرا میرے ساتھ چلو ـــ میں تم کو ملاّحی کے لباس وہاں سے دلوا دونگا ـــ اور دیکھئے آپ بھی بالکل تیار رہئے گا یہ کہکر بشیر اُٹھ کھڑا ہوا۔

حُوروش ناہید صبح کے ناشتہ کے بعد اپنی ساس کے پاس بیٹھی۔ یوسف بھی اپنی دادی کے گھٹنے پر سر رکھے لیٹا تھا۔ اُو

دُنیا بھر کے ذہانت انگیز سوالات کئے جا رہا تھا۔ ماں اور دادی دونو اُس کے ان سوالات کے جواب دے رہی تھیں لیکن اس میں عجب تحقیق و تدقیق کا مادّہ ابھی سے موجود تھا کہ وہ بات میں بھی بات دریافت کرتا چلا جاتا تھا کہ نجف حسین بھی باہر سے آ گئے۔ اور اپنے پوتے کے سوالات کے جوابات دینے میں وہ بھی اپنی بہو اور بیوی کے شریک ہو گئے۔

یہ تینوں اپنے نونہال کی ذہانت و فراست کے لطف اُٹھا رہے تھے کہ اتنے میں عبداللہ ایک غیر ملکی تار لئے ہوئے آیا۔ نجف حسین نے رسید پر دستخط کر کے تار کھولا اور پڑھا ـــ تار پڑھتے ہی نجف حسین کے منہ سے ایک آہ نکلی ـــ اور دم بخود ہو کر رہ گئے۔ تار ہاتھ سے چھوٹ پڑا ـــ اور نجف حسین کا سر کرسی کی پُشت پر آ رہا۔ زرینہ اور ناہید دونو گھبرا گئیں۔ ناہید کی نظر گرے ہوئے تار پر پڑی ہی تھی کہ اُس کے مُنہ سے ایک درد انگیز آہ نکل گئی اور وہ بھی یک لخت بیہوش ہو گئی۔ زرینہ نہایت بدحواس تھی اور دونو کی اس حالت کو دیکھ کر بالکل دیوانہ ہو گئی تھی۔ بڑی مشکل سے حواس ٹھکانے کر کے اُس نے نجف حسین کو ہوش میں لانے کی کوشش کی ناہید کی بُوا شکورن اور ملازمہ گُل شبّو نے گلاب پاش لا کر مُنہ پر چھینٹے دیئے۔ کچھ دیر بعد نجف حسین نے آنکھیں کھولیں اور زرینہ کو دیکھ کر رقّت آمیز لہجہ میں بولے۔ آہ! میں لُٹ گیا ـــ میرا گھر اُجڑ گیا ـــ میرے گلشن کی بہار ختم ہو گئی ـــ اُف میرا یوسف یتیم ہو گیا۔

زرینہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ پیروں سے زمین نکل گئی۔ سر چکرایا اور وہ بھی جو اب تک نجف حسین کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی اس صدمہ سے بیہوش ہو گئی۔

نجف حسین نے جو زرینہ کو گرتے دیکھا تو وہ سنبھلا۔ آنسو کچھ رومال سے صاف کئے۔ کچھ ضبط کئے۔ اور اشکبار ملازموں کو بھی آہ و زاری سے منع کیا۔ سمجھایا اور زرینہ اور ناہید کو کمرے میں پہنچوایا۔ اور دونو کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں ـــ

زرینہ کو مشکل سے ہوش آیا ـــ تو نجف حسین نے سمجھایا ـــ کہ صبر کرو ـــ مقسوم میں یہ داغ لکھا تھا ـــ اُف ـــ وہ اِس عمر میں کھانا ہی پڑا ـــ اب ناہید کی خبر لو ـــ اور اِدھر یوسف کو دیکھو ـــ وہ بھی تمہیں ہمیں روتا دیکھ کر رو رہا ہے ـــ

زرینہ نے بیشک بڑے ضبط اور نہایت صبر سے کام لیا۔ آنسو دوپٹہ کے آنچل میں جذب کئے اور ناہید کی مسہری کی طرف بڑھی۔ اُس کے منہ پر کیوڑہ کے چھینٹے دیئے۔ اور اُس کے ہوش میں آنے کے بعد اُسکو اپنے سینہ سے چمٹا لیا ـــ بہت دیر تک دونو ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے روتے رہے۔ نجف حسین دونو کو تلقین صبر کرتے رہے۔ اور کبھی کبھی خود بھی بے قابو ہو کر ایک آہ بھر لیتے اور آنسو بہا کر پھر سمجھانے لگتے ـــ نجف حسین کے کہنے سُننے سے دونو ساس بہو نے نہایت ضبط سے کام لیا۔ اور آنسو صاف کئے۔ شکورن نے پانی لا کر دیا۔ پیاس سے جاتا۔ ایک ایک گھونٹ دونو نے لئے ـــ اور اب سارا گھر آصف کے غم میں ماتمکدہ نظر آتا تھا۔ سارے شہر میں آصف کے انتقال کی خبر ایک برقی لہر کی طرح دوڑ گئی ـــ اور تعزیت کرنیوالوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ سارا دن اور ساری رات ماں باپ اور دُلہن کو سوگواری میں گزری۔ اور ساری کوٹھی پر ایک غم خیز اُداسی پھیل گئی کوٹھی کا ہر ذرّہ۔ ہر دیوار ہر در آصف کے غم میں یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے۔

ناہید اور ناہید کی ساس کے دل پر جو گزر رہی تھی وہ خدا دشمن کے بھی قلب پر نہ گزارے۔ دونو خاموش تھے۔ دونوں کے

ہونٹ گویا کسی نے سی دیئے ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک جھڑی لگی ہوئی تھی جو کسی طرح بند ہی نہ ہوتی تھی۔۔۔ رات جس مصیبت سے گزری وہ گزری۔ ایک کروٹ چین نہ تھا۔ آصف کی صورت سامنے آ آ کر دونو کو رُلا رہی تھی۔ کلیجہ منہ کو آ آ کر رہ جاتا تھا۔ ناہید آصف کے غم میں ایک رات اور ایک دن ہی میں اتنی نڈھال ہو گئی تھی جیسے کوئی برسوں کا مریض ہو۔۔۔ اور یہی حال زرینہ کا تھا۔۔۔ دونو ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور دونو کا ایک دوسرے کی حالت دیکھ کر اور دل بھر آتا تھا۔۔۔ غرض اسی سوگواری اور اشکباری میں دوسرا دن اور دوسری رات بھی گزر گئی۔۔۔

آصف کے انتقال کی اطلاع موصول ہوئے آج تیسرا روز تھا۔ اور آج صبح سے نجف حسین مردانے میں مساکین و فقراء کو آصف کی روح کو ایصالِ ثواب کے لئے کھانا پکوانے کے انتظام میں منہمک تھے۔ تمام شہر کے غریبوں اور مسکینوں کا آج دونو وقت کا کھانا تھا۔ اور شام کو فاتحہ خوانی کا بھی انتظام تھا۔۔۔ نجف حسین خود بہ نفسِ نفیس ہر کام کو دیکھ رہے تھے کہ دوپہر کی ڈاک آئی۔ اُنہوں نے ڈاک ہاتھ میں لے کر یوں ہی ایک سرسری نظر لفافوں کے پتوں پر ڈالی۔ ایک لفافہ کے پتہ پر نظر جم سی گئی۔ اور سب ڈاک رکھ کر نجف حسین نے اس لفافہ کو چاک کر کے خط نکالا۔۔۔ خط میں خدا جانے کیا جادو بھرا تھا کہ ابھی نجف حسین غم اور الم کی ایک تصویر تھے کہ ابھی شگفتہ پھول بن کر رہ گئے۔۔۔ یہ خط نجف حسین کے چہیتے بیٹے آصف حسین کا تھا۔ جس میں لکھا تھا:۔

میرے پیارے ابا جان! اپنے دور اُفتادہ پیارے آصف کا سلامِ نیاز قبول فرمایئے!! آپ کو یہ معلوم ہو کر مسرت ہوگی کہ آپ کا روپیہ اور میری تمام محنت سب خدا کے فضل سے کام آئی۔ اور آج عدن میں بیرسٹری کے نتیجہ کا تار آگیا جس میں میں ہندوستانی کامیاب طلباء میں اوّل رہا ہوں۔ میں اسی جہاز سے بمبئی پہنچتا۔ لیکن عدن کی ایک علمی سوسائٹی نے مجھے اور میرے ساتھی الیگزنڈر کو نہایت اصرار کے ساتھ ٹھہرا لیا ہے۔ اور میرے اعزاز میں اس سوسائٹی نے ایک ڈنر بھی دیا ہے اور کل مجھے یہاں کے ہائی اسکول کے طلباء نے ایٹ ہوم پر مدعو کیا ہے۔ اس ایٹ ہوم کے موقع پر مجھے "ہندوستان میں علمی ترقیاں" کے موضوع پر ایک تقریر بھی کرنی ہوگی۔ میں ان علمی مشاغل اور علمی احباب کے اصرار کے باعث یہاں تین چار دن کے لئے قیام کر رہا ہوں۔ اور اس حساب سے بجائے شنبہ کے اب میں پنجشنبہ کی دوپہر کو جہاز "اینٹونیا" سے بمبئی پہنچوں گا۔ مجھے خود شرمندگی ہے کہ آپ کو اور اماں جان کو تین چار دن اور اپنے پیارے بیٹے کی واپسی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ اماں جان سے میرا سلام عرض کر دیجئے اور کہہ دیجئے کہ یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور۔ یوسف میاں کو پیار۔ قدمبوسی کا مشتاق آصف

اس خط کو لئے ہوئے خوش خوش نجف حسین ناہید کے کمرے میں پہنچے۔ غمزدہ ناہید اپنے شوہر کو بشاش آتے دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو گئی کہ آصف کے انتقال کی اطلاع کو آج تیسرا ہی روز ہے اور خود بھی اُسکی فاتحہ کے کھانے کے انتظام میں مصروف ہیں۔ پھر یہ مسرت و خوشی کا کونسا موقع ہے۔

قریب آ کر نجف حسین ناہید سے بولے۔ "ناہید بیٹی! لو آصف زندہ ہو گئے"۔۔۔ ناہید اور بھی متعجب ہوئی کہ آج

ماموں جان کیسی باتیں کر رہے ہیں — اسی حیرت و استعجاب میں ناہید کچھ کہہ نہ سکی۔ نجف حسین ناہید کے تحیر کو سمجھ گئے اور انہوں نے اس حالت کو تادیر قائم رکھنا مناسب نہ سمجھا — آصف کا خط ناہید کے سامنے کر دیا۔ ناہید نے خط لے کر پڑھا تو اُس کے چہرہ پر بھی شگفتگی پیدا ہوگئی —

نجف حسین آصف کا خط لئے ہوئے اب زرینہ کے کمرے میں پہنچے۔ زرینہ آج صبح ہی سے قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں — اس وقت بھی چوکی پر بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھیں — نجف حسین ایک کرسی کھینچ چوکی کے قریب بیٹھ گئے — زرینہ قرآن شریف بند کر کے نجف حسین سے مخاطب ہوئیں "کیا ہے"!

"ہوتا کیا — وہی آصف — ایک خوشخبری ہے — ایک مسیحا آئے ہیں۔ کہتے ہیں میری مسیحائی سے آصف زندہ ہو سکتا ہے —" نجف حسین نے کہا زرینہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور بولیں "کہیں مُردے بھی زندہ ہوئے ہیں۔ اب تو خدا مجھے بھی جلد بُلا لے۔ جو میں اپنے آصف سے جنت میں جا ملوں —" یہ کہکر پھر قرآن پاک تلاوت کے لئے کھولنے لگیں کہ نجف حسین بولے "سُنتی بھی ہو پوری بات — مُردے کب زندہ نہیں ہوتے مسیحا اگر مسیحائی کر جائیں تو بیشک زندہ ہو جاتے ہیں — اور تم دیکھ لینا کہ زندہ ہوتے ہیں یا نہیں — بولو! کیا دوگی مسیحا کو اگر وہ آصف کو زندہ کر کے تمہارے سامنے لے آئے"۔ —

"بہت دیکھ لئے ایسے مسیحا — مسیحا ہوتے تو گھر بیٹھے پُجتے — تم کیوں اور دُکھے ہوئے دل کو دُکھا رہے ہو — جاؤ فاتحہ کا انتظام کرو"۔

"تو تم چاہتی ہی نہیں کہ آصف کو دیکھو — لو دیکھو! مسیحا نے ابھی تو یہ پرچہ دیا ہے۔ اور بقیہ مسیحائی کا کرشمہ جمعہ تک دکھا دیگا"۔ آصف کا خط دیتے ہوئے نجف حسین نے کہا۔

زرینہ نے جو اب تک خود نجف حسین کی ان باتوں پر متحیر تھی۔ آصف کا خط لے کر پڑھا تو فرطِ مسرت سے آنکھوں سے اشک ہائے شادمانی نکل پڑے۔ قرآن شریف گردان کر سجدۂ شکر ادا کیا — اور اسی وقت سارے گھر میں ایک مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اب تک لوگ تعزیت کے لئے آتے رہے تھے۔ اب مبارکباد کا سلسلہ جاری ہوگیا — جو کھانا فاتحہ کا پک رہا تھا وہ اب اس خوشی میں کھلایا گیا کہ آصف صحیح و سلامت واپس آنے والے ہیں اور بیرسٹری میں کامیاب ہوگئے۔

کمرے میں تینوں ناہید اور اُسکی ساس اور سُسر بیٹھے اسی شام کی چائے پی رہے ہیں کہ نجف حسین نے دونوں کی تاریخیں اور وقت کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ تار خط کے لکھے جانے سے کچھ عرصہ پہلے دیا گیا تھا —

آخر یہ بات کیا ہوئی۔ یہ تار کس کا تھا — ؟ سمجھ میں نہیں آتا"۔ زرینہ نے کہا

"تار کسی دشمن کی شرارت ہوگی۔ اب میں کل صبح ایک تار عدن دیکر اور اطمینان کئے لیتا ہوں۔ کیونکہ آصف ابھی ہاں پرسوں تک اور قیام کریگا — چنانچہ نجف حسین نے ایک اکسپرس جوابی بحری تار عدن کے پتہ پر آصف کو دیا۔ جس کا

جواب دوسرے دن شام کو وصول ہوگیا۔ نجف حسین آصف کا تار وصول ہونے پر بمبئی کے لئے یوسف میاں کو لے کر
بیٹے کے استقبال کو روانہ ہوگئے۔

جمیل اور بشیر اور نظیر تینوں اس وقت پی اینڈ او کمپنی کے ملاحوں کی وردی میں نظر آ رہے ہیں۔ تینوں کی جیب میں
کلوروفارم کی شیشیاں ہیں۔ بشیر کی جیب میں ایک ریوالور بھی ہے۔ تینوں ملاح اپنی اپنی کشتیوں پر مستعد جہاز کے منتظر
نظر آ رہے ہیں۔ قریب میں اور بھی سینکڑوں کشتیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اور یہ سب پی اینڈ او کمپنی کی ہیں۔ جو جہاز سے
مسافروں اور اُنکا سامان اُتارنے کے واسطے بندرگاہ پر پڑی ہیں۔ کیونکہ کنارے پر ریت کے جمع ہو جانے کے باعث جو
مشینوں کے ذریعہ ہٹائی جا رہی ہے۔ جہاز بندرگاہ کے بالکل کنارے تک نہیں آ سکتا تھا۔ یہ تینوں آپس میں کچھ گفتگو
کر رہے تھے۔ اور گھڑی گھڑی اپنے چاروں طرف دیکھ لیتے تھے۔ اتنے میں جہاز پر سے سرچ لائٹ روشنی ہوئی اور
پی اینڈ او کمپنی کے دفتر ملاحی سے گھنٹی بجنی شروع ہوگئی۔ گویا ملاحوں کے لئے یہ سگنل تھا کہ جہاز رُک گیا اور وہ
مسافروں کو اُتاریں۔ ملاح اپنی اپنی کشتیاں لے کر جہاز پر دوڑ گئے۔ اور سینکڑوں چوبی زینے جہاز کے چاروں طرف لگا
دیئے گئے اور ہر طرف بڑی بڑی اور زبردست برقی روشنی کے گولے روشن ہوگئے ـــ یہ تینوں ملاح اِدھر اُدھر اپنے
شکار کی تلاش میں جہاز کے گرد چکر لگانے لگے۔ بشیر نے جہاز کے ایک طرف دیکھا کہ ایک زینہ پر دو شخص سیاہ سُوٹ
پہنے اور لبادہ ڈالے کشتی کے منتظر کھڑے ہیں۔ بشیر کی ان دونو مسافروں کی صورتیں دیکھ کر باچھیں کھِل گئیں اور ان دونو
کی سمت وہ اپنی کشتی بڑھائے چلا۔ ساتھ ہی ساتھ آواز دی "جا مولا ـــ ہے واشنا" ـــ اس آواز پر ایک کشتی اور قریب
میں آگئی ـــ بشیر نے اپنی کشتی پر ایک صاحب کو اور دوسرے ملاح نے دوسرے صاحب کو مع سامان کے بٹھا لیا ـــ
اور کنارے کی طرف بڑھنے لگے۔ بشیر کشتی چلاتا جاتا تھا اور گاتا جاتا تھا "جا مولا ـــ ہے واشنا ـــ ہے واشنا ـــ
واشنو واشو ـــ ہے واشنا"

جہاز سے کچھ دُور تک تو دونو کشتیاں ٹھیک سمت سے چلتی رہیں۔ لیکن کچھ آگے بڑھ کر ایک کشتی دوسری کشتی سے
ٹکرائی۔ اور پیچھے سے تیسری کشتی بھی آگئی جو خالی تھی اور اس تیسری کشتی کا ملاح بھی بشیر کی کشتی میں کود پڑا ـــ بشیر
نے اس ملاح کے اپنی کشتی میں کودتے ہی پلٹ کر مسافر پر حملہ کر دیا۔ لیکن مسافر خود پہلے سے چوکنا اور ہوشیار تھا
اُس نے بشیر کے حملہ کو اپنے پستول پر روک لیا۔ اور ڈانٹ کر کہا "یہ کیا حرکت"

ادھر دوسری کشتی کے ملاح نے بھی اپنے مسافر پر حملہ کر کے گرا دیا۔ اور دونو میں گُتھم گُتھا شروع ہوگئی۔ دونو
کشتیوں میں یہ ہنگامہ جاری تھا۔ اور ملاح اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح ان دونو مسافروں پر قابو پا کر اُنہیں
بیہوش کر دیں اور سمندر میں غرق کر دیں۔ لیکن ادھر دوسری کشتی پر جسے نظیر چلا رہا تھا جو مسافر تھا وہ انگلستان کا

ایک مشہور پہلوان اور ڈنگہ باز تھا۔ پہلے پہل تو وہ نظیر کے حملہ سے گر گیا۔ کیونکہ وہ ادھر متوجہ ہی نہ تھا۔ اسکے بعد جو اُس نے نظیر کی خبر لی۔ تو نظیر کے حوصلے پست ہو گئے۔ ادھر اُس کشتی پر جس میں بشیر تھا جو مسافر تھا وہ انسپکٹر جنرل جیلخانہ جات صوبہ بمبئی تھا۔ جو اتفاق سے آصف کی بالکل ہمشکل تھا۔ اس نے اپنا پستول داغ دیا۔ پستول کی آواز ہوئی تھی کہ متعدد کشتیاں اور سرچ لائٹ اس کشتی کی جانب دوڑ گئیں۔۔۔ اور آن کی آن میں پولیس کی کشتیوں نے ان کشتیوں کو گھیر لیا۔۔۔ بشیر، جمیل اور نظیر تینوں گرفتار کر لئے گئے۔۔۔ انکی جامہ تلاشی لی گئی تو کلوروفارم کی شیشیاں انکے پاس سے برآمد ہوئیں۔ دوسرے دن پولیس نے عدالت میں انکا چالان کیا۔ جس میں کئی کئی الزام ان پر عائد کئے گئے جن کی پاداش میں ان تینوں کو سات سات سال قید بامشقت کی سزائیں ملیں۔

عید کی صبح ہے۔ اور نجف حسین کے گھر میں آج دوہری عید ہو رہی ہے کہ اسی صبح پنجاب میل سے نجف حسین اپنے بیٹے آصف حسین کو بمبئی سے لے کر بھوپال آ رہے ہیں۔ نجف حسین کی کوٹھی رشکِ ارم بنی ہوئی ہے۔ کوٹھی کے گوشہ گوشہ سے خوشیوں اور مسرتوں کی کرنیں نکل رہی ہیں۔ آصف کے دوست احباب اور نجف حسین کے ملنے والے اسٹیشن پر آصف کو لینے اور نجف حسین کو مبارکباد دینے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ صبح ۱/۲ ۷ بجے پنجاب میل بھوپال پہنچا اور اسٹیشن پر آصف حسین کے دوستوں اور احباب نے آصف حسین کو سکنڈ کلاس سے اُترتے دیکھ کر تحسین و مبارکباد آفرین و مرحبا کا غلغلہ بلند کر دیا۔ "خوش آمدی" کی صداؤں سے پلیٹ فارم گونج گیا۔ اور آصف کا سینہ تمام پھولوں سے تختۂ گلزار بن گیا۔ آصف اور نجف حسین اور اُنکا پوتہ تھوڑی ہی دیر میں موٹر سے اپنی کوٹھی آ گئے۔ آصف سب سے پہلے اپنی ماں کے پاس پہنچ کر قدمبوس ہوا۔ ماں نے اُسے سینہ سے لگایا اور پچاس اشرفیاں اُس پر سے اُسی وقت نچھاور کیں۔ اس کے بعد ناہید کے کمرے میں آیا۔۔۔

چونکہ عید کا دن تھا۔ نجف حسین اور آصف عیدگاہ گئے۔ اور دوگانۂ عید ادا کیا۔ ادھر زرینہ اور ناہید نے بھی شکرانہ ادا کیا۔ عیدگاہ سے واپسی پر شام کو ایک پُرلطف گارڈن پارٹی آصف کی واپسی کے اعزاز میں ہوئی۔ جس میں بعض احباب نے دعائیہ اور تہنیتی نظمیں پڑھیں اور آصف کی کامیاب واپسی پر اسے مبارکبادیں دیں۔

آصف کو ولایت سے واپس ہوئے اب کئی دن ہو چکے ہیں کہ ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے پرچہ میں آصف کی نظر ایک جلی سُرخی پر پڑی کہ "ایک لکھ پتی کے بیٹے کو سزا"۔ "دو انگریزوں کی جان لینے کی سنسنی خیز سازش"۔ آصف کو اس قسم کی خبروں سے ایک گونہ دلچسپی تھی۔ سارا کالم اس اطلاع سے رنگا ہوا تھا۔ آصف نے جلدی جلدی پوری اطلاع پڑھی۔ اخبار دیکھتا جاتا تھا اور چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا۔ . . . . اخبار کا پورا کالم ختم کرنیکے بعد ایک سرد آہ کھینچی اور اخبار لئے ہوئے اندر آیا۔ اخبار ناہید کو دیکر اسی اطلاع کے پڑھنے کا اشارہ کیا۔ ناہید نے اس اطلاع کو جب پڑھا تو اُسے بھی رنج ہوا۔ اور اب اُس نے آصف کی اطلاع والے تار کا ذکر کیا۔۔۔ کہ کس طرح تین دن اور تین رات آصف کی سوگواری میں گزارے۔۔۔ جیتے جاگتوں کا ماتم کر لیا

گیا ــــ اب معلوم ہوا کہ یہ تار بھی ان ہی جمیل میاں کی شرارت تھی ــــ اُف! بے علمی اور جہالت کا یہ ہی نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان کو نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی ۔ بے شک ؎

علم ہی سے انسان انسان ہے ـــ نہ ہو علم تو انسان حیوان ہے

جلیل چچا کے لاکھوں روپیہ اور منوں دولت ہے تو کیا ــــ آج اُنکا بیٹا بے علم ہو کر اس گت کو پہنچا ہے تو اُنکا دل کیا اس دولت سے خوش ہو گا ــــ افسوس صد افسوس!

یوسف اب چار سال کا ہو گیا تھا۔ اور ماں کی زیر تربیت وہ اب نہایت ذی ہوش ہو گیا تھا۔ ناہید کو اب یہ فکر تھی کہ یوسف کی تعلیم کا کوئی باضابطہ انتظام کیا جائے۔ اور ایک اچھی گورنس اُس پر ملازم رکھ دی جائے۔ وہ اسی فکر میں محو تھی ــــ کہ ایکدم اُٹھی اور اپنی میز پر جا بیٹھی۔ آفس بکس کھول کر کاغذات دیکھنے لگی۔ اسی میں ایک نہایت چوڑے اور لمبے نیلے لفافہ پر اُسکی نظر پڑی جس پر اُسی کے قلم سے لکھا تھا "حسابات بنک" ناہید نے اُسی لفافہ کو اُٹھا لیا اور تمام کاغذات اور پاس بکیں جو اس میں بند تھیں نکال کر دیکھنے لگی۔ اسی میں ایک جگہ ناہید کے باپ کی کوٹھیوں اور مکانات و دوکانات کے کرایہ کا حساب تھا جو آج ۲۰-۲۱ برس سے برابر بنک میں جمع ہوتا جا رہا تھا ــــ ناہید نے پنسل سے ایک پرچہ پر اس تمام رقم کا اور اس کے منافع کا حساب لگایا تو چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہ رقم ساٹھ ہزار تو اصل تھی۔ کیونکہ سو روپیہ کوٹھیوں کا اور پچاس روپیہ دوکانوں اور مکانوں کا ماہوار پورے ۲۰ سال سے جمع ہو رہا تھا۔ اس سب رقم پر تین روپیہ سیکڑہ سالانہ سود تھا۔ جو تقریباً ڈھائی ہزار کے قریب ہوتا تھا۔ اس طرح یہ سب رقم ساڑھے باسٹھ ہزار روپیہ کے قریب تھی ــــ اب ناہید نے جائداد کے حسابات دیکھے تو ان میں سے بھی ہر ایک کی میزان کئی کئی ہزار تک پہنچتی تھی۔ ابھی ناہید حساب لگا کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ آصف کمرہ میں داخل ہوا۔ اور پوچھ بیٹھا کہ آج یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم اپنے حسابات کیوں دیکھ رہی ہو۔ یہ تو سب یوسف کے لئے یوں ہی رہنے دو ــــ تم جب تک یہاں ہو اس سے تم کو کچھ واسطہ نہیں۔"

بے شک کوئی واسطہ نہیں ــــ یہ میں بھی جانتی ہوں۔" ناہید بولی۔ لیکن میں نے نہ تو آپ کے جی جانے کی خوشی کی۔ اور نہ بخیریت اور کامیابی واپسی کی۔ اور نہ یوسف کی ولادت کی۔ اب میں ان سب مسرتوں کی ایک یادگار قائم کرنی چاہتی ہوں۔ اس لئے میں دیکھ رہی تھی کہ میرے پاس اتنا روپیہ بھی ہے یا نہیں۔"

کیا خوب! ایسی کیا خوشی ہے اور ایسی کیا یادگار۔ جو تم کو اپنے بنک کے حسابات کی جانچ پڑتال کی ضرورت پڑی!" آصف نے کہا۔ پانچ سو چھ سو روپیہ تو تمہارے کیش بکس ہی میں موجود ہے۔"

"نہیں! میں ایسی معمولی خوشی نہیں کرونگی ــــ میں دوامی خوشی کرونگی اور اس کے لئے ہزاروں اور لاکھوں روپیہ کی ہی ضرورت ہے" ــــ ناہید بولی۔

آخر بتاؤ تو ــــ میں بھی تو سنوں ــــ وہ ایسی کیا خوشی ہوگی۔"

میں ایک تعلیمی انسٹی ٹیوشن قائم کرونگی ـــــ جو یوسف ایجوکیشن ہاؤس کے نام سے ہوگی اور اس کے ساتھ ایک آصفیہ ٹیکنیکل اسکول بھی ہوگا جس میں غریب اور نادار بچوں کی اعلیٰ وادنیٰ تعلیم اور اُنکی رہائش وخوراک وغیرہ سب کا انتظام مُفت ہوگا ـــــ'' ناہید نے اپنی اسکیم کا پنسلی مسودہ جو اُس نے تیار کیا تھا ۔ دکھاتے ہوئے کہا ۔

دیکھئے یہ میری زمین ہے جو نصیرہ لاج کے سامنے اُفتادہ پڑی ہے اور اس زمین کے مشرقی پہلو میں یہ دو کوٹھیاں ہیں ـــــ ان میں سے ایک کوٹھی بالفعل درسگاہ کا کام دیگی ـــــ اور دوسری کوٹھی میں بھی درجے ہی قائم کردیئے جائینگے اور اِدھر جنوبی جانب جس قدر عمارتیں ہیں ۔ یہ بچوں کی رہائش اور مدرسین کے کوارٹرز کا کام دینگی ـــــ باقی عمارت حسب ضرورت مُلحق رہے گی ـــــ بورڈنگ کی نگرانی میں خود کرونگی ۔ اور میرا یوسف بھی اسی تعلیم گاہ میں تعلیم پائیگا ـــــ ناہید کہتی گئی ۔ آصف نے اسکیم کا بجٹ اور نقشہ جو دیکھا تو ناہید کی اس جودتِ طبع پر حیران رہ گیا ـــــ ''یہ کام تو گورنمنٹ آف انڈیا کے ایجوکیشن ممبر کے کرنے کا تھا'' ۔ ناہید! تم بھی اُس سے کسی طرح کم نہیں ـــــ سبحان اللہ! آفرین باد بریں ہمت مردانہ تو اچھا تو اتنا روپیہ تمہارے پاس ہے بھی ـــــ اکیلی اکیلی ہی یہ خوشی کر ڈالوگی ۔ مجھے بھی شریک کروگی یا نہیں ؟ آصف نے کہا ۔

جی نہیں! میرے پاس کافی روپیہ ہے ۔ یہ دیکھئے صرف کوٹھی مکانات اور دوکانات کی آمدنی کی میزان ساڑھے بارہ ہزار ہوتی ہے ۔ میری کوٹھیات کی آمدنی سالانہ مع منافع کے تین ہزار نوسے روپیہ ہوتی ہے اور میری ان انسٹی ٹیوشنوں کے مصارف اگر طلبار کی تعداد اتنی ہوگئی جتنی بجٹ میں میں نے رکھی ہے تو بھی ننلو ڈیڑھ سو روپیہ ریزرو فنڈ کے لئے بچ رہا کریگا ـــــ اس لئے آپ کرم ہی فرمائیں ۔ اپنے روپیہ کو اپنے پاس ہی رکھیں ـــــ ہاں! ماموں جان سے میری جانب سے کہہ دیجئے کہ وہ میری کچھ امداد فرماکر اس انسٹی ٹیوشن کو قائم کرادیں ـــــ ناہید نے کہا ۔

آصف نے کہا ناہید! بدل وجان! علم اور تعلیم کے لئے تمہارا آصف ہر طرح سب سے پیش پیش ہے ۔ لو کل ہی لو! میں اس کا اعلان کئے دیتا ہوں ۔ اس وقت ملک کے سینکڑوں ذہین بچے اپنے والدین کی غربت یا اپنی مفلوک الحالی کے باعث جہالت میں مبتلا ہیں ـــــ اور افلاس اُنکی بے علمیوں کے باعث دن بدن بڑھتا ہی جاتا ہے ۔ ان سب کی تعلیم کا اس طرح ٹھکانا ہوجائیگا ـــــ

چنانچہ ایک ہفتہ کے اندر بھوپال میں یہ تعلیمی انسٹی ٹیوشن قائم ہوگئی اور ملک کے گوشہ گوشہ سے غریب و نادار طلبا اس تعلیم گاہ کے لئے آنے لگے ۔ اور نہایت کامیابی سے یہ تعلیم گاہ چل نکلی ۔

اس تعلیم گاہ کو قائم ہوئے ابھی پانچ چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ مسٹر فریدوں جی سالسٹر کی ایک رجسٹری چٹھی مسز ناہید آصف حسین کے نام وصول ہوئی ـــــ ناہید جہاں نے اس چٹھی کو کھولا تو اُس میں ایک وصیت نامہ کی مصدقہ نقل تھی جو اُس کے چچا جلیل احمد نے اپنے بستر مرگ پر مسٹر فریدوں جی سالسٹر بمبئی کے سامنے دو گواہوں کے روبرو لکھوایا تھا ۔

یہ وصیت نامہ نہایت طول طویل تھا۔ جس میں جلیل احمد مرحوم نے اپنی اور خلیل احمدؔ کی برادرانہ رشتہ داری کو ظاہر کرتے ہوئے بیان کیا تھا کہ سوائے خلیل احمدؔ کے اُس کا کوئی اور رشتہ دار نہ تھا۔ اور خلیل احمد کے بھی جو خود عرصہ ہُوا انتقال کر چکا ہے۔ صرف ایک لڑکی ناہید جہاں ہے جو مسٹر آصف حسین بیرسٹر کی بیگم ہے ___ جلیل احمدؔ نے بیان کیا کہ میرے صرف ایک لڑکا تھا۔ جمیل احمدؔ جو اپنی کم علمی کے باعث بعض بدصحبت اشخاص کی بدولت ایک سنگین جرم میں ماخوذ ہو کر سزایاب ہُوا۔ اور اپنی سزا کی صعوبتیں نہ برداشت کر سکنے کے باعث ۱۲ ماہ کے اندر ہی بمبئی سنٹرل جیل میں انتقال کر گیا۔ ___ بیٹے کی سزایابی سے اوّل تو مجھ پر نہایت صدمہ تھا اور میں اس صدمہ میں ایسا بیمار پڑ گیا کہ اب اسکی موت کے بعد میری حالت اتنی ردّی ہوگئی کہ آج بسترِ مرگ پر یہ چند کلمے بمشکل بطور وصیت نامہ لکھوا رہا ہوں۔ میری اس وقت متعدد کوٹھیاں دوکانات اور مکانات ہیں اور کئی گودام ہیں اور متعدد بنکوں میں تقریباً بارہ لاکھ روپیہ نقد جمع ہے۔ ان سب کی فہرست منیجر کی مرتبہ اور میری دستخطی اس وصیت نامہ کے ساتھ شامل کرنے کے لئے موجود ہے۔ میں اپنی اس تمام جائداد اور روپیہ وغیرہ کو اپنی اکلوتی بھتیجی ناہید جہاں کو ورثہ میں دیتا ہوں۔ اس وصیت نامہ کے ساتھ مسٹر فریدوں جی کا خط بھی تھا کہ آپ خود بمبئی تشریف لاکر حساب فہمی کر لیں یا اپنا دستخطی مختار نامہ بھیجدیں ___

ناہید کو وصیت نامہ کی عبارت پڑھ کر نہایت افسوس وملال ہُوا۔ اور دیر تک وہ ان دونو باپ بیٹے کے حال پر تاسف کرتی رہی۔ اس کے بعد اپنے ماموں سے مشورہ لیا کہ کیا کیا جائے۔ نجف حسین نے کہا کہ تم اور آصف دونو خود بمبئی چلے جاؤ۔ اور سب معاملات کی تکمیل کر کے اپنا کارندہ مقرر کر آؤ۔ چنانچہ آصف اور ناہید دونو بمبئی گئے اور مسٹر فریدوں جی سے ملے۔ بنک کے تمام حسابات اپنے نام منتقل کرائے۔ سالسٹر صاحب کا محنتانہ اُن کو ادا کیا ___ اور وہاں سے آکر ناہید نے ایک اور اسکول جلیل احمد ہائی اسکول کے نام سے قائم کرا دیا۔ اس اسکول میں بھی تعلیم ورہائش اور خوراک کا مُفت انتظام تھا۔

___ جلیل احمدؔ مرحوم کے اس روپیہ سے ایک زنانہ اسکول بھی بمبئی میں قائم کیا۔ اور ایک کوٹھی غربا کی اقامت گاہ کے لئے وقف کردی۔ جس کا نام "اجنبی لوگوں کا گھر" رکھا گیا۔ اس کوٹھی میں ایک باورچی خانہ بھی رکھا گیا۔ جس میں سے ہر مذہب کے مسافروں کی مفت خوراک اور دیگر ضروریات کا انتظام تھا ___

غرض جلیل احمد کا جس قدر روپیہ تھا سب کا سب تعلیمی اور خیراتی کاموں میں لگا دیا۔ اور ایک پائی اُس میں سے نہ رہنے دی ___ کوٹھیوں کی تمام آمدنی تعلیمی کاموں کے لئے وقف کردی ___ تاکہ اس سب کے ثواب میں جمیل احمد کے تمام گناہ بخشے جاسکیں ___ اور اُس کو دوسری دُنیا (عقبےٰ) میں سُکھ اور چین نصیب ہو۔

خدا ناہید کی جیسی قسمت، ناہید کا جیسا علم اور ناہید کی جیسی شرافت وعالی ظرفی سب لڑکیوں کو عطا کرے۔ تاکہ ان ناہید جیسی علم کی متوالی دیویوں کی بدولت ہمارا ہندوستان علم اور تعلیم کے ستاروں سے جگمگا اُٹھے ___ آمین

محاصرۂ قلعۂ ارکاٹ

ڈوپلے کا مقابلہ

کلایو کی فوج کے ہندوستانی سپاہی اور گورے

(از جناب مولوی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر رام پوری)

جولیس کی فوجِ یعنی روم کی تھی جاں نثار — اس کی جانبازی تواریخِ جہاں میں یادگار

یعنی اپنے عہد میں پا نہ سکتے تھے نظیر — یہ جہاں پہنچے بڑھایا روم کا عز و وقار

تھے یونہی مشہور شاہی گارڈ بونا پارٹ کے — فخر تھے یہ فخرِ یورپ میں فرانسیسی جاں نثار

اندلس سے ماسکو تک ان کا استقلال ہے — شاہدِ صادق ہیں جس کے حملۂ دشت و کہسار

بھول سکتا ہے کوئی گارڈ اور بونا پارٹ کے — الپس تا کوہ قاف ان کی رہیں گی یادگار

یہ کہانی بھی رہیگی لیکن اے قوم آفرانس — تا بقائے نسلِ انگلستاں ہے سالم آشکار

نام تاریخیں نہ بھولینگی کبھی ارکاٹ کا — وہ کلایو اور اس کی فوج وہ قلعہ کا حصار

جب بجز چاولوں کے کوئی چیز کھانے کو نہ تھی — وہ بھی صرف اتنے کہ کھا سکتے تھے جن کو چند بار

دیکھ کر قلت رسد کی اور کثرتِ فوج کی — قائدِ لشکر کلایو ہو رہا تھا بے قرار

مضطرب افسر کو پا کر اک مسلماں جری — آگے بڑھ کر یوں ہوا گویا بہ انداز وفا

گوشت و نانِ سبک کے بل پہ ہم لڑتے نہیں — پیٹ بھر کر جنگ کرنا ہے یہ گوروں کا شعار
ان غریبوں نے کہاں دیکھی ہے صورت قحط کی — کب ہوئے برباد طغیانی سے ان کے کشت زار
یہ بھلا کیا جانیں گرمی اور لو کی سختیاں — آتش افشاں کب ہوا ان پر خورِ نصف النہار
کب نصیب ان کو ہوا تھا قربِ خطِ استوا — کب بھلا دیکھے تھے پہلے مشرقی لیل و نہار
بھوک کی سختی اٹھا سکتے ہیں یہ لڑکے کہاں — یہ فقط آرام کے ساتھی ہیں آسائش کے یار
ہمنے جھیلی ہے مصیبت قحط و خشکی کی بہت — ان مصائب اور تکلیفوں کے ہم ہیں رازدار
فقر و فاقہ سے ہمیں اکثر پڑا کرتا ہے کام — بارہا بے آب و دانہ ہم نے کی ہے کارزار
ہم ہیں جسکے دوست اس کے عیش و غم کے ہیں شریک — ہم ہیں جس کے یار اس کے رنج و راحت کے ہیں یار
تو نہ کر کچھ فکر اے سردارِ لشکر غم نہ کھا — چاولوں کی پیچ کافی ہے ہمیں اے غمگسار
اُن کو چاول دے کہ اُن کا پیٹ بھرنا ہی ضرور — ہم تو پانی پر بھی کرلیں گے گزارا چند یار
آفریں اس ہمتِ مردانہ پر اے فوجِ ہند — یہ وفاداری یہ قربانی رہے گی یادگار
سُن لے اے برطانیہ یہ قصۂ ایثارِ نفس — تیرے فرزندوں کو لازم ہے کہ رکھیں برقرار
داستان و قصۂ جانبازی افواجِ ہند — مخلصانِ قوم مردانِ وغا و کارزار
مدح گائیں مل کے اُن کی تیرے سب نغمہ سرا — ناظموں کی نظم میں اُن کا ہو ذکر آبدار
کیا مبارک کیا شریف النسل تھی یہ فوجِ ہند — خوش نصیب اُن کے جنہیں ملجائیں ایسے جاں نثار
تھی یہی وہ فوج جس نے اپنی جانبازی سے آج — کردیا دنیا میں قائم تیرا یہ قومی وقار

یہ سلف جن کے خلف ہوں اُنکے اے برطانیہ — تیری نظروں میں حقیر و مبتذل بے اعتبار
اور دنیا میں کہاں ہیں ایسے بے دامون غلام — ایسے کم قیمت سپاہی مفت کے خدمتگذار

ہم ترے ہر رنج و راحت کے شریک حال ہیں
بے صلہ بے مزد بے اجرت ہیں تیرے غمگسار

ہم تو تیرے واسطے اک موم کی سی ناک ہیں
پھر گئے تو نے جدھر پھیرا بشکل راہوار

ہم نے شک کی آنکھ سے تجھکو کبھی دیکھا نہیں
تیرے فرزندوں نے لیکن کر دیا کچھ ہوشیار

تو ہی کہدے فیصلہ قانون قدرت کا ہے کیا
جب وفاداروں کو سمجھیگا کوئی بے اعتبار

قدرتی انجام کیا اس اختلاف حال کا
آخرش کوئی ہمارا بھی تو ہے پروردگار

ہم کو امیدیں بہت ہیں تجھ سے اے یار قدیم
تو گل امید کو بننے نہ دیگی نوک خار

اپنی دولت کو تکبر سے الگ رکھ اے عزیز
دولت و نخوت میں باہم ہے عداوت آشکار

یہ گلے فریاد کی حد تک نہ جانا چاہئیں
ہے یہ نادانی گل تر کو بنائے کوئی خار

تو ہمارے درد دل کی تہہ کو پہنچے گی ضرور
ہم ہیں اے برطانیہ تیرے رفیق و جاں نثار

افسانۂ الست

(از جناب علامہ منظور حسین خاں صاحب مضطر شاہجہان پوری۔ فاضل السنۂ شرقیہ)

ہر "گل" مری نظر میں ہے "پیمانۂ" الست
"یہ گلشن جہاں" ہے کہ "میخانہ" الست

دل ہے رہینِ غمزۂ ترکانۂ الست
"راحت اثر" ہے دشنۂ جانانۂ الست

ہر "لو" پہ شمعِ حُسنِ جہاں کی ہو انثار
کیا جانے کس خیال میں "پروانۂ الست"

زاہد! خیالِ کوثر و تسنیم تا کجا
"کیف آفریں" ہے مشربِ رندانۂ الست

اللہ رے کیفِ حسنِ ازل باغِ دہر میں
ہر "برگ" کی زباں پہ ہے "افسانۂ الست"

میں ہر "نوائے ساز" کو سمجھا "سکونِ روح"
"گوش آشنا" ہے نغمۂ مستانۂ الست

سمجھا ہے "بوئے گل" کو بھی تمہیدِ بیخودی
یعنی "جنوں سرشت" ہے "فرزانۂ" الست

دل کیا ہے؟ جلوہ گاہِ تجلیٔ حسنِ یار
"پیشِ نظر" ہے جلوۂ مستانۂ الست

اے حسن! تیرے جلوۂ رعنا کو دیکھ کر
چھوٹا ہے "مُرغِ روح" سے کاشانۂ الست

وہ "جنتِ نظر" وہ مقامِ سکونِ دل
اب پائے کس جگہ کوئی دیوانۂ الست

پیمانِ حُسن و عشق ہے مضطر جنوں فزا
دنیائے امتیاز ہے نذرانۂ الست

(مضطر شاہجہانپوری)

ڈاکٹر سعید بریلوی

الٰہی تیری پناہ! ہوٹل کیا ہے اچھا خاصہ ایک غدار شہر ہے۔ غضب خدا کا سینکڑوں زینے۔ ہزاروں کمرے۔ اور پھر سب ایک سے۔ سرِ مو فرق نہیں۔ ویسا ہی دروازہ، ویسے ہی کواڑ، ہو بہو ویسی ہی دیواریں۔ بالکل اسی شکل کے راستے۔ اچھی خاصی بھول بھلیاں بنا دی ہیں۔"

مولوی عبدالسبحان نے بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں زینے کی آخری سیڑھی ختم کرنے کے بعد عصا پر بوجھ دے کر کہا۔ سیڑھیوں پر چڑھنے سے ان کا دم پھول گیا تھا اور وہ بہت بری طرح ہانپ رہے تھے۔ حدِ اعتدال سے تجاوز کر جانے والا گنبد نما پیٹ اگرچہ اس سے پہلے بھی اکثر موقعوں پر تکلیف دہ ثابت ہو چکا تھا لیکن آج تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ سچ مچ اسے کوس رہے تھے۔

مولوی عبدالسبحان کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ اور اگر ان کے غیر معمولی طور پر بلند و فربہ پیٹ سے قطع نظر کر لیں تو ان کے قویٰ بہت کافی اچھے تھے۔ نکاح کے معاملے میں حد شرعی کی تکمیل کئے ہوئے انہیں ابھی صرف تین سال ہوئے تھے، اور اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ مولوی صاحب کو اپنی اس چھوٹی اور چوتھی بیوی سے بدرجۂ غایت محبت تھی۔ اس حد تک کہ وہ عدل و انصاف کی شرط کو بھی بھول گئے تھے یا بالقصد بھلا چکے تھے۔

مولوی عبدالسبحان صوبۂ بنگال کے ضلع میمن سنگھ کے رہنے والے تھے اور ایک عرصہ دراز سے وہیں کے ایک بڑے زمیندار کے ہاں ان کے لڑکے کی تعلیم و تربیت پر ملازم تھے۔ زین العابدین ایک بہت ہی سعادتمند اور فرمانبردار لڑکا تھا۔ اور اب اس کی عمر اگرچہ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی پھر بھی انتہائی صبر اور کامل خموشی کے ساتھ رہا۔ مولوی صاحب کی قمچیوں کو صبر اور کامل خاموشی کے ساتھ برداشت کیا کرتا تھا۔ قمچیاں بالعموم شہتوت کی ہوتی تھیں اور مولوی صاحب اس بات کا بڑا اہتمام رکھتے تھے کہ ہر روز ایک تازہ قمچی اپنے بست سالہ زاجس کے چاقو سے کاٹ کر لائیں اور پھر آہستہ آہستہ بڑے تکلف سے اس کے پتے اور شاخیں ایک ایک کر کے اس طرح الگ کریں کہ جیسے افیونی گنڈیریاں چھیلتے ہیں۔

"حضور کا کمرہ یہی ہے۔ اگر اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو حضور فرما دیں۔" ہوٹل کے خدمتگار نے بہت ادب کے ساتھ کمرہ کا دروازہ کھول کر اور مولوی عبدالسبحان کو اس میں پہنچا کر کہا۔

مولوی صاحب سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے بیدم ہو گئے تھے۔ بے اختیار ایک آرام کرسی پر گر پڑے اور جواب دینے سے قبل کئی منٹ تک سانس درست ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ پھر اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں مخصوص بنگالی لہجہ کے ساتھ کہ جس میں حلق کی گولائی کی وجہ سے زبر کی حرکت بھی کچھ گول سی ہو جاتی ہے کہنے لگے۔

"ہوام گسل کریگا گوارم پانی ملنے سواکتا ہے؟" (ہم غسل کرینگے گرم پانی مل سکتا ہے؟)

"جی ہاں حضور پانی تیار ہے حضور کے کمرے سے پانچواں کمرہ غسلخانہ ہے"۔ خدمتگار نے ہنسی کو ضبط کر کے جواب دیا۔

"او اچھا بات ہوام کوال سبیرے کھُوب سونا مانگتا ہوں ہوام کو کوئی نہیں جوا گانا ہوگا" (اچھی بات ہم کل سویرے خُوب سونا چاہتے ہیں ہم کو کوئی نہیں جگائیگا)

"بہت اچھا حضور" کہہ کر خدمتگار نے دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔

مولوی عبدالسبحان روزانہ غسل کرنے کے عادی تھے اور یہ معلوم کرکے کہ گرم پانی تیار ہے انہیں مسرت ہوئی۔ بہ مشکل کرسی سے اُٹھے اور اپنے سامان میں سے تہمد صابون اور تولیہ نکالکر اور ایک قمیض اور پاجامے کے علاوہ باقی جو کپڑے پہنے تھے انہیں پلنگ پر ڈال کر لٹکتے ہوئے ازار بند کو اُٹھا کر نیفے میں اڑستے ہوئے کمرے سے باہر نکلے اور غسل خانے میں داخل ہو گئے۔

پانی کی ہلکی ہلکی گرمی تھکے ہوئے بدن کے لئے بہت ہی خوشگوار اور تازگی بخش ثابت ہوئی۔ افسردگی اور اضمحلال کی علامتیں چہرے سے دُور ہو گئیں اور مولوی صاحب کے دل میں ایک آرام دہ گھر کی پُرمسرت یاد جاگزیں ہو گئی۔ چھوٹی بیوی کا حسین اور دلکش چہرہ اس کی بھولی بھولی باتیں اور اٹھو بیٹھے کا مذاق زین العابدین کی خدمتگزاری اور اطاعت شعاری، شہتوت کا درخت، اس کی قمچیاں اور پھر ان قمچیوں کا آزادانہ اور بے دریغانہ استعمال غرضکہ تمام باتیں ایک ایک کرکے یاد آتی گئیں اور مولوی عبدالسبحان ان خیالات میں ایسے محو ہوئے کہ کچھ عرصہ کے لئے وُہ یہ بھی بھول گئے کہ وُہ کہاں تھے۔ وقت بہت ہی تیزی سے گزرتا چلا گیا اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وُہ ایک بہت ہی لمبا سانس لے کر اپنی اس خیالی سیر سے چونکے۔ جلدی جلدی تولیا سے بدن پونچھا تہمد باندھا قمیض پہنی اور اپنی سب چیزیں لیکر غسلخانے سے نکلے۔

ایک دو تین چار پانچ ــــ باقاعدہ کمروں کے دروازے گنتے ہوئے وُہ واپس آئے۔ دروازے کی چٹخنی کا لٹو پھر سے گھما کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر کچھ ایسے زور سے دروازہ بند کیا کہ اندر کے رُخ چٹخنی کا جو لٹو تھا وُہ نکلکر گر پڑا۔

ایک اطمینان بے پروائی کے ساتھ وُہ آگے بڑھے اور ٹٹول کو بجلی کا بٹن دبایا۔ کمرہ میں ایک دم روشنی پھیل گئی اور اب اُنہوں نے دیکھا ــــ

ہائیں! یہ کیا تماشا ہے؟ میرے بستر پر یہ کون سو رہا ہے؟ ہوٹل کے لوگ بڑے بدتمیز ہیں آخر اس کے کیا معنے ہیں کہ

انہوں نے میرا کمرہ کسی دوسرے مسافر کو دیدیا۔

لاحول ولاقوۃ الاباللہ! یہ خدمتگار اس قابل ہے کہ اسے سخت سزا دی جائے۔ ابھی ابھی وہ مجھے اس کمرے میں پہنچا کر گیا اور اتنی جلدی بھول گیا کہ یہ کمرہ خالی نہیں ہے۔"

گھنٹی بجانے کے لئے ہاتھ اٹھا ہی تھا کہ یکایک اُن کی نظر کمرے کے سامان پر پڑی۔

"میرا سامان کہاں چلا گیا؟ یہ کپڑے تو زنانے معلوم ہوتے ہیں ـــ الٰہی تیری پناہ! پلنگ پر تو کوئی عورت سو رہی ہے ..... توبہ توبہ! اب کیا ہو؟ میرا تو سامان اس کمرے میں ہے ہی نہیں۔ غلط کمرہ! لیکن مجھے خوب یاد ہے میں نے گن کر پانچواں دروازہ کھولا تھا۔ یہ غلطی کیسے ہو گئی۔ یہ کمرہ میرا نہیں ہے۔ بڑی خیریت ہوئی کہ اس عورت کی آنکھ نہ کھلی۔ سفر کی تھکی ماری ہو گی جبھی تو ایسی بے خبر سو رہی ہے۔"

آہستہ آہستہ دبے پاؤں مولوی عبدالسبحان واپس دروازے کے قریب پہنچے۔ لیکن دروازہ کھولنے کا بظاہر کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لٹو اُن کے پاؤں کے پاس زمین پر پڑا تھا۔

انہوں نے جھک کر لٹو اٹھایا۔ وہ اس کیل میں سے نکل گیا تھا جس کا تعلق چٹخنی سے ہوتا ہے۔ گھبراہٹ میں جلدی سے لٹو کو کیل میں ڈالنے کی کوشش کی، لیکن خدا جانے کیوں اس قسم کے موقعوں پر اکثر ایسا ہی ہوا کرتا ہے کہ کوئی کام ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیل اپنے سوراخ میں بیٹھنے کی بجائے مولوی صاحب کے ہاتھ کے زور سے کسی قدر اندر کو دب گئی اور اب لٹو کسی طرح اس کی نوک تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ بار بار کبھی اس رُخ سے اور کبھی اُس رُخ سے وہ لٹو کو کیل کی سیدھ میں رکھتے۔ مختلف طریقوں سے اسے دباتے مگر وہ کسی طرح گرفت میں نہ آتی تھی۔

"یہ انگریزی چیز ہے کمبخت سب ایسی ہی تکلیف دہ ہوتی ہیں مجھے اسی لئے ان سے نفرت ہے۔ کیسی مصیبت آئی! اب یہ دروازہ کیسے کھلیگا۔ کہیں اس کمبخت کی آنکھ نہ کھل جائے۔ شب خوابی کے لباس میں میرا ایک عورت کے کمرہ میں موجود ہونا ـــ لاحول ولاقوۃ! لوگ کیا خیال کرینگے ـــ ڈکیتی کا مقدمہ بھی تو قایم ہو سکتا ہے۔ یا اللہ تیری پناہ! گھنٹی بجا کر خدمتگار کو بلاؤں ـــ لیکن اب تو مجھے غسل خانے سے نکلے بڑی دیر ہو گئی۔ اگر فوراً ہی اسے بلا لیتا تب تو یہ عذر سمجھ میں آسکتا تھا کہ میں غلطی سے اس کمرے میں بند ہو گیا ہوں۔ اتنی دیر کے بعد اسے بلانا تو یقیناً شبہ کی نظروں سے دیکھا جائیگا۔

یہ مجھ سے کیسی حماقت ہو گئی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں۔ پردیس کا معاملہ نہ کوئی جان نہ پہچان ـــ بھلا یہاں کون میرا یقین کریگا۔ میرے اس بیان پر کہ میں محض اتفاقیہ طور پر غلط کمرے میں داخل ہو گیا اور محض اتفاقیہ ہی طور پر چٹخنی گھمانے کا لٹو دروازہ بند ہو جانے کے بعد ٹوٹ کر گر پڑا کسے یقین آئیگا۔ آخر اتنے اتفاقات مجھ کو کیوں پیش آئے اور پھر وہ کمرہ ایک عورت ہی کا کیوں تھا کہ جس میں غلطی سے داخل ہو گیا .... توبہ توبہ! دروازہ

کھلنے کی کوئی صورت تو نکلنی چاہئے۔ میری جیب میں چاقو تھا . . . . . مگر میرے کپڑے یہاں کہاں ہیں۔ لاحول ولاقوۃ . . . . الٰہی خیر۔ اس عورت نے کروٹ لی کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔ نہیں مجھے شک ہوا تھا۔ وہ تو بہت ہی غافل پڑی سو رہی ہے۔ اب کیا کروں اسی کمبخت کو جگاؤں ہوش آتے ہی چیخ مارے گی۔ ایک عورت کی چیخ سنکر سارا ہوٹل یہیں جمع ہو جائیگا۔ نا بھائی یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ لیکن آخر اب میں یہاں سے کیسے نکلوں . . . . . .

گھبراہٹ اور بدحواسی کے عالم میں مولوی عبدالسبحان پھر ایک مرتبہ لٹو لے کر اس امید میں دروازے کی طرف گئے کہ شائد کسی طرح وہ چٹخنی میں اٹک جائے اور دروازہ کھل سکے۔ لیکن مسلسل دس بارہ منٹ کی تکلیف دہ کوشش کے بعد انہیں پھر ناکام لوٹنا پڑا۔ . . . . .

یہ عورت ہے کون؟ بہت ہی حسین معلوم ہوتی ہے۔ بالکل نوجوان ہے۔ یا اللہ اب میرا کیا حشر ہوگا۔ اس عورت کے ساتھ اس لباس میں جب میں پکڑا جاؤنگا تو دنیا کیا کہیگی . . . . . بیہن سگھ میں جب یہ خبر پہنچیگی . . . . . . لاحول ولاقوۃ! کل زین العابدین بھی تو یہاں آجائیگا۔ اب تو کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ یہ واقعہ پوشیدہ رہ سکے بیں تو اس عورت کو جگاتا ہوں۔ اب جو کچھ بھی ہو اسے جس طرح بھی ہوسکیگا سمجھاؤنگا۔ کہ یہ محض ایک اتفاقی غلطی ہے۔ مگر وہ تو ہوش میں آتے ہی چیخیگی۔ سمجھنا سمجھانا تو سب بعد کی باتیں ہیں . . . . . . نہیں جگانا تو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس سے تو گھنٹی بجا کر خدمتگار ہی کو بلا لینا زیادہ اچھا ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہوگا کہ اس طرح کمرے میں بند ہوتے ہی اسے کیوں نہ بلایا۔ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کسی طرح اگر کوئی جگہ ایسی مل جاتی کہ جہاں میں صبح تک چھپا بیٹھا رہتا تو یہ ممکن تھا کہ صبح کو جب یہ عورت اٹھتی اور خدمتگار کو بلا کر دروازہ کھلواتی تو موقع پاکر میں بھی نکل جاتا۔ کہاں چھپوں؟ کرسی کے نیچے تو چھپنا ناممکن ہے۔ میز کے نیچے بیٹھنا بھی بیکار ہے۔ الماری کے اندر یہ بڑھا ہوا پیٹ نہ گھسنے دیگا اور اگر کسی طرح گھس بھی سکتا تب بھی ایسا کرنا مناسب نہ تھا کیونکہ صبح کو ممکن ہے کہ کسی ضرورت سے وہ پہلے الماری ہی کھولے . . . . . یہی ٹھیک ہے۔ مسہری کے نیچے . . . . . کافی اونچی ہے۔ ایک آدمی اچھی طرح لیٹ سکتا ہے۔ چادر کی جھالر بھی قریب قریب زمین تک لٹک رہی ہے۔ تاوقتیکہ کوئی جھانک کر قصداً ہی نہ دیکھے میں نظر نہ آسکونگا . . . . . بس اس کے سوا اب اور کوئی صورت نہیں نکل سکتی۔ صبح تک اس مسہری کے نیچے پڑا رہوں اور صبح کو جب دروازہ کھلے تو موقع پاکر نکل جاؤں . . .

بہت ہی آہستہ آہستہ مولوی عبدالسبحان نے زمین پر چت لیٹ کر مسہری کے نیچے گھسنا شروع کیا اور بہزار دقت و خرابی اس مہم میں کامیاب ہوگئے۔ اب یہ خدا جانے کہ زمین کی سردی کا اثر تھا یا مسہری کے نیچے کی بند اور گھٹی ہوئی ہوا کا کہ ابھی انہیں اس نئی آرامگاہ میں مشکل سے پانچ منٹ گذرے ہونگے کہ کھانسی اٹھتی معلوم ہوئی۔ اب کیا ہو۔ کھانسی کی آواز سے ناممکن ہے کہ سونے والی کی آنکھ نہ کھل جائے۔ جوانی کی نیند بہت غافل ہوتی ہے۔

لیکن اب ایسا بھی کیا ہوگا کہ بالکل پلنگ کے نیچے کوئی کھانسے اور پھر بھی وہ ہوشیار نہ ہو مُنہ زور سے بھینچ لینے اور اوپر سے ہاتھ رکھ لینے کے باوجود کھانسی رُکتی معلوم نہیں ہوتی یا اللہ اب کیا ہوگا! اس مقام پر پکڑا جاتا تو اور بھی زیادہ خطرناک ہے ۔ اونہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہوں ۔ ۔ ۔ ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے کسی طرح کمبخت نہیں رُکتی یہاں سے بھاگنا چاہئے ۔ یہ جگہ تو کسی طرح بھی مناسب نہیں ۔ یہ کمبخت پیٹ کیسا بلائے جان بن گیا ہے ۔ دُبلا پتلا آدمی ہو تو کہیں بھی چھپ رہے کم سے کم جگہ میں آسانی سے حرکت کر سکے کسی ہوقت کے بغیر چارپائی کے نیچے گھس جائے اور نکل آئے ۔ میرے لئے تو یہ بھی ایک مصیبت ہے ۔ اب دب دبا کر اور سکڑ سکڑا کر کسی طرح یہاں گھس آیا تھا تو اب نکلنا دشوار ہے ۔ الٰہی توبہ! مسہری کی پٹیاں یہ کمبخت بڑھئی گول کیوں نہیں رکھا کرتے ۔ اس مسہری کی پٹیوں کے کنارے تو کچھ بہت ہی زیادہ دھاردار ہیں ۔ کسی طرح یہ پیٹ باہر کو نکل جاتا تو پھر باقی جسم کا نکلنا تو اتنا دشوار نہیں ۔ پیٹ دبنے سے کھانسی کی ضرورت بھی کچھ زیادہ ہوتی معلوم ہو رہی ہے ۔ خدا کی پناہ! مسہریاں اگر ذرا اس سے اونچی ہُوا کریں ۔ تو کیا حرج ہے ؟"

بہزار خرابی و دشواری مولوی عبدالسبحان اس شکنجہ سے برآمد ہوئے اور اطمینان سے ایک لمبا سانس لیا لیکن اب پھر وہی مصیبت سامنے تھی کمرہ کا دروازہ اس طرح بند تھا چٹخنی کی کیل بدستور اندر گھسی ہوئی تھی اور اس کا لٹو حسب سابق زمین پر پڑا ہُوا تھا ۔ عبدالسبحان نے عالم مایوسی میں لٹو اُٹھایا اور ایک مرتبہ پھر اسی پچاس مرتبہ کی آزمائی ہوئی تدبیر سے اسے کیل میں لگانا چاہا اور ایک مرتبہ پھر مایوس ہو کر اس کوشش سے ہاتھ اُٹھا لیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اپنی انگلی اس سوراخ میں ڈالنی چاہی کہ شاید کسی طرح کیل گرفت میں آجائے ۔ لیکن پھر اسی دردناک احساس سے سابقہ پڑا کہ انگلی بہت موٹی تھی اور کسی طرح اس سوراخ میں نہ گھس سکتی تھی ۔

پھر ایک مرتبہ وہ مایوس ہو کر کھڑے ہو گئے اور سوچنے لگے " یہ کمبخت اگر کوئی مرد ہوتا تو چنداں حرج نہ تھا مصیبت تو یہ ہے کہ وہ عورت ہے اور عورت بھی حسین اور نوجوان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُن کی نگاہ اس سونے والی کی طرف گئی اور انہیں ایسا معلوم ہوا کہ اس کی پلکیں اُوپر کو اُٹھ رہی ہیں " ارے غضب ہو گیا ۔ شاید وہ جاگ گئی ۔ اب کیا ہو ۔ اس سے تو مسہری کے نیچے ہی چھپا رہنا بہتر تھا " سانس بہت تیزی سے آنے لگا آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا ۔ دماغ میں کچھ سوچنے کی طاقت نہ رہی اور وہ گھبرا کر جلدی جلدی آیتہ الکرسی پڑھنے لگے ۔ ایک ہی آیت پڑھی تھی کہ آگے کچھ یاد نہ آیا مجبوراً اسے چھوڑ کر "جل تو جلال تو قدرت سے کمال تو ۔ آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد شروع کر دیا ۔ اس میں دو ایک منٹ گزرے اور سونے والی کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی تو اُنہوں نے ہمت کر کے اس کی طرف ذرا غور سے دیکھا آنکھیں بالکل بند تھیں " یا اللہ تیرا شکر ہے " کہ کر انہوں نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور " لاحول ولا قوۃ الا باللہ " کہکر کسی قدر اطمینان کے ساتھ ایک لمبا سانس لیا ۔

"عورت بہت ہی حسین ہے" غور سے دیکھنے کے بعد انہوں نے خیال کیا اور اب کسی قدر آگے بڑھ کر قریب سے اُسے پھر دیکھنے لگے۔

ایں! یا اللہ! اس کا سانس تو . . . . . کیا سچ مچ . . . . . (نبض پر ہاتھ رکھکر) اسے اب میں کیا کروں! ارے میں تو تباہ ہوگیا! ہائے ہائے! (پھر غور سے نبض دیکھ کر) بالکل مُردہ ہے۔ بدن بھی تو ٹھنڈا ہو چکا۔ اے میرے اللہ! اب اب کون یقین کریگا کہ اسے میں نے قتل . . . . . . قتل! خُدایا تیری پناہ! مولا بخش کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی (خوف سے آنکھیں بند کر کے) ارے کیا اب مجھے پھانسی ہوگی؟ یہاں پردیس میں کتّے کی موت مرنا پڑیگا (سر چکرانے لگا مسہری کا پایہ پکڑ کر بمشکل گرنے سے بچے اور وہیں زمین پر بیٹھ کر رونے لگے)

خُدا جانے کس منحوس ساعت میں گھر سے قدم نکالا تھا۔ کچھ یاد تو پڑتا ہے کہ جب میں روانہ ہو رہا تھا کسی طرف سے چھینک کی آواز آئی تھی۔ معلوم ہو جاتا تو کمبخت کی ناک ہی کاٹ لیتا! یسا زکام نزلہ بھی کس کام کا جو دوسروں کو پھانسی پر لٹکوادے"

پھانسی کا خیال آتے ہی اُن کی نگاہوں کے سامنے پھانسی کا تختہ اور رسّی آگئی اور وُہ کانپ گئے۔

تو کیا اب کچھ نہیں ہوسکتا؟ اسی حالت اور اسی صورت سے گرفتار ہو کر صبح کو جیلخانے میں بند کر دیا جاؤنگا . .
. . . . نہیں مجھے پھر کوشش کرنی چاہیئے۔ شاید کسی طرح دروازہ کھل جائے۔ خدمتگار کو بلانے کی گھنٹی بجاؤں؟ نہ لیکن یہ تو اور بھی زیادہ خطرناک صورت ہوجائیگی۔ یوں تو صبح تک کی مہلت بھی ہے، اس صورت میں تو ابھی ابھی گرفتاری ہوجاویگی۔ لیکن اب یہ بھی تو نہیں ہوسکتا کہ بے قصور اور بے گناہ پھانسی پر لٹکنا قبول کرلوں۔ کوئی صورت رہائی کی نکلنی ضرور چاہیئے!" (سوچنے لگے)

ایجاد و اختراع کے شجرہ نسب میں صاف لکھا ہوا ہے کہ یہ ضرورت کی بیٹی ہے، اور بعض مورخین کا تو یہ بھی بیان ہے کہ یہ اکلوتی بیٹی ہے۔ بہرحال مولوی عبدالسبحان کو انتہائی ضرورت درپیش تھی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کی بیٹی ان کی مدد کو نہ آتی۔

مُردہ عورت کے پلنگ کے قریب ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی اس پر ایک کتاب کچھ لکھنے کا سامان اور ایک قلم تراش رکھا ہوا تھا۔ قلم تراش کو دیکھ کر اُن کے دل میں کچھ اُمیدیں پیدا ہوئیں اور دماغ نے فوراً ایک تدبیر سوچ لی۔ وُہ اُٹھے اور چاقو لے کر دروازے کے پاس پہنچے اور چاقو کا پھل چٹخنی کے سوراخ میں ڈالکر کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح وُہ کیل جو پیچھے کو ہٹ گئی تھی۔ آگے کو آجائے۔ چاقو اس کیل میں لگتا تو تھا۔ لیکن وُہ چٹخنی کا کام کیسے دے سکتا تھا۔ اس کے لوہے میں مقناطیس کا اثر بھی نہ تھا کہ لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ پندرہ بیس مرتبہ کیل کو چاقو سے ہلانے کے بعد وُہ مجبور ہو کر تھک گئے اور اُمید کی سُرخی جو چہرہ پر نمایاں ہوگئی تھی۔ پھر سیاہی سے مبدل ہوگئی۔ اس آخری تدبیر

کی ناکامی نے اُنہیں کچھ اس درجہ مایوس کیا کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن مصیبت یہ تھی کہ رونے کے لئے وقت بالکل نہ تھا۔ فوراً کچھ کرنا چاہئیے۔ گھڑی پر نظر گئی تو معلوم ہُوا کہ ایک بج چکا ہے۔

ایک مرتبہ پھر اُنہوں نے کمرہ کے سامان پر نظر دوڑائی۔ پنسل، قلم، دوات، زنانہ کپڑے، تولیا، صابون ...... ممکن تو ہے۔ شاید کام دے جائے۔ بہرحال آزمانا ضرور چاہئیے اور کچھ ہو بھی تو نہیں سکتا۔"

انتہائی شوق کے ساتھ اُنہوں نے صابون کی ٹکیہ اُٹھائی اور چاقو سے اس میں سے پنسل کے برابر ایک گول بتی کاٹی۔ چہرہ پر پھر ایک مرتبہ خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ان کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے جبکہ وہ صابون کی بتی لے کر دروازے کی طرف چلے۔ بہ دشواری ہاتھوں کی لرزش کو روک کر اُنہوں نے وہ بتی سوراخ کے اندر ڈالی اور کوشش کی کہ کیل صابون کی بتی کے اندر گھس جائے۔

کیل صابون میں گھس گئی اور جب خوشی میں آ کر اُنہوں نے اسے جلدی سے گھسیٹا تو وہ صابون کے ساتھ اک ذرا آگے تک آ کر اس میں سے نکل گئی اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ چونکہ کیل کچھ نہ کچھ اپنی جگہ سے آگے بڑھی تھی اس لئے لاحول پڑھ کر وہی عمل دوبارہ کیا گیا۔ لیکن اب صابون کی بتی میں کیل کا سوراخ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ آہستہ آہستہ احتیاط سے کھینچنے کے باوجود کیل فوراً اس میں سے نکل گئی اور ذرا بھی نہ کھنچی۔

مولوی عبدالسبحان کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ سینہ بالکل لوہار کی دھونکنی بن گیا تھا اور وہ ہر مرتبہ کی ناکامی کے بعد پھر اس اُمید میں کہ شاید اب کی دفعہ پھنس جائے صابون کی بتی اس سوراخ میں داخل کر دیتے تھے۔ مسلسل کئی مرتبہ کی ناکامی کے بعد اُنہیں خیال آیا کہ بتی کا رُخ بدل دینا چاہئیے۔ چنانچہ اب تک جو سرا سوراخ میں داخل کر رہے تھے اور جس میں کیل نے سوراخ کر دیا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہاتھ والے سرے کو سوراخ میں داخل کیا اور تھوڑا زور دے کر کوشش کی کہ کیل کا زیادہ سے زیادہ حصہ صابون میں آ جائے۔

انتہائی آہستگی کے ساتھ صابون کی بتی کو واپس کھینچا گیا اور اس کے ساتھ کیل بھی کھنچتی ہوئی باہر نکل آئی۔ مولوی صاحب نے دوسرے ہاتھ سے کیل کو پکڑ لیا اور اب جو لٹو اُٹھا کر اس میں لگایا تو بالکل ٹھیک ......

لٹو کے گھماتے ہی دروازہ کھل گیا اور شاید ہی کوئی قیدی کبھی ایسی خوشی کے ساتھ جیل کے دروازے سے باہر نکلا ہو گا کہ جیسے مولوی عبدالسبحان اس کمرے سے باہر آئے۔

باہر والا کمرہ اُن کا اپنا کمرہ تھا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بہت دیر تک سر نہ اُٹھایا۔

صبح کو دس بجے کے قریب مولوی صاحب کی آنکھ کھلی گھنٹی بجائی۔ خدمتگار حاضر ہُوا۔ تو اُس نے بڑے تعجب سے پوچھا۔"

"حضور کو کچھ خبر ہی نہوئی۔ یہاں ہوٹل میں تو ایک اودھم صبح سے مچی ہوئی ہے۔ حضور کے برابر والے کمرہ میں ایک بیگم صاحبہ ٹھہری ہوئی تھیں انہوں نے یا تو زہر کھالیا یا خدا جانے کسی نے انہیں قتل کر دیا۔"

" ایں کیا ہوا، قتل کر دیا؟ کس نے قتل کر دیا؟"

"حضور اب مجھے کیا خبر۔ پولیس لاش لے گئی ہے۔ سب لوگ تو یہی کہہ رہے تھے کہ اس نے زہر کھالیا۔ مگر ایک پولیس والا کہتا تھا کہ اس کے کمرے میں چارپائی کے قریب کسی مرد کے پاؤں کے سلیپر پڑے ہوئے ملے ہیں۔"

"کیا ملے ہیں سلیپر؟"

یہ جملہ مولوی صاحب نے کچھ ایسے گھبرائے ہوئے لہجہ میں ادا کیا کہ خدمتگار حیرت سے اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

"اچھا چاء لاؤ اور ہماری ڈاک اگر کچھ آئی ہو تو پہنچا دو۔" خدمتگار چلا گیا۔

میں بھی کس قدر احمق ہوں ننگے ہی پاؤں وہاں سے بھاگ آیا" زیر لب تبسم کے ساتھ مولوی عبدالسبحان نے کہا۔ اور چاء کا انتظار کرنے لگے۔

سرزمین مشرق کے عارف اعظم کے چند زرین اقوال

۱۔ جو شخص ترقی کے وقت ترقی نہیں کرتا۔ جو نوجوان قوی ہو کر بھی سست ہے جس کا دماغ اور قوت ارادہ کمزور ہے ایسا آدمی کبھی سچا راستہ نہیں پا سکتا۔

۲۔ تم دوسروں کو جیسا بننے کی نصیحت کرتے ہو ویسا پہلے خود بنو جس نے اپنے آپ کو مطیع کیا ہے۔ وہ دوسروں کو مطیع کر سکتا ہے۔

۳۔ غصہ کو محبت سے۔ بدی کو نیکی سے۔ حرص کو سخاوت سے اور جھوٹ کو راستی سے فتح کرو۔

۴۔ سچ بولو غصہ مت کرو۔ اگر تمہارے پاس کوئی کچھ مانگنے آئے تو اُسے دو۔ ان صفات سے تم دیوتا بن جاؤ گے۔

۵۔ مندرجہ ذیل دس مہاں پاپ ہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے۔ کہ ان سے پرہیز کرے۔

۱۔ کسی جاندار کی جان لینا۔ ۲۔ چوری کرنا۔ ۳۔ زنا کرنا۔ ۴۔ جھوٹ بولنا۔ ۵۔ دوسروں کی غیبت کرنا ۶۔ گالی دینا۔ ۷۔ فضول اور بیہودہ بات چیت کرنا۔ ۸۔ لالچ۔ ۹۔ حسد۔ ۱۰۔ رشک یعنی حسد۔

زیدی

ہر گھڑی یکساں ہے میری دوست دشمن پر نظر

(پنڈت شیو ناتھ صاحب کول شاکر ۔ گوالیار لشکر)

اتفاقاً ایک کانے پر پڑی میری نظر — اور اپنے حسن پر کچھ اُس کو نازاں دیکھ کر

میرے دل نے یہ کہا پوچھو تو اس سے اس کا حال — پھر مخاطب ہو کے اُس سے مَیں یہ بولا بیخطر

کیوں میاں کانے بتاؤ تو مجھے تم ایک بات — مہربانی و عنایت کر کے میرے حال پر

سب کو تو خالق نے دو آنکھیں جہاں میں کیں عطا — کیا درندے ۔ کیا پرندے ۔ کیا ملائک ۔ کیا بشر

جتنے ہیں چھوٹے بڑے کیڑے زمیں پر گامزن — سب کو دو آنکھیں خدا نے دیں ضرورت جانکر

سب پہ ہے حکمِ الٰہی کا یہاں یکساں عمل — سب پہ ہے قانونِ قدرت کا یہاں یکساں اثر

کیا خطا تم سے ہوئی اللہ کی درگاہ میں — جرم کیا تم سے ہوا غائب ہے جو چشمِ دگر

آنکھ جس سے دیکھتے ہیں باغ عالم کی بہار — جس سے آتا ہے نظر حسنِ بتانِ سیمبر

آنکھ جو انساں کے چہرے کی ہے زینت کا سبب — یہ نہ ہو تو دہر میں مشکل ہو پھر اُس کا گذر

آنکھ جیتا جاگتا جادو جسے کہتے ہیں لوگ — جس کے آگے ہیچ ہے دنیا کا سارا مال و زر

آنکھ جس پر منحصر ہیں ساری دنیا کے مزے — رہتے ہیں شاہ و گدا محتاج جس کے سر بسر

جس سے حظ انساں اُٹھاتا ہے جہاں میں بے شمار — جس سے ملتی رہتی ہے راحت اُسے شام و سحر

ایسی نعمت سے تمہیں محروم خالق نے کیا — کچھ کہو تو کیا گذرتی ہے تمہارے قلب پر

سن کے میری بات کانے نے دیا جلکر جواب   بس اُٹھا کر رکھئیے تقریر یہ اپنی طاق پر
خوبیاں مجھ میں ہیں کیا کیا آپ کیا جانیں انہیں   مجھ میں جو اوصاف ہیں کیا آپکو اُن کی خبر
چشمِ بد دُور اب [illegible] دشمنوں میں لاثانی ہوں میں   آنکھ ہو تو مجھ کو دیکھو آنکھ اپنی کھول کر
جب کبھی دو چار ملکر جاتے ہیں بہرِ شکار   بس نشانہ میرا ہی ہوتا ہے اُن میں کارگر
کام دو آنکھوں سے وہ ہوتا نہیں ہرگز وہاں   جو فقط ایک آنکھ کر جاتی ہے میری وقت پر
آپ دو آنکھوں سے اپنی دیکھتے ہیں خلق کو   آپ کے دل میں دوئی نے کر لیا ہے اپنا گھر
دیدۂ واحد مجھے بخشا ہے خالق نے مرے   ہر گھڑی یکساں ہے میری دوست دشمن پر نظر

آدمی کو عیب اپنا خود نظر آتا نہیں
جس کو آتا ہے نظر شاکر وہی ہے خوش سیر

کلامِ تپش

(از جناب شیخ عبد اللطیف صاحب تپش ایم اے ایم او ایل)

گھٹا جاتا ہے دم ضبطِ فغاں سے   بگڑتی ہے تو بگڑے آسماں سے
نہ سنواؤ مجھے غیروں سے باتیں   کہو جو کچھ کہو اپنی زباں سے
خدا جانے کہاں رنگِ پریدہ   اُڑا اُڑ کر چلا ہے آشیاں سے
جہاں چاہیں گے قسمت پھوڑ لیں گے   غرض کیا ان کے سنگِ آستاں سے
کہیں دبتے ہیں فتنے اُٹھنے والے   تمہاری چال سے میری فغاں سے
نہ سمجھو گے عدو سے مجھ کو اچھا   بھلا پھر فائدہ کیا امتحاں سے
تپش نے دیکھے دل اک بیوفا کو   لڑائی مول لی سارے جہاں سے

(جناب پنڈت ہری چند صاحب اختر ایم اے)

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب مَیں پیرس کے ایک چھوٹے سے غیر معروف کوچے میں سکونت پذیر تھا۔ سائنس کے شغف نے مجھے زاویہ نشین بنا رکھا تھا اور میں وہاں رات بھر اپنے کام میں منہمک رہتا تھا۔ دن کو ایک لائبریری چلا جاتا جو نزدیک ہی تھی۔ اُن نوجوانوں کی طرح جو اپنے کام کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔ کفایت شعارانہ بلکہ زیادہ صحیح یہ کہ درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک نواحی پارک کی سیر میری تفریح کے لئے کافی تھی جہاں غریبانہ کپڑے پہنے مَیں لوگوں سے گھل مل کر ان کی عادات کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ مَیں سودا سلف کے معاملے میں ان سے ربط ضبط پیدا کرتا اور ہوٹلوں میں ان کے ساتھ تاش کھیلتا۔

چونکہ فطرت نے بھی یہ ملکہ کسی حد تک عطا کر رکھا تھا۔ اس لئے میں نے جلد ہی انسانی خصائل کے پہچاننے میں مہارت حاصل کر لی۔ کوئی شخص خواہ کسی پوشاک میں ملبس ہو اور مجھے دھوکا دینے کی کتنی ہی کوشش کرے۔ میں فوراً بھانپ لیا کرتا تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے اور اس کی گزشتہ زندگی کس طرح گزری ہے۔ بعض اوقات مَیں اپنی قوت مشاہدہ کی بدولت اپنی نظروں میں ایسا ہی امیر کبیر معلوم ہونے لگتا تھا جیسا خلیفۂ بغداد اپنے مال و متاع کی موجودگی میں۔ الغرض میں ہر روز شام کے وقت کسی دلچسپ آدمی کی تلاش میں چکر لگایا کرتا تھا۔

کبھی کبھی مجھے اپنی کوششوں کا صلہ مل جاتا۔ ایک رات مجھے خاص طور پر کامیابی حاصل ہوئی۔ میں نے ایک مزدور کو اپنی بیوی کے ہمراہ کسی محفلِ سماع سے واپس آتے دیکھا اور دل بہلانے کی غرض سے ان کے پیچھے چل پڑا تاکہ خفیہ طور پر ان کی گفتگو سُن لوں۔ وہ اپنے تھیٹر کے مشاہدات کا ایک عجیب پیرایہ میں ذکر کر رہے تھے۔ ہوتے ہوتے ان کے ذاتی معاملات گفتگو کا موضوع بن گئے۔ ان کا بچہ ان کے ساتھ گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ بچہ ان سے چھوٹنے کی زبانی اور عملی کوشش میں مصروف تھا اور کھیل کے متعلق سوال پر سوال کئے جاتا تھا۔ مگر اس کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ مالی معاملات اور ہفتۂ آئندہ کی آمدنی کے خرچ کا بہترین طریق معرضِ بحث میں آ گیا۔ بہت سے تجاویز جانبین نے پیش کیں۔ "آلو کتنے مہنگے ہیں؟.... اور نبح ہی نانبائی نے کہا تھا کہ ....."

پھر وہ اس بات پر بحث کرنے لگے کہ آیا مرد جو محنت و مشقت کے لئے مارا مارا پھرتا ہے بہتر ہے یا عورت جو مزے اُڑاتی اور عیش کرتی ہے۔ مباحثہ گرم ہو گیا۔ پھر وہ تلخ کلامی پر آ گئے اور دونو اپنی اپنی اور ایک دوسرے کی عجیب و غریب عادات و خصائل کا حال ظاہر کرنے لگے۔

میں تخیل کے زور سے اپنے آپ کو ان کی سی زندگی بسر کرتے دیکھنے لگا۔ پھٹے ہوئے چیتھڑے ٹوٹا ہوا جوتا اور دنیاوی افکار کا طومار۔ رہنے کے لئے ایک نمدار شکستہ جھونپڑا۔ کھانے کو سرد آلو اور خشک روٹی۔ اور تفریح کے لئے تین آنے فی ٹکٹ خرچ کرنے پر تھیٹر کا تماشا اور وہ بھی شائد سال بھر میں ایک بار میں خیال ہی خیال میں دوسروں کے مصائب و تکالیف کا ایسا مکمل اندازہ کرلیتا ہوں کہ وہی آلام خود مجھے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو دوسروں کی حالت میں تصور کرکے ان کے واقعات پر غور کرنے کی مجھ میں اتنی قابلیت پیدا ہوگئی ہے کہ اس وقت گویا میں اور وہ ایک ہی شخصیت ہوتے ہیں۔

کیا یہ کوئی عجیب دماغی قابلیت ہے؟ اس میں کوئی فائدہ بھی ہے یا نہیں؟ کیا یہ مجھے اپنی اور دوسروں کی مدد کے قابل بناسکتی ہے؟ آیا اس کا غلط استعمال بھی ممکن ہے؟

مگر میں نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ مجھے اس کی تہ تک پہنچنے کی ضرورت نہیں۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ مجھے قابلیت حاصل ہے۔ اور میں اس کا بہترین استعمال کرونگا۔ کوئی بھی اپنی قابلیتوں کا برا استعمال کرنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ اگر کوئی غلط راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کا سبب عموماً اتفاق ہوتا ہے یا اخلاقی کمزوری۔

لیکن اس قابلیت کی مشق سے میں اُس مخلوق کو جان گیا تھا جسے انسان کہا جاتا ہے۔ میں ان کے نیک خصائل اور کمزوریوں کو سمجھ گیا تھا۔ ان میں بہادر مخترع اور مختلف علوم کے ماہر پائے جاتے تھے۔ لیکن ان ہی میں بدکار چور جفاکار شرابی اور افیونی نظر آتے تھے۔ اور ایسے آدمی بھی ملتے تھے جن کا افلاس نے کچھ مزہ کال رکھا تھا۔ پیرس تکلیفوں کا شہر ہے۔ اور میں نے اسے کارناموں ... ہوں اور غم انجام واقعات سے بھرا ہوا پایا ہے۔ اس میں دونو اوصاف ہیں۔ خوبصورت بھی ہے اور خوفناک بھی۔

لیکن دُنیا کے تمام تصورات مل کر بھی سچائی کو پورے طور پر ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کی وجہ نہایت مختصر اور سادہ ہے۔ یعنی تصور حقیقت پر رنگ چڑھا دیتا ہے۔ ممکن ہے ہم وہی ظاہر کرنا چاہتے ہوں جو ہم نے دیکھا ہے لیکن ہمارا تصور فوراً اس واقعہ میں دخل حاصل کرکے اس کے ساتھ شیر وشکر ہوجاتا ہے۔ فرض کرو ہم صرف اتنا کہیں کہ کل رات ایک عورت ڈوب مری۔ جب تک ہم نے اس واقعہ کو دیکھا نہ ہو ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہوں تو پھر ہم اسے اتنے اختصار کے ساتھ بیان کرنے پر قانع نہیں ہونگے۔ چونکہ واقعہ کا ہمارے دل پر ایک خاص اثر ہوا ہوگا۔ اس لئے ہم اسے رنگین الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کرینگے۔ حقیقت ہماری نظروں کے سامنے نہیں آتی۔ وہ انسانی مصائب کے ذلیل اور عمیق غاروں میں پنہاں رہتی ہے۔ کوئی اسے وہاں ڈھونڈھنے نہیں جاتا میں نے خود ابھی تک یہ تکلیف گوارا نہیں کی۔

میں حیران ہوں کہ ابھی تک میں ادھر اُدھر بھٹکتا رہا اور وہ کہانی جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں شروع نہیں کی۔ تمام واقعات جو میری نظر سے گزر چکے ہیں میرے دماغ کے تھیلے میں ایک مجموعۂ پریشاں کی طرح پڑے ہیں۔ جب ضرورت ہوتی

ہے ان میں سے کوئی سا سُنانے لگتا ہوں ۔ پس یہ کہانی میں نے اس لئے شروع نہیں کی کہ یہ کسی لحاظ سے بہترین ہے ۔

ایک دن مکان کی مالکہ نے مجھے اپنے ایک رشتہ دار کی شادی پر مدعو کیا ۔ میں اس کی بہت عزت کرتا تھا ۔ وہ سخت محنت کے باوجود تھوڑا کماتی تھی ۔ اور اس کے خاوند کی روزانہ مزدوری پانچ شلنگ تھی ۔ ان کے تین بچے تھے ۔ اور میں نے ایسی محنتی اور دیانتدار ہستیاں آج تک نہیں دیکھیں ۔ جب میں پیرس کے کسی اور حصّے میں بھی مقیم ہوتا تو وہ میری سالگرہ کی تقریب پر ضرور آتی اور میرے لئے پھول اور نارنگیاں بطور تحفہ لاتی ۔ تاہم بیچاری کی آمدنی بہت کم تھی ۔

غریبی نے ہم دونو کو یکجا کر دیا تھا ۔ مجھے زیادہ کرایہ ادا کرنے کا مقدور نہ تھا اور وہ زیادہ کما نہیں سکتی تھی ۔ تاہم اس نے کبھی مجھے چھوڑ کر کوئی امیر کرایہ دار ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی ۔ اس لئے میں بھی کرایہ وقت پر ادا کر دیتا تھا خواہ قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے ۔

میں نے اس خیال سے کہ ان غریب مگر نیک دل لوگوں کی سادہ خوشی سے ایک خاص حظ حاصل ہوگا ۔ شادی پر جانے کا وعدہ کر لیا ۔

شادی کی ضیافت اور ناچ ایک میفروش کی دوکان کے اوپر ایک بڑے کمرے میں ہُوا جو اس موقع کے لئے خاص طور پر سجایا گیا ۔ مَیں وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچا ۔ اسی بچاسی آدمی اپنے فیشنوں سے سجے ہوئے بہترین لباس میں وہاں جمع تھے ناچ شروع ہُوا ۔ جلد ہی اتنا شور وغل ہونے لگا اور سب کے سب رقص وسرود میں ایسے محو ہوگئے گویا دوسرے دن قیامت آنے والی تھی اور وہ اس مقولے پر عمل پیرا تھے کہ "کھاؤ پیو اور عیش کرو کیونکہ کل تم مر جاؤ گے" ان کی پھبتیاں عاصیانہ اور عریان تھیں لیکن اتنی سوقیانہ اور خطرناک نہ تھیں جتنے کسی شریف گھرانے کی تربیت یافتہ نوجوان دوشیزہ کے شرمیلے اور دزدیدہ اشارے ہوتے ہیں ۔

ہر فرد بشر محو شادمانی تھا ۔ گویا خوشی نے ایک متعدی مرض کی صورت اختیار کر لی تھی ۔ کمرہ نہایت عجیب معلوم ہوتا تھا دیواریں بدنما سُرخ نقش ونگار سے مزین تھیں اور ہوا شراب کی بدبو سے آلودہ ۔ سٹیج پر تین اندھے بیٹھے تھے جن میں سے ایک تو نفیری بجا رہا تھا ۔ دوسرا شہنائی اور تیسرا الغوزہ ۔

ان کو اس شام کے لئے پانچ شلنگ فی کس دیئے گئے تھے ۔ اس لئے ان سے اعلےٰ قسم کے نغموں کی توقع فضول تھی ۔ وہ جس وقت جو کچھ چاہتے اور جس طرح چاہتے الاپ دیتے ۔ تاہم انہوں نے سب کو خوش کر لیا ۔ کیونکہ ہر شخص خود بخود خوش ہو جانے پر آمادہ تھا ۔

مَیں اُس کونے میں پہنچا جہاں یہ تینوں بیٹھے تھے ۔ مجھے خانہ بدوش سازندوں سے خاص اُنس ہے کیونکہ یہ ایک پُراسرار طبقہ ہے جو آدھا تو اس دُنیا کا معلوم ہوتا ہے اور آدھا اُس خطّے کا جہاں سے اس پر موسیقی نازل ہوتی ہے ۔ مَیں ہمیشہ اپنے تئیں ان میں کا ایک فرد سمجھتا ہوں اور آج رات تو مجھے اپنی اسی عجیب قابلیت کی بدولت ایسا معلوم ہُوا گویا میری

رُوح شہنائی نواز کے جسم میں حلول کر گئی -

نفیری اور الغوزہ بجانے والے تو واقعی عوام میں سے معلوم ہوتے تھے لیکن شہنائی نواز کے خط و خال غیر معمولی طور پر مؤثر اور دلکش تھے - اس کا چہرہ ڈانٹے کے بنائے ہوئے سنگِ مرمر کے بُتوں سے مشابہ تھا - لیکن سُرخی کی جھلک بھی موجود تھی سر پر گھنے نقرئی بال تھے - بشرے پر رنج و الم کے آثار اور آنکھوں میں غیر معمولی جذبات کی چمک - کبھی کبھی وہ اپنے نغموں کی دُھن میں والہانہ طور پر محو ہو جاتا تھا - وہ اطالوی معلوم ہوتا تھا - اور اگرچہ بے پروائی سے شہنائی بجا رہا تھا اور کوئی مشکل سُر لگانے کی کوشش نہ کرتا تھا تاہم یہ بات بالکل درست ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے زیادہ کاریگر تھا -

استقلال اور بزرگی اس کے چہرے سے عیاں تھی - وہ ایک طباع شخص تھا لیکن غیر معروف - تاہم اس کی ویرانہ میں ایک خاص کشش تھی جو دلوں کو اپنی طرف مائل کر لیتی تھی - اس کا سر بہت بڑا تھا جو اس کے عالی دماغ ہونے کی دلیل تھی - مجھے وہ کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا تھا - اس نے اپنی ذلیل حالت کے احساس پر غلبہ حاصل کر لیا تھا - اس سرد مہری کے زمانے میں اپنی قابلیت ہی اس کے لئے باعث تسلی تھی -

اس کے چہرے پر اُن ولولہ انگیز جذبات کے نشانات موجود تھے - جو کبھی تو انسان کو ایک مشہور و معروف شجاع یا فرشتہ بنا دیتے ہیں اور کبھی چور اور مُسرف - اس کے استخوان گویا ایک پنجرہ تھا جس میں ایک ایسا شیر ژیاں خوابیدہ تھا جو رہائی کی تمام کوششوں میں ناکام رہنے پر دبک کر بیٹھ گیا ہو غصے میں اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں سے اس طرح شعلے نکلتے معلوم ہوتے تھے گویا رات کے وقت رہزن ہاتھوں میں مشعلیں لئے غار سے برآمد ہو رہے ہیں - یاس اس کے تمام خیالات پر قبضہ جمائے بیٹھی تھی - اس کا دل بُجھ چکا تھا - پیشانی کے بل اور چہرے کی جُھریاں گزشتہ جوش و خروش کے خروج کا پتہ دیتی تھیں -

دوسرے دو نو نوازندے وقتاً فوقتاً اپنے سازوں کو گلے سے لٹکا کر ساغر و مینا کی طرف ہاتھ بڑھاتے اور بڑے اشتیاق سے پیاس بجھاتے - لیکن جب وہ شہنائی نواز کو کچھ پیش کرتے تو وہ ایک اندازِ ممنونیت سے سر ہلا کر انکار کر دیتا -

ان دونو کو مشغولِ مینوشی دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا "دوست تمہارا وطن کہاں ہے"؟

اس نے اطالوی لہجے میں جواب دیا "وینس"-

"کیا تم مادر زاد نابینا . . . . . یا کوئی حادثہ پیش آیا تھا . . . .؟"

"میں مادر زاد اندھا نہیں ہوں!"

"میں نے وینس کی بابت اتنا کچھ سُن رکھا ہے کہ میرا جی وہاں جانے کو ترستا ہے"۔

بوڑھے کے دل میں جذبات نے ہلچل ڈالدی - کہنے لگا "اگر میں آپ کے ساتھ جاؤں تو آپ کا بہت سا وقت ضائع ہو۔

پھر وہ تینوں نغمہ نوازی میں مشغول ہو گئے اور جب وہ دیہاتی رقص کے ساتھ اپنے سازوں کے سُر ملائے اپنے کام

میں مصروف تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھا کچھ میری نسبت سوچ رہا ہے اور خیال کرتا ہے کہ میرے دل میں اس نے دلچسپی پیدا کردی ہے۔ وہ اب اتنا اندوہگیں نہیں تھا بلکہ جب وہ شہنائی کو ایک طرف رکھ کر ایک کھردرے رومال سے پیشانی پونچھ رہا تھا تو اس کے لبوں پر مُسکراہٹ بھی عیاں ہوئی۔

میرے پوچھنے پر اس نے اپنی عمر بیاسی سال بتائی۔

میں نے پوچھا کہ لوگ تمہیں "مجسٹریٹ" کے نام سے کیوں پکارتے ہیں؟ اُس نے کہا۔ "میں اٹلی کے ایک اونچے گھرانے کا فرد ہوں اور ایک دفعہ حاکم اعلےٰ منتخب ہُوا تھا۔"

"اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"یہاں تو مجھے بوڑھا کینٹ کہتے ہیں لیکن میرا اصلی اطالوی نام مارکو فاسینوکین شہزادہ وارِیس ہے۔"

"اوہو! تو کیا تم مشہور و معروف فاتح فاسینوکین کی اولاد سے ہو؟"

ہاں وہی!.... ہاں اُس وقت کونسل سے بچنے کے لئے کین کا بیٹا وینس میں پناہ گیر ہُوا اور اس نے اپنا نام "طلائی کتاب" میں درج کرایا تھا۔ لیکن اب کتاب اور کین دونو دُنیا سے ناپید ہوچکے ہیں۔" اس موقع پر اس نے تمام دُنیاوی چیزوں حتیٰ کہ حُبِ وطن اور انسانی فطرت سے بھی انتہائی حقارت ظاہر کی۔

میں نے کہا۔ "لیکن اگر تم وینس کے حاکم تھے تو اس وقت تم ضرور امیر آدمی ہوگے۔ تمہارا مال و منال کس طرح ضائع ہُوا؟"

یہ سُن کر اُس نے اپنا معزز سر اُٹھایا۔ اس کے انداز سے بے کسی ٹپک رہی تھی۔

اُس نے کہا۔ "مجھ پر ایک نہایت ہی ناگوار حادثہ گزرا تھا۔"

میری تجسس کی خواہش اور بھی پُرزور ہوگئی لیکن میں اس سے دوسرا سوال پوچھنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ یہ ایک نا واجب حرکت ہوتی۔ مزید برآں وہ مجھے کچھ تھکا ہُوا بھی معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا میں منتظر رہا کہ وہ خود ہی گفتگو شروع کرے۔

لیکن میں اُسے غور سے دیکھ رہا تھا اور تمام واقعات کی نُدرت پر غور کر رہا تھا۔ میں نے تصوّر میں وینس کا نقشہ باندھا اور عالمِ خیال میں منڈی اور بندرگاہ لیڈو کی سیر کرنے لگا۔ میں نے وہاں کا فلک نما گرجا دیکھا اور شاہی محلسرا کے مختلف نقش و نگار سے آراستہ حجروں کا معائنہ کیا۔ پھر گذشتہ اطالوی اُمرا کے ظلم و ستم اور زوال اور اس زوال کے اسباب یعنی انکی جسمانی اور اخلاقی پستی پر غور کرنے لگا۔

یکایک فاسینوکین نے شہنائی بجانا بند کرکے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ اُٹھا اور میرے پاس آکر بولا "آؤ چلیں!"

مَیں خوشی اور تعجب سے اُچھل پڑا۔

میں نے اسے اپنا ہاتھ دیا اور ہم چل کر کھڑے ہوئے۔ گلی میں پہنچ کر وہ یوں گویا ہُوا "کیا تم مجھے وینس لے چلو گے؟ تم مجھ پر اعتبار کرو گے! تم لنڈن اور امسٹرڈم کے متموّل ترین سوداگروں سے بھی زیادہ دولت مند ہو جاؤ گے ہاں۔ روبس چائلڈز۔ سے بھی زیادہ امیر! الف لیلہ کے شہزادوں جتنے دولت مند!!"

میں نے خیال کیا اس کا دماغ چل گیا ہے۔ لیکن میں اس کی شخصیت اور استقلال سے مرعوب ہو کر اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ مجھے ایک باغیچہ میں لے گیا۔ اور فصیل کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چاندنی میں اس کے نورانی بال چمک رہے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن یکایک وہ یوں گویا ہُوا:۔

میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے تم اُسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ لیکن بخدا میں نے بالکل سچ کہا ہے ۔۔ تمہاری عمر غالبًا بیس سال یا اس سے کچھ زیادہ ہوگی ۔۔۔۔ ہاں میں بھی کبھی تمہاری عمر کا تھا۔ نوجوان خوبصورت رعنا ۔۔۔ لیکن میری پہلی ہی بیوقوفی بدترین تھی یعنی محبت ۔۔۔۔ میری محبت ایسی تھی جس سے آج کل کے لوگ نا آشنا ہیں۔ ایک نظرِ عنایت کے وعدے پر میں موت کے نیچے چھپنا گوارا کر لیتا اور اس بات سے بھی بے پروا ہو جاتا کہ اگر پکڑا گیا۔ تو طرح طرح کے عذابوں سے مارا جاؤنگا۔

"میں ایک نوجوان اور خوبصورت مگر کتخدا عورت کے تیرِ نظر کا گھائل تھا۔ اس کے خاوند کا نام سگریڈو تھا۔ وہ اعلیٰ کونسل کا رُکن تھا اور بیوی پر لٹو۔

ایک دن جب ہم عشق و محبت کی باتیں کر رہے تھے وہ اچانک سر پر آپہنچا۔ ہم دونو بیگناہ تھے لیکن اسے یقین نہ آیا۔ وہ مجھ پر حملہ آور ہُوا۔ مَیں بالکل نہتا تھا۔ مگر محض مدافعت کے خیال سے اس سے لپٹ پڑا۔ اور اسے نیچے گرا کر سینے پر چڑھ بیٹھا۔ پھر اس کے گلے پر گھٹنا ٹیک کر زور سے دبایا۔ حتیٰ کہ اس کی جان نکل گئی۔ اب میں نے بیانکا سے کہا کہ وہ میرے ساتھ فرار ہو چلے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ دوست! عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

لہذا میں اکیلا ہی چل پڑا۔ میں مجرم قرار دیا جا چکا تھا اور میری جائداد ضبط ہو کر میرے وارثوں کے لئے محفوظ رکھی گئی تھی۔ لیکن میں اپنے جواہرات اور اعلیٰ قسم کی تصاویر کپڑوں میں چھپا کر لے آیا تھا۔ میں ایک اور ملک میں چلا گیا جہاں میرا خیال تھا کہ زندگی اطمینان سے بسر ہوگی۔

کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ عورتیں جب حاملہ ہوتی ہیں تو اس بچے پر جو پیٹ کے اندر ہوتا ہے اپنے خیالات اور افعال کا اثر ڈال سکتی ہیں؟ کم از کم مَیں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب میری والدہ حاملہ تھی تو اسے سونے سے بیحد محبت تھی۔ کیونکہ میں خود ہمیشہ زر کا شیدائی رہا ہوں۔ اور کچھ نہ کچھ سونا ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہوں اب بھی میرے پاس کسی قدر موجود ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے چند طلائی سکّے جیب سے نکال کر مجھے دکھلائے۔

پھر اس نے داستان کو جاری رکھتے ہوئے کہا :میں اگرچہ اندھا ہوں لیکن جہاں کہیں بھی سونا ہو محسوس کر سکتا ہوں۔ مَیں ہمیشہ جوہریوں کی دوکانوں پر ٹھہر کر مختلف اشیاء کے رنگ چشمِ تصور سے دیکھتا ہوں.... پس میں سونے کی خواہش میں جواری بن گیا۔ میں فطرةً چور یا ڈاکو نہیں ہوں بلکہ دوسروں نے مجھے لوٹا اور تباہ کر دیا۔

اَب میرے پاس کچھ نہیں رہا تھا :مَیں نے مایوسی کے دلخراش اثر کو گھٹانے کے لئے بیانکا سے ملنے کا ارادہ کیا۔ بھیس بدل کر واپس وینس پہنچا اور چھ مہینے اس کے گھر میں چھپ کر عیش و مسرت سے گزارے مَیں سمجھتا تھا کہ مرتے دم تک یونہی گزر جائیگی.... لیکن اس کے دوسرے عشاق میں سے ایک کو کچھ شبہ سا ہو گیا ایک دن ہم اکٹھے بیٹھے تھے کہ وہ اچانک آن وارد ہُوا۔ ہم دونو اُلجھ پڑے۔ لیکن میں نے اسے مارا نہیں صرف ایک شدید زخم لگا کر چھوڑ دیا۔

"میری مسرت کا خاتمہ ہو گیا اور میں پھر ترکِ وطن پر مجبور ہُوا۔

اب میں زندگی کی مسرتوں میں اندھا دھند کود پڑا۔ میں لُوئی پانزدہم کے دربار میں مشہور و معروف عورتوں کے درمیان دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی بیانکا کے حُسن و محبّت اور شانِ رعنائی کو نہ پہنچتی تھی۔ اس لئے میرے دل میں پھر اس سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مَیں تمام خطرات سے بے پرواہ وینس میں داخل ہُوا۔ لیکن دشمنوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اور موت کا حکم صادر ہو گیا۔ بیانکا نے میرے ساتھ مرنے کا قصد کیا.... عورتیں عجیب خیال کی واقع ہوئی ہیں۔ فرار ہونے سے تو انکار کر دیا تھا اور اب میرے ساتھ مرنے پر آمادہ تھی۔ خیر اسے قتل کر دیا گیا اور مجھے ایک شکارے میں ڈال کر خلیج کے پاس ایک خوفناک محبس میں لے گئے۔

"میرا تمنچہ ٹُوٹ گیا تھا لیکن میں نے قبضہ چھپا رکھا تھا کہ شائد کسی وقت کام آئے۔ میں بائیس سال کا نوجوان تھا۔ تنومند اور دلاور۔ میرے ڈوئل کے زخم جلد ہی بھر آئے۔ لیکن جب مجھ میں کچھ جان آئی تو معلوم ہُوا کہ مَوت کا فتوےٰ صادر ہو چکا ہے اور جلد ہی میرا سر اُڑا دیا جائیگا۔

مَیں نے مُہلت حاصل کرنے کی خاطر بیماری کا بہانہ کیا اور رہائی کی تدبیریں سوچنے لگا۔ آخر مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ دیوار میں سوراخ کر کے نہر میں کود پڑوں اور تَیر کر پار نکل جاؤں۔ میرے بچ نکلنے سے ڈوب جانے کا امکان زیادہ تھا۔ کیونکہ میں غواص نہیں تھا کہ غوطہ لگا کر سطح پر اُبھر آؤں۔ ممکن تھا تیرنے کا وقت آنے سے پہلے ہی ڈوب جاؤں۔ شائد پانی شور کرتا ہُوا دیوار تک آجائے اور مجھے مثل ایک چوہے کے بہا لے جائے۔ حفاظت کی خواہش انسان کو بہت سی تدبیریں سمجھا دیتی ہے۔ اُس کے خیال میں کوئی تدبیر بھی ناممکن سمجھ کر

رد نہیں کی جا سکتی۔ اس کا دماغ حیرت انگیز تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ایک پتھر دیکھا جس پر عربی حروف کندہ تھے۔ بلاشک یہ پتھر کوئی قیدی بعد میں آنے والوں کی اطلاع کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ کیونکہ اس پر مندرجہ ذیل سرنوشت تھی :-

"دائیں کونے میں دروازے کے قریب ہی میں نے دو پتھر اُکھاڑے ہیں۔ میں نے ایک گیارہ فٹ لمبی اور تین فٹ گہری سرنگ بنانی بھی شروع کر دی ہے "

خوش قسمتی سے ہماری کوٹھڑی میں کوئی محافظ نہیں تھا اور میرے ساتھی کو سویرے ہی سو جانے کی عادت تھی۔ یہ بھی میری تقدیر کی خوبی تھی کہ میرے لئے کسی دوسرے نے کام شروع کر رکھا تھا۔ وہ بیچارہ تو اپنا کام ختم کرنے سے پہلے ہی راہئِ ملکِ عدم ہوا۔ لیکن اس کے شروع کئے ہوئے کام سے فائدہ میں نے اُٹھایا۔

میں نے پتھر کو ذرا لڑھکایا۔ دوسری طرف اس کے دفینے کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ دفینہ حاصل کرنے میں قریباً ایک مہینہ لگیگا۔ . . . میں سونے کا خیال دل میں لئے نہایت تندہی سے کام میں لگا ہوا تھا۔ . . . اہاہا! سونا! جواہر!! میں دفینہ حاصل کرونگا۔ میں آزادی حاصل کرونگا۔ . . . . . "

ایک دن میرے بیلچے کا شکستہ پھل کسی چوبی تختے سے ٹکرایا۔ تختے میں سوراخ ہو گیا۔ کام آسان ہو رہا تھا۔ میں برہنہ جسم کام میں لگا ہوا تھا تاکہ میرے اعضا کسی رکاوٹ کے بغیر کام کئے جائیں۔ اور جس روز مجھے عدالت میں پیش ہونا تھا اُس سے پہلی رات میں، اپنے کام کو بھوت بن کر چمٹا ہوا تھا۔ . . . یکایک میرا اوزار لکڑی کے پار ہو گیا۔ دوسری طرف کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ میں نے سوراخ میں سے جھانکا۔ کچھ فاصلے پر ایک غار نظر آیا جس میں سونے کا انبار لگا ہوا تھا۔

"حاکمِ اعلیٰ اور کونسل کا ایک رکن دوسری جانب باتیں کر رہے تھے۔ مجھے انکی آواز صاف سُنائی دیتی تھی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اعلیٰ حکام اور تمام ریاست کی پوشیدہ دولت یہیں مدفون تھی۔

جب ہمارا محافظ آیا تو میں نے اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ رہائی حاصل کرنے میں میری مدد کرے اور جس قدر سونا اُٹھایا جا سکے لے کر خود بھی میرے ساتھ بھاگ نکلے۔

وہ فوراً آمادہ ہو گیا۔ ایک جہاز لیونٹ کی طرف روانہ ہونے کو تھا۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے اور ایک رات ہم دونو وینس کے پوشیدہ خزانے میں بیٹھے تھے۔

آہا! وہ بھی کیا رات تھی!!

"مجھے سونے سے بھرے ہوئے چار صندوقچے ملے۔ باقی سب چاندی کے چمکدار ٹکڑوں سے پُر تھے۔ . . . میں نے خیال کیا کہ محافظ پاگل ہو گیا ہے کیونکہ وہ فرطِ خوشی سے کبھی ناچتا تھا اور کبھی گانا یا ہنسنا شروع کر دیتا تھا۔ میں نے اُسے دھمکایا کہ اگر تم نے اس طرح حواس کھو دیئے یا ذرا بھی شور کیا تو گلا گھونٹ دونگا۔

خوشی کے جوش میں اُس نے جواہرات نہیں دیکھے تھے۔ مَیں اُدھر لوٹ پڑا اور ٹھونس ٹھونس کر جیبیں بھرلیں۔ تاہم میں تیسرا حصہ بھی نہ اُٹھا سکا۔

مَیں نے سوچا کہ جواہرات کاٹ کر درست کرنے پڑیں گے۔ ہم اپنی تمام حرص و آز کے باوجود صرف تین ہزار پونڈ اُٹھا سکے اور ہمیں چھ بار شکارے تک آنا جانا پڑا۔ سونے کی ایک تھیلی ملاحوں اور پہرہ داروں کو دی گئی۔

پَو پھٹتے ہی ہم نکل کھڑے ہوئے اور کچھ دیر بعد سمندر میں پہنچ گئے۔ آہ جب وہ رات۔ وہ تذبذب اور وہ زرو جواہر سے پٹی ہوئی جگہ یاد آتی ہے تو مَیں آپے میں نہیں رہتا۔ مجھے گویا طلائی بخار ہوگیا تھا۔

سمرنا سے ہم فرانس کو روانہ ہوئے۔ راستے میں تقدیر نے یاوری کی اور میرا ساتھی قیدی بھی فوت ہوگیا۔ اگرچہ میں اُس وقت اِس واقعہ کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔

کئی دن تک ہم میں بولنے کی بھی طاقت نہ تھی کیونکہ ہم گزشتہ واقعات سے تھک کر چُور ہو چکے تھے۔ محافظ جیل کا دماغ پھر گیا تھا لہٰذا ہم ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

اپنی آدھی دولت لنڈن اور ایمسٹرڈم میں فروخت کرکے مَیں میڈرڈ پہنچا۔ پانچ سال وہاں رہا۔ پھر پیرس آگیا۔ یہاں مَیں عیش و مسرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ لیکن اسی عیش و مسرت میں میری صحت خراب ہوگئی۔ بلاشبہ ابھی میرے گزشتہ مصائب اور تذبذب کا اثر کلی طور پر زائل نہیں ہوا تھا۔ مجھے تعیش کی زندگی میں اندھا دُھند کُودنے سے پہلے کچھ عرصہ آرام کرنا چاہیئے تھا۔

اس وقت مجھے ایک عورت سے محبت ہوگئی۔ مَیں شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے حسب و نسب سے آگاہ کردیا۔ وہ بھی فرانس کے ایک زبردست گھرانے سے تھی۔ وہ میڈم ڈی بیری کی دوست تھی اور خود بھی .... باا‌ثر اور بارسوخ تھی۔ ... لیکن کیا تم میری بات کا یقین کروگے؟ نابکار عورت نے میرا سب سرمایہ لوٹ لیا اور دھکے دے کر بٹھا دیا۔ مجھ میں کمزوریاں تھیں۔ جیسا کہ مجھ سے بہتر آدمیوں میں بھی ہیں ... کم بخت عورت نے مجھے اُلّو بنایا۔ مَیں کیا کرتا؟ مَیں لوگوں کو اپنا اصلی نام نہیں بتا سکتا تھا۔ اور نہ حکام ہی سے دادخواہ ہوسکتا تھا۔ کیونکہ ایسا کرنے پر مجھے وینس بھیج دیا جاتا جہاں موت یقینی تھی۔ مَیں اس سوچ میں رہتا تھا کہ انہی دنوں بغاوت شروع ہوگئی۔

کاش مَیں نے وینس سے فرار ہونے سے پیشتر جیل کا نقشہ بنایا ہوتا! مجھے اب یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کونسا جیل ہے اور کہاں واقع ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو جب نپولین نے جمہوریہ کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ مَیں فوراً وینس جاتا اور اس خزانے کا بہت سا حصہ دستیاب ہوجاتا۔

مگر آخر کار مجھے یہی کرنا پڑیگا۔ مَیں ضرور وینس جاؤنگا اور باقی خزانہ حاصل کرکے چھوڑونگا! مَیں نہیں جانتا کہ مجھے یہ کام کس طرح شروع کرنا چاہیئے۔ مگر تم میری مدد کرو۔ ..... مَیں نے سرکاری امداد حاصل کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ مَیں نے

شہنشاہ آسٹریا کو بھی لکھا۔ مگر وہ سب مجھے دیوانہ خیال کرتے ہیں۔

"ہاں۔ آؤ وینس چلیں! ہم مانگتے کھاتے وہاں جا پہنچیں گے...... اور کروڑپتی بن کر آئیں گے... اور تم میرے وارث اور شہزادہ وارپس ہو گے"۔

بوڑھے کی یہ کہانی سُن کر میں سکتے کے عالم میں گُم صُم بیٹھا تھا... مجھے یہ سب کچھ شاعرانہ تخیل معلوم ہوتا تھا۔

کچھ دیر تک میں نے کوئی جواب نہ دیا اور بلاشبہ فاسینوکین مجھے بھی ان لوگوں ایسا شکی خیال کرنے لگا جو اس کی داستان سُن چکے تھے۔ اس نے حقارت، افسوس اور یاس سے بھرے ہوئے فلسفیانہ انداز میں سر ہلایا... پھر شہنشاہی اُٹھا کر اطالوی دھن نکالی..... لیکن اب وہ بوڑھوں کی طرح نہیں بلکہ ایک ایسے نوجوان امیر کی طرح نغمہ نوازی کر رہا تھا جو محض دل بہلانے کے لئے رقص و سرود سے شغف رکھتا ہو۔

میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

بے شک راہرو بھی جو اس خندۂ تقدیر سے ناواقف تھے ایک پُرشکوہ خاندان کی اس آخری نشانی کے دردناک نغموں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

لیکن یکایک اس جوانی کے رنگ پر سونے کی چمک جھلکی۔ فاسینوکین بولا "میرا خزانہ ہر وقت تاباں و درخشاں میری نظر کے سامنے رہتا ہے... جواہرات نہایت اعلیٰ قسم کے تھے... انکی چمک میری رُوح کی گہرائیوں کو روشن کر دیتی ہے..... میں نے اپنا خزانہ ڈھونڈ لیا تھا.... اب پھر اسے حاصل کرونگا"۔

یکایک وہ دو زانو ہو کر محوِ دعا ہو گیا۔ "میں دیوتاؤں کے حضور میں دعا کرتا ہوں کہ مرنے سے پہلے وینس پہنچ جاؤں"

میں نے کہا "میں تمہارے ساتھ چلونگا"۔

اس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولا "آخر مجھے ایک آدمی مل ہی گیا"!

میں ہاتھ میں ہاتھ دیئے اسے باہر لے آیا۔ اور عین اُس وقت جبکہ محفل شادی سے واپس آنے والے شور و غوغا کرتے ہوئے گذر رہے تھے ہم نے مصافحہ کیا۔

بوڑھے نے پوچھا "کیا ہم کل روانہ ہوں"؟

میں نے جواب دیا "جس وقت بھی ہمارے پاس کچھ روپیہ ہو جائے"۔

وہ بولا "مگر ہم پیدل جا سکتے ہیں..... مانگتے کھاتے... ایسا خزانہ حاصل کرنے کے لئے کوئی بات بھی ناممکن نہیں"!

لیکن اُنہی سرد[illegible] فاسینوکین کا انتقال ہو گیا۔

A LEGEND

افسانہ

ماخوذ از چارلس ٹینی سن

AN UNVARNISHEDTALE OF GREAT LOVE THAT PROMPETED TWO BROTHERS TO THINK ALWAYS OF EACH OTHER'S GOOD THE QUIET AND PIOUS TONE OF POEM IS OBVIOUS; ITS GREAT MERIT IS THE PERFECT NATURALNESS WITH WHICH THE MORAL IS BROUGHT OUT:-

(از جناب غلام محی الدین صاحب مائل انبالوی)

یہ آرزو ہے کہ ہو کوئی ایسا افسانہ — کہ جس کو سُن کے چھلک جائے دل کا پیمانہ
فسانہ کیا ہے؟ حدیث محبّت انساں — کہ جس کا حکم سراپا ہے کارسازِ جہاں
وہ رات جس کو کہ "لامس" کی رات کہتے ہیں — یکم اگست کی گویا یہ بات کہتے ہیں
یہی تو رات وہ ہے جس میں دو سگے بھائی — کہ ایک دوسرے کی چاہتا ہے اچھائی
خیالِ مہر و محبّت میں مستِ خواب ہوئے — سحر سے پہلے ہی بیدار و دشتاب ہوئے
بڑے نے اُٹھ کے کہا ماجرا یہ بیوی سے — کہ چھوٹے بھائی کی بیوی ہے اور نہ ہیں بچے
نہ اُس کا دوست ہے کوئی جو اُس کو دے تسکیں — اسی کی فکر میں رہتا ہے روز و شب غمگیں
وہ اب تو گھر میں پڑا میٹھی نیند سوتا ہے — اُسے خبر نہیں کیا مشورہ یہ ہوتا ہے
میں زندگی کو بناؤں گا پُربہار اُس کی — کہ میرے دل کو یہ کلفت ہے ناگوار اُس کی

اضافہ اور ذخیرہ میں اس کے میں کر دوں — اٹھا کے اپنے ذخیرہ سے پولیاں دھر دوں

وہ سو رہا ہے اسے اس کی کیا خبر ہوگی — وہ ڈھیر دیکھ کے خوش ہوگا جب سحر ہوگی

وہ نیک بھائی چلا نیک کام کرنے کو — جہاں میں خلق و محبت کا نام کرنے کو

اٹھا کے اپنے ذخیرہ سے پولیاں اس نے — تمام اس کے ذخیرہ میں ڈال دیں گن کے

ادھر تو کام کیا ختم ایک نے اپنا — وہ چھوٹا بھائی بھی فی الفور نیند سے چونکا

یہی خیال جو پہلے کے دل میں تھا آیا — اسی خیال نے اس کے بھی دل کو گرمایا

خیال دونوں کے تھے ایک ہی مگر دیکھو — ولیک راز سے دونوں تھے بے خبر دیکھو

یہ سوچتا ہے کہ بھائی کی بیوی اور بچے — کریں گے عیش گذاریں گے چند دن اچھے

اٹھاؤں اپنے ذخیرہ سے پولیاں گن کے — جو اس کے بچوں کے آئیں گی کام کچھ دن کے

یہ دل میں کہہ کے چلا جس جگہ ذخیرہ تھا — نمود صبح تھی لیکن ابھی اندھیرا تھا

اٹھا کے اپنے ذخیرہ سے پولیاں اس نے — چھپا کے ڈھیر میں رکھ دیں عزیز بھائی کے

خیال یہ تھا کہ اس کو نہ کچھ خبر ہوگی — وہ آکے ڈھیر کو دیکھے گا جب سحر ہوگی

وہ نیک دل تھے محبت کی پاک تصویریں — بدل سکے نہ نوشتہ کی اپنے تحریریں

یہ نیک کام رہا چند روز تک جاری — کہ ان کے دل میں محبت کا جوش تھا ساری

جب اپنے اپنے ذخیروں کو دیکھنے آتے — تمام ٹھیک وہ گنتی میں پولیاں پاتے

اگرچہ دل میں تعجب سے سوچتے تھے ضرور — مگر یہ راز نہاں ان کی عقل سے تھا دور

وہ ہو کے رہتا ہے جو کچھ خدا کو ہو منظور — یہاں تو حضرت انساں کی عقل ہے مجبور

پر اتفاق سے اک شب یہ راز فاش ہوا — کہ بھائی بھائی نے اک دوسرے کو دیکھ لیا

کھلا جو راز تو حیران تھے یہ کیا دیکھا — تمام نخل محبت ہرا بھرا دیکھا

فسانہ جب یہ خلیفہ کے روبرو آیا — بلا کے ساری رعایا کو اس نے سنوایا

فسانہ ختم ہوا جب تو اس نے فرمایا — کہ اہل مہر و وفا پر خدا کا ہے سایا

جہاں دلوں میں محبت کا کچھ اثر ہوگا
وہیں یہ مائل خستہ خدا کا گھر ہوگا

مائل تلمیذ نواب سائل دہلوی

(۱)
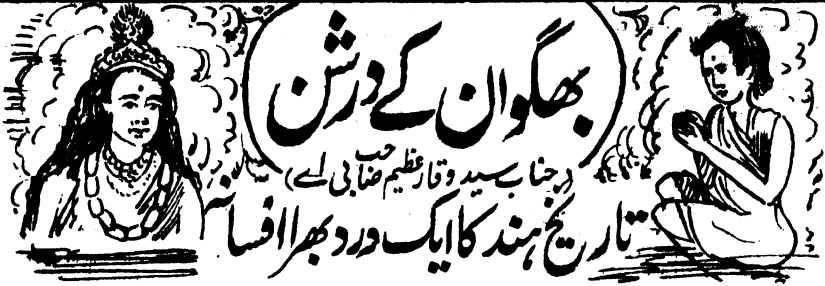
(ماں بیٹے ایک پھونس کی معمولی جھونپڑی میں بیٹھے ہیں۔ ایک چارپائی پر ایک کتھری پڑی ہے۔ دوسری طرف چوکا بنا ہوا ہے۔ اُس میں تھوڑے سے پیتل اور مٹی کے برتن بہت صاف دھلے ہوئے رکھے ہیں۔ ایک طرف بانس کے اوپر سُنیتی کی ساری سوکھ رہی ہے۔ جھونپڑی کے دوسرے کونے میں پوجا کا سامان رکھا ہے اور اُس کے پاس ہی پتھر کے ایک ٹکڑے پر بھگوان کی مورت رکھی ہے۔ ماں بیٹے گھاٹ پر بیٹھے ہیں۔ دھرو نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال رکھی ہیں۔ ماں بیٹوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔ ماں دھرو کے بکھرے ہوئے بال اوپر کو سرکاتی ہے۔ دونو ہاتھوں کے بیچ میں اُس کا سر پکڑ لیتی ہے اور پیار کرتی ہے اور اپنے سینے سے چمٹا لیتی ہے۔

سُنیتی ۔ بیٹا رو و مت تمہیں اگر سُرچی نے بن باسی کا لڑکا کہا تو بالکل ٹھیک ہے۔ تم بن باسی کے لڑکے ہو تو بیٹا اس میں کوئی تمہارا قصور نہیں قصور میرا ہے میں بن باسنی ہوں۔ بھکارن ہوں اور اس لئے میرے لال تم بھی بھکارن اور بن باسنی کے پتر کہلاتے ہو۔ بیٹا تمہیں سُوروچی نے ابھاگا کہا ٹھیک کہا۔ اس لئے کہ تم ایک ابھاگنی کی کوکھ سے پیدا ہوئے اور اس لئے کیسے ہو سکتا ہے کہ تم راج گدی پر بیٹھ سکو۔ راج گدی پر وہ بیٹھے جس نے سُوروچی کی کوکھ سے جنم لیا۔ میں اُس سے الگ کر دن کاٹے ہوں۔ بیٹا شوک نہ کرو اونچی پدوی پانے کے لئے آدمی کو

مدتیں گذریں کہ متھرا میں اُتّان پاد راجہ حکومت کرتا تھا۔ اسکی نیکی اور رعایا پروری نے اُسے بیحد ہر دلعزیز بنا دیا تھا سُنیتی اُسکی نیک اور عقلمند بیوی تھی۔ راجہ رانی نہایت خوشی سے دن گذارتے تھے لیکن دونو کے دلوں پر اولاد نہ ہونیکا ایک داغ کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ سُنیتی نے کوشش کر کے راجہ کی دوسری شادی کروا دی۔ نئی رانی نے راجہ کو اس طرح اپنے پھندے میں پھنسایا کہ حسین سُنیتی کو بن میں جا کر رہنا پڑا ایک دن راجہ شکار کو گئے۔ رات ہو گئی تو سُنیتی کی جھونپڑی میں ٹھہرے۔ رات بھر اُس کے پاس رہ کر صبح کو چل دیئے۔ کچھ عرصہ بعد سُنیتی کے ایک لڑکا ہوا۔ اُسکا نام دھرو رکھا گیا۔ اُدھر چھوٹی رانی کے بھی لڑکا ہوا تھا راجہ نے چاہا کہ بڑی رانی کو محل میں رکھے لیکن چھوٹی رانی کی وجہ سے نہ رکھ سکا۔ سُنیتی ایک جھونپڑی میں رہتی رہی اور دھرو راجہ کے التفات سے محروم رہے۔ دھرو پر ایک روز اُس کا بیحد اثر ہوا وہ روتا ہوا ماں کے پاس آیا۔

محنت کرنا پڑتی ہے۔" یہ کہہ کر اپنی آنکھوں سے پوچھے۔

دھرو (گود سے الگ ہو کر) "پر ماں ہم اور اُتم تو ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں۔ پھر بھلا میں ابھاگا اور وہ بھاگ شالی کیسے ہُوا؟"

سُنیتی۔ "میرے لال یہ میرے کرموں کا پھل ہے جو تمہیں بھی بھوگنا پڑ رہا ہے۔ تم اتنے بھولے ہو کیسے کہوں کہ تم نے بھی اپنے پہلے جنم میں بُرے کرم کئے ہیں اور اس لئے تم بھکارنی کے پتر کہلاتے ہو اور اُتم گدی کا مالک ہے۔ بیٹا چنتا نہ کرو کرموں کی لیلا کو کوئی نہیں مٹا سکتا جو ہم نے کیا اُس کا پھل پا رہے ہیں۔"

دھرو۔ "ماں! بتاؤ کہ سنسار کے دُکھ کسی طرح چھوٹ بھی سکتے ہیں۔"

سُنیتی۔ "بیٹا! سنسار میں کوئی کام کٹھن نہیں۔ آدمی جو چاہے کر سکتا ہے۔ اپنے دُکھ بھی دُور کرنے کٹھن نہیں۔ بھگوان چاہے تو سب کچھ ہو جائے۔ اس لئے بھگوان کو خوش کر کے سب دُکھ دُور ہو سکتے ہیں۔ بھگوان کی سیوا کرو جھوٹ نہ بولو کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ رونے دھونے سے کچھ فائدہ نہیں۔ آنسو پوچھو۔ اور جو کچھ تمہارے پتا نے اُتم کو یونہی دے دیا تم اپنی بھجاؤں (بازوؤں) کے زور سے اُس سے ادھک (زیادہ) حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اُتم بھی تمہارا بھائی ہے۔ اُسے گدی پر بیٹھنے دو اور تم ایشور کے بھگت بن جاؤ تمہیں سب کچھ مل جائیگا۔"

دھرو۔ "اچھا تو ماں! بتاؤ کہ ایشور کہاں ہے؟ میں اُسے ڈھونڈونگا اور اُس کی سیوا کرونگا۔"

سُنیتی۔ "میرے لال میں کہاں بتاؤں کہ ہر (ایشور) کہاں ہے۔ ہر ہر جگہ ہے۔ جل میں۔ تھل میں۔ اکاش میں پاتال میں ہر جگہ ایشور ہے۔ چاند اور سورج میں بھی وہی ہے۔ تاروں کی چمک میں بھی وہی ہے۔ اُس کی جوت آدمی کے من میں بھی ہے۔"

دھرو۔ "پر ماں! تم کہتی ہو ایشور ہر جگہ ہے پھر وہ دکھائی کیوں نہیں دیتا۔ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔"

سُنیتی۔ "بیٹا بھگوان ہر ایک کو نہیں دکھائی دیتے۔ جو لوگ موہ۔ مایا کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ ہر اُن سے دُور رہتے ہیں اور جو لوگ پریم سے اپنی آنکھوں کا جل اُن کے چرنوں پر چڑھاتے ہیں وہ اُنہیں دکھائی دیتے ہیں اُس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔"

دھرو۔ "تو ماں! اگر میں ایشور کو پکاروں تو وہ میری پکار سُن لیں گے؟"

سُنیتی۔ "کیوں نہیں بیٹا! اگر تم سچے دل سے اُنہیں پکارو تو وہ ضرور سُن لیں گے۔ پر بیٹا۔ ایشور کا دھیان کرنے کے لئے آدمی کو سنسار سے الگ رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے رشی اور منی جنگلوں میں ہی رہ کر ایشور کا دھیان کرتے ہیں۔"

دھرو۔ "پر ماں وہ وہاں کھاتے کیا ہیں؟"

سُنیتی۔ "بیٹا! پریم رس سے اُن کا پیٹ ہمیشہ (ہر وقت) بھرا رہتا ہے۔ [illegible] اُنکی بھوک اور پیاس کبھی

اُن کے پاس نہیں آتی "۔

دھرو۔ تو ماں! اگر میں ایشور کا دھیان کروں تو مجھے بھی اُن کا درشن ہوگا"؟

سُنیتی۔ کیوں نہیں بیٹا۔ اگر تم سچے دل سے اُنہیں یاد کرو گے تو کیوں درشن نہیں دینگے۔ پر بیٹا ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے تم ابھی تپسیا کیسے کر سکتے ہو؟"

دھرو۔ ایسا کس لئے ماں! تم ابھی کہہ چکی ہو کہ جو ایشور کے پریم رس کا پیالا پی لیتے ہیں۔ اُنہیں سنسار کا کوئی دُکھ نہیں ستاتا۔ پھر مجھے بن میں کیوں نہیں جانے دیتیں۔ ماں! تم مجھے ضرور جانے دو۔ میں ایشور کی سیوا کرونگا پھر وہ تمہارا اور ہمارا دُکھ دُور کر دے گا"۔

سُنیتی۔ "بیٹا! تپسیا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ تمہارے تو ابھی دُودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔ ابھی پانچ برس کے ہو بن میں شیر، چیتے۔ بھالو سبھی طرح کے جانور رہتے ہیں۔ پھر میرے لال میں تمہیں کس طرح بن میں بھیجدوں۔ اب تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سُکھ چین اگر کوئی ہے تو تم ہو میرے دل کے ٹکڑے میری آنکھوں سے دور مت ہو"۔

دھرو۔ "ماں! میرے مُنہ میں کسی نے اُسی پریم کا پیالہ لگا دیا جس کا نام تم نے ابھی لیا تھا۔ اب میرا دل نہیں مانتا کہ میں یہاں رہوں اب بن میں ضرور جاؤنگا۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ ایشور دیالو ہے۔ وہ مجھے سب چیزوں سے بچائے گا۔ ماں! میرے دل سے راج پاٹ کا دھیان بالکل دُور ہو گیا۔ وہ تو تم ہی کے لئے بھلا معلوم ہوتا ہے میں تو اب ایسے سنگھاسن (تخت) کی کھوج کرونگا جس کے سامنے یہ راج پاٹ دھوں (گرد) کے برابر ہے۔ میں تپسیا کرونگا۔ میں اپنے ہر کو ڈھونڈھنے جا رہا ہوں۔ اُن کا درشن کرونگا۔ ماں! بس میرا دل اپنے ہر کے درشن کے لئے بیاکل (بے چین) ہو رہا ہے۔ آگیا دو (اجازت) (یہ کہہ کر ہاتھ جوڑ کر پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے)۔

دھرو۔ "ماں! جلدی آگیا دو"۔

سُنیتی کے آنسو اور تیز ہو گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "آؤ میرے لال۔ میری آنکھوں کی پُتلی۔ آؤ۔ میرا پتی میرا دھن تھا اُسے کرموں نے مجھ سے چھین کر سُرچی کی گود میں ڈال دیا۔ میرے چاند۔ اب میرا سارا دھن تم ہو۔ میں کیسے چاہوں کہ اسے بھی کوئی لوٹ لے۔ میں بے ہاتھ پاؤں کی ہو جاؤں۔ پر نہیں۔ میرے لال۔ آؤ میں تمہیں تمہارے ہر سے چھُڑانا نہیں چاہتی۔ جاؤ تمہیں تمہارے ہر کے پاس بھیجدوں۔ تم اس کی جی توڑ کے سیوا کرنا۔ (یہ کہہ کر اور رونے لگتی ہے۔ دھرو بھی رونے لگتے ہیں۔ ماں بیٹے کو جھونپڑی کے دروازے تک پہنچانے آتی ہے۔ کئی دفعہ پیار کرتی ہے اور کہتی ہے) جاؤ میرے کلیجے کی ٹھنڈک جاؤ (غریب دھرو بغیر کسی سامان کے وہاں سے چل دیتا ہے۔ صرف ایشور کا پریم اور ماں کی دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ ماں پھر چلاتی ہے) "بیٹا دھرو۔ سنو تو اپنی ماں کو کہاں چھوڑے جاتے ہو" (دوڑ کر اُس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ سینے سے لگا کر بہت دیر تک بیٹھی رہتی ہے۔ آنکھوں کے آنسو [illegible]

نرم بالوں میں جذب ہوتے جاتے ہیں)۔
دھرو۔ ماں! اب مجھے جانے دو۔ ہری مجھے بلا رہے ہیں "۔

(۲)

راجہ کا دربار۔ راجہ ایک جڑاؤ سنگھاسن پر بیٹھے ہیں۔ سونے اور چاندی کے برتن جھم جھم چمک رہے ہیں۔ سنگھاسن کے پیچھے دو آدمی مورچھل رہے ہیں۔ نیچے منتری اور درباری چھوٹی چھوٹی چاندی کی چوکیوں پر بیٹھے ہیں۔ اور اُن میں سے کسی پر لال اور کسی پر ہرے رنگ کے تکیے ہوئے ہیں۔ سب کے چہروں سے پریشانی ٹپک رہی ہے۔ راجہ اور زیادہ بے چین معلوم ہوتا ہے۔ باہر سے آوازیں آرہی ہیں۔ "اُتان پاد کی جے اُتان پاد کی جے"۔ راجہ بے چین ہوکر منتری کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ منتری جی میرا دل اس ہلچل سے بہت بیاکل ہے۔ راتوں کو نیند نہیں آتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔
منتری: "مہاراج اگر چھما (معاف کریں) تو بتاؤں "۔
راجہ: "ہاں۔ ہاں۔ اِس سمے تم سب کچھ کہہ سکتے ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا"۔
منتری: "تو مہاراج! یہ سب نتیجہ سُنیتی مہارانی اور بالک دھرو کے دکھوں کا ہے۔ ہم سب نے مل کر دونوں ماں بالک کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے اور اُسی کا پھل ہے جو ہم بھوگ رہے ہیں"۔
راجہ۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو مگر کیا اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے سے یہ سب دُکھ دُور ہو جائینگے۔
منتری۔ "مہاراج"!
راجہ۔ "آہ۔ میں نے بہت بڑا ظلم کیا۔ ایشور میرے اِس ظلم کو شما کرے۔ منتری جاؤ۔ جلدی جاؤ اور پیارے دھرو کو جلدی لاؤ۔ میری آنکھیں اور دل اُن کے دیکھنے کو بے چین ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ماں۔ بیٹے اِس دُکھ کو جھیل نہ سکیں اور اپنی جان دیدیں"۔ (بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ سُنیتی دربار میں داخل ہوئی)
سُنیتی (ہاتھ جوڑکر) "مہاراج آپ چنتا نہ کریں۔ سُنیتی آپ پر کلنک کا ٹیکا نہ لگنے دیگی۔ آپ اُسے خواہ کچھ سمجھیں وہ آپ کو اپنا ناتھ اور دیوتا سمجھتی ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔ اُس کے دُکھوں کی ساتھی کب ہو سکتی ہے۔ دھرو بھی بہن سروچی کے کہنے سے بن کو سدھار گیا ہے۔ وہاں وہ ایشور کے بھجن گائیگا اور وہ اُسے مرنے نہ دینگے اُسے سب دُکھوں سے بچائیں گے"۔
(راجہ یہ سُنکر چونک پڑا۔ سنگھاسن پر کھڑا ہوگیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا)
سُنیتی یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ پانچ برس کا دھرو اور بن میں ہر کے بھجن بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جلدی بتاؤ کیا تم نے جو کچھ کہا ٹھیک ہے۔ پیاری سُنیتی۔ دیوی سُنیتی جلد بولو۔ میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔

سُنیتی۔ "مہاراج! میں آپ کی داسی ہوں آپ میرے دیوتا۔ آپ مجھے داسی کہئے۔ دیوی کہہ کر مجھے کانٹوں میں مت گھسیٹئے مہاراج!"

راجہ۔ "اچھا سُنیتی! اب اِن باتوں کا سمے نہیں۔ جلدی بتاؤ دھرو کہاں ہے؟"

سُنیتی۔ "مہاراج! میں نے سچ سچ سب کچھ بتا دیا۔ دھرو ہر کی کھوج میں گیا ہے۔"

راجہ۔ ہائے یہ میں کیا سُن رہا ہوں پرتھوی کیوں نہیں پھٹ جاتی کہ میں اُس میں سما جاؤں۔ جاؤ لوگو جاؤ جلدی جاؤ میرے دھرو کو جلدی میرے پاس لاؤ میں اس دُکھ کو نہیں سہہ سکتا۔ دیکھو میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے۔ ہائے سُنیتی یہ تم نے کیا کیا۔ بیٹا دھرو تم کہاں چلے گئے کہیں جانور تمہیں چیر پھاڑ کر نہ کھا جائیں"

سُنیتی۔ "مہاراج اب بیکار ہے اِس چنتا کا کوئی پھل نہ ہوگا۔ اب دھرو کسی کے کہنے سے لوٹ نہیں سکتا ہر کا پریم اُس کے دل میں ایسا سمایا ہے کہ اُس نے میرے آنسوؤں کی کچھ پروا نہیں کی۔ وہ ایسے سنگھاسن کو ڈھونڈھنے گیا ہے جسے آج تک کسی نے نہیں پایا وہ کہہ گیا ہے کہ اگر ہر اُس کو مل گیا تو وہ گھر لوٹ آئیگا نہیں تو اُس کی کھوج میں خود بھی مٹ جائیگا۔"

(سوروچی داخل ہوتی ہے)

سوروچی۔ "پانچ برس کے بچّے پر اتنا گھمنڈ ہے کہ راج سنگھاسن کو بھی کچھ نہیں سمجھتی معلوم ہوتا ہے کہ اب متھرا کا سنگھاسن تجھے ہی ملنے والا ہے۔ کیوں بولتی کیوں نہیں؟"

سُنیتی۔ "سوروچی۔ دھرو تمہارے متھرا کے سنگھاسن کی پروا نہیں کرتا وہ تو اسے دُھول سے بھی کم سمجھتا ہے وہ تو کہتا ہے کہ وہ اب ایسا سنگھاسن ڈھونڈھے گا جس کے آگے متھرا کا سنگھاسن نہیں کے برابر ہے۔"

سروچی نے ہنس کر کہا کیوں نہ ہو جب سنگھاسن چھونے کی بھی کوئی آشا نہ رہی تو اب تم لوگ اور کر ہی کیا سکتے ہو۔ دل کی جلن اسی طرح دور کرو۔ بھکارنی تجھے ایسے بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے لجا (شرم) نہیں آتی۔ راج دربار میں کھڑے ہو کر متھرا کی رانی سے ایسے گھمنڈ سے باتیں کر رہی ہے۔ سپاہیو اس کلنکنی کو مار کر دربار سے نکال دو۔"

(دربار تھرتھرانے لگتا ہے۔ دو آدمی آگے بڑھتے ہیں لیکن اُن کے آنے سے پہلے سُنیتی راجہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتی ہے اور دربار سے چل دیتی ہے۔ آنسو کے قطرے رہ رہ کر اُس کی آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں)۔

(۳)

ایک جنگل جس کے تین طرف پہاڑیوں کے سلسلے جاری ہیں ہرے ہرے پیڑ ہوا کے جھونکوں سے جھول رہے

ہیں۔ ایک طرف پتھریلی پہاڑیوں پر سے پانی بہہ بہہ کر آرہا ہے اور ایک گھاٹی میں جھرنے کی شکل میں گر رہا ہے۔ موروں کی آوازیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھاٹی میں گونجنے لگتی ہیں۔ دھرو اپنے ہری کی کھوج کرتے کرتے یہاں پہنچے سوچا کہ ہری اس سندر گھاٹی میں رہتا ہوگا۔ جھرنے کے پاس ایک شیر بیٹھا ہوا ہے۔

دھرو۔ ہری۔ تم کہاں ہو میں تمہیں ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گیا۔ ہری بولو۔ کہاں ہو (شیر کے دھاڑنے کی آواز آتی ہے دھرو سمجھتے ہیں کہ یہی ہری ہے دوڑ کر اس کے پاس پہنچتے ہیں اس کے گلے سے لپٹ جاتے ہیں اور کہتے ہیں) "بھیا ہری"

ماں نے کہا تھا کہ تم بڑے دیالو ہو مگر تم تو بڑے کٹھور ہو دیکھو آج کے دن گذر گئے بھوکا پیاسا تمہیں ڈھونڈھ رہا ہوں جو ملا میں نے سمجھا کہ وہی ہری ہوگا مگر تمہیں دیا نہ آئی اتنے دن میں ملے ہو بولو اب تو مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ گے۔ بولو۔ تم تو میری بات کا جواب بھی نہیں دیتے (اسکی گردن چھوڑ دی اور ذرا الگ ہو گئے۔ شیر اٹھ کر چل دیا اور ایک جھاڑی میں گھس گیا دھرو چلانے لگے) ہری۔ تم کہاں گئے۔ بولو۔ کہاں ہو۔ بھگوان آؤ مجھ پر دیا کرو۔ میں تمہارا داس ہوں۔ میرے تھکے ہوئے شریر (جسم) کو اپنا ہاتھ پھیر کر آرام دو۔ میں نے سنا ہے تم بھولے بھٹکے لوگوں کو راہ بتاتے ہو۔ غریبوں پر دیا کرتے ہو میں بھی تو راہ بھول گیا ہوں۔ میں بھی تو غریب ہوں پھر مجھے کیوں راہ نہیں دکھلاتے بھگوان! پھر مجھ پر کیوں دیا نہیں کرتے۔ ہری میرا اب سوائے تمہارے کوئی نہیں۔ سوامی مجھے اپنا بنا لو۔ اپنے دھرو کو اپنا سمجھو۔ جنگل کا پتا پتا اور چرند پرند سب جانتے ہیں کہ میں تم کو کب سے ڈھونڈھ رہا ہوں۔ ماں نے کہا تھا تم پھولوں میں بستے ہو۔ میں نے انہیں سونگھا تو تمہاری مہک آئی مگر تم دکھائی نہیں دیتے۔ ماں نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری چمک سورج اور چاند میں ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس میں تمہاری چمک ہے پر میں تو تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہاری باس۔ تمہاری چمک۔ تمہاری شیلتا مجھے جب ہی اچھی لگے گی جب تم میرے سامنے آجاؤ۔ تم آئے اور چلے گئے۔ بھگوان میں نے کونسا پاپ کیا ہے۔ اگر کیا ہے تو تم ایک پاپ کے بدلے میں مجھ سے دور بھاگتے ہو۔ تم اپنے بھگتوں سے کیسا پریم کرتے ہو (جنگل کے کسی کونے سے بین کی آواز آنی شروع ہوئی۔ دھرو نے چونک کر ادھر دیکھا) آہا کیسی مدھر (مست کرنے والی) آواز ہے۔ کیسے سریلے اور میٹھے بول ہیں واہ بھگوان تمہاری بانی میں بھی کتنا رس ہے تم نے میری باتیں سن لیں اب بین بجا کر مجھے سنا رہے ہو میرے بھاگ کتنے اچھے ہیں (بین کی آواز بند ہو گئی۔ ہری ہری کے نغمے ہوائیں گونجنے لگے) اتنے میں سامنے سے نارد منی گیروے رنگ کی دھوتی باندھے سر پر جٹا ایک ہاتھ میں سنکھ دوسرے میں بانسری پاؤں میں کھڑاؤں پہنے جنگل میں داخل ہوتے ہیں۔ دھرو ان کو دیکھ کر ان کی طرف دوڑتے ہیں اور ان کے پاؤں پر گر پڑتے ہیں۔ پھر ہاتھ جوڑ کر پوچھتے ہیں) مہاراج! کیا آپ ہری کو جانتے ہیں وہ کہاں رہتے ہیں بتا دیجئے میں انہیں ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گیا ہوں"

نارد (تھوڑی دیر تک دھرو کو دیکھنے کے بعد) "بیٹا میں ہری کو جانتا ہوں اُن کا بھگت ہوں"۔
دھرو (خوش ہوکر) "تو مہاراج! کیا آپ کرپا کر کے مجھے اُن کے پاس پہنچا دینگے میں اُن کے چرنوں پر پھل چڑھانا چاہتا ہوں"۔
نارد - بیٹا۔ ہری تو سب جگہ ہے ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں وہ نہ ہو پر اُن کا درشن کرنا بڑا کٹھن ہے۔ کوئی اُن تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں راستہ بتا سکتا ہوں مگر تم تو ابھی بالکل بچے ہو۔ بھلا اُسے کیسے پا سکتے ہو۔ اِس عمر میں تم گھر سے کیسے نکل آئے۔ تمہارے ماتا۔ پتا کا کیا حال ہو گا کہ تم اپنے کھیلنے کودنے کے دن ایسے کٹھن کام میں کاٹ رہے ہو"۔
دھرو - "مہاراج اِس میں کٹھنتا (مشکل) کیا ہے اور اگر کٹھن بھی ہے تو اب تو میں نکل پڑا ہوں۔ بھگوان کے دیکھے بنا گھر نہ جاؤنگا۔ میں جب تک ہری کو دیکھ نہ لونگا ایسے ہی بیاکل رہونگا۔ اس لئے مجھے آپ ہری کے گھر کا راستہ بتا دیجئے۔ کچھ چنتا نہیں۔ اگر وہ کنکریلا پتھریلا بھی ہے تو بھی مجھے پھولوں کے سمان معلوم ہو گا"۔
نارد - "بیٹا تم اسے جتنا آسان سمجھ رہے ہو اتنا ہی کٹھن ہے۔ بھگوان دیالو ہیں۔ پریمی ہیں پر اتنی جلدی اپنا درشن نہیں دیتے۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ اپنا یہ دھیان چھوڑ کر گھر لوٹ جاؤ بھلا تم چھوٹے سے بالک اِس بن میں کیسے زندہ رہ سکتے ہو"۔
دھرو - "مہاراج اب تو جو کچھ بھی ہو جب بھگوان کا چولا پہن لیا تو کچھ بھی ہو جنگل ہی میرا گھر ہے اور جنگلی جانور ہی میرے سنگی ساتھی۔ سورج کی گرمی چلی جائے چاند کی ٹھنڈک اور چمک چلی جائے پر میرے دل سے ہری کا پریم نہیں جا سکتا۔ آپ مجھے وہ راستہ دیجئے جس سے میں ہری تک پہنچ جاؤں۔
نارد - "بیٹا تمہارے لئے یہ ٹھیک ہے کہ تم ماتا۔ پتا کی سیوا کرو اُن کے چرنوں کی پوجا کرو ابھی اتنی سی عمر میں وہی تمہارے بھگوان ہیں"۔
دھرو - مہاراج اب تو ہری سے ناتا جوڑا ہے وہی میرے پتا ہیں اور وہی میری ماتا۔ اُنہیں کی سیوا کرونگا۔ انہیں کے چرنوں میں سیس (سر) دھرونگا۔ اُنہی کا پجاری بنونگا۔ اِسی میں میری ماتا کی بھی سیوا ہو جائیگی۔ اِس لئے آپ مجھے راستہ بتا دیجئے"۔

نارد کے دل پر اس گفتگو کا بیحد اثر ہوا اُنہوں نے دھرو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا بیٹا۔ جمنا ندی کے کنارے ایک جگہ ہے جس کا نام مدھوبن ہے وہ استھان (جگہ) ہری کو ڈھونڈنے کے لئے بہت اچھا ہے۔ وہیں جاؤ اور بھگوان کے بھجن گاؤ بھگوان تمہیں ضرور درشن دینگا۔ دیکھو یہی مدھوبن کا راستہ ہے (ایک طرف نارد منی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر کے بانسری بجاتے ہوئے چل دیئے۔ دوسری طرف کمسن بچہ۔ دل میں ہری کے پریم کا رس لئے ہوئے مدھوبن کی طرف چل دیا۔ اُسی وقت ایک کوئل نے کہا پی کہاں۔ دھرو خوشی سے چونک پڑا وہ سمجھا کہ چڑیا کہہ رہی ہے ہری بول۔ زور سے چلا کر کہا ہری بول۔ بارش ہونے لگی۔ جھرنوں کے بہنے کی آوازیں اور تیز ہو گئیں۔

دھرو کے دل میں خوشی کی لہر تھی۔ آسمان پر بجلی کی ایک لہر آئی اور مدھوبن کی طرف چلی گئی)۔

(۴)

گرمی کا زمانہ ہے جیٹھ کا مہینہ۔ سورج کی کرنیں پیپل کے پتوں میں سے چھن چھن کر دھرو کے اوپر گر رہی ہیں وہ آنکھیں بند کئے بھگوان کے دھیان میں لگے ہوئے تھے۔ جنگل کے دوسری طرف دیوتاؤں کا اکھاڑا جما ہوا تھا۔ اندر نے دھرو کی عبادت کا حال دیکھ کر دیوتاؤں کو حکم دیا کہ وہ کسی طرح دھرو کو بھٹکانے کی کوشش کریں۔ دیوتاؤں نے مختلف بھیسوں میں آنا شروع کیا۔ خوفناک شیر آئے اور گرج کر چلے گئے۔ لیکن اُن کی محویت میں فرق نہیں آیا۔ ڈراونا ہاتھی آیا اور چنگھاڑ کر چلا گیا۔ لیکن اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کالے ناگ آئے اور اُن کے مُنہ کے پاس پھنکار ماری لیکن اُنہوں نے بالکل پروا نہ کی۔ کبھی جنگل کے تمام جانوروں نے ایک ساتھ چلا کر جنگل سر پر اُٹھا لیا لیکن سوائے دھرو کے ہر چیز کانپ اُٹھی۔ جب دیوتاؤں کی یہ ترکیبیں کارگر نہ ہوئیں تو طرح طرح کی ڈراونی شکلوں میں آنا شروع کیا۔ عجیب الخلقت بولیاں بولیں۔ نئی نئی ڈراونی شکلیں بنائیں اور دھرو کو ڈرانے کی کوشش کی لیکن اُنہیں کچھ خبر نہ ہوئی وہ ایشور کی یاد میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پریم کے نشے نے اُنہیں مست بنا رکھا تھا۔ جب یہ ترکیبیں بھی نہ چلیں تو ایک دیوتا سوروچی کے بھیس میں آیا اور کہنے لگا۔

سوروچی۔ بیٹا دھرو بس۔ میں نے تم کو بڑا دُکھ دیا۔ لیکن تم نے وہ کچھ کر دکھایا کہ اب تم مجھے اُتم سے بھی (بہت) ادھک سُندر اور پیارے لگتے ہو۔ آؤ۔ بیٹا چلو اور متھرا کے راج سنگھاسن پر بیٹھو۔ راج گدی پر اُتم کی بجائے تم ہی بھلے معلوم ہوگے۔ بیٹا آنکھیں کھولو ساری متھرا کی پرجا تمہاری یاد میں بے چین ہے۔ چلو (وار خالی گیا)

اس کے بعد ایک عورت سُنیتی کی صورت میں بدل کر آئی۔ دو آدمی اُسے گھسیٹ رہے تھے۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے وہ چلا کر بولی بیٹا دھرو آنکھیں کھولو دیکھو میری کیا گت بن رہی ہے۔ ایشور کے بھگت آنکھیں کھول کر دیکھو کہ تمہاری دکھیاری ماں تمہاری یاد میں روتے روتے کیسی بے حال ہو گئی ہے۔ میرے لال بھلا اس جنگل میں کیسے پکاروں۔ آؤ بیٹا جلدی مجھے بچاؤ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ پھر تم کسے ماں کہہ کر پکارو گے۔ بیٹا بھلتے نہیں۔ آتے نہیں۔ کیا تم یہ سب کچھ (سہار) کر سکتے ہو۔ کہ تمہاری ماں کی یہ گت تمہارے سامنے بنے"

(لیکن دھرو کی محویت میں فرق نہ آیا۔ اس کے بعد اُس کے باپ کی شکل اُس کے سامنے آئی)۔

بیٹا۔ میرے بڑھاپے کے سہارے دھرو۔ آنکھیں کھولو میں تمہیں دیکھنے کے لئے کتنا بیاکل تھا۔ بڑی مصیبتوں سے تمہیں ڈھونڈا ذرا میری طرف دیکھ لو۔ کیا تمہارے دل سے پریم بالکل اُٹھ گیا۔ کہ گردن تک اوپر کو نہیں اُٹھاتے۔ کیا اپنے پتا کو اس کے کرموں کا پھل دے رہے ہو بیٹا! نہیں بیٹا ایسا نہ کرو تم تو ایشور کے بھگت ہو میری بُرائیوں کو بھول جاؤ۔ مجھے سکھ سے مرنے دو بیٹا۔

(لیکن دھرو نے ان باتوں کو نہیں سُنا وہ اس وقت بھگوان سے باتیں کر رہے تھے۔ پھر کیسے بولتے تکلیفوں کی انتہا ہو گئی۔ بھگوان دھرو کے سامنے آئے اور بولے)۔

بیٹا دھرو آنکھیں کھو تمہارا ہری تم سے باتیں کرنے آیا ہے۔ تم نے اپنی بھگتی سے اپنے آپ کو اور سارے سنسار کو بڑے دکھوں سے بچایا تمہاری بھگتی نے نہ جانے کتنوں کا کلیان کیا آنکھیں کھولو۔ مجھے دیکھو۔

(دھرو نے آنکھیں کھول دیں دل کی تمنا پوری ہو گئی۔ بھگوان کے درشن ہو گئے اور اُنہیں سب کچھ مل گیا۔ اُنہوں نے دوڑ کر ہری کے چرنوں میں سر رکھ دیا۔ ہری نے اپنے بھگت کو اُٹھایا اور اُسے پیار کیا اور کہا بیٹا کیا چاہتے ہو۔ دھرو کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا۔ وہ بولے "بھگوان تمہاری لیلا بھی عجب ہے۔ مجھ سے پوچھتے ہو کہ کیا چاہتا ہوں۔ بھگوان! کیا تم نہیں جانتے کہ کیا چاہتا ہوں تمہیں تو ہر وستو (چیز) کا حال معلوم ہے۔ ناتھ پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو کہ کیا چاہتا ہوں کیا ابھی دُکھ دینے سے جی نہیں بھرا۔ اگر نہ بھرا ہو تو دھرو اب بھی ہر بات کے لئے تیار ہے۔ بھگوان نے اپنے بھگت کی درد بھری باتیں سنیں تو اُن پر بیحد اثر ہُوا۔ اُنہوں نے کہا "بیٹا دھرو۔ تمہیں میرے لئے بڑے دُکھ اُٹھانے پڑے پر اُنہیں دکھوں نے آج ہم دونو کو ملا دیا۔ تم اب پارس ہو دھرو۔ تم اب ہیرا ہو بیٹا بنا دُکھ کے سُکھ نہیں ملتا۔ جاؤ اب متھرا لوٹ جاؤ تم جو چاہو گے وہ ہو گا۔ تمہیں مرنے کے بعد وہ جگہ ملے گی جو آج تک کسی کو نہیں ملی۔ چاند سورج اور تارے سب اُس کے چاروں (چاروں طرف) اور گھومیں گے۔ اُس میں ہمیشہ پرکاش رہیگا۔ سورج چاند سب مٹ جائیں گے۔ مگر جہاں تم جیسا بھگت رہے وہ جگہ کبھی نہیں مٹ سکتی۔ اچھا بیٹا۔ اب فوراً متھرا کے لئے روانہ ہو جاؤ تمہارے ماتا پتا تمہارے دُکھ میں تمہیں جنگل میں ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اُن سے ملو اور اُن کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچاؤ۔ متھرا کے سنگھاسن پر بیٹھو۔ دھرم سے راج کرو غریبوں پر دیا کرو اُنہیں سُکھ دو اُن سے پریم سے ملو وہ بس پریم ہی کے بھوکے ہیں۔ جاؤ بیٹا۔ دھرو جاؤ"۔

(دھرو نے ہاتھ جوڑ کر بھگوان کے آگے سر جھکا دیا۔ بھگوان نے اپنا سنکھ اُن کے سر پر پھیرا اور آسمان کی طرف اُڑتے ہوئے چلے گئے۔ جنگل میں ایک چمک پیدا ہو گئی۔ جیٹھ کی گرمی ساون کی ہریالی سے بدل گئی)۔

(۵)

دربار میں چاروں طرف منتری اور درباری جمع ہیں۔ دھرو سنگھاسن پر بیٹھے ہیں۔ مورچھل جھلے جا رہے ہیں۔ دربار کا ہر شخص دھرو کو راج گدی پر دیکھ کر بہت خوش ہے۔ متھرا کی پرجا کی تمام مصیبتیں دھرو کے تخت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی دُور ہو گئیں۔ لیکن دھرو کے چہرے پر رنج کے آثار موجود ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ وہ بھگوان کے درشن کر لیں۔ وہ اور کچھ نہیں چاہتے تھے لیکن اُنہیں دُنیا میں آنا پڑا اور اِس لئے دُکھ اور رنج بھی ساتھ ہی آئے۔ منتری نے اُنہیں رنجیدہ دیکھ کر کہا:۔

مہاراج! ہم کتنے بھاگ شالی ہیں کہ آپ جیسا راجہ ہمارا مالک ہے۔ ہم جتنے سکھی ہوں کم ہیں مگر آپ کو سنگھاسن پر بیٹھنے سے دُکھ ہے۔ ہم یہ نہیں دیکھ سکتے۔"

دھرو۔ منتری جی یہ سب ٹھیک ہے مگر اپنے دل کو کیا کروں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ متھرا کے سنگھاسن پر میں نہیں بھائی اُتم بیٹھیں گے۔ پر ایشور کی لیلا سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ شکار کھیلنے گئے اور کسی یکش (راکشش) نے انہیں مار ڈالا۔ ماتا سروچی نے بھی اُن کے دُکھ میں نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ پھر بھلا بتاؤ مجھے کیسے دُکھ نہ ہو۔ میں دن رات اسی شوک (غم) میں رہتا ہوں کہ اپنے بھائی کے لہو کا بدلہ ضرور لونگا۔ یکشوں میں سے جب تک ایک آدمی بھی زندہ رہیگا۔ میری آگ ٹھنڈی نہیں ہوگی۔ اُتم میرا بھائی تھا۔ ایک یکش نے اُسے مار ڈالا۔ میں سب یکشوں سے اُس کا بدلہ لونگا۔ جب تک میں یہ نہ کروں مجھے سُکھ نہ ملے گا۔

(ایک آدمی دربار میں داخل ہوتا ہے۔ "مہاراج! بڑے مہاراج اور مہارانی اپنی کٹی میں جانے کے لئے تیار ہیں)۔

دھرو۔ اچھا چلو۔ ہم سب ماتا جی اور پتا جی کو اُن کی کٹی تک بھیج کر آوینگے۔ بھگوان انہیں بھی ضرور درشن دیں گے۔ وہ بڑے سندر ہیں۔

طبّی چٹکلے

لہسن کی ایک پوتھی پاؤ بھر دُودھ میں ملا کر پینے سے سانپ کا زہر زائل ہو جاتا ہے۔

گیہوں کے دانے آک (اکھا) کے دُودھ میں تین روز رکھیں۔ پھر جو جانور کھائیگا بے ہوش ہو جائیگا۔

چونے کا پانی اور السی کا تیل ملا کر لگانے سے جلی ہوئی جگہ پر ٹھنڈک پڑ جاتی ہے اور آرام ہو جاتا ہے۔

ایک پاؤ دُودھ میں ۴ رتی سونٹھ پیس کر ملانے اور پینے سے ہچکی بند ہو جاتی ہے۔

ست پودینہ اور صابن پانی میں حل کر کے غسل کریں۔ اس سے جُوں پیدا نہیں ہوتی۔

چائے کا پانی زیادہ نہ پکایا کرو۔ صرف ایک جوش پر اُتار لیا کرو۔ چائے نہایت مزے دار ہوگی۔

انڈہ چونے کے پانی میں رکھنے سے دیر تک گندہ نہیں ہوتا۔

ٹین کے ڈبہ میں کھانے کی چیز اپنی میعاد سے پہلے خراب ہو جاتی ہے۔

چند دلچسپ مقولے

(۱) تقدیر پر بھروسہ کرتے ہوئے تدبیر کو نہ چھوڑو۔

(۲) کسی کام میں جلدی نہ کرو۔

(۳) کسی کے مکر و فریب میں نہ پھنسو۔

(۴) ترقی کے لئے نااتفاقی زہر قاتل ہے۔

(۵) ہمیشہ اپنے وعدہ کو پورا کر کے دکھانا جوانمردی ہے۔

(۶) پچھلی کی ہوئی نیکیوں کو بھول کر آئندہ کی بُرائیوں سے بچنا اخلاق حمیدہ ہے۔

(۷) بے تکلفی یا سادہ زندگی ہمیشہ بہتر اور محمود ہوتی ہے۔

(۸) دوسروں کی کمائی ہوئی دولت کو ہاتھ نہ لگاؤ بلکہ خود کمانے کے قابل بنو۔

(۹) روپے کما کر پیسے خرچ کرنا کفایت شعاری میں شامل ہے۔

(۱۰) کسی شخص کی شکایت کرنا سخت عذاب ہے۔

(از ایچ۔ آئی۔ مومن اُردو سکول ٹیچر شہرا تُلی، ضلع دھارواڑ)

عقل و فراست نے وزارت دلوائی

شہاب الدین شاہجہان

کلک کو قوتِ تحریر عطا کر یارب طبع کو مہر کی تنویر عطا کر یارب
نظم کو حسنِ جہانگیر عطا کر یارب میری تقریر کو تاثیر عطا کر یارب

اوج افسانہ کا تاریخ سے بالا کر دوں
بزم میں شمعِ فراست کا اوجالا کر دوں

جب جہانگیر ہوا تیر قضا کا نخچیر مسند آرائے حکومت ہوا فرزندِ کبیر
مملکت نورِ شہابی سے ہوئی پُر تنویر شاد و مسرور تھے بھارت کے کبیر اور صغیر

شہاب الدین

فیضِ اخلاق سے سلطانِ جہاں بن بیٹھا
ہو کے مقبول زماں شاہِ جہاں بن بیٹھا

شاہِ ایران کو اس بات کی پہنچی جو خبر جانب ہند روانہ کیا اک نامہ بر
خط میں لکھا تھا مبارک تمہیں تخت و افسر اختیار اب کوئی موزوں سا لقب کر لو مگر

در جہاں ہند چو یک موج بہ دریا باشد
لقبِ شاہجہاں بر تو نہ زیبا باشد

شاہ آئینۂ حیرت ہوا سُن کر یہ پیام عقلا اور ادبا بھی ہوئے خاموش تمام
اس نے اعلان کیا دوں گا بہت کچھ انعام کسی صورت دلِ مضطر کو جو ہو گا آرام

جو لکھے اس کا جواب اس کو بہت زر دونگا
اور تو اور وزیر اپنا اسے کر دوں گا

دیکھا اعلان یہ سعد اللہ ذی ہوش نے بھی — اپنے آقا سے بصد شرم و ادب عرض یہ کی
میں اتالیقِ غریب آپ امیر اور سخی — دُرِ مقصود سے بھر دیجئے میری جھولی
در شاہی تک اگر میری رسائی ہو جائے
شاہ ایران میں اور شہ میں صفائی ہو جائے

عبدِ مومن متبسم ہُوا حیراں بھی ہُوا — بات سے طفلِ دبستاں کے پریشاں بھی ہُوا
گلِ خنداں بھی ہُوا شعلہ بداماں بھی ہُوا — اپنے جذبات پہ خود آپ پشیماں بھی ہُوا
سرخرو ہو گیا خوشنودیٔ خاطر کر کے
دم لیا سعد کو دربار میں حاضر کر کے

دیکھ کر سعد کو سلطاں ہوئے یوں گویا — دامنِ عقل میں کیا حل ہے مری مشکل کا
سعد نے شاہ کو لپٹا ہُوا پُرزہ سا دیا — خطِ گلزار میں کاغذ پہ تھا یہ شعر لکھا
یہ عدد ہند و جہاں ہر دو برابر باشد
لقب شاہجہاں بر تو مقرر باشد

شاہ مسرور ہُوا پڑھ کے یہ پاکیزہ جواب — لکھ کے مکتوب روانہ کیا ایراں کو شتاب
سعد نے پائی وزارت بصد اعزاز و خطاب — بعد کو خاں تھا اور نام کے آگے نواب
(نواب سعد اللہ خاں)
دولتِ فہم و فراست سے وزارت بھی ملی
گہر و زر بھی ملا عزت و حشمت بھی ملی

طالب الہ آبادی

محبت

سمجھتے ہیں جسے ہم زندگانی وہ محبت ہے — محبت سے الگ جو کچھ ہے اُس کو موت کہتے ہیں

دولت مندی

ایک ہو دیوانِ حافظ دوسری گیتا جلی — ہوں یہ دو چیزیں تو پھر انسان دولتمند ہے

دل کی بات

حالت ہماری رات چھپائے نہ چھپ سکی — آنکھوں سے دل کی بات چھپائے نہ چھپ سکی

پاکبازی کی ایک بہترین مثال

(از پنڈت شیوناتھ صاحب کول شاکر ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ کسٹمس اینڈ ایکسائز گوالیار گورنمنٹ)

حکم پدر میں عذر نہ کچھ رام نے کیا
بارہ برس کے واسطے بن باس لے لیا

لچھمن بھی اُنکے ساتھ تھے سیتا بھی ساتھ تھیں
اُن میں سے ساتھ ایک نے چھوڑا نہ رام کا

بن باس لیکے بن میں وہ پھرتے تھے رات دن
سامان حفظ و امن کا ساتھ اُنکے کچھ نہ تھا

اک روز رام چندر اکیلے نکل گئے
جنگل میں۔ اور ساتھ نہ تھا کوئی دوسرا

لچھمن نہ پھرتے کس لئے اُن کی تلاش میں
حد سے زیادہ اُنس تھا بھائی کو بھائی کا

سیتا اکیلی رہ گئی تھیں ایسے دشت میں
جس میں سوائے عالمِ ہُو اور کچھ نہ تھا

پھر کیا تھا آکے راون بدکیش اُس جگہ
دامِ بلا میں اپنے اُنہیں پھانسنے لگا

ظالم نے پھر تو ایک بھی اُنکی نہیں سُنی
جبراً اُٹھا کے گود میں لنکا کو چل دیا

جب واپس آئے لچھمن و رام اُس مقام پر
سیتا نہیں ملیں۔ تو بڑا فکر ہو گیا

اس فکر و غم میں ہو کے پریشان و مضطرب
سیتا کو ڈھونڈھنے لگے جنگل میں جابجا

اس جستجو میں رام کو رستے میں یک بیک
زیور زمین پر نظر آیا پڑا ہُوا

مشکوک رام ہو گئے زیور کو دیکھ کر
فوراً اُسے وہاں سے اُنہوں نے اُٹھا لیا

زیور دکھا کے پوچھا برادر سے رام نے
سیتا کے جسم سے تو نہیں ہے یہ گر پڑا

لچھمن بھی دیکھ کر اُسے بولے یہ رام سے
زیور یہ غالباً ہے گلے میں پہننے کا

سیتا سے چار آنکھ کبھی میں نے کی نہیں
سر اُنکے آگے رہتا تھا ہر وقت خم مرا

جب اُن سے بات کرنے کا ہوتا تھا اتفاق
رہتا تھا رُخ تو پاؤں کی جانب نگاہ کا

کیونکر کہوں میں کس کا یہ زیور ہے بھائی جان — میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ بتاؤں کیا
زیور اگر یہ پاؤں کا ہوتا ۔ تو واقعی — پہچاننے میں ہوتی نہ دِقت مجھے ذرا
واقف نہیں ہے کون ۔ اسے جانتے ہیں سب — مُفلس ہو ۔ یا امیر ہو ۔ چھوٹا ہو ۔ یا بڑا
پاکیزگی کی ایسی یہ عمدہ مثال ہے — سُنتا ہے جو اسے وہی کہتا ہے مرحبا
بھائی کو اُنس بھائی کا یوں ہو تو بات ہے — بھابی کا یوں کرے جو ادب وہ ہے پارسا
جس کو بڑوں کا پاسِ ادب ہے ۔ بڑا ہے وہ — جو صدق دل سے نیک ہے ۔ کیا اُس کا پوچھنا

ہر نوجوانِ ہند اسے پڑھ کے لے سبق
شاگر اگر ہے کچھ ۔ تو یہ ہے میرا مدعا

قیصر جرمنی کے دس اصول

مندرجہ ذیل اصول جرمنی زبان میں ایک کاغذ پر چھپے ہوئے ہر وقت قیصر ولیم سابق شہنشاہ جرمنی کی میز پر رکھے رہتے تھے اور وہ ان پر عمل پیرا تھا۔

(۱) تکلیف کے وقت ثابت قدم رہو۔

(۲) وہ چیز جو حاصل ہی نہیں ہو سکتی ۔ اسکی خواہش کرنا بیکار ہے

(۳) دن جیسا گذر رہا ہے اسے صبر و سکون سے گزار دینا چاہئے۔ ہر بات کے روشن پہلو کو دیکھنا چاہئے۔

(۴) قدرت اور خلقت کو دیکھ کر خوش ہوا کرو ۔ اور وہ جس حالت میں ہیں اسی میں انہیں پسند کرو۔

(۵) اگر تمہارے ہزار گھنٹے تلخی سے گذریں تو ان کی تلافی صرف اس ایک گھنٹے کے اندر سمجھ لو جو آرام سے گذرا ہے۔

(۶) اپنی زبان سے وہی بات نکالو جو بہترین ہو ۔ خواہ اس کے بدلے میں کوئی تمہارا شکریہ ادا کرے یا نہ کرے جو شخص اس پر عمل کرتا ہے ۔ وہ حقیقت میں آزاد ، خوش اور قابل فخر ہے اور اسکی زندگی ہمیشہ خوشنما رہے گی ۔ جو شخص قابل اعتبار نہیں وہ دوسروں کی بے عزت کرتا ہے اور اپنے آپکو نقصان پہنچاتا ہے۔

(۷) ہمارا فرض ہے کہ ہر شخص کو اُس وقت تک نیک جانیں جب تک کہ اس کے خلاف ہمارے پاس کافی ثبوت موجود نہ ہوں

(۸) اگر ہمیں کوئی شے تکلیف دیتی یا نقصان پہنچاتی ہے ۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ خلقت کے فائدہ کے لئے نہیں ہے۔

(۹) اس دُنیا کی ہر شے میں خواہ وہ مردہ ہو یا زندہ اُس زبردست اور ہمہ داں قادر مطلق کی مرضی ضرور ہوتی ہے گو ہم اپنے طبقے کے انسان اسقدر فہم و فراست نہیں رکھتے کہ اس کی کنہ سمجھ سکیں۔

(۱۰) اس دُنیا میں جو شے جس طریقے پر موجود ہے ۔ اسے اس طریقے پر رہنا ضروری ہے خواہ وہ کسی حالت میں کیوں نہ ہو۔

فسانہ نگاری کا فسانہ

یعنی

مختصر فسانہ نویسی کی مختصر تاریخ

(از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ایڈیٹر اخبار عروج)

تمہید

لٹریچر کی تاریخ میں شاید ہی کوئی چیز اتنی قدیم ہو جس قدر قصے اور فسانے کا وجود قدیم ہے۔ اردو میں قدیم ترین کتابوں میں سے کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لو۔ خواہ وہ کسی علم و فن کے متعلق ہو۔ تم اُسے قصوں سے مملو پاؤ گے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ نظم میں کہے گئے ہوں یا نثر میں بیان کئے گئے ہوں۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ جس قدر لگاؤ۔ جتنا رجحان اور جتنی دلچسپی طبائع انسانی کو قصوں کے ساتھ ہے اتنی دوسرے علوم کے ساتھ نہیں۔ اس عام رجحان اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے مذہبی رہنماؤں اور معلمین نے بھی گذشتہ زمانوں میں جو کچھ کہا عام طور پر تمثیلوں اور حکایتوں کے پیرائے میں کہا۔ تاکہ لوگ دلچسپی اور شوق کے ساتھ اُن کی کتابوں کو پڑھ بھی لیں۔ اور اُن سے اپنی طبیعت اور استعداد کے موافق فائدہ بھی اٹھا لیں۔ توریت اور انجیل کے صحائف اور ہتوپدیش اور حکایات لقمان کی کہانیاں ہمارے دعوے کا بین ثبوت ہیں۔ جو آج بھی اُسی عقیدت و جوش اور اُسی قدر دلچسپی و شوق سے پڑھی جاتی ہیں جیسی کہ اُس وقت پڑھی جاتی تھیں۔ جب کہ وہ بیان کی گئیں اور پھر اُس وقت جبکہ وہ احاطۂ تحریر میں آئیں۔

اس حقیقت سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہر ملک کے قدیم ادب میں سینکڑوں اور ہزاروں ایسی کتابیں موجود ہیں۔ جن کا مقصد ہی لوگوں کی دلچسپی کے لئے قصے اور داستانیں بیان کرنا تھا۔ اس قسم کی ساری

کتابوں کا نہ احاطہ کیا جاسکتا ہے اور نہ اُس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے۔

قصوں کی بیسیوں اقسام ہیں اور ہر ایک قسم متعدد شعبوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے اور اگر اُن سب کی تشریح تاریخ کی روشنی میں کرنے بیٹھیں تو بلا مبالغہ کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔ لہذا قصے کی تمام دیگر اقسام کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہاں محض مختصر قصوں کی تاریخ اور اُردو میں اُس کی وسعت" پر نہایت اختصار کے ساتھ کچھ بیان کریں گے۔

میں یہ مضمون ایسی حالت میں سپرد قلم کر رہا ہوں جب کہ پانچ سات روز کے لئے عارضی طور پر دفتر "رہنمائے تعلیم" میں مقیم ہوں نہ یہاں میرے پاس کتب کا ذخیرہ ہے جس سے مستفید ہو سکوں نہ مضمون کے لائق میٹیریل ہے جس سے استفادہ کر سکوں۔ لہذا یقین ہے کہ مضمون میں بہت سی نمایاں خامیاں رہ جائیں گی۔ صاحب ذوق ناظرین کے سامنے ایسا نامکمل اور ادھورا مضمون پیش کرتے ہوئے مَیں سخت شرمندہ ہوں۔ مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ کہ اس بے سروسامانی کی حالت میں مضمون مرتب کیا جاتا۔ کیونکہ رسالہ تیار ہے بہت سی کاپیاں چھپ چکی ہیں اور اب نہ فرصت ہے نہ مہلت کہ اطمینان سے بیٹھ کر مضمون مرتب کیا جاسکے۔ لہذا نہایت جلدی میں جو کچھ لکھ سکا لکھ کر کاتب کے حوالے کر رہا ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو کسی وقت فرصت میں اس مضمون کو تفصیلی طور پر بیان کروں گا۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ

مختصر فسانہ نویسی کی تاریخ

بے انتہا طویل قصوں کے ساتھ مختصر فسانوں کا رواج بھی ہر ایک ملک میں قدیم سے چلا آتا ہے۔ عہدِ پیشین کے چند متمدن ممالک کا حال یہاں لکھا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ہندوستان کا ذکر کریں گے۔ کیونکہ اُسے تہذیب و شائستگی میں تقدم زمانی بھی حاصل ہے۔ اور اس قسم کے لٹریچر کی یہاں کثرت بھی پائی جاتی ہے۔

ہندوستان قدیم

سنسکرت یہاں کی قدیم زبان ہے۔ جو وسط ایشیا کے آرین اپنے ساتھ لائے تھے۔ شاید ہی کسی زبان میں قصص و حکایات کا اس قدر کافی ذخیرہ موجود ہو جس قدر سنسکرت میں ہے مختصر فسانے اس زبان میں بھی سینکڑوں اور ہزاروں لکھے گئے اور لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئے۔ لیکن اُن میں سب سے زیادہ شہرت اور قبولیت غالباً اُس مجموعۂ حکایات کو حاصل ہوئی جس کا نام ہتوپدیش ہے۔ ہندوستان سے نکل کر دنیا کی بیسیوں زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ اور سینکڑوں ایڈیشن اُس کے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ کہنے کو یہ صرف دو گیدڑوں کا قصہ ہے۔ مگر باکمال مصنف نے کتاب میں ادب۔ اخلاق اور سیاست کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ ہندوستان کی دنیا اسے "انوار سہیلی" کے نام سے جانتی ہے۔

سنسکرت میں مختصر فسانوں کی دوسری مشہور کتاب "شکا سپ تتی" ہے۔ جس میں ایک طوطے کی زبان سے ستر کہانیاں کہلوائی گئی ہیں۔ اُس وقت جب کہ طوطے کا مالک پردیس گیا ہوا تھا۔ اور گھر کی مالکہ شوہر کی عزت ڈبونے کے لئے تیار

بیٹھی تھی۔ ان کہانیوں کے ذریعے سے عقلمند طوطے نے بیگم کو اُس وقت تک کسی فعل شنیع کے اقدام سے روکے رکھا تھا۔ جب تک کہ گھر کا مالک واپس آیا۔ اس کتاب کو بھی بڑی قبولیت حاصل ہوئی اور اُس کا بھی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ "طوطا کہانی" اس کا معروف اُردو نام ہے۔

"سنگھاسن بتیسی" تیسرا مجموعہ کہانیوں کا ہے۔ جو مہاراجہ بکرماجیت کے سنگھاسن (تخت) کی بتیس پتلیوں نے مہاراجہ بھوج کے سامنے بیان کیں۔ اس کتاب کا بھی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

"بیتال پچیسی" ایک اور کتاب ہے۔ جو ۲۵ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا بھی ہندی اور اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

سنسکرت کے زوال کے بعد پالی زبان میں بُدھ کی پیدائش کے متعلق "جاتکا" کی کہانیاں اس قدر مقبول ہوئیں کہ بعد کے زمانہ میں یونانیوں نے ایسپ کی کہانیاں انہیں کے تتبع میں تصنیف کیں۔

غرض یہ کہ ہندوستان میں یہ فن انتہائی عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ جو کتاب بھی لکھی جاتی تھی فسانہ کا اُس میں ضرور دخل ہوتا تھا۔ لوگ بڑے شوق سے رامائن اور مہابھارت کی کتھائیں پڑھتے تھے اور اُن کو مذہبی کتابوں کی مانند محبت اور عقیدت سے رکھتے تھے۔ اور اب تک بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

مصر

جس وقت ہندوستان اپنی قدیم تہذیب و شائستگی میں ترقی کر رہا تھا۔ اُس وقت مصر بھی متمدن ممالک میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اہرام مصری اس تمدن کا زندہ ثبوت اس وقت بھی موجود ہیں۔ ہمیں اس کے قدیم لٹریچر پر عبور نہیں۔ مگر برٹش میوزم میں مصر قدیم کی جو یادگاریں رکھی ہوئی ہیں اُن میں فسانے بھی شامل ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ فسانے آج سے قریباً چار ہزار برس پیشتر کی تصنیف ہیں۔ اس امر سے مصریوں کے شوقِ فسانہ نگاری کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

یونان

یونان بھی اپنی تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے قدیم زمانہ میں ایک نمایاں ملک رہ چکا ہے۔ جس کے تذکرے اب تک زبانوں اور کتابوں میں موجود ہیں۔ تم اُس کے تمام لٹریچر کو دیوتاؤں اور دیویوں کے دراز کار اور خلافِ قیاس و عقل فسانوں سے بھرا ہوا پاؤ گے۔ ہومر کے قصّے آج بھی چھپتے اور بکتے ہیں۔ ایسپس ٹیلز کی تخلیق بھی یونانیوں ہی کی رہینِ منت ہے۔ مابعد کے زمانہ میں اس دلچسپ کتاب کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور بہت سی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اُردو میں ان حکایات کا منظوم اور دلچسپ ترجمہ پیرزادہ محمد حسین نے کیا تھا اور حکایات لقمان کے نام سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

ایران

ایشیائی ممالک میں ایران کی تہذیب نہایت قدیم ہے اور وہاں کی زبان شیریں اور لوچدار ہونے کی وجہ سے فسانوں اور قصّوں کے لئے خاص طور پر موزوں بھی ہے۔ پس وہاں بھی بکثرت قصے رائج تھے۔ بادشاہ اور امرا کے ہاں داستان گو باقاعدہ طور پر حاضر رہتے تھے۔ اور وہ سلطنت کا ایک ضروری جزو سمجھے جاتے تھے کیونکہ اُس زمانہ میں قصّہ کہہ کر اور داستان بیان کر کے بادشاہ کا دل خوش کرنا بجائے خود سلطنت کا کام کرنا تھا۔ ایران کی قدیم زبان پہلوی تھی۔ نوشیرواں کے عہد میں حکیم برزویہ

ہندوستان آیا اور ہتوپدیش کے منہ پر پہلوی نقاب ڈال کر چپکے سے ایران لیگیا۔ اور اس عروس نو کو شہنشاہ کے حضور پیش کر دیا۔ پس پہلوی زبان وہ اولین زبان ہے۔ جس میں ہتوپدیش کا بلاواسطہ ترجمہ ہوا۔

اگرچہ تھوڑے ہی عرصہ بعد شہنشاہیت ایران کی کشتی اسلام کی زبردست چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی مگر فارسی لٹریچر اُسی طرح آزاد و خود مختار رہا۔ بعد کے زمانہ میں وہاں خود مسلمان ادیبوں نے ایسے ایسے رنگ برنگ اور خوبصورت گلدستے فسانوں اور حکایتوں کے ترتیب دیئے کہ آج تک اُن کی بھینی بھینی خوشبو سے گلستانِ فارس مہک رہا ہے۔ ان گلدستوں میں سب سے زیادہ قبولیت اور شہرت اُس گلدستہ کو حاصل ہوئی جو "گلستاں" کے نام سے ایک چابکدست باغبان نے جس کا نام مصلح الدین سعدی شیرازی تھا۔ ۶۵۶ھ ہجری میں آٹھ رنگ کے پھولوں سے ترتیب دیا۔ جس وقت یہ لطیف و نازک گلدستہ باغ ادب میں لاکر سجایا گیا۔ تو اُس کی مشام جاں بخش سے سارا باغ مہک اُٹھا۔ بچے دوڑے کہ اسے اپنے آغوش میں لے لیں۔ جوان بھاگے کہ اُسے اپنے دامن میں چھپالیں۔ بڈھوں نے بھی للچائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور کہا کیسا اچھا گلدستہ ہے۔ جب اس کی خوشبو پھیلی اور شہرت بڑھی تو ملک ملک کے فوٹوگرافر غول کے غول آئے اور اُس کے فوٹو اُتار کر اپنے اپنے ملک میں لیگئے۔ اور چھاپ چھاپ کر ہزاروں لاکھوں روپے کما لئے۔ ہنرمند کا کمال دیکھو آج اگرچہ گلدستہ آٹھ سو سال کا پُرانا ہو چکا ہے۔ مگر نہ اُس کی تازگی میں فرق آیا اور نہ خوشبو کم ہوئی۔

مولوی جلال الدین رومیؒ ایک اور باکمال مصور تھے۔ جنہوں نے منظوم اخلاقی کہانیوں کا وہ دلفریب مرقع تیار کیا جس کے متعلق لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ۔۔ مثنوئ مولوی معنوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی

"چہار مقالہ" کو بھی فارسی ادب میں کچھ کم شہرت حاصل نہیں جو احمد بن عمر بن علی النظامی العروضی السمرقندی کی تصنیف اور چار بابوں پر مشتمل ہے۔ جس میں مصاحبتِ سلطان۔ صلاحیتِ شعر۔ نکاتِ علم ہیئت اور فن طب سے بحث کی گئی ہے۔ اور ہر ایک باب کو بڑی دلچسپ اور متعلقہ تاریخی حکایتوں سے زینت دی گئی ہے۔ یہ کتاب سعدیؒ سے ایک سو سال پہلے سنہ ۵۵۰ھ میں مرتب کی گئی تھی

ادب و لٹریچر کی بڑھتی ہوئی رو کے ساتھ حکیم برزویہ کے زمانہ کی زبان متروک الاستعمال ہو چکی تھی۔ ضرورت تھی کہ کلیلہ دمنہ کو نیا لباس پہنا کر پھر دلہن بنایا جائے۔ سامانیوں کے زمانہ میں رودکی شاعر کو یہ خدمت تفویض ہوئی۔ بیچارہ آنکھوں سے معذور تھا مگر دماغ سے کام لیکر اور ہاتھوں سے ٹٹول کر اُس کے لئے ایک منظوم ملبوس تیار کر ہی دیا۔ رودکی کو اگرچہ مشاطہ گری کا انعام زر و جواہر کی شکل میں دربار شاہی سے مل گیا مگر تماشائی اس طرف کچھ زیادہ متوجہ نہ ہوئے لیکن بعد میں ملا حسین واعظ کاشفی نے امیر سہیلی کے ایما سے ایسا چست اور چمکتا ہوا جامہ اس کیلئے تیار کیا۔ کہ جس نے دیکھا پھڑک اُٹھا۔ "انوار سہیلی" کو آج کون نہیں جانتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض کام ایسے مبارک اوقات میں کئے جاتے ہیں کہ صدیوں تک قائم رہتے ہیں۔ اسی انوار سہیلی کو دیکھو کس قدر اُس نے شہرت پائی۔ ایران تو الگ رہا۔ ہندوستان میں بھی اس نام کو بیحد فروغ حاصل ہوا۔ سب سے اول

اکبر کے حکم سے ابوالفضل نے عیار دانش کے نام سے اس کو نسبتاً آسان اور سلیس زبان میں مرتب کیا اور جو دو باب ملا صاحب نے چھوڑ دئے تھے وہ بھی شامل کر دیئے۔ علاوہ ازیں انوار سہیلی کی طرز پر ہندوستانی ادیبوں نے بعض اور کتابیں بھی فارسی زبان میں مرتب کیں۔ جیسے سبستان عشرت۔ بہار دانش اور طراز دانش وغیرہ

کچھ انہیں پر موقوف نہیں ان کے علاوہ بھی بہت سے مختصر قصے اور قصوں کے مجموعے فارسی میں لکھے گئے۔ جن کی تفصیل حد بیان سے باہر ہے۔ کہاں تک بیان کریں اور کس کس کا تذکرہ کریں۔

عربی زبان کے فسانے

قدیم عربوں میں اگرچہ لکھنا پڑھنا شرفا کے لئے عیب گنا جاتا تھا۔ مگر اُس وقت قصوں اور فسانوں کا ایک سمندر تھا۔ جو اُمڈا چلا جا رہا تھا۔ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک بات کے متعلق بیسیوں اور سینکڑوں قصے لوگوں کی زبانوں پر تھے۔ لوگوں کو چاندنی راتوں میں اپنے خیموں کے سامنے بیٹھ کر اپنے بزرگوں کی داستانیں سننے میں وہی لطف آیا کرتا تھا۔ جو میدان جنگ میں داد شجاعت دینے سے اُن کو آتا تھا جس کیلئے وہ ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ہر ایک ضرب المثل کے ساتھ ایک سچا واقعہ ضم تھا۔ کہ وہ مثل کس طرح شروع ہوئی اور کس طرح اس کا رواج پڑا۔ اسلام آیا۔ تو اُس نے پرانی جہالت کا جنازہ گہرا گڑھا کھود کر دبا دیا اور قانون نافذ کر دیا کہ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ (علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کا فرض ہے) اور کہدیا کہ اگر چین کے دور دراز ملک میں بھی علم حاصل کرنے کے لئے جانا پڑے تو جاؤ اور ضرور جاؤ (اطلبوا العلم ولو کان بالصین) پھر کیا تھا اس پیغمبرانہ ارشاد کو سنتے ہی ہر شخص دیوانہ وار طلب علم میں لگ گیا۔ جنگ کے قیدی صرف اس وعدہ پر چھوڑے جانے لگے کہ وہ ایک مسلمان بچے کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ مملکت روم کا خراج صرف اس بنا پر معاف کر دینے کا وعدہ کیا گیا کہ قیصر روم قسطنطنیہ کے ایک فلسفی کو فلسفہ کا درس دینے کے لئے بغداد بھیجدے۔ چنانچہ جب عرب کے لوگ حکومت کے ساتھ علم کے بھی مالک ہو گئے تو قصص اور حکایات کا وہ سارا خزانہ جو اب تک سینوں میں پوشیدہ اور زبانوں پر جاری تھا۔ قلم کے ذریعہ سے دنیا میں پھیلنے لگا۔ فہرست ابن ندیم اور کشف الظنون کے دیکھنے سے ایک لمبی اور طول طویل فہرست قصوں۔ فسانوں اور حکایتوں کی کتابوں کی تیار ہو سکتی ہے جو مسلمانوں نے عربی میں لکھیں۔ یہاں صرف نمونتہً دو کتابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

بنو امیہ کے زمانہ میں ابن المقفع غالباً پہلا شخص ہے۔ جس نے فارسی قصوں کو عربی قالب میں ڈھالا۔ اسی نے سب سے پہلے حکیم برزویہ کے پہلوی ترجمے سے "ہتوپدیش" کا ترجمہ کیا۔ اور یہی ترجمہ بنیاد ہے ہتوپدیش کے اُن تمام تراجم کی جو دنیا کے مختلف ممالک نے بعد کے زمانہ میں مز اس وقت تک کئے۔ اگر یہ ترجمہ نہ ہوتا تو غالب گمان تھا کہ یہ کتاب کبھی کی قعر گمنامی میں غرق ہو جاتی اور کوئی نہ جانتا کہ ہندوستان کی سرزمین میں ایک گوہر شب چراغ مدفون ہے۔

"الف لیلہ" عربی زبان کا وہ دوسرا مہکتا ہوا پھول ہے۔ جو ساری دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ دراصل

یہ اُس وقت کی تمام مہذب دنیا کے بہترین فسانوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ اور کون شخص اس حقیقت کی تردید کر سکتا ہے کہ یورپ فن فسانہ نویسی میں اپنے انتہائی عروج کے بعد بھی آج تک الف لیلہ کا ثانی پیدا نہ کر سکا۔ بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ یورپ کی موجودہ فسانہ نگاری کی بنیاد ہی اس لاجواب اور عدیم المثال کتاب پر رکھی گئی۔ جس پر آج اتنی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے۔ جس کو دیکھ کر دنیا حیران ہو رہی ہے۔ (اس کی بہت ہی مختصر تفصیل میں آگے چل کر عرض کروں گا)

لطافت بیان اور ایجاد خیال میں یہ کتاب اپنی نظیر آپ ہے۔ زبان کی شیرینی کا حال یہ ہے کہ اگرچہ قریباً ساری کتاب کی تعمیر کی بنیاد خالص تخیلاتِ ہوائی پر رکھی ہوئی ہے۔ لیکن سحر طراز مصنف نے اس میں وہ جادو بھر دیا ہے کہ کم از کم چند لمحوں کے لئے تو اچھا بالغ النظر اور صحیح الدماغ انسان بھی شک میں پڑ جاتا ہے کہ شاید یہ واقعات صحیح ہوں۔ یہ تو کیفیت ہوئی لطافت بیان کی۔ اب ایجاد خیال کو لیجئے تو کتاب تخیلات کا ایک ایسا بحر ناپیداکنار نظر آتی ہے۔ جس سے بعد کے سینکڑوں قصّہ نویسوں نے تخیل کی روانی مستعار لی ہے۔ فارسی زبان کے بکثرت قصّے آپ کو لٹریچر میں ایسے ملیں گے۔ جن کے چہروں پر سے الف لیلہ کا عربی غازہ اتار کر فارسی کا اُبٹنا مل دیا گیا ہے۔ ایک بڑا کمال اس کتاب کا یہ ہے کہ اس میں فسانہ نگاری کے تمام مقررہ اور مروجہ اصول و ضوابط سے بڑی کامیابی کے ساتھ کام لیا گیا ہے۔ ہم اس کتاب کی حیرت انگیز قبولیت کا ایک عجیب و غریب واقعہ آگے چل کر بیان کریں گے۔

ادب اور انشا پردازانہ نقطۂ نظر سے دیکھیں تو کتاب ایک نمائش گاہ معلوم ہوتی ہے۔ جہاں کی ہر چیز نرالی ہے۔ ہر شے انوکھی ہے۔ ہر سبزی دل کو موہ لینے والی ہے اور ہر نظارہ آنکھوں میں کھب جانے والا ہے۔

علوم کے لحاظ سے اگر اس کا مطالعہ کیا جائے۔ تو وہ فلسفہ و منطق۔ طبعی و نجوم۔ علم النفس اور اصول اخلاق کا بھی مخزن معلوم ہوتی ہے۔

ان علوم و فنون کے علاوہ تاریخ و سیر کے بیان میں بھی آپ اُسے بیگانہ پائیں گے۔ آغاز دور جاہلیت سے خلافت بنو عباس تک عربوں کے رسم و رواج۔ طرز معاشرت اور طریق ماند و بود کا جیسا صحیح۔ دلچسپ اور تفصیلی خاکہ یہ کتاب پیش کرتی ہے۔ اور پھر انتہائی دلنشین پیرایہ میں اُس کے مقابلہ سے خود عربی ادب کی دوسری تصانیف عاری ہیں۔

کتاب نہایت ضخیم اور ایک ہزار ایک فسانوں پر مشتمل ہے۔ چند بہت ہی معمولی اور مختصر خلاصوں کے علاوہ اُردو میں آج تک اُس کا ترجمہ نہیں ہوا۔

الف لیلہ کے علاوہ اور بھی سینکڑوں کتابیں مختصر فسانوں کی عربی میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن چونکہ ہمیں اس مضمون میں بعید اختصار مدنظر ہے لہٰذا اُن کا تذکرہ ہم چھوڑتے ہیں۔

موجودہ فسانہ نگاری کا آغاز

مختلف صدیوں۔ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں سے جلدی جلدی گذر کر اب ہم اُس سرحد پر آ کھڑے ہوئے ہیں جس سے

موجودہ فسانہ نگاری کی حدیں ملی ہوئی ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہونگے کہ ہماری مراد یورپ کی موجودہ فسانہ نگاری سے ہے کیونکہ اس وقت ہندوستان میں فسانہ نگاری کی جس قدر بہتات ہے۔ یہ سب یورپ کے صدقے میں ہے اور اُسی کی پیروی اور تقلید کا نتیجہ ہے۔ پس آئیے ایک طائرانہ نظر ڈال کر اس قصہ کو بھی ختم کر دیں۔

اٹلی میں فسانہ نویسی

یورپ کی قدیم شان و شوکت کا مدفن اٹلی ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں ایک زمانہ میں مقدس پوپ خدائی کر چکے ہیں بحیثیت فن کے فسانہ نگاری کی ابتدا اسی ملک سے ہوئی سنہ ۱۳۴۸ء میں وہاں ایک زبردست طاعون پھیلا جس نے بڑی آزادی کے ساتھ بربادی پھیلائی۔ سچ پوچھو تو اُسی طاعون کی یادگار یہ موجودہ فسانہ نگاری ہے سُنیئے کیوں؟ اسی طاعون کے زمانہ میں ملک کے لائق ادیب بوکاچیو نے ایک سو مختصر کہانیوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا یہ کتاب بہت بڑی حد تک عربی افسانوں کی انسائیکلو پیڈیا یا الف لیلہ سے ماخوذ تھی۔ علاوہ ازیں دیگر عربی حکایتیں بھی اس میں شامل کر کے کتاب کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے متعلق بھی بعض قصص ملتے ہیں۔ بوکاچیو کی اس کتاب کے متعلق مبصرین کی تحقیق ہے کہ انگلستان کے زبردست فسانہ نویس چوسر اور ملک الشعراء شکسپیر کے بعض فسانے دبی آواز سے کہہ رہے ہیں کہ ع سارا دیارِ غیر ہیں ہمیں وطن سے دُور۔ مگر ہمیں گڑے مردے اکھیڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ چوسر اور شکسپیر نے اگر ایسی حرکت کی ہوگی تو وہ بھگتیں گے۔ ہماری بلا سے۔

ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ یورپ میں سب سے پہلے بوکاچیو نے مختصر فسانے شائع کئے۔ آئیے اب آگے چلیں۔ بوکاچیو کے بعد مختلف لوگ مختلف ملکوں میں فسانے لکھتے رہے اور لوگ انہیں پڑھتے رہے۔ مگر تھے سب یکساں طرز اور یکساں قسم کے۔ جدت اور ندرت موقوف تھی۔ ایک بھیڑ چال تھی جو چلی جا رہی تھی۔

فرانس کی فسانہ نگاری

یکایک دنیائے فسانہ میں انقلاب برپا ہوا۔ اور فرانس میں وہ نامور مصنف پیدا ہوا جو انتوان گالاں کے نام سے مشہور ہے۔ اُس نے اُٹھتے ہی فسانہ نویسی کی کایا پلٹ دی۔ مگر یہاں بھی وہی عربی معشوق پس پردہ گالاں کے کندھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا کون؟ وہی الف لیلہ۔

گالاں پہلا شخص ہے جس نے بحیثیت کتاب کے الف لیلہ کو روشناس کرایا۔ اُس کا ترجمہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں شائع ہوا تھا۔ اس کو کس قدر مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک مرتبہ شہر کے ایک جم غفیر نے رات کے وقت گالاں کے مکان کو گھیر لیا۔ شور سُنا تو گالاں گھبرا کر بالائی منزل کی کھڑکی پر آیا۔ باہر جھانک کر دیکھا تو خون خشک ہو گیا۔ سمجھا یہ لوگ مجھے لوٹنے اور قتل کرنے آئے ہیں۔ آج خیر نہیں۔ اُدھر لوگوں نے گالاں کی منڈیا دیکھی تو چلا چلا کر کہنا شروع کیا۔ "گالاں! گالاں! ہم اس سردی اور ہوا میں محض اس لئے تیرے پاس آئے ہیں کہ تو ہمیں پھر کوئی مزیدار عربی کہانی سُنا"۔ دیکھا آپ نے! آج جب کہ فسانہ نویسی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور ایک سے ایک بڑھ کر باکمال فسانہ نویس موجود ہیں۔ لوگ اُن کے فسانوں اور شاہکاروں کو پڑھتے ہیں اور تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ مگر باوجود اس کے ایسے والہانہ شوق کی

کوئی دوسری مثال فسانہ نگاری کی ساری تاریخ پیش کر سکتی ہے ؟ یقیناً نہیں۔

اس کے ایک سو سال بعد فرانس میں ایک اور باکمال پیدا ہوا جس کا نام بالزک تھا۔ اُس کے فسانے بہت حد تک موجودہ زمانہ کے فسانوں سے مشابہ تھے۔

فرانس کا تیسرا حقیقت نگار گانٹے تھا۔ جو ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۷۲ء میں مرگیا۔

فرانس ہی میں موجودہ مختصر فسانہ نویسی نے جنم لیا اور وہیں وہ معراج کمال کو پہنچی۔ بڑے بڑے قابل اور لائق فسانہ نویس وہاں پیدا ہوئے اور اپنے کمالات سے دنیا کو گرویدہ کرتے رہے۔ ان میں سے زولا اگرچہ حقیقت کا ترجمان ہے مگر بہت فحش گو ہے۔ اور اپنے اس عیب کی وجہ سے بہت بدنام ہے۔ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۲ء میں مرگیا۔

دوسرا شخص موپاسان ہے۔ جو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۹۳ء تک زندہ رہا۔ اس کے بعد بھی فسانوں میں فحش کی کثرت ہے۔
کیا اچھا کہا ہے مسٹر نظامی قدوسی ایم اے نے کہ "فرانسیسی ادیب انسان کی نفسیات کی تہوں تک جا پہنچے ہیں اور تہ نشین فواحش کو سطح پر لے آتے ہیں"۔

روس کے فسانہ نویس

اُنیسویں صدی کی ابتدا میں روس میں بھی بعض زبردست انشا پرداز پیدا ہوئے جنہوں نے قدیم طرز کو ملیا میٹ کرکے فسانہ نگاری کی جدید سڑک تیار کی اس میں سے ٹالسٹائے سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ شخص ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۱۰ء میں مرگیا۔ مگر سچ یہ ہے کہ نام کر گیا۔ نوع انسانی سے سچی ہمدردی بجائے حقارت اور نفرت کے ملائمت اور نرمی سے سمجھانا۔ حالات کی اصلاح بڑی خوش اسلوبی سے کرنا نصیحت کو انتہائی خلوص کے ساتھ اور خالص ہمدردی کے لئے بیان کرنا ٹالسٹائے کا خاص طرزِ تحریر ہے۔ اور وہ اس کوشش میں پورے طور پر کامیاب ہوا ہے۔ اُس کے مختصر فسانوں کا مجموعہ چھپ گیا ہے اور ہر جگہ ملتا ہے۔ اردو میں بھی اُس کے اکثر فسانوں کا ترجمہ مختلف رسائل و اخبارات میں چھپتا رہتا ہے۔

ترجنیف روس کا ایک اور فسانہ نویس ہے۔ یہ بھی ٹالسٹائے کے ساتھ ہی ساتھ اُسی سال پیدا ہوا تھا جس سال ٹالسٹائے ہوا تھا۔ مگر اُس سے ۲۷ سال پہلے ۱۸۸۳ء میں مرگیا روسی فسانہ نویسی کی تاریخ میں اُس کا نام بھی زندہ رہیگا۔

چیخوف سے ترجموں کے ذریعے ہندوستانی افسانہ خوان بخوبی واقف ہونگے۔ کیونکہ اُس کے اکثر افسانوں کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔ یہ فسانہ نویس ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۹۰۴ء میں انتقال کر گیا۔

مختصر فسانہ نویسی انگلستان میں

انگلستان میں موجودہ طرز کی مختصر فسانہ نگاری کا رواج دینے والا رابرٹ لوئی اسٹیونس تھا۔ جس نے اپنا سب سے پہلا قصہ شاید ۱۸۷۵ء میں لکھا۔ اسٹیونس کی خصوصیت انسان کی اندرونی کیفیت کی خوبصورتی کے ساتھ بے نقابی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے اس ملک میں سروالٹر سکاٹ۔ مسز گاسکل اور چارلس ڈکنز قصوں کی دنیا میں نام پیدا کر چکے تھے لیکن فن کے اعتبار سے اُن کے فسانوں میں وہ خوبیاں موجود نہیں ہیں۔ جن کا ہونا موجودہ فن کے لحاظ سے ضروری ہے

اور جن کے بغیر اس وقت کوئی قصہ قصہ نہیں کہلا سکتا۔

ریڈیارڈ کپلنگ انگلستان میں زمانہ حال کا فسانہ نویس ہے۔ بیحد لکھتا ہے اور خوب لکھتا ہے۔ اس کے قصوں میں سلاست بھی ہے اور دلچسپی بھی۔ طرز بیان کی خوبی اور ادائے مطالب میں زور اور قدرت کی خوبی مبدء فیاض نے اُسے کافی سے زیادہ دی ہے۔ اُس کے متعلق ایک خاص بات بیان کرنے کی یہ ہے۔ کہ اُس نے اپنے اکثر فسانوں میں ہندوستانی زندگی کی تصویریں بھی کھینچی ہیں۔

امریکہ میں موجودہ فسانہ نویسی کی ابتدا۔ امریکہ میں موجودہ طرز کی مختصر نویسی کا موجد واشنگٹن ارونگ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے اکثر فسانے مزاحیہ ہوتے تھے۔ اُردو میں نیاز فتحپوری نے اُس کے بعض فسانوں کا ترجمہ کیا ہے۔

ہاتھارن امریکہ کا ایک دوسرا فسانہ نویس ہے۔ جس نے شروع شروع میں معمولی طور پر ماہوار رسائل میں فسانے لکھنے شروع کئے۔ بالآخر اُس کے قلم سے "جنٹل بوائے" نامی فسانہ نکلا یہ اس قدر پسند کیا گیا کہ سارے ملک میں اس کی بدولت ہاتھارن کا نام مشہور گیا۔

"ایڈگر ایلن پو" بھی پہلے ایک غریب شخص تھا۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک رسالہ کے ایڈیٹر نے بہترین فسانہ پر انعام دینے کا اعلان کیا۔ جس وقت نتیجہ نکلا۔ تو پوؔ انعام کا حقدار پایا گیا۔ پوؔ کو انعام بھی مل گیا اور سارے ملک میں شہرت بھی خاصی ہوگئی۔

یہ دونوں فسانہ نویس امریکہ میں اپنے بعد آنے والے فسانہ نگاروں کے لئے ایک رہبر اور اُستاد کے طور پر تھے کیونکہ بعد میں بہت سے ادیبوں نے ان کے نقشِ قدم پر چل کر فسانہ نگاری میں بڑی بڑی باریکیاں پیدا کیں۔ اور اب تو یہ ایک مستقل اور باقاعدہ فن بن چکا ہے۔ جس کے ہر شعبے کے متعلق بکثرت کتابیں موجود ہیں۔ اور فسانہ نویس بھی یورپ اور امریکہ میں اتنے پیدا ہو گئے ہیں۔ کہ اگر اُن کے حالات جمع کرنے کی کوشش کی جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوں۔ اور اگر وہ سب فسانے مہیا ہوسکیں جو گذشتہ سو سال میں یورپین دماغوں نے پیدا کئے۔ تو یقین ہے کہ بہت سی الماریاں بھر جائیں۔ پس اس ذکر کو یہیں چھوڑ کر اب ہم اردو فسانہ نگاری کے متعلق مختصر طور پر کچھ بیان کرکے اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

اُردو فسانہ نگاری کی تاریخ

دُنیا کی موجودہ زبانوں میں اُردو شاید سب سے کمسن زبان ہے۔ بیچاری ابھی بچی ہی ہے۔ جوانی کو بھی نہیں پہنچی۔ ظاہر ہے۔ کہ اتنی تھوڑی سی عمر میں کیا کیا کرتی۔ دینیات کا ذخیرہ فراہم کرتی۔ تاریخ سے دل لگاتی۔ ہیئت۔ ہندسہ

اور حساب سے دل بہلاتی۔ منطق اور فلسفے سے سر پھوڑتی یا قصوں اور فسانوں کی طرف متوجہ ہوتی۔ مگر اس ننھی سی عمر میں اپنی بساط کے موافق اس نے ہر ایک کا دل رکھنے کی ضرور کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ سب کو خوش کرنے کی کوشش میں کوئی بھی خوش نہ رہا ہو۔ مگر ایمان کی بات ہے۔ کہ جتنا اعتنا اس چھوٹی سی عمر میں اس نے سب علوم وفنون کے ساتھ کیا۔ وہ ضرور سراہنے کے قابل ہے۔ لیکن ہم اپنے موضوع کے لحاظ سے یہاں صرف انھیں کوششں کا ذکر کریں گے۔ جو مختصر فسانہ نگاری کی ذیل میں اُس سے ظہور میں آئی۔

۱۔ دورِ قدیم

اُردو زبان میں مختصر فسانوں کی سب سے پہلی کتاب جس کا پتہ چلتا ہے۔ ابن نشاطی کا "طوطی نامہ" ہے۔ "شکا سپتتی" جس کا ہم اُوپر ذکر کر آئے ہیں۔ یہ اُسی کا ترجمہ ہے۔ دکن میں عبداللہ قلی قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۶۰ھ کے قریب لکھی گئی۔ اور آجتک مشہور ہے۔ اس کا حال ہم اُوپر لکھ چکے ہیں۔

طوطی نامہ کے بعد کوئی اور قابلِ ذکر تصنیف اس فن میں نہیں ہوئی۔ مگر جب کلکتہ کے فورٹ کالج میں جان گلکرسٹ کے ماتحت اردو تصنیف وتالیف اور تراجم کا محکمہ قائم ہوا۔ تو اُس وقت دوسری کتابوں کے ساتھ مختصر فسانوں کے متعلق بھی بعض کتابیں لکھی گئیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ۱۸۰۱ء میں سری لالوجی نے سنگھاسن بتیسی کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کی کیفیت قبل ازیں بیان ہو چکی ہے۔

(۲) پریم ساگر اور

(۳) راج نیتی بھی ہندی زبان میں مختصر فسانوں کے مجموعے تھے۔ جن کو اسی سنہ میں اُردو کا لباس پہنایا گیا۔

(۴) خود ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے مختصر قصوں کا ایک مجموعہ قصصِ مشرقی کے نام سے ۱۸۰۲ء میں شائع کیا۔ یہ فسانے کچھ تو حکایاتِ لقمان سے ماخوذ ہیں اور کچھ انگریزی کے دوسرے فسانوں سے۔

(۵) شیخ حفیظ الدین نامی ایک صاحب نے جو محکمہ کے ملازم تھے۔ ۱۸۰۳ء میں ابوالفضل کی عیار دانش کا اُردو ترجمہ کیا۔ اور خرد افروز نام رکھا۔

(۶) بیتال پچیسی نامی ایک کتاب سنسکرت میں ۲۵ کہانیوں کا مجموعہ تھی۔ ۱۱۴۰ھ میں بعہد محمد شاہ رنگیلا اُس کا ہندی ترجمہ ہوا۔ اور پھر دیوناگری حروف میں لکھا گیا ۱۸۰۳ء میں کاظم علی جوان نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر اس کا اردو ترجمہ کیا۔ مگر نام غالباً یہی رہا۔

(۷) مادھونل وکام کندلا کا ترجمہ بھی اسی سنہ میں مظہر علی کے قلم سے نکلا۔

(۸) طوطی نامہ کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ اب اس کے بھی نصیب کھلے اور حیدر بخش حیدری نے اس کا اُردو میں ترجمہ

کرکے طوطا کہانی نام رکھا۔

یہ ہیں مختصر فسانوں کی وہ کتابیں جو فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام اُنیسویں صدی کے شروع میں شائع ہوئیں۔
فورٹ ولیم کالج کے محکمہ کے ٹوٹنے کے بعد اگرچہ تصنیف و تالیف کا وہ ذوق و شوق باقی نہیں۔ مگر چونکہ چسکا پڑ چکا تھا۔ کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا۔ اگرچہ نہایت سست رفتاری کے ساتھ۔ اس عرصہ میں قابلِ ذکر ایک تو انوارِ سہیلی کا ترجمہ ہے۔ جو فقیر محمد خاں گویا نے بستانِ حکمت کے نام سے کیا اور دوسری کتاب الف لیلہ کا ایک مختصر ترجمہ ہے۔ جو منشی عبدالکریم نے کلکتہ سے ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان شائع کیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۸۵۷ء میں دہلی کا غدر ہو گیا۔ اور شمالی ہند میں وہ تباہی پھیلی کہ خدا کی پناہ۔ سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ تصنیف و تالیف کا تو کسے ہوش تھا۔ غدر فرو ہونے کے بعد بھی اُس کے اثرات اور عواقب نے برسوں لوگوں کو بدحواس رکھا۔ غرض اس تمام عرصہ میں بہت ہی معمولی رفتار سے ۱۹۰۰ء تک جو کام ہوا اُس کا بہت ہی تھوڑا سا نمونہ مندرجہ ذیل فسانے ہیں۔ جو مختلف مطابع سے بار بار چھپ کر نکلے۔ اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے زمانہ کی نیرنگی دیکھو۔ کہ جس وقت آپ یہ فہرست پڑھیں گے۔ مجھ پر ہنسیں گے۔ اور کہیں گے کہ کیا نامعقول فہرست لکھی ہے۔ حالانکہ اُس زمانہ میں لوگ ان کو نہایت مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ آپ کو شاید مشکل سے یقین آئیگا۔ کہ میرے والد محترم کے پاس چار صندوق ایسے ہی ایسے قصوں سے بھرے ہوئے رکھے تھے۔ خیر لیجیئے آپ تو دو چار کی فہرست پڑھیئے

(۱) قصہ سوداگر بچہ	(۲) قصہ ماہی گیر	(۳) قصہ جمجمہ	(۴) قصہ منصور
(۵) قصہ شاہ روم	(۶) قصہ ماہ رمضان	(۷) گلزار ابراہیم	(۸) چشمہ شیریں
(۹) ایجاد رنگین	(۱۰) قصہ عابد و شیطان	(۱۱) قصہ سورج پور	(۱۲) قصہ گلفام
(۱۳) قصہ گل و صنوبر	(۱۴) قصہ دائی حلیمہ	(۱۵) قصہ سپاہی زادہ	(۱۶) قصہ شاہِ یمن
(۱۷) معجزہ آل نبی	(۱۸) معجزہ ہرنی	(۱۹) معجزہ شق القمر	(۲۰) فسانہ جمیل
(۲۱) فسانہ معقول	(۲۲) فسانہ دلفریب	(۲۳) قصہ ناہد شمسی	(۲۴) قصہ موتی بنولہ
(۲۵) ایک روسی زمیندار کا قصہ		(۲۶) قصہ عورت ڈلہ	(۲۷) قصہ دہرم سنگھ

اس مختصر فہرست کے ساتھ ہم دورِ قدیم کے فسانوں کی تفصیل ختم کرتے ہوئے موجودہ دَور کی طرف آتے ہیں۔

ب۔ دورِ جدید

یورپ اور امریکہ اور خود ہندوستان میں مختصر فسانوں کی کثرت اور بہتات کا باعث موقت الشیوع اخبارات و رسائل ہیں۔ جس ملک میں جس قدر زیادہ اخبارات و رسائل کی زیادتی ہوتی ہے۔ اُسی قدر کثرت کے ساتھ وہاں مختصر فسانے

پھیلتے ہیں۔ کیونکہ انسان بالطبع راحت طلب اور آسانی پسند واقع ہؤا ہے۔ لمبے ناول اور طویل قصے کو پڑھنے کی بجائے ہر شخص چاہتا ہے کہ دس منٹ میں اُس کا فسانہ ختم ہو جائے۔ اور بعد وہ کسی اور کام میں مصروف ہو۔ اور یہی آسان پسندی مختصر فسانوں کے عالمِ وجود میں آنے کا باعث ہوئی۔

۱۔ دورِ جدید کا ابتدائی حصہ مختصر فسانہ نگاری کے دورِ جدید کی ابتدا میں جبکہ بیسویں صدی بھی شروع ہو رہی تھی۔ جن ادیبوں نے اس فن میں شہرت حاصل کی۔ پہلے اُنھوں نے رسائل میں فسانے لکھنے شروع کئے۔ لیکن بعض ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے اگرچہ کبھی کسی اخبار یا رسالہ میں کوئی فسانہ نہیں لکھا۔ مگر کتابی شکل میں فسانوں کے مجموعے شائع کئے۔ ایسے اشخاص میں سب سے زیادہ نمایاں میرے ہموطن اور سرسید احمد خاں کے لٹریری اسسٹنٹ مولوی سید وحید الدین سلیمؔ مرحوم تھے۔ سرسید کے انتقال کے بعد وہ معہ اپنے رسالہ معارف کے پانی پت چلے آئے تھے۔ اور یہاں ۱۹۰۲ء میں اُنھوں نے ایک مطبع حالی پریس کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس میں اچھی اچھی کتابیں چھاپتے اور نیشنل بک ایجنسی کے نام سے اشتہار دے کر اُنہیں فروخت کرتے۔ دوسری کتابوں کے علاوہ مختصر فسانوں کی مندرجہ ذیل کتابیں اُنھوں نے حالی پریس سے چھاپ کر شائع کیں۔ یہ سب کی سب اُن کی اپنی تصنیف تھیں۔

(۱) عہدِ بنو اُمیہ۔ اس مجموعہ میں اُنھوں نے بنو اُمیہ کے زمانے کے متفرق دلچسپ تاریخی قصے جمع کئے ہیں۔

(۲) عہدِ عباسیہ۔ یہ بنو عباس کے عہد کے تاریخی قصوں کا مجموعہ ہے۔ جو دو جلدوں میں ہے۔

(۳) اسلامی جوش۔ ۲۰ یا ۲۱۔ اسلامی تاریخی واقعات کو فسانے کے رنگ میں ڈھالا ہے۔

(۴) زنانہ اخلاقی کہانیاں۔ یہ چھوٹی چھوٹی پندرہ بیس خیالی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

(۵) ۲۵ سراغرسانی کے ناول۔ چھوٹے چھوٹے ۲۵ فسانوں کا مجموعہ ایک مکمل کتاب کی شکل میں ہے۔

(۶) ۲۵ عاشقانہ ناول　　〃　　〃　　〃　　〃　　〃　　〃　　〃

(۸) ۲۵ اخلاقی ناول　　〃　　〃　　〃　　〃　　〃　　〃　　〃

مگر اب یہ ساری کتابیں ناپید ہیں۔ اور کہیں نہیں ملتیں۔ اور جس کے پاس ہونگی۔ بھی تو انشاء اللہ امروز و فردا کی مہمان ہونگی۔ کیونکہ مولوی صاحب مرحوم کی کفایت کتابوں کے کاغذ کے معاملہ میں انتہا سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔

صدی کے شروع میں اخبارات و رسائل کی بہتات نہیں تھی۔ جو آجکل ہے۔ گنتی کے اخبارات تھے۔ اور گنتی کے رسائل اور وہ پرچے جن میں فسانے شروع ہؤا کرتے تھے۔ اُن کی تعداد تو اُنگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

(۱) انتخاب لاجواب لاہور۔ مولوی محبوب عالم کا ہفتہ وار رسالہ تھا۔ اور ہر پرچہ میں ایک مختصر فسانہ شائع کیا کرتا تھا

اب بھی جاری ہے۔

(۲) "مخزن" لاہور سے اُس شخص کی اڈیٹری میں جاری ہؤا۔ جو اُس وقت صرف "شیخ سر عبدالقادر" تھا۔ لیکن آج "آنریبل جسٹس سر عبدالقادر" ہے۔ اردو لٹریچر کی تاریخ مخزن کے نام کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ادب و انشا کے ایسے ایسے جواہر ریزے اُس نے پیش کئے ہیں۔ کہ پیچھے آنے والے باوجود ہر قسم کے سامانوں کے اُن کی نظیر لانے سے آج تک بھی عاری ہیں۔ اس میں اکثر نہایت پُرلطف اور دلچسپ فسانے شائع ہؤا کرتے تھے۔ میں جب کبھی "تولہ بھر ریڈیم" کو پڑھتا ہوں۔ اپنی ہنسی کو کبھی ضبط نہیں کر سکتا۔ یہ مخزن کی خوش قسمتی تھی۔ کہ اُس کو مضمون نگار سارے کے سارے ایک سے ایک بڑھ کر ملے تھے۔

(۳) "زمانہ" کانپور سے منشی دیانرائن نگم نے نکالا۔ اور اب تک نکال رہے ہیں۔ زبان اور ادب کی جس قدر بیش بہا خدمت اس پرچہ نے کی ہے۔ وہ صد ہزار تحسین کے لائق ہے۔ دور حاضرہ کا مشہور فسانہ نگار پریم چند غالباً سب سے اول زمانہ ہی کے ذریعہ روشناس ہؤا۔

(۴) "زبان" دہلی سے مائل دہلوی نے جاری کیا تھا۔ اس میں بعض بعض نہایت مزیدار فسانے شائع ہوئے ہیں ایک مختصر ڈرامہ "کاٹھ کی تلوار" تو بلا مبالغہ دس ہزار مرتبہ پڑھنے کی چیز ہے۔ جب پڑھو گے نیا لطف حاصل ہوگا۔

(۵) "ادیب" الہ آباد سے شاید ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں جاری ہؤا تھا۔ طباعت۔ کتابت۔ کاغذ اور نفاست کے لحاظ سے بہترین پرچہ تھا۔ اور پھر مضمون سونے پر سہاگہ تھے۔ اس نے ایسے پُرزور اور پُرلطف فسانے شائع کئے ہیں۔ کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ "خالائی کا مارا آغا" اُردو زبان میں ایک بالکل نئی چیز تھی۔

(۶) ادیب کی جان کندنی کے ایام میں لکھنؤ سے مسٹر پیارے لال شاکر نے اُسی پیمانے پر "العصر" نکالا۔ لیکن زمانے کی ہوا اُسے راس نہ آئی۔ پرچہ اچھا اور ہونہار تھا۔ زندہ رہتا تو کچھ کما کھاتا۔ مر گیا تو اب کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ اس کی مختصر سی زندگی میں بھی بعض فسانے بہت اچھے اچھے شائع ہوئے تھے۔

(۷) "پنجاب ریویو" یہ مولوی ظفر علیخاں اڈیٹر زمیندار کا پرچہ تھا۔ جو ماہوار شائع ہوتا تھا۔ علمی رنگ کے فسانے اس میں بعض اچھے شائع ہوئے ہیں۔

(۸) "عصمت" دہلی سے مولانا راشد الخیری نے شاید ۱۹۱۰ء سے جاری کیا اور اِس وقت تک جاری ہے۔ اس میں خود مولینا کے قلم سے فرقۂ نسواں کی مظلومانہ حالت کے متعلق ایسے ایسے دل ہلا دینے والے فسانے شائع ہوئے کہ جن کو پڑھ کر بے اختیار رونا آتا تھا۔ اس سلسلہ میں بعض اور بھی رسائل کے نام لئے جا سکتے تھے۔ مگر میں بخوف طوالت اُنہیں نظر انداز کرتا ہوں۔

دور حاضرہ کے بعض بڑے بڑے ادیبوں نے انہیں رسائل میں فسانے اور مضامین لکھ لکھ کر موجودہ شہرت حاصل کی

ہے۔ مثلاً سید سجاد حیدر بی اے۔ خواجہ حسن نظامی۔ منشی پریم چند بی اے۔ مولوی ظفر علیخاں۔ مولانا راشد الخیری وغیرہ وغیرہ۔

(۱) سجاد حیدر پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے ترکی فسانوی ادب سے اُردو دانوں کو رُوشناس کیا۔ نہایت بلند تخیل۔ شستہ اور سلیس زبان کے ساتھ جذباتِ انسانی کی صحیح تصویر کھینچ دینا یہ ہیں۔ سجاد حیدر کی فسانہ نگاری کے کمالات۔

(۲) خواجہ حسن نظامی اپنے مخصوص انداز میں دہلی مرحوم کا نوحہ پڑھنے اور بدنصیب مغلیہ شاہزادوں اور شاہزادیوں کا دکھڑا رونے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

(۳) مولانا راشد الخیری بجا طور پر "مصورِ غم" ہیں۔ عورتوں کی مظلومانہ حالت اور فرقہ نسواں پر مردوں کے مظالم کچھ اس اثر اور درد کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ پڑھ کر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔

(۴) مولوی ظفر علیخاں بی اے اچھے ادیب اور زبردست انشاپرداز ہیں۔ دکن ریویو اور پھر پنجاب ریویو میں بہت عرصہ تک دادِ فصاحت دے چکے ہیں۔ اکثر ناول اور متعدد افسانے بھی لکھے۔ اور اگر یہ سلسلہ جاری رہتا۔ تو اُن کی ذات سے فسانوی ادب میں بہت معقول اضافہ ہوتا۔ مگر سیاسیات کے شوق اور "ردِ قادیانیت" کے ذوق نے ایک قابل ادیب کو برادری سے چھین لیا۔ اگرچہ پوری وہاں بھی نہ پڑی۔ مولانا نہ حکام کو "لرزہ براندام" کر دینے میں کامیاب ہو سکے اور نہ اُن کی "باطل شکن اور فلک شگاف تقریریں" ایوانِ حکومت میں زلزلہ" ڈال سکیں۔ اور نہ "قادیانیوں کے استیصال" اور قادیانیت کے جڑ بنیاد سے اُکھیڑ پھینکنے" میں اُن کی "مساعی جمیلہ" بار آور ہوئیں۔ مگر اپنا شوق ہی تو ہے۔ اس شوق کی بدولت مولانا نے سخت سے سخت تکالیف اُٹھائیں۔ متعدد مرتبہ قید و نظربند ہُوئے۔ "زمیندار" پر مصائب و آلام کی آندھیاں چلیں۔ اور وہ اکثر مرتبہ بند ہُوا۔ قوم کا ہزارہا روپیہ اُس کی ضمانتوں میں ضبط ہُوا مگر اپنا شوق ہی تو ہے۔ کاش مولینا اب بھی "سیاسیات کے دور از کار مسائل" کو خیرباد کہیں اور "قادیانیت کے بھاری پتھر" کو جنہیں اُن کی آنکھیں "حسرت کے ساتھ" دیکھ رہی ہیں۔ چوم کر چھوڑ دیں تو اب بھی کچھ نہیں گیا۔ کیونکہ سب کچھ کھو چکنے کے بعد بھی ابھی بیٹی باپ ہی کے گھر ہے۔ مگر بظاہر اُمید نہیں کہ ہماری نیازمندانہ اور مخلصانہ گذارش مولانا کی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ پا سکے۔ اس لئے کہ سیاسیات کا شوق ایسا چسکہ نہیں ہے جو ایک مرتبہ لگ کر پھر چُھوٹ سکے۔ اور "قادیانیت کے استیصال کی کوشش" وہ مذہبی فریضہ ہے۔ جس کو بجالانے کے بغیر نہ مولینا کی نمازیں قبول ہو سکتی ہیں نہ روزے۔ پھر بتلائیے۔ ایسی ضروری چیز کو کس طرح چھوڑ دیں۔

(۵) منشی پریم چند بی اے وہ قابل فسانہ نگار ہیں۔ جنہوں نے پیدا ہو کر اردو مختصر فسانہ نویسی میں تازہ روح ڈالدی۔ اور اُس کو اُس معراجِ ترقی پر پہنچایا۔ جس سے وہ آج کل گذر رہی ہے۔ فطرتِ انسانی کی گہری واقفیت۔ ادائے مطالب میں حیرت انگیز قابلیت زبان اور بیان کی فصاحت اور بیحد اثر انگیز طریقہ بیان پریم چند کے فسانوں کی خصوصیات ہیں۔ کاش! بہی خواہانِ اُردو قدر کرتے اور مختصر فسانہ نویسی کا یہ شہسوار محض اُردو ہی کی خدمت کیلئے وقف رہتا۔

یہ بعض چند نام ہیں جن کا تذکرہ کیا گیا۔ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو اور بھی بہت سے اصحاب کے نام اس فہرست میں لئے جاسکتے ہیں۔

۲- دورِجدید کا آخری حصہ | یورپ کی جنگ عظیم سے پہلے اردو مختصر فسانہ نویسی کی رفتار بہت حد تک سُست تھی اور اُس کی وجہ اخبارات در سائل کی محدود تعداد تھی۔ لیکن جنگ کے بعد جب ہزاروں آدمیوں نے اخبار نویسی اپنا پیشہ بنالیا۔ اور نئی نئی قسم کے ہزاروں پرچے روز بروز نکلنے لگے۔ تو اُن کے ایڈیٹروں کو پبلک میں دلچسپی اور ہر دلعزیزی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوا۔ کہ رسائل و اخبارات میں مختصر فسانے بھی درج کریں۔ چنانچہ کچھ لکھنے والے پیدا کئے گئے۔ کچھ خود پیدا ہو گئے۔ اور کام چل پڑا۔ انگریزی اور دوسری زبانوں سے بکثرت تراجم ہونے لگے۔ اور مختصر فسانہ نویسی گھنٹے کی رفتار کو چھوڑ کر ڈاک گاڑی کی تیزی کے ساتھ دوڑنے لگی۔ سینکڑوں فسانہ نویس پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے تراجم اور قصے لکھ لکھ کر انبار لگا دیئے۔ اور اُن کی تعداد میں روز بروز حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر قسم کے فسانے لکھے گئے۔ ادبی[۱]۔ معاشرتی[۲]۔ عشقیہ[۳]۔ علمیہ[۴]۔ جزئیہ[۵]۔ مزاحیہ[۶]۔ اصلاحی[۷]۔ تاریخی[۸]۔ مذہبی[۹]۔ اخلاقی[۱۰]۔ سائنٹیفک[۱۱]۔ طبی[۱۲]۔ جاسوسی[۱۳]۔ تبلیغی[۱۴]۔ رزمیہ[۱۵]۔ بزمیہ[۱۶]۔ اقتصادی[۱۷]۔ ہیبت ناک[۱۸]۔ حیرت انگیز[۱۹]۔ بچوں کے لئے عورتوں کے لئے۔ غرض فسانوی ادب کا کوئی شعبہ اور کوئی صیغہ ایسا نہ رہا۔ جس کے متعلق بیسیوں فسانے نہ لکھے گئے ہوں اور ہنوز یہ سلسلہ ترقی پذیر ہے۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی اور کون کون سی قسم کے فسانے لکھے جائیں گے۔

اس دور کے بعض بہت مشہور مشہور مختصر فسانہ نگار حسب ذیل ہیں:۔

(۱) نیاز فتحپوری۔ شوکتِ الفاظ اور اسلوب بیان کی خوبصورتی ان کے فسانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ گرچہ فسانے کم لکھتے ہیں۔ مگر جب لکھتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں۔ عرصہ تک نگار کو بھوپال سے نکالتے رہے۔ کچھ دنوں سے لکھنؤ سے آئے ہیں "مذہب اور حقیقت مذہب" کے قصے اگر دلآزار طریقے سے نگار میں نہ چھیڑتے۔ تو اُن کے خلاف عوام وخاص مسلمانوں میں نفرت وحقارت کا جذبہ پیدا نہ ہوتا۔ اور یہ بلند پایہ فسانہ نگار اُسی طرح ہر دلعزیز رہتا جیسا "نگارستان" کی اشاعت کے وقت تھا۔ مگر شدنی ہو کر رہتی ہے۔ خدا آلتوں کو پکڑے مگر بعض لوگوں کو تو یہ بھی شکایت ہے۔ کہ مولانا نیاز اپنے آپ کو ملاءِ اعلیٰ کا انسان سمجھتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر لوگوں کا یہ ظن حقیقت واقعہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ عیب کی بات ہے۔

(۲) سدرشن مسٹر پریم چند کے ٹائپ کے فسانہ نگار ہیں اُو اُسی رنگ میں رنگین چندن کو ایسی کامیابی سے نکالا۔ کہ دنیائے ادب میں دھوم مچ گئی۔ اگرچہ نبھا نہ سکے۔ اور چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے۔

(۳) سید امتیاز علی تاج بی اے۔ ان کے فسانوں میں ادبیت اور لطافت کا کافی سرمایہ موجود ہوتا ہے۔

(۴) عبد المجید سالک بی اے۔ روزنامہ انقلاب کی ذمہ واریوں سے کہاں فرصت ملتی ہے۔ کہ فسانہ نویسی کریں۔ اس سے پہلے "زمیندار" میں تھے۔ وہاں بھی سر کھجانے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ لیکن اس میں شبہ نہیں۔ کہ جب لکھتے ہیں۔ تو نثر میں خوب شاعری کرتے ہیں۔ اُن کے "افکار و حوادث" مزے کی چیز ہوتے ہیں۔ لوگ اس عنوان سے خائف بھی بہت رہتے ہیں۔ اور اُسے پڑھتے بھی بہت دلچسپی سے ہیں۔

(۵) ابوالاثر حفیظ جالندہری۔ شاہنامہ اسلام کی تصنیف نے اُن کو سارے ہندوستان میں مشہور کر دیا ہے۔ اب وہ چاہے کچھ بھی نہ لکھیں۔ تب بھی مشہور رہیں گے۔ مگر وہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں۔ ان کے افسانے خالص ادبی رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔

(۶) ڈاکٹر سید احمد بریلوی۔ بڑی قابلیت کیساتھ اخلاقی اور اصلاحی فسانے لکھتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ مخصوص طرز کے مالک ہیں۔ قوم کی دلسوزی اور ہمدردی اُن کے سینے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوتی ہے۔

(۷) شوکت تھانوی۔ مزاحیہ نویسی میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ "سودیشی ریل" ایسا مزے کا فسانہ ہے۔ کہ چاہے کتنا ہی سنجیدہ اور متین انسان ہو پڑھ کر متبسم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۸) مرزا فرحت اللہ بیگ۔ دہلی کی پاکیزہ زبان میں جس وقت یہ مزاحیہ افسانے لکھتے ہیں۔ تو آدمی ایک ایک فقرے پر ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے۔ "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ اُنکی زبانی" اور "ایک وصیت کی تعمیل" کو بار بار پڑھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی۔ یہی دل چاہتا ہے کہ پھر پڑھیں۔ "سکول کی شرارتیں" بھی اپنے اندر کچھ کم دلچسپی نہیں رکھتیں۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار فسانہ نویس اس وقت فسانہ نگاری میں مشغول ہیں۔ سب کا تذکرہ کہاں تک لکھوں۔ ان میں سے بعض بہت اچھا لکھنے والے ہیں۔ اور اکثروں کی مشق ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ لیکن مجھے کہنے دیجئے۔ کہ متعدد ایسے بھی "قابل" افراد اس زمرہ میں شامل ہیں۔ کہ اگر خدانخواستہ اُن کی عمر دو سو برس طویل ہو جائے۔ اور وہ اس عرصہ میں برابر فسانہ نگاری کرتے رہیں۔ تب بھی اُن کا آخری فسانہ لغویات کی پوٹ سے زیادہ وقیع نہیں ہوگا۔

اس کے بعد ہم اُردو کے بعض بہت مشہور فسانوں کی ایک مکمل فہرست پیش کرتے ہیں۔ جس سے ناظرین پر واضح ہوگا۔ کہ اُردو لٹریچر فسانوی حیثیت سے کہاں تک ترقی کر چکا ہے۔ اور اُس میں کس کس قسم کے کیسے کیسے فسانے پائے جاتے ہیں۔ یہ صرف وہ فسانے ہیں۔ جو کتابی شکل میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اور عام طور پر دستیاب ہوتے ہیں۔ باقی رہے۔ وہ فسانے جو آئے دن اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور اب تک کسی مجموعہ میں مرتب نہیں ہوئے نہ اُن کی تعداد کا احاطہ ہو سکتا ہے۔ اور نہ اُن کے نام گنوانے سے کوئی خاص فائدہ ہے۔

اُردو کے بعض فسانہ نویس اور اُن کے مختصر فسانے

۱۔ سید سجاد حیدر یلدرم بی۔ اے ڈپٹی کلکٹر۔ سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

(۱) خیالستان۔ بعض ترکی اور بعض طبعزاد افسانوں کا مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۳۲۰ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ (۲) حکایات و احتساسات مشہور ترکی ادیبہ خالدہ ادیب خانم کے بعض فسانوں کا ترجمہ اور بعض طبعزاد قصوں کا مجموعہ ۲۲۶ صفحوں پر (۳) پرانا خواب اور دو فسانے۔ ترکی سے ترجمہ (۴) مرزا پھوپا۔ ایک رئیس زادے کی علیگڈھ میں تعلیم پانے کا بڑا مزے کا منظوم قصہ

۲۔ مصور فطرت" خواجہ حسن نظامی دہلوی۔

دس جلدوں میں ایک کتاب" غدر دہلی کے افسانے" ان کی تصنیف ہے جو ساری کی ساری درد وغم کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ دسوں حصوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ حصہ اول "بیگمات کے آنسو" ۱۷۲ صفحے حصہ دوم۔ "انگریزوں کی بپتا" ۶۴ صفحے حصہ سوم۔ "محاصرہ دہلی کے خطوط" ۳۲ صفحے۔ حصہ چہارم۔ "بہادر شاہ کا مقدمہ" ۲۸۰ صفحے۔ حصہ پنجم۔ "گرفتار شدہ خطوط" ۱۵۲ صفحے۔ حصہ ششم "غدر دہلی" کے اخبار ۲۸ صفحے حصہ ہفتم "غالب کا روزنامچہ" ۷۲ صفحے حصہ ہشتم "دہلی کی جان کنی" ۲۰۴ صفحے حصہ نہم۔ "دہلی کا آخری سانس" ۲۶۸ صفحے۔ حصہ دہم "غدر کی صبح وشام"۔

ان دسوں حصوں کے علاوہ ایک فسانوں کی کتاب "جگ بیتی کہانیاں" ہے۔ بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اور اس میں حسب ذیل کہانیاں ہیں۔ قینچی کا فیضان۔ عطر اور ڈنڈے۔ آنسو کا جھولا۔ پیاری ہتھکڑی۔ دکھیا شہزادی جاذب کاغذ کی کہانی۔

۳۔ منشی پریم چند بی اے ایڈیٹر مادھری لکھنؤ

(۱) پریم پچیسی دو حصے۔ پچیس معاشرتی اور اصلاحی فسانوں کا مجموعہ ہے۔ (۲) پریم بتیسی دو حصے۔ اس میں ۳۲ فسانے ہیں۔ (۳) پریم چالیسی دو حصے۔ اس میں ۴۰ فسانے ہیں۔ (۴) خاک پروانہ۔ ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ (۵) خواب وخیال۔ اس میں بھی ۱۴ افسانے ہیں۔ (۶) نجات۔ تازہ فسانوں کا مجموعہ۔ ۲۰۰ صفحات پر شائع ہوا ہے (۷) سوز وطن (۸) حب وطن کے قصے۔

۴۔ مصور غم علامہ راشد الخیری دہلوی

(۱) گلدستہ عید۔ اس میں ۱۴ افسانے ہیں۔ (۲) سیلاب اشک۔ ۸ حزنیہ فسانوں کا مجموعہ ہے۔ (۳) طوفان اشک۔ اسی قسم کے ۱۲ افسانے اس میں ہیں۔ (۴) جوہر عصمت۔ اس میں بھی ۱۲ افسانے ہیں۔ (۵) سات روحوں کے اعمال نامے (۶) تمغہ شیطانی (۷) سنجوگ (۸) سوکن کا جلاپا (۹) شاہین و دراج (۱۰) گوہر مقصود۔ (۱۱) نسوانی زندگی۔ یہ چار فسانوں کا مجموعہ ہے۔ (۱۲) ستونتی (۱۳) مسودہ (۱۴) انگوٹھی کا راز (۱۵) تفسیر عصمت (۱۶) منازل ترقی (۱۷) بچہ کا کرتا (۱۸) ویڈیا کی سرگذشت (۱۹) ولایتی ننھی (۲۰) نانی عشو (۲۱) ابین کا دم واپسین۔ (۲۲) درشہوار (۲۳) شہنشاہ کا فیصلہ (۲۴) سزائے نقد

(۵) نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری ایڈیٹر رسالہ نگار وجن لکھنؤ۔

ان کے مختصر افسانوں کے مجموعے کا نام نگارستان ہے۔ آج کل فسانے لکھنے انہوں نے کچھ چھوڑ سے دیئے ہیں۔

۶۔ مہاشہ سدرشن جرنلسٹ سابق ایڈیٹر چندن لاہور

(۱) بنگال بتیسی دو حصے۔ ۳۲ مختصر فسانوں کا مجموعہ ہے۔ (۲) بہارستان۔ یہ بھی فسانوں کا مجموعہ ہے (۳) تہذیب کے تازیانے (۴) چندن (۵) قوس وقزح (۶) سدابہار پھول (۷) چشم وچراغ۔ اُن کی تازہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ (۸) صبح وطن (۹) پارس۔ بچوں کیلئے دلچسپ کہانیاں ۴ حصوں میں۔ (۱۰) امرت (۱۱) بچوں کیلئے ہتوپدیش۔ (۱۲) طائر خیال

جدید فسانوں کا مجموعہ ہے۔

۷۔ سید امتیاز علی تاج بی۔ اے

موریس لیول عہدِ حاضرہ کا ایک مشہور فرانسیسی مختصر فسانہ نویس ہے۔ دہشت اور ہیبت اور اُسکے فسانوں کی خاص خصوصیت ہے۔ سید صاحب نے اس کے فسانوں کا ترجمہ "ہیبت ناک فسانے" کے نام سے کیا۔ فسانے واقعی ایسے ہیں کہ اُنہیں پڑھ کر دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

اس کے علاوہ سید صاحب نے بچوں کے لئے بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے فسانے اور کہانیاں لکھی ہیں۔ تفصیل یہ ہے۔

(۱) ابوالحسن (۲) بادشاہوں کی کہانیاں (۳) بچوں کی بہادری (۴) پھولوں کی کلیاں دو حصے (۵) پرستان دو حصے اس میں پریوں کی کہانیاں بیان کی ہیں۔ (۶) چڑیا خانہ دو حصے۔ اس میں پرندوں کی کہانیاں ہیں۔ (۷) سپاہی اور درویش (۸) سمندری شہزادی (۹) گدگدی دو حصے۔ اس میں ہنسانے والی کہانیاں ہیں۔ (۱۰) موت کا راگ

۸۔ عبدالمجید سالک بی اے۔ مدیر روزنامہ انقلاب

چمپا اور دوسرے افسانے ان کے ادبی فسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو اُنہوں نے وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات و رسائل میں لکھے۔

۹۔ ابوالاثر حفیظ جالندہری مصنف شاہنامہ اسلام

ہفت پیکر۔ یہ ان کے طبعزاد فسانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے بچوں کے لئے بہت سے چھوٹے چھوٹے قصے لکھے ہیں۔ جو قریباً سارے الف لیلہ سے لیکر آسان زبان میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:-

(۱) بدر بادشاہ اور جواہر شاہزادی (۲) سندباد جہازی (۳) سوداگر کی کہانی (۴) شہزادہ خداداد اور شہزادی دریابار (۵) شہزادہ صنم اور جنوں کا بادشاہ (۶) عمر عیار دو حصے۔ (۷) کل کا گھوڑا (۸) ماہی گیر کی کہانی (۹) نورالدین علی اور بدرالدین حسن۔

۱۰۔ ڈاکٹر سعید احمد بریلوی۔ سابق اڈیٹر کامیابی و سعید دہلی۔

انہوں نے افسانے تو بہت لکھے ہیں۔ مگر اب تک غالباً ان کے فسانوں کا صرف ایک مجموعہ دامن باغباں کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۱۱۔ شوکت تھانوی

ان کے مزاحیہ فسانوں اور مضامین کے اب تک چار مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔ طوفانِ تبسم موجِ تبسم۔ سیلابِ تبسم۔ اور موجِ تبسم۔

۱۲۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی بی اے۔

آج کل گلبرگہ میں بسلسلہ ملازمت مقیم ہیں۔ پہلے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری حضور نظام تھے۔ ان کے مزاحیہ فسانوں اور مضامین کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کی کتاب غدر دہلی کے افسانوں کا گیارہواں حصہ موسوم بہ "دہلی کی آخری شمع" بھی انہی کا لکھا ہوا ہے۔

۱۳۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔اے۔ ایل۔ایل۔بی۔ وکیل جودھپور

رسائل میں مزاحیہ اور اصلاحی فسانے تو بہت لکھتے رہتے ہیں۔ مگر کتابی شکل میں ابتک تین مجموعے ان کے مختصر افسانوں کے شائع ہوئے ہیں۔ ایک کا نام شریر بیوی ہے دوسرے کا روحِ ظرافت اور تیسرے کا روحِ لطافت نہایت دلچسپ کتاب ہے۔

۱۴۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

ان کے فسانے کے مجموعے کا نام ہجولی ہے۔ جو دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

۱۵۔ مولوی منصور احمد ایڈیٹر رسالہ ادبی دنیا لاہور

مختلف ملکوں کے ۲۳ مختصر فسانہ نویسوں کے فسانے ترجمہ کرکے آپ نے جو مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اس کا نام "دنیا کے بہترین فسانے" ہے۔

۱۶۔ عشرت رحمانی رام پوری مدیر نیرنگ دہلی

انہوں نے ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کے پانچ افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو شائع ہو چکے ہیں۔ نام یہ ہیں۔ بیوی کی محبت اور شاعری کی جیت۔ زندگی یا موت۔ پریم بندھن اور دھوکا۔ علاوہ ازیں آپ کی ایک کتاب "بچوں کی کہانیاں" اور دوسری "بچوں کی دنیا" جو فسانوں کا مجموعہ ہے۔

۱۷۔ سید ظہور احمد وحشی شاہجہانپوری

ان کے اخلاقی اور اصلاحی فسانے نہایت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اب تک مندرجہ ذیل مجموعے ان مفید فسانوں کے شائع ہو چکے ہیں:۔

(۱) "درسِ عبرت"۔ اس میں حسب ذیل ۱۱ قصے ہیں۔ بنت الرشید۔ انجامِ ہوس۔ کرشمہ تعلیم۔ نیرنگی تقدیر۔ عروج و زوال۔ انتقامِ قدرت۔ ترکی ٹوپی۔ خونی گلوڑی۔ صلہ طاعت۔ پاداشِ گناہ۔ چاہ کندہ را چاہ درپیش۔

(۲) "تصویرِ معاشرت"۔ یہ ان نو فسانوں کا مجموعہ ہے۔ حسنِ اتفاق۔ وقت کی نیرنگیاں۔ کشتگانِ رسوم۔ انجام بے حتیاطی۔ گمشدہ فرزند۔ بے گنہ گنہگار۔ رنج و راحت۔ لیلائے سخن کا دیوانہ۔ پیکرِ دیانت

(۳) "طوفانِ زندگی" اس میں مندرجہ ذیل آٹھ قصے ہیں۔ اُمرا کی دوستی۔ ترکِ دنیا۔ فہمیدہ۔ پیکرِ وفا۔ حق بحقدار۔ امدادِ باہمی۔ سود خوار کا حشر۔ امید و بیم۔

(۴) "زندگی کی صبح و شام"۔ اس مجموعہ میں یہ دس فسانے ہیں۔ پر فرتوت۔ خوابِ پریشاں۔ تیر از کمان حسینہ۔

تازیانۂ عبرت - اشتہاری شادی - بھائی بہن - فریب دولت - عیار طبیعت - ثمرۂ محنت - ایک دن چاندنی چوک میں -

(۵) "عروج زندگی" اس میں دس افسانے ہیں - جن کے عنوان یہ ہیں - تصویر عروج - زور بازو - زرداد زری کشد پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ ہاؤس کا مالک - فولاد کا شہزادہ - نوجوان لکھ پتی - گدڑی میں لال - قعر پستی - العین بالعین دور اندیش -

(۶) "رہبر زندگی" یہ مندرجہ ذیل ۱۱ افسانوں کا مجموعہ ہے - سزائے عمل - حبس دوام - حسین بیوی - موت کے بعد کیا ہوا پیر و مرشد - غلط فہمی - شرعی عشق - انجام بے صبری - خدمت قوم - ایک مخفی خزانہ - لکھ پتی مزدور -

۱۸ - خان احمد حسین خاں بی - اے ایم - آر - اے - ایس - ایڈیٹر شباب اُردو لاہور

ان کے مختصر فسانوں کا پہلا مجموعہ تو "لالہ زار" کے نام سے شائع ہوا ہے - جو دو جلدوں میں ہے - دوسرے مجموعہ کا نام "سبزہ زار" ہے - اور تیسرا مجموعہ "زعفران زار" کے نام سے شائع ہوا ہے - مولوی فیروز الدین اینڈ سنز نے بھی آپ کے مختصر فسانوں کے تین مجموعے شائع کئے ہیں - ایک کا نام "شعلہ زار" ہے - جو دنیا کے مشہور آٹھ رزمی فسانوں کا مجموعہ ہے - دوسرے مجموعہ کا نام آبشار ہے جو شیکسپیر کے ۱۶ مختصر فسانوں کا مجموعہ ہے - تیسرا مجموعہ انگلستان کے مایۂ ناز فسانہ نویس ڈکنز کے بارہ فسانوں کا ترجمہ ہے - جس کا نام زعفران زار ہے -

۱۹ - پروفیسر محمد علم الدین سالک ایم - اے -

ان کے مختصر فسانوں کے مجموعہ کا نام "سبد گل" ہے -

(۲۰) مرزا فہیم بیگ چغتائی

بچوں کے لئے دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ اُنھوں نے تین حصوں میں لکھا ہے - جس کا نام "قصر صحرا" رکھا ہے -

(۲۱) محترمہ نذر سجاد حیدر صاحبہ

بہت اچھا لکھنے والی ہیں اور اکثر ناول ان کے شائع ہوئے ہیں - عام فسانوں کا مجموعہ ابتک کوئی کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا صرف ایک کہانیوں کا مجموعہ بچوں کے لئے پھولوں کے ہار کے نام سے چھپا ہے - سلیم کی کہانی اور نیک انجام فسانے بھی بچوں کے لئے لکھے ہیں - "نیرنگی تقدیر" اور "دکھ بھری" عورتوں کے لئے لکھی ہیں -

۲۲ - پروفیسر رام سروپ کوشل ایم - اے

ہندی زبان کا ایک مشہور فسانہ نویس وشومبھر ناتھ شرما کوشک ہے - اُس نے اپنے فسانوں کا مجموعہ چترشالہ کے نام سے شائع کیا ہے - پروفیسر صاحب نے اُس کا ترجمہ تصویر خانہ کے نام سے دو جلدوں میں کیا - فسانے اخلاقی اور اصلاحی ہیں اور ہندوستان کے مختلف شعبوں پر روشنی ڈالتے ہیں -

اس کے علاوہ بچوں کیلئے کہانیوں کی مندرجہ ذیل کتب آپ نے لکھی ہیں - (۱) اندھا اور بہرا (۲) بینگن سندری (۳) جادوگر اور دوسری کہانیاں (۴) گدھے کی آپ بیتی (۵) نٹ کھٹ پانڈے -

۲۳۔ مولوی محمد عنایت اللہ بی اے۔ دہلوی

آپ نے زلفی نام ایک فسانہ بچوں کے لئے جنگل بک میں سے خالص دہلی کی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اور بڑی قابلیت سے کیا ہے۔

۲۴۔ خان بہادر شیخ نور الٰہی ایم۔اے آئی ای ایس اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب

آپ نے جو کچھ لکھا ہے۔ بچوں کے لئے لکھا ہے۔ آپ کی شائع شدہ کہانیوں میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔
(۱) آپ بیتی دو حصے (۲) احمد نجومی (۳) جنگلی شہزادی (۴) چن چن (۵) چندا ماموں (۶) شہزادہ گڈریا (۷) غٹرغوں (۸) ککڑوں کوں (۹) گڈیا کا گھر دو حصے (۱۰) میاں کوشش (۱۱) میاؤں میاؤں (۱۲) ہائے میری ناک (۱۳) یار غار (۱۴) نواب شیر خاں اور اُن کی بلی (۱۵) لکشمی (۱۶) شمسی (۱۷) شہزادہ منکا (۱۸) شہزادہ گوالا (۱۹) بدھو کی کہانی (۲۰) مائی بیجا (۲۱) شمس اور اُس کی گائے (۲۲) گوہر بانو (۲۳) کرمو دھرمو (۲۴) اندھیر نگری (۲۵) راجہ مور۔

۲۵۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی

اُنھوں نے ناول تو اکثر لکھے ہیں مگر اس ذیل میں صرف اُن کی کتاب پیش کی جاسکتی ہے۔ جس کا نام منتخب الحکایات ہے۔

۲۶۔ مولوی بشیر الدین احمد مرحوم ایم۔ آر۔ اے۔ ایس دہلوی

عزم بالجزم ایک اخلاقی فسانہ ہے۔ نیز حکایاتِ لطیفہ تین حصے جس میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی ہیں۔

۲۷۔ محترمہ محمدی بیگم صاحبہ مرحومہ اہلیہ مولوی سید ممتاز علی شمس العلماء

بچوں کے لئے اُنھوں نے مندرجہ ذیل کہانیاں لکھیں (۱) امتیاز پچیسی (اپنے بچے سید امتیاز علی تاج بی۔اے) کے لئے ۲۵ چھوٹی چھوٹی کہانیاں (۲) تین بہنوں کی کہانی (۳) دل پسند کہانیاں۔ یعنی وہ کہانیاں جو دہلی میں مائیں اپنے بچوں کو سُناتی ہیں (۴) دل پسند کہانیاں (۵) ریاض پھول وہ کہانیاں جو اخبار پھول میں چھپیں (۶) علی بابا اور چالیس چور۔ عورتوں کے لئے آپ نے حسبِ ذیل فسانے لکھے۔ صفیہ بیگم۔ آج کل۔ شریف بیٹی۔ چندن ہار۔

۲۸۔ محترمہ لیلیٰ بانو اہلیہ خواجہ حسن نظامی

انھوں نے بچوں کی کہانیاں نامی ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں ۱۶ مزیدار کہانیاں ہیں۔

۲۹۔ غلام عباس ایڈیٹر اخبار پھول لاہور

بچوں کے لئے "چاند کی بیٹی" اور دوسری "جاپانی کہانیاں" نامی ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل چھ کہانیاں ہیں:۔ چاند کی بیٹی۔ زبان کٹی بلبل۔ بھوتوں کی ضیافت۔ گیدڑ اور خرگوش۔ راشوشوں کا دیو۔ سچی خوشی۔

۳۰۔ مفتی شوکت علی فہمی ایڈیٹر دین و دنیا دہلی

انھوں نے بچوں کے لئے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔ (۱) بچوں کی گلستاں

(۲) بچوں کی بوستاں (۳) اولیاء اللہ کی کہانیاں (۴) قرآن کی کہانیاں (۵) پیغمبروں کی کہانیاں (۶) بچوں کے تاریخی قصے (۷) بچوں کی اخلاقی کہانیاں (۸) بچوں کی نئی نئی کہانیاں (۹) بچوں کی علمی کہانیاں (۱۰) بچوں کی دلچسپ کہانیاں (۲۰) بچوں کی اصلاحی کہانیاں (۱۲) پریوں کی کہانیاں۔

۳۱۔ پروفیسر فیروز الدین مراد ایم۔ ایس۔ سی۔ لکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

کینن ڈائل ایک مشہور فسانہ نویس ہے۔ جو سراغرسانی کے قصے لکھنے میں مشہور ہے۔ اُس کے فسانوں کی کتاب میموریز آف شرلاک ہومز کا آپ نے حکایاتِ شرلاک ہومز کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ یادگار شرلاک ہومز کے نام سے بھی آپ نے ایک ترجمہ سراغرسانی کے مختصر فسانوں کا شائع کیا ہے۔

کینن ڈائل کی کتاب کا ایک اور ترجمہ بھی "حکایات شرلاک ہومز" ہی کے نام سے محمد یعقوب صاحب کلام بی۔ اے کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

۳۲۔ مسٹر جلیل احمد قدوائی ایم۔ اے

ان کے بعض روسی اور بعض طبعزاد فسانوں کا ترجمہ "سیر گل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ۱۶ افسانے ہیں۔ بعد کے فسانوں کا مجموعہ "اصنام خیالی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ سُنتے ہیں کہ عنقریب تیسرا مجموعہ بھی آپ کے مختصر فسانوں کا شائع ہونیوالا ہے

۳۳۔ آغا حشر قزلباش دہلوی۔ "گوہر گوش" ان کی انگریزی اور دیسی وضع کی کہانیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

۳۴۔ حکیم احمد شجاع بی اے۔ اسسٹنٹ سکرٹری پنجاب کونسل

اکثر وقیع رسائل میں فسانے لکھتے رہتے ہیں مگر "حسن کی قیمت اور دوسرے افسانے" ہی ایک مجموعہ ان کے مختصر فسانوں کا اب تک شائع ہوا ہے۔

۳۵۔ مسٹر حامد اللہ افسر بی۔ اے۔ میرٹھی

مختلف پرچوں میں فسانے لکھتے رہتے ہیں۔ "ڈالی کا جوگ اور دوسرے افسانے" اُن کے مختصر فسانوں کا مجموعہ ہے۔

۳۶۔ کوثر چاند پوری

"دلگداز فسانے" ان کے مختصر افسانوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ چھوٹی تقطیع کے کوئی ۲۰۰ صفحے ہونگے۔

۳۷۔ نور الٰہی محمد عمر

اکثر ڈرامے اور کبھی کبھی مختصر فسانے لکھتے ہیں "ناٹک کتھا" ان کے قدیم ہندوستان کے ڈرامائک کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

۳۸۔ سید ابو تمیم فرید آبادی

ان کے مختصر فسانوں کے دو مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں۔ جو دونوں مزاحیہ ہیں۔ ایک "بارہ پھلجھڑیاں" اور دوسرا "ہنسانے فسانے"۔ بچوں کے لئے بھی ایک کتاب "مزیدار کہانیاں" اُنھوں نے لکھی ہے۔

۳۹- فاطمہ بیگم (منشی فاضل) لیڈی سپرنٹنڈنٹ گرلز سکول بمبئی

"غیرت کی پتلی" ان کا افسانہ ہے۔ جو مستورات کے لئے لکھا گیا ہے۔ مختصر کہانیوں کی ایک کتاب بھی ان کی تصنیف ہے غالباً "اخلاقی کہانیاں" ہے۔

۴۰- محشر عابدی بی۔ اے

ان کے مختصر فسانوں کے مجموعہ کا نام محشرستان ہے

۴۱- سید علی عباس حسینی ایم۔ اے

"رفیق تنہائی" ان کے مختصر فسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ۷ فسانے شامل ہیں۔

۴۲- پروفیسر اکبر حیدری

"سیر خرابات" ان کے فسانوں کا مجموعہ ہے۔

۴۳- شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی مالک اخبار "تہذیب النسواں" لاہور

"پٹیو نوجوان" کا فسانہ انھوں نے بڑا مزیدار لکھا ہے۔ بچے بھی اس سے نصیحت حاصل کر سکتے ہیں اور بڑے بھی۔

۴۴- ماسٹر سید معین الدین صاحب شاہجہانپوری

انھوں نے بچوں کیلئے مندرجہ ذیل کہانیاں لکھی ہیں۔ (۱) بدمزاج شوہر (۲) شبنم بار شہزادی (۳) فیضی اور فیاض (۴) گوہر مسٹر

۴۵- آقائے مرتضیٰ احمد خاں دُرّانی

"الہامی فسانے" ان کے مجموعہ قصص کا نام ہے جس میں قرآن مجید میں جس قدر تذکرے نبیوں کے آئے ہیں اُن کو ادبی سانچے میں ڈال کر لکھا ہے

۴۶ خواجہ عبدالحی - "نبیوں کے قصے" ان کی کتاب ہے۔ جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔

۴۷- مولوی احسان اللہ خاں چڑیاکوٹی

شیکسپیر کے فسانوں (ٹیلز فرام شیکسپیر) کا اُردو ترجمہ "افسانہائے دلپذیر" کے نام سے آپ نے کیا ہے۔

۴۸ منشی محمد امین زبیری سابق مہتمم تاریخ بھوپال

انھوں نے "گیارہ قصے" نامی ایک کتاب شائع کی ہے۔ میں نے نہیں دیکھی خبر نہیں کیسی ہوگی۔

۴۹- جناب جوش - "فسانۂ جوش" ان کے فسانوں کا مجموعہ ہے۔

۵۰- شیخ محمد بدرالاسلام فضلی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) سابق پروفیسر ٹوکیو یونیورسٹی جاپان

"اسلامی کہانیاں" چھوٹے بچوں کے لئے ایک نہایت دلچسپ اور آسان کتاب اُنھوں نے لکھی ہے۔ جو بارہ تاریخی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ لائق مصنف نے ان بارہ کہانیوں کو بچوں کو تیرہ سو برس کی ساری اسلامی تاریخ کا خلاصہ بتادیا ہے کتاب کو حالی بک ڈپو پانی پت نے شائع کیا ہے۔

ان کی دوسری کتاب "جاپانی کہانیاں" حال ہی میں مطبع سے نکلنے والی ہیں۔
کیمیائی ہیرا ایک بڑا مزیدار سراغرسانی کا مختصر فسانہ ہے۔ وہ بھی عنقریب شائع ہو گا۔

۵۱۔ محترمہ الیس۔ آر۔ کرمانیہ

"نیرنگ" ان کے مختصر فسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں۔ راہ ہدایت۔ ایثار عظیم۔ شبہ۔ جستجوئے محبت۔ زندگی کی آخری شب۔ طلاق۔ ضمیر کی آواز۔ بیوی کی محبت۔ رشک۔ احساس فرض۔ گنجینۂ صبر۔ نیکی کا بدلہ

۵۲۔ محترمہ خاتون اکرم مرحومہ

"گلستان خاتون" ان کے مختصر فسانوں کا مجموعہ ہے جس میں مندرجہ ذیل فسانے ہیں۔ شہید ظلم۔ آرزوؤں پر قربانی۔ انقلاب زمانہ تربیت اولاد۔ طرز زندگی۔ سچ کی فتح۔ دوسری شادی وغیرہ۔ علاوہ ازیں ان کے دو مختلف فسانے علیحدہ بھی شائع ہوئے ہیں۔ ایک کا نام پیکر وفا ہے اور دوسرے کا بچھڑی بیٹی۔

۵۳۔ بیگم صاحبہ نانپارہ۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی" ان کا فسانہ عورتوں کے لئے ہے۔

۵۴۔ محترمہ بنت داؤد الرحمٰن۔ "سارہ کی کجروی" ان کا فسانہ ہے۔ عورتوں کے لئے لکھا گیا ہے۔

۵۵۔ والدہ سید افضل علی ایم اے۔ ان کے فسانہ کا نام "سعادت کا سہرا" ہے۔

۵۶۔ محترمہ ح۔ ب صاحبہ

"شہیدی بیگم" ان کا چھوٹا سا نصیحت آموز فسانہ ہے۔ جس میں بے سمجھے سوچے شادی کرنے کی خرابیاں بتائی گئی ہیں۔

۵۷۔ محترمہ حلیمہ بیگم۔ "بدمزاج دلہن" اس فسانہ میں ایک دولتمند مغرور لڑکی کا انجام دکھایا گیا ہے۔

۵۸۔ تہور علی خاں۔ "پھلجھڑی" انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں بچوں کے لئے کچھ کہانیاں نظم و نثر ہیں۔

۵۹۔ مولوی بدرالدین بی۔ اے۔ اپنے فسانہ "اسیر قفس" میں انھوں نے تعلیم نسواں پر محاکمہ کیا ہے۔

۶۰۔ مولوی ضیاء الحق صدیقی۔ "نرالی دنیا" بچوں کے لئے گلیور صاحب کی کہانیوں کا ترجمہ ہے۔

۶۱۔ عثمان حیدر مرزا۔ "انوکھی دنیا" یہ بھی گلیور ٹریولز کا اردو ترجمہ ہے۔

۶۲۔ ارشد۔ "بن باسی رستم" جنگل بک کی ایک کہانی کا ترجمہ بچوں کے لئے ہے۔

۶۳۔ سیفی سہواروی۔ بچوں کیلئے انھوں نے یہ تین دلچسپ کہانیاں لکھی ہیں (۱) کن کٹا قاضی (۲) نغے ملا (۳) بگلا بھگت

۶۴۔ رضا احمد جعفری۔ ان کی کتاب کا نام پھولوں کا گلدستہ ہے۔ جس میں بچوں کے لئے مندرجہ ذیل کہانیاں ہیں اصلی شرافت۔ احمقوں کی دانائی۔ بڑھیا اور گدھا۔ بیوی کی محبت۔ غریب لکڑہارا۔ کوٹھڑی کا بھوت۔

۶۵۔ لالہ امرناتھ چوپڑہ۔ تین بھائیوں کی کہانی ان کا فسانہ ہے۔ جو انھوں نے بچوں کے لئے لکھا ہے۔

۶۶۔ افضل حسین چشتی (علامہ مضحک دہلوی)۔ اخوان الشاطین انھوں نے اپنے فسانوں کے مجموعہ کا نام رکھا ہے۔

۶۷۔محترمہ انیس فاطمہ۔ "چار رُخ" اس مختصر فسانہ میں مغربی تمدن کی اندھا دھند پیروی کی بُرائی بتائی گئی ہے۔

۶۸۔محترمہ امت الوحی۔ "شہید وفا" انھوں نے ایک مختصر فسانہ لکھا ہے۔

۶۹۔نواب رائے۔ ان کے فسانوں کے مجموعہ کا نام سوز وطن یا سیر درویش ہے جس میں مندرجہ ذیل فسانے ہیں۔دنیا کا سب سے انمول رتن ۔شیخ مخمور۔یہی میرا وطن ہے۔صلۂ ماتم۔عشق دنیا۔حب وطن۔سیر درویش۔

۷۰۔محترمہ صغرا ہمایوں مرزا۔ایڈیٹر ہمجولی حیدر آباد دکن

"سرگذشت ہاجرہ" یہ چار مفید اور سبق آموز فسانوں کا مجموعہ ہے۔جس میں ہاجرہ کی سرگذشت سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔

۷۱۔سید طالب علی طالب الٰہ آبادی بی اے۔ گوہر عصمت۔معصوم لڑکی۔طلسم ساز۔بیلا۔سیتا رام۔ پھول۔انوکھے جادوگر ان کے وہ فسانے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔حال ہیں ان کے نو طلسمی فسانوں کا مجموعہ نورتن کے نام سے نکلا ہے۔

۷۲۔مولوی ظفر علیخاں بی۔اے آف زمیندار لاہور۔(۱) میری عینک۔سنہری گھونگا۔

۷۳۔سید عابد علی۔ ان کے مختصر فسانے حجاب زندگی کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

۷۴۔مولوی محمد شاہ ولی میمنی بی اے۔(آنرز)

ڈاکٹر ٹیگور کے چند افسانوں کا ترجمہ آپ نے اندرا اور دوسرے افسانے کے نام سے کیا ہے۔

۷۵۔مولانا تمکین کاظمی۔ "غنچۂ تبسم" ان کے مزاحیہ افسانوں کا نام ہے۔

۷۶۔تیرتھ رام فیروز پوری۔

سراغرسانی کے بیسیوں ناولوں کا ترجمہ کیا ہے۔ان کے فسانوں کے مجموعے یہ ہیں۔(۱) کارنامہ جات شرلاک ہومز۔ (۲) کارنامہ جات آرسین لوپن (۳) افسانۂ بنگال۔رابندر ناتھ ٹیگور اور دوسرے بنگالی فسانہ نگاروں کے مختصر فسانوں کا ترجمہ (۴) مصنوعی انسان۔گیارہ حیرت انگیز کہانیوں کا مجموعہ (۵) سنبلستان۔بنگال کے مشہور و معروف فسانہ نگاروں کے ۱۵ منتخب فسانوں کا ترجمہ

۷۷۔شیخ محمد ناظر اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس۔بچوں کے لئے آپ نے حسب ذیل کہانیاں لکھی ہیں (۱) نجومی ڈاکٹر (۲) برگ حیات (۳) شہزادہ بدھو (۴) سندھ باد سیاح۔

۷۸۔لالہ خزانچند سابق ڈپٹی انسپکٹر مدارس۔ بچوں کے لئے آپ نے چند کہانیاں لکھی ہیں مثلاً (۱) مبارک جوڑی (۲) سلکھن راجکمار (۳) ستونتی (۴) کھراماتی لڈو (۵) ہوائی گھوڑا (۶) بیر بر کے ہیرے موتی۔ (۷) دانشمند وزیر (۸) انکل بچہ جوتشی (۹) چین کی شہزادی (۱۰) شکنتلا (۱۱) جادو کی پری

۷۹۔لالہ کرم چند اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس۔آپ نے بچوں کے لئے چند کہانیاں لکھی ہیں مثلاً (۱) ناصحا۔

(۲) مسخرا (۳) حکایاتِ حیوانات۔

۸۰۔ مولوی محمد عبداللہ خاں مرحوم۔ آپ بھی تعلیمی کتب کی تالیف و تصنیف میں نہایت مشہور ہیں۔ بچوں کیلئے حکایاتِ شیریں آپ کی مشہور کتاب ہے جو چار حصوں میں ہے۔

۸۱۔ خانصاحب خلیفہ عماد الدین مرحوم۔ آپ نے بچوں کی کہانیوں کی کچھ کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً (۱) تین شہزادے (۲) چار دوست (۳) سونے کا ہاتھی (۴) سات کہانیاں

۸۲۔ کے ایل۔ رلیا رام۔ آپ کی بھی کتابیں بچوں کے لئے وقف ہیں۔ آپ کی ایک کتاب بچوں کے لئے دلچسپ کہانی کے نام سے غالباً دو حصوں میں ہے۔

۸۳۔ رائے صاحب لالہ رگھوناتھ سہائے بی۔اے۔ آپ نے بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا ہے۔ گلدستہ نام ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ جو بچوں کا اخبار ہے۔ بچوں کے لئے آپ نے جو کہانیاں لکھی ہیں۔ اُن میں سے دو تین کے نام نیچے لکھے جاتے ہیں۔ (۱) بے ایمان دوست (۲) صبح اُمید (۳) انجام ظلم۔

۸۴۔ چودھری عبدالمجید نسیم۔ ان کے دو فسانے جو بچوں کے لئے لکھے گئے ہیں شائع ہوئے ہیں۔ ایک کا نام "سہیل یمن" ہے اور دوسرے کا "تصویر وفا"۔

۸۵۔ لالہ شودیال ایم۔اے۔ بچوں کے لئے ایک فسانہ "ثمرہ دیانت" شائع ہوا ہے

۸۶۔ چودھری فتح الدین۔ آپ نے بچوں کے لئے مندرجہ ذیل فسانے لکھے ہیں۔ (۱) خونی خاوند (۲) صبر کا اجر قسمت کا گورکھ دھندا (۳) جاں نثار دوست (۴) درد مند دیو (۵) بیمار غم

۸۷۔ مولانا تاجور نجیب آبادی۔ اعلیٰ درجہ کے مورخ اور انشا پرداز ہیں۔ بچوں کے لئے دو کہانیاں لکھی ہیں۔ پاٹھفاں کا آئینہ اور سچی محبت کی فتح۔

۸۸ بابو راجیشور ناتھ۔ آپ نے ایک کتاب "بنگالی کہانیاں" بنگالی زبان سے ترجمہ کی ہے۔ جس میں بچوں کیلئے بنگالی مشہور مصنفوں کے چھوٹے چھوٹے فسانے درج کئے ہیں۔

۸۹ مہاشہ یدھشٹر۔ آپنے بچوں کیلئے اخلاقی کہانیوں کے دو مجموعے لکھے ہیں۔ پہلے کا نام دلکش کہانیاں ہے اور دوسرے کا نام پھولوں کی کیاری۔

۹۰۔ خواجہ محمد شجاع منعمی ایم۔ایس سی۔ آپ نے بچوں کے لئے دلچسپ فسانہ کے رنگ میں ایک کتاب راج کنور لکھی ہے۔ جس میں فطرۃ انسانی کے سربستہ رموز پر باتوں باتوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۹۱۔ افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش دہلوی۔ آپ کے فسانوں کا مجموعہ اگر مَیں نام نہیں بھولتا تو "پرپرواز" ہے۔ بچوں کے لئے عجائبات فلکی کے متعلق ۲۹ دلچسپ کہانیوں کا بھی آپنے ایک مجموعہ لکھا ہے "جس کا نام ہمارا آسمان" ہے۔

۹۱۔ مولوی دلدار خاں مقبل ایم۔اے۔ بچوں کیلئے دلچسپ اور معنی خیز کہانیوں کا آپ نے ایک مجموعہ دو جلدوں

میں لکھا ہے۔ جس کا نام "دلکش کہانیاں" ہے۔ آپ کی دوسری کتاب کا نام گلدستہ حکایات ہے۔ جس میں بچوں کے لئے نظم و نثر حکایتیں جمع کی گئی ہیں۔

۹۳۔ خان بہادر مولوی فیروز الدین مالک فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور

آپ نے ایک کتاب تو بچوں کے لئے "منتخب اُردو گلستان" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں گلستاں کی حکایتوں کا ترجمہ نہایت آسان زبان میں کیا ہے۔ دوسری اہم بالشان کتاب آپ کی "الہام منظوم" ہے۔ جو مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ ہے اور آپ نے اُس کو بڑے اہتمام سے چھ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ "مثنوی مولانا روم" جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ فارسی میں اخلاقی کہانیوں کی بہترین کتابوں میں سے ہے۔

یہ ہیں اُردو کے وہ مختصر فسانہ نگار جن کی تصانیف نہایت سرسری طور پر تلاش کر کے میں جمع کر سکا لیکن اگر عمیق مطالعہ کیا جائے اور زیادہ تحقیق و تفتیش کی جائے تو اور بھی بہت سی تصانیف کا اس فہرست میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ مختصر فسانہ نویسی روز بروز ترقی ہی پر ہے اور آئے دن جدید اور عجیب فسانے برابر شائع ہو رہے ہیں۔ میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز نے علامہ تاجور نجیب آبادی کی ایڈیٹری میں "منتخب فسانے" کے نام سے گذشتہ ستائیس اٹھائیس برس میں مختلف اخبارات و رسائل میں جس قدر دلچسپ فسانے شائع ہوئے تھے۔ اُن کا انتخاب ۱۲ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اور جس قدر فسانہ نویسوں کے فسانے اُس میں درج کئے ہیں۔ اُن میں سے اکثروں کے فوٹو بھی دیئے ہیں اور حالات بھی۔ علاوہ ازیں ایک مجموعۂ زرین فسانے کے نام سے شائع کیا۔ اس فرم نے بچوں اور لڑکوں کے لئے بھی فسانوں کے تین مجموعے شائع کئے ہیں۔ ایک کا نام عمرو کی عیاریاں ہے۔ اس کے ۱۶ حصے ہیں۔ دوسرے کا نام خوجی کے کارنامے ہے اس کے چھ حصے ہیں تیسرے مجموعے کا نام آزاد کے کارنامے ہے اس کے دو حصے ہیں۔ "دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن ۱۴ جلدوں میں تمام دنیا کے مشہور فسانے ایک جگہ جمع کرنا چاہتا ہے۔ جو مولوی عبد القادر سروری ایم۔ اے۔ ایل ایل بی ایڈیٹر رسالہ مکتبہ کی زیر ادارت مرتب کئے جائیں گے۔ چودہ جلدوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔ جلد اول۔ قدیم افسانے۔ جلد دوم۔ چینی اور جاپانی افسانے۔ جلد سوم۔ انگریزی افسانے۔ جلد چہارم جرمن افسانے۔ جلد پنجم۔ فرانسیسی افسانے۔ جلد ششم۔ اطالوی افسانے۔ جلد ہفتم ہسپانوی افسانے۔ جلد ہشتم ولندیزی افسانے۔ جلد نہم۔ روسی افسانے۔ جلد دہم۔ پولی افسانے۔ جلد یازدہم بلجمی افسانے۔ جلد دوازدہم۔ جدید اسلامی افسانے۔ جلد سیزدہم۔ امریکی افسانے۔ جلد چہاردہم بہترین اُردو فسانے ان میں سے دو تین جلدیں چھپ چکی ہیں باقی باقی ہیں۔

"آلام حیات" کے نام سے یورپین فسانہ نگاروں کے دلچسپ فسانوں کا ترجمہ دہلی سے گذشتہ دنوں شائع ہوا ہے۔ نیز پانچ مشہور ادیبوں (پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایم۔ اے۔ پروفیسر محمد دین تاثیر ایم۔ اے۔ غلام عباس ایڈیٹر پھول۔ معراج الدین شامی اور مسٹر بدر الدین بدر) نے مل کر فرانس کے نامور فسانہ نویسوں (اناطول فرانس۔ الکش فشر۔ موپاسان۔ تھیوفیل گاشہ اور بلزاک وغیرہ) کے آٹھ فرانسیسی فسانوں کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے اور "فرانسیسی فسانے" نام رکھا ہے۔ اس کے علاوہ دار الاشاعت پنجاب ۔

عطر چند کپور۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ۔ گلاب چند کپور۔ نرائن دت سہگل۔ فیروز پرنٹنگ ورکس اور قومی کتب خانہ لاہور خواجہ بکڈپو اور جامعہ ملیہ دہلی وغیرہ اشاعتی ادارات نے بچوں اور لڑکیوں کے لیے سینکڑوں نئی نئی اور عجیب عجیب کہانیاں شائع کی ہیں۔ جن کی تفصیل ایک بڑی فرصت چاہتی ہے۔

چونکہ جو کچھ مجھے بیان کرنا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مختصر اور سرسری طور پر میں سب کچھ بیان کر چکا۔ اب آخر میں اُردو کے موجودہ مختصر فسانہ نویسوں کی صرف نامواز فہرست دیکر مضمون ختم کرتا ہوں۔ دل چاہتا تھا کہ ہر ایک فسانہ نگار کے مختصر حالات بھی ساتھ لکھتا لیکن نہ اتنی مہلت ہے اور نہ سب کے حالات مہیا کر کے مرتب کرنا دو چار دن کا کام ہے۔ لہٰذا اس وقت صرف ناموں کی فہرست پر قناعت کرتا ہوں۔ شاید پھر کبھی حالات بیان کرنے اور ہر ایک شخص کی فسانہ نگاری پر تنقید کرنے کا بھی موقع مل جائے۔ اس فہرست میں اُن اصحاب کے نام بھی شامل ہیں۔ جن کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔ اور اُن کے نام بھی ہیں جن کا ذکر اُوپر نہیں ہوا۔ یعنی جن کی کوئی مستقل تصنیف کتابی شکل میں نہیں اور جو صرف اخبارات و رسائل میں فسانے لکھتے ہیں۔ جن اصحاب کا ذکر ہو چکا ہے محض فہرست کی تکمیل کے لئے میں نے ان کا نام ان میں شامل کر لیا ہے۔ ورنہ ویسے چنداں ضروری نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس فہرست کے پیش کرنے سے ہمارے اُردو دان احباب کو اپنی فسانوی دنیا کے ہیروں سے ایک ہلکا سا تعارف ہو جائیگا۔ میں یہ فہرست بغیر کسی ترتیب کے درج کرتا ہوں۔ بڑے چھوٹے فسانہ نگار کا قطعاً خیال نہیں کیا۔ جس کا نام جہاں یاد آ گیا لکھ لیا۔ کچھ مہلت ہوتی تو حروف تہجی کی ترتیب سے ان ناموں کو مرتب کرتا۔ وھو ہٰذا :۔

ہندوستان کے اُردو مختصر فسانہ نگاروں کی فہرست

(۱) منشی پریم چند بی۔ اے ایڈیٹر مادھری

(۲) سید سجاد حیدر یلدرم بی اے سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی

(۳) مسٹر سدرشن

(۴) جلیل احمد جلیل قدوائی ایم اے

(۵) مسٹر منصور احمد بی۔ اے ایڈیٹر ادبی دنیا

(۶) سید امتیاز علی تاج بی۔ اے

(۷) ابوالاثر حفیظ جالندھری

(۸) مصور فطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

(۹) غلام عباس ایڈیٹر اخبار پھول لاہور

(۱۰) پروفیسر رام سروپ کوشل ایم۔ اے

(۱۱) محترمہ محمدی بیگم مرحومہ اہلیہ شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی

(۱۲) پروفیسر فیروز الدین مراد ایم۔ ایس۔ سی۔ لکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

(۱۳) محترمہ نذر سجاد حیدر

(۱۴) خان بہادر شیخ نور الٰہی ایم اے۔ آئی۔ ای۔ ایس اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات پنجاب لاہور

(۱۵) ماسٹر سید معین الدین شاہجہانپوری

(۱۶) خان احمد حسین خاں بی۔ اے ایم آر۔ اے۔ ایس ایڈیٹر شباب اُردو لاہور

(۱۷) مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل جودھ پور

(۱۸) عبدالمجید سالک بی۔اے۔ مدیر روزنامہ انقلاب لاہور

(۱۹) مرزا عظیم بیگ چغتائی

(۲۰) مصورِ غم مولانا راشد الخیری دہلوی

(۲۱) خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

(۲۲) محترمہ عباسی بیگم مرحومہ

(۲۳) حکیم احمد شجاع بی اے۔ اسسٹنٹ سکرٹری پنجاب کونسل لاہور

(۲۴) مسٹر ظفر عمر بی۔اے۔

(۲۵) سید احمد شاہ بخاری پطرس ایم اے سکرٹری پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی لاہور

(۲۶) نور الٰہی محمد عمر

(۲۷) ایم۔ اسلم۔ بی۔اے

(۲۸) محمد عبدالقادر سروری ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی مدیر مکتبہ حیدرآباد دکن

(۲۹) ڈاکٹر سعید احمد بریلوی سابق ایڈیٹر کامیابی دہلی

(۳۰) عشرت رحمانی رام پوری ایڈیٹر نیرنگ دہلی

(۳۱) سید ظہور احمد وحشی شاہجہانپوری

(۳۲) مفتی شوکت علی فہمی ایڈیٹر دین دنیا دہلی

(۳۳) پروفیسر اکبر حیدری دہلی

(۳۴) ضیاءالدین شمسی جرنلسٹ

(۳۵) مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

(۳۶) دیوانہ بریلوی

(۳۷) مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

(۳۸) سید شاہ ولی مبینی بی۔اے۔

(۳۹) ظفر قریشی بی۔اے

(۴۰) طاہر غلام ناصر خاں

(۴۱) محترمہ ممتاز رفیع بیگم مارہروی بھوپال

(۴۲) ڈاکٹر خان شاطر غزنوی ایڈیٹر رسالہ گرستی

(۴۳) اندرجیت شرما ماچھرہ

(۴۴) مرزا فدا علی خنجر

(۴۵) لالہ رنبیر سنگھ ویر بی۔اے

(۴۶) کوثر چاندپوری

(۴۷) شیخ محمد عبدالاسلام فضلی بی۔اے۔ بی ٹی (علیگ) منشی فاضل پانی پت

(۴۸) سید اشفاق حسین رمزی ایم۔اے۔ بی۔ٹی (علیگ) منشی فاضل گوڑیانی

(۴۹) نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار لکھنؤ۔

(۵۰) شوکت تھانوی

(۵۱) نسیم انہونوی

(۵۲) سیماب اکبرآبادی

(۵۳) ساغر اکبرآبادی

(۵۴) سید ابو تمیم فرید آبادی

(۵۵) مس حجاب اسماعیل

(۵۶) مولانا سید تمکین کاظمی حیدرآباد

(۵۷) حامد اللہ افسر بی۔اے۔ میرٹھی

(۵۸) ہری چند اختر ایم۔اے

(۵۹) پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایم۔اے

(۶۰) مسٹر ملک مجید

(۶۱) رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم ایڈوکیٹ ہائیکورٹ لاہور

(۶۲) مولوی ظفر علی خاں بی۔اے (علیگ) آف زمیندار لاہور

(۶۳) صدیق طبیب ایڈیٹر روزنامہ آزاد لاہور

(۶۴) سید ابو محمد ثاقب کان پوری
(۶۵) شاہد احمد بی۔ اے (آنرز) دہلوی مدیر ساقی
(۶۶) حسن عزیز جاوید
(۶۷) حکیم محمد یوسف ایڈیٹر نیرنگِ خیال لاہور
(۶۸) مولوی ابو محمد امام الدین رام نگری ایڈیٹر ترجمان بنارس
(۶۹) اختر شیرانی بی۔ اے
(۷۰) محمد تقی بی۔ اے
(۷۱) سید فرید جعفری مچھلی شہری
(۷۲) مرزا صفوۃ اللہ بیگ صوفی دہلوی
(۷۳) پنڈت میلا رام وفا
(۷۴) فاخر ہربالوی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
(۷۵) وقار انبالوی
(۷۶) سید ابن الحسن فکر ایم۔ اے
(۷۸) پروفیسر سید عابد علی ایم۔ اے۔ او۔ ایل۔ ایل۔ بی
پروفیسر ڈی ایس کالج لاہور
(۷۹) منشی کنھیا لال ایم۔ اے ایڈوکیٹ
(۸۰) لطیف احمد اکبر آبادی
(۸۱) زین العابدین سجاد میرٹھی
(۸۲) مولانا مشتاق علی خاں تمکین رام پوری
(۸۳) مولانا سید ناصر نذیر فراق دہلوی مرحوم
(۸۴) پروفیسر محمد دین تاثیر ایم۔ اے
(۸۵) جناب جوش ملسیانی
(۸۶) پروفیسر محمد علم الدین سالک ایم۔ اے
(۸۷) محترمہ انیس فاطمہ
(۸۸) محترمہ آمنۃ الوحی

(۸۹) محترمہ ایس آر کرمانیہ
(۹۰) مولوی بشیر الدین احمد ایم۔ اے ایم۔ آر۔ اے۔ ایس مرحوم
(۹۱) شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم
(۹۲) رضا احمد جعفری
(۹۳) محترمہ لیلیٰ بانو اہلیہ خواجہ حسن نظامی
(۹۴) مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم
(۹۵) مولوی محمد حسین بڈھالوی
(۹۶) مولوی عنایت اللہ بی۔ اے
(۹۷) سیفی سہواروی
(۹۸) والدہ سید افضل علی ایم۔ اے
(۹۹) بنت داؤد الرحمٰن
(۱۰۰) نواب رائے
(۱۰۱) محترمہ فاطمہ بیگم (منشی فاضل) ایڈی سپرنٹنڈنٹ گرلز سکول بمبئی
(۱۰۲) محشر عابدی بی۔ اے۔
(۱۰۳) سید علی عباس ایم۔ اے
(۱۰۴) افضل حسین چشتی دہلوی (علامہ مضحک)
(۱۰۵) آغا حشر قزلباش دہلوی
(۱۰۶) محترمہ ہمایوں اختر مرزا ایڈیٹر ہمجولی حیدرآباد
(۱۰۷) پنڈت بالمکند عرش ملسیانی
۱۰۸ میجر عطاء الرحمٰن
۱۰۹ خیر بھوروی۔ ایڈیٹر جیون۔ گورکھپور
(۱۱۰) ڈاکٹر اعظم کریوی ایڈیٹر اکبر الہ آباد
(۱۱۱) سید طالب علی طالب بی۔ اے۔ الہ آبادی
(۱۱۲) مظہر انصاری بی۔ اے (آنرز) دہلوی
(۱۱۳) عبد الغنی اصغر

(۱۱۴) مسٹر زہیر حسن بی۔ اے الہ آبادی
(۱۱۵) سید وقار عظیم بی۔ اے۔ الہ آبادی
(۱۱۶) ادیب انصاری مالی گانوی
(۱۱۷) مسٹر پریم چند پریم سیالکوٹی ایڈیٹر تشنہ
(۱۱۸) منشی عابد حسین ایچ۔ پی۔ شاہ جہاں پوری
(۱۱۹) مسٹر سری کرشن کول الہ آبادی
(۱۲۰) مسٹر رشید احمد صدیقی ایم۔ اے لکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
(۱۲۱) آغا حیدر حسن
(۱۲۲) محترمہ خاتون اکرم مرحومہ
(۱۲۳) معراج الدین شامی
(۱۲۴) مسٹر بدر الدین بدر
(۱۲۵) قاضی عبد الغفار مصنف لیلی کے خطوط
(۱۲۶) روشن دین بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
(۱۲۷) سید محمد عسکری طباطبائی بی۔ اے
(۱۲۸) مسٹر خلیل بی۔ اے
(۱۲۹) سید ابو طاہر داؤد بی۔ ایس۔ سی
(۱۳۰) مولانا احمد ایم۔ اے
(۱۳۱) راحت سعید علیگ
(۱۳۲) سراج الدین بی۔ اے
(۱۳۳) شیخ قمر الدین بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
(۱۳۴) فیض محمد فیض لدھیانوی (منشی فاضل)
(۱۳۵) آغا عبد الحمید بی۔ اے (آنرز)
(۱۳۶) رحمٰن چغتائی
(۱۳۷) فضل حسین
(۱۳۸) غیر معروف جرنلسٹ
(۱۳۹) پروفیسر واقف (شمس الافاضل)
(۱۴۰) مسز ایم ڈی۔ بخت حجاب چغتائی
(۱۴۱) مولوی احسان اللہ خاں چڑیاکوٹی
(۱۴۲) منشی محمد امین زبیری
(۱۴۳) مولوی ضیاء الحق صدیقی
(۱۴۴) عثمان حیدر مرزا
(۱۴۵) ارشد
(۱۴۶) محترمہ ر ح۔ ب صاحبہ
(۱۴۷) ظہور علیخاں
(۱۴۸) لالہ امر ناتھ چوپڑا
(۱۴۹) مسٹر مدن شرما
(۱۵۰) اشرف قریشی لکھنوی
(۱۵۱) سردار رام سنگھ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی
(۱۵۲) شیخ محمد انعام الحق ہوشیارپوری
(۱۵۳) محترمہ بلقیس جمال بریلوی
(۱۵۴) آزاد انصاری مالیگانوی
(۱۵۵) منشی تیرتھ رام فیروزپوری
(۱۵۶) شیخ محمد ناظر اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس
(۱۵۷) لالہ خزانچند سابق ڈپٹی انسپکٹر مدارس
(۱۵۸) لالہ کرم چند اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس
(۱۵۹) مولوی عبد اللہ خاں مرحوم
(۱۶۰) خانصاحب خلیفہ عماد الدین مرحوم
(۱۶۱) کے۔ ایل۔ رلیا رام
(۱۶۲) رائے صاحب لالہ رگھوناتھ سہائے بی۔ اے۔
ایڈیٹر گلدستہ لاہور

(۱۶۳) چودھری عبدالمجید نسیم
(۱۶۴) لالہ شودیال ایم اے
(۱۶۵) چودھری فتح الدین بی۔ اے
(۱۶۶) مولانا تاجور نجیب آبادی
(۱۶۷) بابو راجیشور ناتھ
(۱۶۸) مہاشہ بدھشٹر
(۱۶۹) خواجہ محمد شجاع منعمی ایم۔ ایس سی
(۱۷۰) افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی
(۱۷۱) مولوی دلدار خاں مقبل ایم۔ اے
(۱۷۲) خان بہادر مولوی فیروز الدین مالک فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور
(۱۷۳) منشی گوپی ناتھ امن دہلوی
(۱۷۴) سادھو ٹی۔ ایل۔ وسوانی
(۱۷۵) گیان چندر طالب ایم۔ اے
(۱۷۶) پنڈت رام پرشاد نسیم جرنلسٹ جالندھری مدیر "امید"
(۱۷۷) مسٹر ودیا ساگر جالندھری
(۱۷۸) ایل۔ سی۔ ہتیشی ایڈیٹر سندیش جالندھر
(۱۷۹) ڈاکٹر رگھبر دیال لاہور
(۱۸۰) شیدا کپورتھلوی
(۱۸۱) مس کملا دیوی
(۱۸۲) روشن صدیقی
(۱۸۳) جے کرشن
(۱۸۴) شرقی رضوی
(۱۸۵) جگیشور ناتھ ورما بیتاب دہلوی
(۱۸۶) بھگوت سروپ
(۱۸۷) بنواری لال شرما بی۔ اے
(۱۸۸) مجنوں گورکھپوری ایم۔ اے
(۱۸۹) مسٹر اظہار الحسن بی۔ اے ایل ایل۔ بی
(۱۹۰) مسٹر مجید اسحاق ایم۔ اے
(۱۹۱) گنگا پرشاد ورما بی۔ اے
(۱۹۲) محشر عابدی
(۱۹۳) تنویر قریشی
(۱۹۴) ایس ایم۔ ناظم۔ بی۔ ایس سی
(۱۹۵) قیسی اجمیری
(۱۹۶) مولوی مظفر احمد
(۱۹۷) خادم حسین بٹالوی
(۱۹۸) عاشق حسین بٹالوی بی۔ اے
(۱۹۹) فلک پیما
(۲۰۰) عبدالعزیز خاں
(۲۰۱) خواجہ عبدالکریم ایم۔ اے
(۲۰۲) سراج الدین احمد نظامی
(۲۰۳) مولوی حفیظ الرحمٰن
(۲۰۴) ذوقی علیگ
(۲۰۵) حامد علی خاں
(۲۰۶) مسٹر تقی علی باسمی
(۲۰۷) پروفیسر سید فیاض محمود گیلانی ایم۔ اے۔
(۲۰۸) مولوی انیس الدین احمد رضوی امروہوی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)

یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ یقیناً بہت سے قابل فسانہ نگاروں کے نام رہ گئے ہونگے۔ جن کو میری محدود واقفیت اور کمزور حافظہ صفحہ قرطاس پر پیش کرنے سے قاصر رہے۔ میں نہایت ممنون ہوں گا اُن احباب کا جو مجھے جدید فسانہ نگاروں کے اسمہائے گرامی سے مطلع فرمائیں گے۔ تاکہ کسی مفصل مضمون کے لکھتے وقت اُن کو بھی شامل کیا جا سکے۔ نیز چونکہ مضمون ہذا نہایت عجلت اور بے حد بے سرو سامانی کی حالت میں لکھا گیا ہے۔ لہٰذا اس میں بہت سی غلطیاں اور خامیاں بھی رہ گئی ہونگی۔ میں ناظرین کا شکر گذار ہونگا اگر وہ ازراہِ عنایت میری خامیوں سے مجھے مطلع فرمائیں گے۔

خاکسار شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

تصویر کے تین رُخ

یعنی

تین حیرت انگیز تاریخی فسانوں کا مجموعہ

(از شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی)

ہر ناظر کم از کم تین مرتبہ اس فسانہ کو پڑھے

(پہلا رُخ)

عباسی پرچم خلافت بغداد کے شاہی قصر پر لہرا رہا ہے اور ساری دُنیا اُسے دیکھ دیکھ کر خوف سے لرز رہی ہے۔ مشرق کے اس عظیم الشان تاجدار سے مغرب کا ہر شہنشاہ کانپ رہا ہے۔ قیصر روم اُسے خراج دے رہا ہے۔ اور شہنشاہ فرانس اُسے خوشامدیں تحفے بھیج رہا ہے نہ اس سے بڑا روئے زمین پر کوئی بادشاہ ہے اور نہ اُس سے زیادہ کسی شہنشاہ کی ہیبت دُنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ دُنیا اسے "امیر المومنین ہارون الرشید اعظم" کے نام سے پکار رہی ہے۔

اسی شہنشاہ کے لڑکے "مامون الرشید" سے علمی دُنیا کا کون شخص ہے جو واقف نہ ہو۔ خود بہت بڑا عالم اور علم کا انتہائی قدردان تھا۔ عربوں میں اشاعت علوم کی کثرت جس قدر اس کے زمانے میں ہوئی۔ مختلف علوم و فنون کی جس قدر بیش بہا کتابیں اس کے عہد میں ترجمہ تالیف اور تصنیف ہوئیں۔ علما و فضلا اور مترجمین و مؤلفین کی جتنی اس کے وقت میں بہتات ہوئی۔ اتنی کسی دوسرے عباسی خلیفہ کے وقت میں نہیں ہوئی۔ آئیے آج ہم آپ کو اس کے بچپنے کا ایک واقعہ سنائیں۔

باپ نے شروع ہی سے مامون کی تعلیم و تربیت کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔ ہر علم اور ہر فن کی تعلیم کے لئے اُستاد مقرر تھے۔ ورچھوٹی سی عمر میں مامون علوم مختلفہ کا عالم ہو چکا تھا۔ بچپن کا زمانہ تھا۔ رگ رگ میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ حکومت کا زعم اور سلطنت کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ جب محل سے باہر آتا ڈیوڑھی کے غلاموں کا ناک میں دم کر دیتا۔ اِسکی پگڑی اُچھال دی۔ اُس کی ٹوپی اُڑا دی۔ اِس کے بازو میں چٹکی بھر لی۔ اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارا۔ غرض شہزادہ کا باہر آنا ایک حشر اور قیامت سے کم نہ تھا جو اُس کے آتے ہی ہر طرف برپا ہو جاتا تھا۔ بیچارے غلام بے بس تھے۔ لاچار اور مجبور تھے۔ نہ کچھ کر سکتے تھے نہ کچھ کہہ سکتے تھے۔ نہ ان شرارتوں سے منع کرنے کی کسی میں جرأت تھی اور نہ مارتے وقت ہاتھ پکڑ لینے کا کسی میں حوصلہ تھا۔ مگر تھے سب نہایت تنگ اور پریشان۔

شہزادہ کے لئے باپ نے منجملہ اُستادوں کے ایک اتالیق بھی مقرر کر رکھا تھا۔ ایک روز جو اتالیق صاحب ڈیوڑھی پر آئے تو غلاموں نے

جرأت کرکے اُن سے کہہ ہی دیا کہ جناب ہم لوگ تو شہزادہ صاحب کے ہاتھوں زندگی سے اجیرن ہو رہے ہیں کچھ بن نہیں آتا کیا کریں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کریں۔ اتالیق نے کہا کیا قصہ ہے؟ غلاموں نے ساری کیفیت من و عن بیان کر دی یہ سُنکر اتالیق نے ایک غلام سے کہا کہ اندر میرے آنے کی شہزادہ کو اطلاع کرو۔ خیر اطلاع ہوئی اور شہزادہ کھیل کھال چھوڑ کر مسکین صورت بنائے نیچی نظریں کئے آن کر سامنے کھڑے ہو گیا۔ اتالیق نے کہا ذرا میرے پاس آؤ۔ وہ تعمیل حکم میں اور قریب آیا۔ اتالیق نے ایک ہاتھ سے شہزادہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے جس میں ایک بید تھی۔ تین چار بیدیں ایسے زور زور سے لگائیں کہ شہزادہ تڑپ اُٹھا۔ بچہ ہی تھا رونے لگا۔ اتالیق نے کہا ابھی سے اسقدر شرارتیں۔ کہ کوئی آدمی تمہارے ہاتھ سے امن میں نہیں۔ جب اس وقت یہ حالت ہے تو جس وقت خود بادشاہ ہو گئے اس وقت تو خلق خدا کو جینے بھی نہیں دو گے۔ تمہیں اپنے ماتحتوں کو پریشان کرتے شرم نہیں آتی۔

شہزادہ درد کی شدت سے رونے لگا اور اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اسی حالت میں اتالیق صاحب شہزادہ کو چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ راستہ میں وزیر السلطنت جعفر برمکی ملا جو قصر خلافت کو جا رہا تھا۔ باہم علیک سلیک ہوئی اور دونوں اپنے اپنے راستے چلے گئے۔

جب جعفر محل کی ڈیوڑھی پر پہنچا تو مامون میاں ابھی تک بیٹھے رو ہی رہے تھے۔ وزیر کو سامنے سے آتے دیکھا تو جھٹ آنسو پونچھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جعفر پاس آیا تو اُس نے سلام کیا اور مزاج پُرسی کی۔ شہزادہ نے جواب دیا الحمدللہ اچھا ہوں۔ اور قطعاً اس بات کا اظہار نہیں ہونے دیا کہ ابھی پٹ چکا ہوں۔ جعفر تھوڑی دیر شہزادہ سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اندر خلیفہ کے پاس چلا گیا۔

دوسرے دن جب اتالیق صاحب تشریف لائے تو اُنہوں نے شاگرد سے پوچھا کہ کل میں جس وقت یہاں سے واپس جا رہا تھا تو راستے میں جعفر ملے تھے۔ اِدھر ہی آ رہے تھے۔ تم نے میری کچھ شکایت تو اُن سے نہیں کی؟

مامون نے کہا استغفراللہ! آپ نے عجیب بات کہی۔ میں نے حضرت امیرالمومنین سے تو اس کے متعلق ایک لفظ کہا ہی نہیں وزیر سے تو کیا کہتا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو سزا مجھے کل دی تھی۔ یہ میری اصلاح کے لئے تھی اور میں نے عہد کر لیا ہے کہ اب کبھی شرارت نہیں کرونگا۔

یہ تھا تصویر کا پہلا رُخ جہاں ایک چھوٹا شاہزادہ اپنے غلاموں کے سامنے پیٹا جا رہا ہے۔

(دوسرا رُخ)

عباسیوں کا پرچم اقبال لہلہا کر پھٹ گیا۔ غزنوی خاندان کی بساط بھی بچھ کر لپٹ گئی۔ غلام۔ سادات۔ پٹھان اور لودھی بھی ایک ایک دوسرے کے بعد آئے اور چلے گئے۔ اب ہندوستان کی قسمت کی باگ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے مضبوط ہاتھوں میں ہے اکبر کس جاہ و جلال کا اور کس شان و شوکت کا بادشاہ تھا۔ اس کے ثابت کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں۔ سورج نکل

رہا ہو تو کوئی نہیں کہا کرتا کہ مجھے سورج دکھاؤ۔ چاند چمک رہا ہو تو کون ذی ہوش اُس کے وجود سے انکار کریگا۔ یہی حال اکبر اعظم کی سطوت و جبروت کا سمجھ لو۔ آیئے آج ہم آپ کو اُس کے اوائل سلطنت کی ایک کہانی سُنائیں۔ جبکہ شہنشاہ ابھی بچہ ہی تھا۔

نوروز کی تقریب تھی۔ جشن منعقد ہو رہا تھا۔ تمام اعیان سلطنت اور ارکین دولت اپنی اپنی جگہ بیٹھے تھے۔ باہر سے راجہ مہاراجہ بھی آئے ہوئے تھے۔ دربار لگ رہا تھا۔ بادشاہ ابھی محل سے برآمد نہیں ہوئے تھے۔

یکایک خدام فرشی سلام کے لئے جھک گئے۔ اور ارکین سلطنت کھڑے ہوگئے۔ کیونکہ بادشاہ محل سے باہر آچکے تھے۔

نوروز کی مناسبت سے بادشاہ نے گیروا لباس زیب بدن کر رکھا تھا لیف قلوب کہو یا بچپن کہ چہرے پر قشقہ بھی لگا لیا تھا۔ اس ہیئت سے شہنشاہ آن کر تخت پر بیٹھ گئے۔

اہل دربار میں ملا عبدالنبی بھی شامل تھے۔ بچپن میں یہی اکبر کے اُستاد تھے۔ اور اسی وجہ سے بادشاہ انکی بڑی عزت اور تعظیم کرتا تھا۔ ملاجی نے نظر اُٹھائی تو شاگرد کو سادھوؤں کے لباس میں ملبوس اور چہرہ پر چندن کا قشقہ دیکھ کر تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اپنی مسند پر بیٹھے ہی بیٹھے شاگرد کو آواز دے کر بلایا۔ اکبر چپ چاپ اُٹھا۔ آخر اُستاد کا بھی حق ہوتا ہے۔ اگرچہ اکبر نے اُستاد سے کچھ حاصل نہیں کیا تھا۔

ملاجی کی جریب مقدس پاس رکھی تھی۔ شہنشاہ آیا تو اُس نے ادب سے پوچھا "کیا ارشاد تھا؟"

ملاجی کھڑے ہوگئے۔ جریب اُٹھائی اور بھرے دربار میں زور زور سے تین چار اکبر کے لگائیں اور کہا "یہ سادھوؤں کی روش اور ہمایوں کا فرزند۔ شرم کیا امرکوٹ کے قلعہ میں چھوڑ آیا؟"

شہنشاہ کے کافی چوٹ لگی تھی۔ رویا تو نہیں مگر درد سے بے چین ہوگیا۔

تمام دربار اس عجیب وغریب نظارہ سے لرز اُٹھا۔ آج سے پہلے کب کسی نے شہنشاہ وقت کو یوں سر دربار ذلت سے پٹتے دیکھا تھا؟ امراء اور وزراء نے یقین کر لیا کہ آج ملاجی کی خیر نہیں۔ ہاتھی کے پاؤں سے روندوائے جائیں گے یا جلاد کے حوالے کئے جائینگے۔ سارا دربار مارے خوف کے کانپ رہا تھا۔ اور دربار پر حیرت انگیز خاموشی چھا رہی تھی۔

اکبر واپس ہوا اور آن کر تخت پر بیٹھ گیا مگر نہایت مغموم اور مضمحل۔

درباری اُسی طرح کانپ رہے تھے اور ملا عبدالنبی کا حشر دیکھنے کے منتظر تھے۔

انسان کو درد اور تکلیف کے وقت ہمدرد اور مونس کی تلاش ہوا کرتی ہے مگر ایسا دربار میں کون تھا جو شفقت کا ہاتھ پیٹھ پر پھیرتا۔

اکبر کچھ دیر سر نیچا کئے تخت پر بیٹھا رہا۔ پھر بیٹھے بیٹھے کچھ خیال آیا تو اُٹھ کر محل میں چلا گیا۔ دربار اُسی طرح منعقد تھا۔ مگر نہایت ساکت اور خاموش۔

اکبر محل میں پہنچا اور سیدھا والدہ کے پاس گیا۔ ماں نے بیٹے کو غمگین دیکھا تو بے چین ہوگئی۔ اور کہنے لگی۔ کیوں بیٹا! خیر تو ہے

نصیبِ دشمناں ایسے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ یہ کہہ کر ماں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جھٹ ننھے شہنشاہ کی پیشانی چوم لی۔

بہت دیر سے اکبر ضبط کر رہا تھا۔ مگر ماں کے محبت بھرے الفاظ نے صبر کا پیمانہ چھلکا دیا۔ اور ہندوستان کا شہنشاہ ماں سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ماں بے انتہا پریشان ہوئی کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ اُس نے کہا تمہیں میرے سر کی قسم! جلدی بتاؤ واقعہ کیا ہوا؟

اکبر نے روتے ہوئے جواب دیا۔ اماں! آج جو کچھ ہوا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ آج مجھے ملاجی نے صرف گیروا لباس پہننے اور ماتھے پر قشقہ لگانے کے جرم میں سر دربار پکڑ کر پیٹا۔ مجھے اس کا رنج نہیں کہ ملاجی نے مجھے کیوں مارا؟ اُستاد مارا ہی کرتے ہیں۔ لڑکے پٹا ہی کرتے ہیں۔ مگر مجھے رنج اس بات کا ہے کہ تمام درباریوں کے سامنے میں ذلیل ہوا۔ اگر انہیں مجھے تنبیہ ہی کرنی تھی تو تنہائی میں سرزنش کر سکتے تھے۔ یوں کھلے دربار میں اس طرح بے تحاشا مارنا میری سخت توہین کا باعث ہوا۔ بس مجھے اسی کا رنج ہے۔

ماں نے حقیقتِ واقعہ سُنی تو کہنے لگی۔ بیٹا! میں تو تیرے رونے سے ڈر گئی تھی۔ کہ نہ معلوم کیا بات ہوئی۔ اب قصہ سُنا تو دل ٹھکانے آیا۔ میرے لال! یہ تیرا خام خیال ہے کہ یوں سر دربار پٹنے سے تیری توہین اور ذلت ہوئی؟ ہرگز نہیں۔ آئندہ تاریخوں میں یہ بات بڑے فخر سے لکھی جائیگی کہ شہنشاہ ہند کو ایک بینوا فقیر نے سر دربار لکڑی سے مارا مگر سعادتمند شاگرد نے اُف تک نہ کی۔ بیٹا! یہ تو تیرے لئے فخر کا موجب ہے نہ کہ توہین کا باعث اُستاد کا کام مارنے کا اور شاگرد کا پٹنے کا ہوا کرتا ہے۔ جاؤ جا کر تھوڑی سی دیر لیٹ جاؤ۔ پھر باہر چلے جانا۔

یہ تھا تصویر کا دوسرا رُخ جہاں ایک عظیم الشان شہنشاہ اپنے ارکین دولت کے سامنے پیٹا جا رہا ہے۔

(تیسرا رُخ)

اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان اور عالمگیر نے بڑے جاہ و جلال کے ساتھ فرمانروائی کی۔ ہر مخالف کو زیر کیا۔ ہر دشمن کو نیچا دکھایا مگر موت سے شکستِ فاش کھائی۔ اُنکے بعد مغلیہ شہزادے شطرنج کے مہروں کی مانند جلد جلد بدلتے رہے۔ سلطنت کمزور ہوگئی اور طاقتوروں نے اُس پر قبضہ جمالیا۔ مرہٹوں کا عروج ہوا اور وہ تمام شمالی ہند پر چھا گئے۔ مگر ۱۷۶۱ء میں افغانستان کی طرف سے ایک زبردست طوفان احمد شاہ ابدالی کی شکل میں آیا اور تمام مرہٹہ طاقت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ کر پھینک گیا۔ مغلیہ سلطنت کا آفتاب تو غروب ہو ہی چکا تھا۔ اُس کے دوبارہ طلوع ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اسی حالت میں لوگوں نے دیکھا کہ سکھوں کے اقبال کا ستارہ سرزمین پنجاب پر چمک رہا ہے۔ مگر ۱۸۴۹ء میں یہ بھی غروب ہو گیا۔

اب کیا ہوا؟ سات سمندر پار سے ایک سفید رنگ کی آندھی اُٹھی اور دیکھتے دیکھتے سارے ملک پر چھا گئی۔

اس آندھی سے ہر چیز میں ایک نیا تغیر اور ایک نئی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ شہروں کی حالت اور قصبوں کی صورت بدل گئی۔

مسندوں کی جگہ کرسیوں نے لے لی اور مکتبوں کی بجائے سکول جاری ہو گئے۔ جن میں ہر علم اور ہر زبان کی تعلیم دی جانے لگی۔ آیئے آج آپ کو اسی قسم کے ایک جدید سکول کی سیر کرائیں۔

سینٹ انتھنی ہائی سکول لاہور کا ایک نامی گرامی اور مشہور مدرسہ ہے۔ سٹاف قابل اور سامانِ تعلیم وافر موجود ہے۔ بہت سے طالب علم اس مدرسے سے پڑھ کر نکل چکے اور بہت سے پڑھ رہے ہیں۔ انہی میں کپتان ایس۔ آر۔ پوری پی۔ سی۔ ایم۔ ایس کا لائق اور ہونہار فرزند للت کمار پوری سکول کی چوتھی جماعت کا طالب علم ہے۔ ابھی جیسے عمر ہی کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی نو سال کا ہوگا۔ اگر اسی طرح ترقی کرتا رہا تو پندرہ برس کی عمر میں اس سکول سے چھلانگ لگا کر کسی کالج میں پہنچ جائیگا اور پانچ سال کے بعد ایم اے کا ڈپلوما لئے ہوئے وہاں سے شاداں و فرحاں نکلے گا۔ اتنے ہوائی جہاز ریل سے زیادہ سستے ہو ہی جائینگے۔ جھٹ سوار ہو لندن پہنچ جائیگا۔ پھر قسمت میں چین ہی چین لکھا ہے۔ اور تین سال کی محنت میں کوئی اچھی سی ڈگری مل جائیگی۔ لیکر ہندوستان آجائیگا اور پھر مزے اُڑائیگا۔

خیر اس جھگڑے سے کیا مطلب ہے۔ آئندہ کا حال خدا جانے۔ ہم تو موجودہ کا حال سُناتے ہیں۔ اور اس کے لئے جہاں سے چلے تھے وہیں واپس لوٹنا چاہئے۔ یعنی سینٹ انتھنی ہائی سکول کی چوتھی جماعت کے کمرہ میں۔

مسٹر للت کمار پوری دوسرے ہم جماعتیوں کے ساتھ کلاس میں بیٹھے ہیں۔ سامنے سرہنری برنٹ ایک اینگلو انڈین اُستاد تشریف رکھتے ہیں۔ شاگرد نے کوئی بے عنوانی کی یا اُستاد کو غصہ آیا۔ کچھ بھی ہُوا ہو مگر میاں للت کمار کے تین چار بیدیں لگ گئیں اور لگیں بھی اتفاق سے زور سے۔ چوٹ لگنی فطری امر تھا مگر ہم جماعتیوں نے سامنے پِٹنا اور بھی غضب تھا۔ نہ چوٹ کا صدمہ بھلایا جا سکتا تھا اور نہ ہم جماعتیوں کے سامنے شرم سے گردن اُٹھ سکتی تھی۔ مگر مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے۔ بیچارہ للت کمار خاموش بیٹھا رہا۔

سکول کا گھنٹہ اپنے وقت پر ٹن ٹن بجا اور سارے لڑکے بھونروں کی طرح اُڑ گئے۔ سکول خالی ہو گیا۔

دوسرے دن عدالت کا ایک چپراسی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ مسٹر برنٹ کا ماتھا ٹھنکا۔ اتنے میں وہ قریب پہنچ چکا تھا۔ ایک کاغذ اُس کے ہاتھ میں تھا وہ اُس نے اِنکی طرف سرکا دیا۔ گھبرا کر مسٹر برنٹ نے اُسے کھولا تو عدالت کا حکمنامہ تھا لکھا تھا کہ للت کمار پوری نے تمہارے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا ہے کہ تم نے اُسے بید سے پیٹا۔ لہذا فلاں تاریخ کو سردار نریندر سنگھ سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضر ہو کر مقدمہ کی پیروی کرو۔"

تاریخ مقررہ پر اُستاد اور شاگرد مدعا علیہ اور مدعی کی حیثیت میں عدالت کے کٹھڑے سے لگے کھڑے تھے۔

یہ ہے تصویر کا تیسرا رُخ جہاں بادشاہوں کے مقابلہ میں ایک معمولی افسر کا چھوٹا بچہ اپنے ہم جماعتوں کے سامنے پیٹا جا رہا ہے۔

تصویر کے تینوں رُخ کتنے صاف۔ کتنے نمایاں اور کیسے روشن ہیں۔ اس کے نقوش ہمارے لئے عبرت و موعظت کی ایک دُنیا اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں۔ کاش! کوئی نصیحت پکڑنے والا ہو +

فسانوں کے بچّے

(از شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی)

فسانہ نمبر میں عشقیہ کو چھوڑ کر ہر قسم کے دلفریب اور دلچسپ فسانے جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر بعض مرتبہ ایک طویل فسانہ اتنا دلچسپ ثابت نہیں ہوتا جس قدر ایک دوسطری لطیفہ۔ چونکہ مقصود یہ ہے کہ ہر قسم کی مرغوب اور لذیذ غذا اس ادبی دستر خوان پر معزز مہمانوں کے سامنے چنی جائے۔ لہذا یہاں میں چند دلچسپ مگر سنجیدہ لطیفے بھی لکھ رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ اہل ذوق ناظرین انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ لطیفے آخر مختصر فسانوں ہی کی چھوٹی سی تصویر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے فسانوں کے بچّے غالباً ان کا غیر موزوں عنوان نہ ہوگا۔

شاعر دزد

فارسی زبان کا مشہور شاعر انوری ایک روز بلخ کے بازار میں سے گذر رہا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ ایک مجمع کے اندر ایک شخص اُسی کے قصیدے اپنے نام سے پڑھ رہا ہے اور لوگ اُس کی بڑی تعریف کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر انوری کو بڑا طیش آیا۔ یہ آگے بڑھا اور اُس شخص سے پوچھا۔ یہ اشعار جو تم پڑھ رہے ہو کس کے ہیں؟ اُس نے جواب دیا کہ "انوری" کے۔ اس پر انوری نے پوچھا کہ کیا تم انوری سے ملے ہو؟ اُس شخص نے بگڑ کر جواب دیا کہ یہ کیا واہیات سوال ہے۔ میں خود ہی تو انوری ہوں۔ انوری کو اس پر بے اختیار ہنسی آگئی اور وہ کہنے لگا۔ شعر دزد شنیدہ بودم شاعر دزد نہ دیدہ بودم۔ یعنی میں نے آج تک شعروں کے چُرانے والے تو سُنے تھے مگر شاعروں کو چرانے والا نہ دیکھا تھا۔

پھر جیلخانے کو

شہنشاہ ہاروں رشید کا لڑکا امین بچپن میں شعر کہنے کا بڑا شوقین تھا۔ باپ نے درباری شاعر ابو نواس سے کہہ رکھا تھا کہ اس کے اشعار ذرا دیکھ لیا کرو۔ ایک روز ابو نواس نے شہزادہ کے اشعار میں کچھ عروضی غلطیاں بتائیں۔ امین نہایت ناراض ہُوا اور بیچارے ابو نواس کو قید خانے بھیجدیا۔ دو ایک روز کے بعد باپ کو خبر ہوئی تو امین پر خفا ہُوا اور ابو نواس کو قید خانہ سے رہائی دلائی۔ پانچ چھ روز کے بعد ہارون کے سامنے امین نے چند شعر ابو نواس کو سُنائے۔ ابھی امین نے دو تین شعر ہی پڑھے تھے کہ ابو نواس اُٹھ کھڑا ہُوا اور جوتیاں پہن کر چلنے لگا۔ ہارون نے پوچھا۔ کیوں یہ یکایک کہاں چلے؟

ابونواس نے جواب دیا۔ پھر جیلخانے۔

دل کی بات

ماموں رشید کے زمانہ میں پیغمبری اور نبوت کا دعوٰے کرنا ایک فیشن سا ہو گیا تھا (جیسا آجکل داڑھی منڈانا، سر کے بال بنانا اور ننگے سر رہنا فیشن ہے) جہاں کوئی ذرا خوش پوش اور فصیح و بلیغ ہوا۔ اُس نے جھٹ دو چار بیفکروں کو اپنے ساتھ ملایا اور نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ خیر ایک مرتبہ اس ٹائپ کے ایک بزرگ پکڑے ہوئے آئے۔ بادشاہ نے پوچھا "میاں تمہارے پاس نبوت کی کوئی دلیل بھی ہے یا ویسے ہی خالی خولی نبی بن گئے ہو"۔ آپنے فوراً جواب دیا۔ ہاں جناب کیوں نہیں۔ میرا معجزہ یہ ہے کہ میں دل کی بات فوراً بتا دیتا ہے۔ ماموں رشید ہنسا اور کہنے لگا اچھا بتاؤ میرے دل میں کیا ہے؟ آپ نے فوراً کہا۔ "یہی کہ میں جھوٹا ہوں"۔

ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے

ایک صاحب کسی دعوت میں جو تشریف لے گئے تو وہاں معزز میزبان نے چاندی کے برتنوں میں مہمانوں کے سامنے کھانا پیش کیا۔ کھانا کھا کر ان صاحب نے سوچا کہ چیز قیمتی ہے۔ کم از کم مجھے ایک چمچہ یہاں سے ضرور اُڑانا چاہیئے۔ یہ سوچ کر آپنے لوگوں کی نظر بچا جھٹ ایک چمچہ اُٹھا لیا اور بڑی پھرتی کے ساتھ اُسے اپنے جوتے میں چھپا دیا۔ اور جوتا پہن کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ کہ کسی کو مجھ پر شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بیچاروں کی شامتِ اعمال کہئے یا بدقسمتی کہ محفل میں سے ایک صاحب دزدیدہ نظروں سے اِدھر ہی دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے یہ ساری کارستانی دیکھی مگر کچھ بولے نہیں لیکن بیٹھے بیٹھے آپکا دل بھی چاہا کہ ایک چمچہ اُڑانا چاہیئے۔ مگر پھر سوچا کہ ایک چمچہ تو پہلے ہی غائب ہو چکا ہے۔ ایک میں لے لونگا تو دو چمچے غائب ہو جائیں گے۔ اور یہ بات کچھ ٹھیک نہیں ہوگی۔ غائب صرف ایک ہی چمچہ ہونا چاہیئے۔ اس کی جو لاجواب ترکیب اُن کے ہوشیار دماغ نے سوچی اُس کی پُر زور داد نہ دیجائے۔ تو بڑا ظلم ہے۔ لوگ کھانا کھا چکے تھے کہ یکایک آپ کرسی پر سے کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے صاحبان! آپنے کھانا تو کھا لیا۔ اب میں آپ کو ایک نہایت عجیب و غریب اور حیرت انگیز کھیل دکھاتا ہوں۔ سب لوگ نہایت غور سے مجھے دیکھیں۔ خیر سب لوگ متوجہ ہو گئے تو آپنے فرمایا صاحبان! میں جو کمال آپ کو دکھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ چمچہ جو میرے ہاتھ میں ہے اور جسے آپ سب صاحبان دیکھ رہے ہیں۔ میں آپ لوگوں کے سامنے اسے اپنی جیب میں داخل کرتا ہوں۔ اور یہیں کھڑے کھڑے ملاں صاحب کے جوتے میں سے نکال دونگا۔ یہ کہکر آپنے چمچہ اپنی جیب میں رکھ لیا اور ان صاحب سے جو پہلے اپنے جوتے میں چمچہ چھپا چکے تھے فرمانے لگے کہ ہاں صاحب!

اب ذرا مہربانی فرماکر سب لوگوں کے سامنے ذرا اپنا جوتا تو جھاڑ کر دکھایئے"۔ اب تو مجبوراً چور صاحب کو جوتا دکھانا پڑا اُس میں چمچہ رکھا ہی تھا۔ بیچارے نے شکستہ دلی اور شرمندگی کے ساتھ چمچہ اُٹھاکر میز پر رکھدیا اور وہ صاحب جنہوں نے چمچہ جیب میں داخل کیا تھا۔ موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے محفل سے نکل کر چلدیئے۔

سادہ لوحی کا شاہکار

ایک نہایت اعلےٰ پایہ کے خوشنویس ایک رئیس کے پاس طلب امداد کے لئے گئے۔ مگر آپ میں اتفاق سے شئے لطیف کی نہایت کمی تھی۔ امیر نے اپنے پاس ٹھیرایا۔ اور کہا اچھا اپنے خط کا کوئی نمونہ تو لکھ کر دکھایئے۔ خوشنویس صاحب مندرجہ ذیل شعر نہایت خوبصورت اور خوشخط لکھ کر رئیس کے پاس لے گئے۔ ؎ دیدہ بودم روئے تو۔ دانستہ بودم خوئے تو دیدہ ودانستہ خودرا دربلا انداختم۔ رئیس یہ شعر دیکھ کر نہایت ناراض ہوا اور انکو فوراً نکلوادیا (شعر اگر محبوب کی شان میں پڑھا جائے تب تو نہایت بینظیر ہے مگر ممدوح کے سامنے پیش کرنا اُسکی صریح ہتک اور تضحیک ہے۔ مگر بچارے خوشنویس صاحب اس نکتہ کو کہاں سمجھ سکتے تھے۔ اُنکے سامنے تو جو شعر آیا لکھ مارا)۔

فرمانبردار شاگرد

ایک بچہ مکتب میں اُستاد کے قریب بیٹھا ہؤا اپنا سبق یاد کر رہا تھا اور بار بار پڑھ رہا تھا وان علیک لعنتی الی یوم الدین (یعنیؔ تجھ پر قیامت تک لعنت ہو"۔ یہ قرآن مجید کا ایک فقرہ ہے جو ابلیس کے متعلق خداوندکریم نے استعمال کیا) چونکہ لڑکا یہ سبق یاد کرتے ہوئے برابر اُستاد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُستاد کو اس پر بڑا غصہ آیا۔ تھوڑی دیر تک تو صبر کئے رہا۔ لیکن جب لڑکا برابر کہے ہی گیا تو آخر بڑے جوش میں آکر اُستاد نے لڑکے سے کہا "علیک وعلیٰ والدیک" (یعنی تجھ پر اور تیرے باپ دونو پر لعنت ہو) لڑکا بھی بڑا چالاک واقع ہؤا تھا۔ جھٹ کہنے لگا "حضور! یہاں قرآن مجید میں تو صرف علیک (تجھ پر) لکھا ہؤا ہے۔ اگر حضور فرمائیں تو علیٰ والدیک (تیرے باپ پر) بھی کہوں"؟

ٹھیک ہے! بیٹھ جایئے

ماسٹر نے ایک سادہ لوح لڑکے سے چند سوال پوچھے اور اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکے نے سب سوالوں کے ٹھیک جواب دیئے۔ چنانچہ لڑکے سے کہا "ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ"۔ تھوڑی دیر کے بعد ماسٹر نے لڑکے سے کہا کہ "اچھا اب تم بھی مجھ سے کچھ پوچھو۔ لڑکا (کچھ سوچ کر) بتلایئے اگر ایک گز کپڑے کی قیمت دو کوڑی ہو تو دو گز تاگے کی کیا قیمت ہوگی؟ ماسٹر۔ شائد تم نے مجھے بیوقوف سمجھا ہے جو ایسا سوال پوچھتے ہو؟ لڑکا۔ ٹھیک ہے بیٹھ جایئے۔

پتی کی چتا پر

(از جناب لکشمی چند نسیم نورمحلی تلمیذ حضرت جوش ملسیانی)

آرزوؤں کا امیدوں کا سہارا توڑ کر — اے مرے پریتم چلے ہو کس پہ چھوڑ کر
کیوں ہم آغوشِ عروسِ مرگ ہونے کے لیے — بدنصیبوں کی بستی کو چھوڑ کر چلتے ہوئے
آپ ہی اک آسرا تھے جانِ مفلس کے لیے — کون پیارا رہ گیا اب میں جیوں کس کے لیے
کون ایسا ہے کہ جو تسکین دے گا دیکھ کر — زندگی کے دن گزاروں گی میں کس کو دیکھ کر
غم مجھے ایذا مجھے صدمہ مجھے آفت مجھے — [illegible] مجھے

اب مری ہستی کہاں ہستی تو اب بے مدعا ہوں
سر سے پیکر پاؤں تک میں اک دلِ مجروح ہوں

یہ جو ہیں اقربا یہ شرم کی پابندیاں — آپ کے ہمراہ جاؤں یہ مری قسمت کہاں
ساتھ والے آپ کی ہونے نہیں دیتے مجھے — ہائے یہ ظالم ستی ہونے نہیں دیتے مجھے
حیف صد حیف آپ پر قربان ہو سکتی نہیں — بدنصیب ایسی ہوں قسمت کو بھی رو سکتی نہیں
آگ کے شعلوں سے ڈر کر فرض اپنا چھوڑ دوں — پہلی ہی منزل میں کیا الفت کا رشتہ توڑ دوں
وقت پر منہ پھیر لینا کچھ وفاداری نہیں — آپ پیارے ہیں مجھے یہ زندگی پیاری نہیں

پھونک دے ہاں پھونک دے اے سوزشِ پنہاں مجھے
کھائے جاتا ہے خیالِ صدمۂ ہجراں مجھے

(نسیم نورمحلی)

گھڑی کا قضیہ

(از مصور اسرار خان شاطر صاحب غزنوی لاہور)

اُن کی شادی ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے ــــ یہ چھ ماہ مسرت و شادمانی کی مسرور کن اور بہجت آگین ساعتوں میں ختم ہوئے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے عاشق تھے ــــ کبھی بھولے سے بھی اُن کے درمیان شکر رنجی پیدا نہ ہوئی۔

"آج شام تمھیں ضرور کچھ روپے لانے ہونگے، بھولنا مت"!

ایک صبح زہرہ نے شوہر کو کوٹ پہناتے ہوئے کہا۔ بلاشبہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ادنیٰ اشارہ پر جان چھڑکنے کو تیار تھے۔ ہر ہفتہ عباس ایک مقررہ رقم خانگی اخراجات کے لئے زہرہ کے ہاتھ میں دیدیا کرتا اور جونہی یہ رقم قریب الاختتام ہوتی۔ زہرہ عباس کو مطلع کر دیتی۔

"بہت بہتر، میری روح! عباس نے جواباً کہا۔

اور دوبارہ اُسے اس معاملہ کے متعلق خیال نہ آیا۔ دوپہر کے کھانے تک ــــ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر عباس نے چک لکھتے ہوئے خیال کیا۔ کہ لاؤ لگے ہاتھوں "پاس بک" کا مطالعہ ہی کر ڈالوں کئی ہفتوں سے حساب پر تو نظر ہی نہیں ڈالی،

چند لمحوں کے امتحان کے بعد اس کی حیرانگی کی حد نہ رہی، آنکھیں کھل گئیں۔ خدایا! صرف دس روپے تیرہ آنے باقی"۔ اس نے زیر لب اپنے آپ سے کہا۔ "اوہ یہ ناممکن ہے"۔

اُس نے کئی بار جمع و خرچ کا شروع سے آخر تک مقابلہ کیا۔ لیکن ہر بار ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا۔ وہی دس روپے تیرہ آنے باقی!

اور پھر ــــ پھر دماغ پر زور دینے سے اُسے کئی غیر معمولی اخراجات یاد آگئے۔ اس ماہ کے آغاز میں وہ کئی مواقع پر غیر معمولی اخراجات کا ذمہ دار تھا۔ تاہم اُس نے اپنے آپ کو تسلی دی، آخر گھبرانے کی کیا بات ہے اس میں؟ اُسے دس روپے کا چک تو سردست وصول کر لینا چاہیئے۔ یہ دس روپے اور جو کچھ اس کی جیب میں ہے۔ وہ تنخواہ ملنے کی تاریخ تک بخوبی گذارہ کر سکتے ہیں۔ تنخواہ ملنے میں صرف سات ہی دن تو باقی رہ گئے ہیں، زہرہ کو یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے! کہ ہمارے پاس صرف اتنی رقم باقی رہ گئی ہے۔ جس سے مہینہ کے اختتام تک گذارہ ہو سکے۔ وہ عورت ذات ہے خوامخواہ

پریشان ہوگی۔ اور پھر ــــ جب وہ سنیگی کہ میں اس ماہ کے شروع میں بہت سا روپیہ غیر ضروری مواقع پر ــــ ......
اوہ ٹھیک نہیں یہ، خواہ مخواہ آپس میں شکر رنجی اور غالباً بدظنی پیدا ہو جائیگی۔ اور میں یہ ہرگز نہیں چاہتا۔ بدظنی ہی تو ایک مستقل فساد اور رنجش کی جڑ ہے۔

"یہ لو پیاری!" عباس نے اس شام کھانے سے فارغ ہو کر میز سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "دس روپے ہفتہ بھر کا خرچ"۔

"مشکور ہوں سرتاج!" زاہدہ نے دس روپے کا نوٹ تھامتے ہوئے کہا۔ "مگر افسوس صبح میں یہ تو بتانا ہی بھول گئی۔ کہ مجھے دس روپوں کی اور ضرورت ہے"!

ایک فوری اضطراب و پریشانی نے دفعتاً عباس پر تسلط جما لیا۔ تاہم اُس نے چہرہ سے اضطراب و پریشانی کے آثار ظاہر نہ ہونے دئے۔

ہیں ــــ کیا ــــ کیا؟ واقعی! جانِ من"! اس نے تعجب سے کہا۔

"ہاں، آج دوپہر والدہ یہاں آئی تھی" زاہدہ نے بیان کیا۔ "اور دس روپے مجھ سے قرض مانگے۔ اتوار تک کے لئے۔ میں بہت نادم ہوئی۔ اور اُسے مطلع کیا۔ کہ اس وقت تو میرے پاس موجود نہیں۔ البتہ آج شام تک دس روپے مہیا کر دونگی۔ اور میرے خیال میں پیارے تمہیں بھی اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا"۔

"مگر ــــ مگر میرے پاس مزید دس روپے موجود نہیں ہیں"۔ عباس نے گھبرائی ہوئی آواز سے کہا"۔

"ہاں، نہیں ہونگے، مجھے علم ہے۔ تم نے اتنے ہی روپے بنک سے نکلوائے ہونگے جتنے مجھے درکار تھے"۔ زاہدہ نے کہا۔ "میں یہ دس روپے حسبِ وعدہ والدہ کو دے دیتی ہوں اور تم صبح بنک سے مزید دس روپے منگوا لینا بالکل آسان بات ہے۔ کیا نہیں پیارے"!

اب ــــ عباس ایک حساس انسان تھا۔ وہ بیوی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ کہ ہمارا بنک میں جمع کردہ روپیہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا۔ کہ بیوی اس کی بے قاعدگی اور فضول خرچی سے آگاہ ہو۔ اس سے بدظن ہو۔ آہ، وہ کس منہ سے بیوی کو بتلائے کہ اس ماہ کے آغاز میں وہ بہت سا روپیہ دوست و احباب کی پارٹیوں کی نذر کر چکا ہے نہیں، ہرگز نہیں وہ اپنی حماقت ــــ فضول خرچی اور عاقبت نااندیشی سے بیوی کو آگاہ ہونے نہ دیگا نتیجہ خواہ کچھ ہی ہو

"ہاں ــــ ہاں، یقیناً" عباس نے اپنے آپ پر تسلط پاتے ہوئے جلدی سے کہا "کوئی ہرج نہیں اس میں"

"ہاں، پیارے، مشکل کے وقت ہمیں والدہ کی مدد ضرور کرنی چاہیئے وہ کیا کہیگی کہ بیٹی کے سامنے دستِ سوال دراز کیا۔ اور محروم رہی"! زاہدہ نے نہایت نرم و موثر لہجے میں کہا،

بالکل ٹھیک ہے۔ عباس نے کہا۔" والدہ کی مدد ہمارے فرائض میں سے ایک ہے۔ ضرور ہم اس کی مدد کریں گے۔"

اگلی صبح زہرہ نے ناشتہ کے وقت شوہر کو مطلع کیا۔

" پیارے! وہ دس روپے میں والدہ کو نوکر کے ہاتھ بھیج دونگی۔ خانگی ضروریات کے متعلق چند اشیا آج مجھے ضرور منگوانی ہیں۔ لیکن اس وقت چھ آنے میرے پاس باقی ہیں۔"

" کوئی فکر نہ کرو۔ میں بھولوں گا نہیں" عباس نے کہا۔" آج دس روپے ضرور لاؤں گا"

گھر سے دفتر تک تمام راستہ عباس نے اسی نحث دپز میں طے کیا۔ کہ دس روپے شام تک کہاں سے پیدا ہوں؟ وہ ایک باحمیت وحساس شخص ہے اور کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔ یا کسی دوست سے قرض مانگے۔ اور مالک ا---- جس کے یہاں وہ ملازم ہے۔ توبہ، اس سے تو کوئی اُمید ہی رکھنی فضول ہے۔ کوئی شخص ایک پائی بھی اس سے پیشگی ---- تنخواہ کے دن سے پہلے وصول نہیں کر سکتا۔

دوپہر کے وقت اس کی نظر اپنی گھڑی پر پڑی۔ اور ---- اس کے ساتھ ہی ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس کے دماغ میں داخل ہوا ---- ایک خیال ---- ارادہ ---- تدبیر ---- ہاں اور پھر کوئی طاقت اس تجویز کو اس کے ذہن سے خارج نہیں کر سکی۔

میں یہ گھڑی کسی ساہوکار کے پاس رہن کر سکتا ہوں"۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

مگر آہ، کس قدر رنج دہ ---- معیوب اور روح کو مضمحل کر دینے والی بات ہے کہ میں ایک ساہوکار ---- سود خوار کے پاس جاؤں، آہ؟

لیکن بیش از بیش غور و فکر کے بعد عصر کے وقت وہ اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں۔ کہ ساہوکار کے پاس جاکر گھڑی گروی رکھدوں۔ خالی ہاتھ بیوی کے سامنے جانا ساہوکار کے منت کش ہونے سے کہیں زیادہ اور رنجدہ و باعثِ شرم ہے۔

رات تاریک تھی۔ اور وہ خوش تھا کہ رات تاریک ہے۔ دائیں بائیں دیکھ کر وہ چپکے سے ساہوکار کی دوکان میں گھس گیا...... جھجکتے جھجکتے گھڑی ساہوکار کے سامنے رکھدی۔ ایک سونے کی نہایت اعلیٰ قسم کی گھڑیوں میں سے ایک تھی۔ لمحہ بھر کے لئے ساہوکار نے گھڑی کو جانچا اور پھر بولا۔

" کتنے روپے چاہتے ہیں آپ اس پر؟"

پچاس روپے کی گھڑی ہے یہ عباس نے جواب دیا۔

"ہوگی" ساہوکار نے کہا۔" زیادہ سے زیادہ دس روپے میں گروی کر سکتا ہوں میں"۔

عباس نے بلاحیل و حجت دس روپے منظور کر لئے۔ کیونکہ اُسے اتنی ہی رقم درکار تھی۔ ساھوکار نے "رہن نامہ کا ٹکٹ" لکھنا شروع کیا۔

"نام اور پتہ جناب؟"

لمحہ بھر کے لئے عباس ٹھٹکا اور پھر ــــ بہتر یہ ہے کہ میں اپنی شخصیت پوشیدہ رکھوں، اس نے سوچا اور بولا۔

"ہوں ــــ ہوں ــــ فیروز جی، چرچ روڈ، نمبر ۹۸، بمبئی"

ساھوکار نے دس روپے اور ٹکٹ عباس کے حوالے کرتے ہوئے اس پر کچھ عجیب پُراسرار نگاہیں ڈالیں، وہ نگاہیں ــــ جو عباس کو اپنے بدن میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

عباس نے دوکان سے باہر نکل کر اطمینان کا سانس لیا۔ مہینہ کے اختتام کے ساتھ ہی یہ تکلیف دہ پیچیدہ معاملہ بھی ختم ہو جائیگا۔ تنخواہ ملتے ہی اس کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا۔ کہ دس روپے مع سود ادا کر کے اپنی گھڑی واپس لے لے۔

ایک بار پھر اُس نے اطمینان کا سانس لیا جب اُس نے گھر پہنچ کر دس روپے بیوی کے ہاتھ میں دے دئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا ایک ناقابلِ برداشت بوجھ اس کے دل پر سے اُٹھ گیا۔

رات عباس بستر استراحت پر دراز تھا۔ کہ زہرہ کو وقت معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُٹھی اور کھونٹی کے قریب گئی۔ جہاں شوہر کا کوٹ لٹک رہا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا اور ــــ دفعتاً گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"تمہاری گھڑی کہاں ہے سرتاج!" بیوی نے متعجب ہو کر جلدی سے پوچھا، "جیب میں تو نہیں؟"

"نہ ــ نا ــ نہ۔ نہیں، وہاں نہیں ــ" عباس نے رُک رُک کر کہا۔ "دو ــ سر ــ دوسری جیب میں دیکھو تو بھلا؟"

زہرہ نے دوسری جیبیں بھی دیکھ ڈالیں۔

"گھڑی کا نشان تک نہیں" زہرہ نے مطلع کیا۔ "کہاں رکھ آئے ہو! کیا مرمت کے لئے تو نہیں دی۔"

"نہیں ــ نہیں تو ــ شاید ــ شاید" عباس گھڑی کی گمشدگی پر کچھ روشنی نہ ڈال سکا۔

بظاہر عباس بیوی سے زیادہ حیران تھا۔ کہ گھڑی کہاں گئی۔ میاں بیوی نے مل کر کوٹ کی تمام جیبیں ــ بستر اور خوابگاہ کا چپہ چپہ چھان مارا مگر گھڑی کہاں؟!"

"میں خوب جانتی ہوں" زھرہ نے کہا۔ "تم گھڑی گنوا نہیں سکتے، یہیں کہیں، گھر ہی میں پڑی ہوگی! کہیں رکھ کر بھول گئے ہو! ہمیں زیادہ سرگرمی سے تلاش کرنی چاہیئے، مگر یہ تو کہو کہ تم نے آخری بار کب دیکھی تھی؟"

"افسوس مجھے یاد نہیں" شوھر نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔ "یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آج دوپہر تک دفتر

میں میرے پاس موجود تھی اور شاید اس کے بعد مجھے وقت دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی"۔

بیش از بیش سرگرمی سے مکان کا کونہ کونہ دیکھا گیا۔ لیکن گھڑی نہ ملی، زہرہ کے لئے گھڑی کا کھو جانا حد درجہ موجب رنج تھا۔ یہ گھڑی اس کی ایک عزیز سہیلی کی نشانی تھی۔ اس کی سہیلی نے بخلوص قلب زہرہ کو شادی کے موقع پر تحفتہً دی تھی۔ آہ جب اس کی سہیلی سُنے گی تو کیا کہیگی، اور اُسے کس قدر صدمہ گذریگا۔

"تم ضرور گھڑی دفتر میں بھول آئے ہو"۔ زہرہ نے مایوس ہو کر کہا۔ "یا کسی "جیب کترے" نے اُچک لی ہے۔ تم جانتے ہو آجکل "اچکوں" نے کیسا اودھم مچا رکھا ہے بمبئی میں"،

اور پایانِ کار وہ اپنے اپنے بستروں پہ دراز ہو گئے،

"مگر مجھے یقین نہیں کہ کسی نے گھڑی اُڑالی ہے" شوہر نے کہا "میری جیب سے گھڑی اُڑا لینا کچھ آسان کام نہیں۔

"اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ تم اس سے بھی زیادہ نقصان اُٹھاؤ گے" بیوی نے کہا۔ "تم ایسے لاپرواہ شخص کو دھوکا دینا کچھ مشکل کام نہیں۔

خلاف معمول وہ رات زیادہ دیر تک جاگتے رہے۔ چنانچہ وہ صبح کافی دن چڑھے تک بیدار نہ ہو سکے۔ عباس بہت جلد ناشتہ میں مصروف ہو گیا۔ گھڑی کی گمشدگی کے متعلق مزید بحث کے لئے وقت نہ تھا۔ تاہم دفتر جاتے وقت بیوی نے عباس کو مطلع کیا کہ وہ اپنی آخری اُمید کا نتیجہ دیکھنے کے لئے اُسے ساڑھے دس بجے ٹیلیفون پر مخاطب کریگی۔

"مگر نہیں، پیاری!" شوہر نے کہا۔ "نہیں ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ آقا نے پرائیویٹ طور پر ٹیلیفون استعمال کرنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ اور وہ سخت بُرا مانتا ہے۔ اگر کوئی ملازم دفتر کے اوقات میں ذاتی معاملات کو دخل دے۔

چند سیکنڈ کے لئے زہرہ گہرے سوچ میں پڑ گئی اور پھر بولی،

"سنو پیارے! میں ٹھیک ساڑھے دس بجے تمہیں ٹیلیفون پر مخاطب کرونگی۔ اگر تمہیں گھڑی مل گئی تو جواب دینا "معاف فرمائیے آپ غلط نمبر پہ خطاب کر رہے ہیں۔

اور اگر گھڑی نہ ملی تو کہنا

"نہیں، یہ نمبر 5 — 3 — 6 ہے"۔

اور سلسلہ کلام قطع کر دینا۔

زہرہ اپنی اس عجیب و دلچسپ تجویز پر بہت مسرور نظر آتی تھی۔ عباس کے لئے بھی اس بے ضرر تجویز سے اتفاق کرنے میں عذر کی گنجائش نہ تھی۔

ٹھیک دس بجکر تیس منٹ پہ زہرہ نے ٹیلیفون پر بلایا۔

مگر آہ جواب ملا،

"نہیں یہ نمبر 5-3-6 ہے۔"

چنانچہ زہرہ کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

پبلک کال بکس سے واپس گھر آتے ہوئے زہرہ کو گھڑی کی واپسی کے لئے آخری کوشش بھی بروئے کار لانے کی سوجھی۔ لے دے کے صرف یہی ایک شبہ باقی تھا۔ گھڑی چرائی گئی ہے۔

اب زہرہ کے نزدیک یقیناً گھڑی چرالی گئی تھی۔ اور اس کی واپسی کے لئے زہرہ کے پاس صرف یہی ایک تدبیر باقی تھی۔ کہ گھڑی کی چوری کی رپورٹ پولیس میں کر دے، چنانچہ اُس نے پولیس سٹیشن کا رُخ کیا۔

انچارج افسر سب کچھ چھوڑ کر زہرہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

"ایک سادہ، سنہری ـــــ میرا مطلب ہے سونے کی گھڑی۔" زہرہ نے کہنا شروع کیا۔ "ساختہ بیبز اینڈ کمپنی"۔

"بیبز اینڈ کمپنی نے آج تک لاکھوں گھڑیاں بنائی اور بیچی ہونگی بیگم صاحبہ!" انچارج افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گھڑی کا نمبر بتائیے نمبر!"

زہرہ نے گھڑی کے نمبر کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور بتایا کہ اُسے یہ خیال تک کبھی نہیں آیا۔ کہ گھڑی کا کوئی نمبر بھی ہوتا ہے۔

"مگر آپ کیونکر کہہ سکتی ہیں کہ گھڑی چُرائی گئی ہے؟" پولیس افسر نے سوال کیا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کے شوہر کی لاپرواہی سے گھر آتے ہوئے کہیں راستے میں گر گئی ہو!"

"اوہ یہ غیر ممکن ہے" زہرہ نے جواباً کہا۔ "میرا شوہر اتنا بے وقوف نہیں"۔

"اتنا بیوقوف نہیں" افسر نے دہرایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "خیر ممکن ہے آپ درست کہہ رہی ہوں۔

پولیس افسر نے رپورٹ مرتب کر لی، اور زہرہ سے وعدہ کیا۔ کہ میں چور کو گرفتار کرنے اور گھڑی کی واپسی کیلئے اپنی تمام کوششیں بروئے کار لاؤں گا۔

اسی دوپہر آقا نے عباس کو بلا بھیجا۔

عباس جی! شاید آپ کو معلوم نہ ہوگا کہ آپ کیوں بُلائے گئے ہیں۔" آقا نے مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ آپ نے اپنے فرائض حسن خوش اسلوبی اور تن دہی سے سرانجام دیئے ہیں۔ میرے لئے باعث فخر و مسرت ہے۔ آپ یہ سن کر یقیناً خوش ہونگے۔ کہ آپ کی ہمت افزائی کے لئے آپ کی تنخواہ میں تیس 30 روپے کا اضافہ کرتا ہوں، آپ کی یہ ترقی نئے سال کے آغاز یعنی گذشتہ ماہ کی یکم تاریخ سے شمار ہوگی۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ آئندہ اپنے فرائض اس سے بیحد زیادہ

احسن طریق پر ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہاں، تیس روپے بابت ماہ جنوری آپ ابھی جا کر خزانچی سے وصول کر سکتے ہیں، بس، مجھے صرف اسی قدر کہنا تھا۔

اظہار تشکر کے بعد عباس ہنسی خوشی آقا کے کمرہ سے نکلا۔ اس کا چہرہ وفور مسرت سے تمتما رہا تھا۔ حرکات و سکنات سے مسرت کی لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔ تیس روپے ترقی! گذشتہ ماہ کی بابت تیس روپے نقد ——— ابھی ——— اسی وقت! آہا!

دفتر سے فراغت پاتے ہی عباس سیدھا ساہوکار کے پاس پہنچا۔ تیس روپے اس کی جیب میں تھے۔ اس نے "ٹکٹ" ساہوکار کے آگے رکھتے ہوئے گھڑی کا مطالبہ کیا، عباس کا خیال تھا کہ ساہوکار حیران ہو کر متعجب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھے گا، لیکن نہیں، ساہوکار نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ گویا اُس نے عباس کی آمد کو محسوس تک نہیں کیا، بغیر ایک لفظ تک منہ سے نکالے ساہوکار دوکان کے دوسرے حصّہ میں چلا گیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیا۔ پانچ منٹ گذر گئے۔ لیکن وہ واپس نہ آیا۔ اب عباس نے خیال کیا۔ کہ شاید مرتہن اس کی گھڑی ہزار ہا اشیاء میں سے تلاش کر رہا ہے۔ لیکن .... پانچ منٹ اور گذر گئے۔ عباس حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ساہوکار اُسے منتظر کھڑا چھوڑ کر کہاں غائب ہو گیا۔

وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھا۔ کہ اتنے میں دوکان کے دوسرے حصّہ کا دروازہ کھلا، اور ساہوکار آتا دکھائی دیا۔ عباس کی حیرانی کی حد نہ رہی۔ جب اُس نے ساہوکار کے بعد ایک باوردی پولیس مین کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا، قریب پہنچ کر پولیس مین نے عباس کو ایک سنہری گھڑی دکھائی اور بولا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ کل شام تم نے یہ گھڑی دس روپے کے عوض یہاں گروی رکھی؟"

"بالکل درست!" عباس نے جلدی سے جواب دیا۔ اور اب دس روپے ادا کر کے گھڑی واپس لینے آیا ہوں"

"تو پھر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ از راہ نوازش میرے ساتھ تھانہ تک چلئے۔" پولیس مین نے کہا۔ یہ گھڑی مسروقہ ہے"۔

"پاگل تو نہیں ہو گئے تم؟" عباس نے حیران ہو کر جلدی سے کہا۔

"خیر، پاگل ہی سہی ——— تاہم اپنا فرض نہایت دانشمندی سے ادا کر رہا ہوں، "پولیس مین نے کہا" اپنی مدافعت اور بچاؤ کے لئے آپ مجھے پاگل، بیوقوف ——— جو جی چاہے کہہ سکتے ہیں۔

"یاد رکھو" عباس نے مدبرانہ لہجے میں کہا۔ "تمہیں ایک بے گناہ شخص کو گرفتار کرنے کا خمیازہ بھگتنا ہوگا"۔

"گرفتار!" پولیس مین نے دہرایا، "مگر میں نے تو گرفتاری کا ذکر ہی نہیں کیا۔ میں تو درخواست کر رہا ہوں"

کہ میرے ساتھ تھانہ تک چلئے، اور چند سوالوں کا جواب دیجئے، چلئے پھر!"

عباس پولیس مین کے ساتھ جانے کے سوا چارہ نہ دیکھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ تھانہ پہنچ کر کنسٹیبل نے عباس کو افسر انچارج کے سامنے پیش کر دیا۔

ہاں تو مسٹر فیروز جی!" انسپکٹر انچارج نے اپنے سامنے ڈیسک پر پڑی ہوئی گھڑی اور رہن نامہ کے ٹکٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس گھڑی کے متعلق سرقہ یا گمشدگی کی رپورٹ کی گئی ہے اور۔۔۔۔۔۔۔

"سرقہ یا گمشدگی کی رپورٹ!" عباس نے بات کاٹی۔" دونوں شبہات، مگر یہ پولیس مین تو صرف چوری کا ذکر کر رہا تھا"

اور کیا تعجب کہ چوری ہی ثابت ہو جائے" انسپکٹر نے شانے سکیڑ کر چھوڑتے ہوئے کہا۔" ہوں، تو تم نے یہ گھڑی رہن رکھی نا"؟

"ہاں، ہاں، بے شک" عباس نے جلدی سے کہا۔" اور اس سے میں کیوں انکار کروں؟

"تو میرا فرض ہے کہ آپ کو گھڑی چرانے کے الزام میں گرفتار کر لوں۔ میں تمہیں مطلع کر دوں کہ۔۔۔۔۔۔۔

"ٹھہرو! خدا کے لئے!" عباس چلایا۔" اوہ، میں پاگل ہو جاؤں گا۔ کیا کوئی شخص اپنی ہی گھڑی چرا سکتا ہے۔ کیا کوئی اپنی ہی گھڑی چرانے کی علت میں گرفتار ہو سکتا ہے؟ او خداوندا"

"ایک مجرم اپنی صفائی میں ایسی ہی دلائل پیش کیا کرتا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنے آپ کچھ روشنی ڈالو مسٹر فیروز جی!

"میرا نام فیروز نہیں" عباس نے گھبرا کر کہا۔

انسپکٹر نے ٹکٹ پر نگاہ ڈالی۔

"تو تم نے نقلی نام سے گھڑی گروی رکھی! جس کا مطلب یہ ہے کہ تم چوری اور جعل سازی دو جرائم کے مرتکب ہوئے ہو۔ مجھے افسوس ہے مسٹر! تم خود حالات کو اپنی مخالفت پر آمادہ کر رہے ہو"۔

"اگر تم اپنی گھڑی رہن رکھو!" عباس بولا۔" تو کیا اپنا اصلی نام استعمال کرو گے"؟

"ہاں اور نہیں بھی" انسپکٹر نے جواب دیا، مگر بہ سبیل تذکرہ تمہارا اصلی نام کیا ہے؟ اور پتہ؟

عباس جی۔ دلکشا منزل نمبر ۸۸ بمبئی۔ عباس نے جواباً کہا۔

انسپکٹر کے لئے یہ بات کسی قدر تسلی بخش تھی۔ گھڑی کے سرقہ کی رپورٹ کرنے والے نے بھی یہی پتہ نوٹ کرایا تھا۔ ورنہ ـــــ بصورت دیگر نام اور پتہ عباس کے حق میں کچھ مفید نہ ہوتا۔ اور نہ ہی انسپکٹر اسے اہمیت دیتا۔"

"ہوں" انسپکٹر نے کہا۔ تم کہتے ہو کہ یہ گھڑی میری اپنی ملکیت ہے۔ کیا اس کے ثبوت میں کوئی گواہی پیش کر سکتے ہو تم؟"

"ہاں، کیوں نہیں!" عباس نے دعویٰ سے کہا۔ میری بیوی اس کی تصدیق کر سکتی ہے لیکن وہ ......

"لیکن کیا؟"

"لیکن میں نہیں چاہتا کہ یہ معاملہ اس کے کانوں تک پہنچے۔"

"تمہارا یہ عذر کچھ وزنی نہیں واقعات سراسر تمہارے خلاف ہیں۔ اور اندریں حالات تمہاری پوزیشن بہت نازک ہے" انسپکٹر نے ہمدردی سے کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ اگر تم صفائی پیش کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ تم شروع سے آخر تک سارا قصہ مجھ سے کہہ دو، بلا کم و کاست"

لمحہ بھر کے لئے عباس رُکا اور پھر طوہاً و کرہاً ساری رام کہانی انسپکٹر سے کہہ سُنائی۔

انسپکٹر نے اطمینان کی حالت میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو مسٹر عباس! ایک معمولی سی بات بیوی کے سامنے سچ نہ کہہ دینے سے اتنی بڑی مصیبت آپ نے خرید لی؟

عباس نے ٹھنڈا سانس لیکر اثبات کے طور پر سر ہلایا۔

"تو اب میں جا سکتا ہوں کیا؟" عباس نے کہا۔ "اُمید ہے آپ کی تشفی ہو گئی ہو گی۔"

معاف فرمائیے، ابھی نہیں" انسپکٹر نے جواب دیا۔ "میرا فرض ہے کہ تحقیقات کی بنا پر حقیقت کی تہ تک پہنچوں۔ گو ذاتی طور پر میں آپ کے بیان پر یقین کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن ابھی تک اس امر کے باور کر لینے کی کوئی وجہ میرے پاس نہیں کہ یہ گھڑی ہے جس کی گمشدگی کی رپورٹ کی گئی ہے۔ ہُوں، تو اس وقت آپ کی بیوی مکان ہی پہ ہو گی نا؟"

"ہو گی، میرا خیال ہے"

"تو پھر میں اُسے یہاں بُلاتا ہوں"

"اور یوں وہ تمام معاملہ سے آگاہ ہو جائیگی۔ اے خدایا!" عباس نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہیں آپ گھبرائیے نہیں" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جتنی دیر میں آپ کی بیوی سے گفتگو کروں آپ دوسرے کمرہ میں چھپے رہیئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نہ تو اُسے آپ کی یہاں موجودگی کا علم ہو گا۔ اور نہ ہی وہ سمجھ سکیگی کہ اس گھڑی کی گمشدگی سے میرے شوہر کا بھی کچھ تعلق ہے، آپ اطمینان رکھیں۔

چنانچہ انسپکٹر کا حکم پاکر ایک سپاہی عباس کی بیوی کو بلانے چلا گیا۔ اس دوران میں انسپکٹر اور عباس مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ کوئی نصف ساعت بعد سپاہی نے انسپکٹر کے کمرہ میں داخل ہو کر زہرہ کی آمد کی اطلاع دی۔

جلدی اس کمرہ میں داخل ہو جائیے" انسپکٹر نے اپنے ملحق کمرہ کا دروازہ کھولا اور عباس کو اشارہ کیا۔

اُس نے دیکھا کہ انسپکٹر نے زہرہ کو کرسی پیش کی اور بیٹھ جانے کا اشارہ کر کے سنہری گھڑی اس کے ہاتھوں میں دیدی۔

"کیا آپ نے یہ گھڑی اس سے قبل کبھی دیکھی ہے"؟ انسپکٹر نے سوال کیا۔

"کیوں! بالیقین یہ میرے شوہر کی گھڑی ہے۔" زہرہ نے جلدی سے کہا۔ "اوہ آپ اپنے کام میں کس قدر ہوشیار ہیں کس قدر جلد آپ نے گھڑی ڈھونڈ نکالی۔۔۔ کیا واقعی یہ چرائی گئی تھی؟ کہاں سے ملی آپ کو؟ کس نے چرائی؟"

"معاف فرمائیے، خاتون، یہ میں نہیں بتا سکتا" انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "پولیس اپنے راز منکشف نہیں کیا کرتی! بعض اوقات!"

"خیر میں تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آہ، میرا شوہر اپنی گھڑی دیکھ کر کس قدر مسرور ہوگا"

"بجا فرما رہی ہیں آپ، گھڑی لے جانے کی اجازت ہے آپ کو، اگر میرے لائق کوئی اور خدمت باقی نہیں تو آپ اب بخوشی جا سکتی ہیں"۔ زہرہ ہنسی خوشی انسپکٹر کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئی اور عباس دوسرے کمرے سے نکل کر انسپکٹر کے پاس آ گیا

"اگر آپ ٹیکسی کا خرچ برداشت کر لیں تو اپنی بیوی سے پہلے گھر پہنچ سکتے ہیں" انسپکٹر نے عباس کے شانے دباتے ہوئے کہا "کیا نہیں"؟ اظہارِ تشکر کے بعد عباس بھی انسپکٹر سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

عباس آرام کرسی پر بیٹھا سگرٹ کے کش لگا رہا تھا۔ جب زہرہ شاداں و فرحاں مکان میں داخل ہوئی۔

"میں نادم ہوں پیاری! عباس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ آج کام کی زیادتی کی وجہ سے دفتر میں دیر ہو گئی۔ تاہم آج میں اپنی زہرہ کے لئے ایک خوش خبری لایا ہوں"

چنانچہ عباس نے جلدی جلدی اپنی تنخواہ میں تیس روپے کے اضافہ کا ذکر کر دیا۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ یہ ترقی گذشتہ ماہ سے متصور ہوگی۔

"اور میں بھی اپنے شوہر کے لئے ایک مژدہ لائی ہوں" زہرہ نے شوہر کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا "میں نے تمہاری گھڑی پالی پیارے! اس گھڑی ہی کے لئے میں شہر گئی تھی۔ یہی وجہ ہے میں دیر سے واپس آ رہی ہوں"۔

"واقعی"؟ عباس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "تو آج کا دن ہم دونوں کے لئے بہت سعید ثابت ہوا!"

"ہاں پیارے!" بیوی نے جواب دیا۔ "لو اور سنو! آج دوپہر والدہ آئی اور کہا کہ مجھے روپوں کی ضرورت نہیں رہی چنانچہ اُس نے روپے واپس دے دیئے اور تکلیف کا بہت بہت شکریہ ادا کیا جو تم نے اس کے لئے برداشت کی"۔

"نہیں تو مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی" عباس نے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"اور میں نے والدہ سے گھڑی کے متعلق بھی کوئی ذکر نہ کیا۔ پیارے مجھے امید ہے آئندہ تم اپنی اشیاء کے لئے محتاط رہو گے!"

"اطمینان رکھو پیاری! آئندہ تم کبھی نہ سنو گی کہ شوہر نے کوئی شے گنوائی!"

بُت کی ناک

ایک نہایت دلچسپ تاریخی فسانہ

بہادری۔ الوالعزمی۔ رحمدلی اور انصاف و عالی حوصلگی کا ایک محیر العقول کارنامہ

[از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ایڈیٹر اخبار عروج]

اس حیرت انگیز سچے فسانہ کا ماخذ قدیم عیسائی مورخ بشپ بوئیکٹس کی عربی کتاب "تاریخ مصر" ہے جو لاطینی ترجمہ کے ساتھ پچھلے دنوں یورپ میں چھپ گئی ہے (محمد اسمٰعیل)۔

(۱)

کسریٰ کو شکست دینے اور قیصر پر فتح پانے کے بعد مسلمانوں نے براعظم افریقہ کا رُخ کیا اور سنہ ۲۱ھ میں مصر کو حملہ کر دیا۔ الوالعزمی کی انتہا دیکھو کہ مسلمان سپہ سالار حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس صرف چار ہزار کی قلیل فوج تھی جس وقت انھوں نے مصر کی سرحد میں قدم رکھا۔ ایسے وسیع اور عریض ملک کو فتح کرنے کے لئے پچاس ہزار فوج بھی ناکافی تھی۔ مگر بہادر سپہ سالار نے اس عظیم الشان کام کے لئے صرف چار ہی ہزار سپاہی کافی سمجھے اور اطمینان اور بے پروائی کے ساتھ اریش۔ پلوسیم اور بلبیس وغیرہ کو فتح کرتا ہوا اُس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں بعد کے زمانہ میں شہر فسطاط آباد ہوا۔ یہاں قیصر کی طرف سے ایک زبردست فوجی چھاؤنی تھی اور ایک مضبوط قلعہ بنا ہوا تھا۔ مقابلہ کی پوری تیاری پہلے ہی سے کر لی گئی تھی۔ اور فصیل قلعہ پر جگہ جگہ سپاہی متعین کر کے قلعہ کا دروازہ بند کر دیا گیا اور فوج قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہی۔ مسلمانوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور حملہ کی تیاری کرنے لگے۔

(۲)

دو چار، دس دن گذر گئے۔ مگر نہ تو قلعہ والوں نے دروازہ کھولا۔ اور نہ میدان میں مقابلہ کے لئے نکلے فاتحین روم و ایران کو بھلا اتنا انتظار کس طرح گوارا ہو سکتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت زبیر بن العوام نے ایک روز صبح کو کہا۔ کہ یا آج قلعہ فتح ہو جائیگا۔ یا اپنی جان مسلمانوں پر قربان کر دوں گا۔ اس کے بعد صبح کی نماز

پڑھی گئی اور تمام اسلامی فوج قلعہ کے سامنے میدان میں جمع ہوگئی۔ قلعہ والے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ آج کیا ہونے والا ہے۔ دفعتہً زبیر بن العوام فوج میں سے نکلے جھپٹ کر قلعہ کی دیوار سے سیڑھی لگائی اور نہایت بہادری اور دلیری کے ساتھ انتہائی پھرتی سے باوجود قلعہ والوں کی سخت مزاحمت کے آن کی آن میں فصیل قلعہ پر چڑھ گئے اور بغیر ایک لمحہ ضائع کئے فوراً ہاتھ میں ننگی تلوار لئے ہوئے فصیل پر سے نیچے کود پڑے۔ اور سامنے پڑنے والوں کے ایک ایک کے دو دو کرتے ہوئے دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔ اسلامی فوج تو منتظر ہی کھڑی تھی۔ فوراً قلعہ میں گھس گئی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ بعد عمرو بن عاص قلعہ پر قابض ہوگئے۔

(۳)

قلعہ کی تسخیر کے بعد اسکندریہ کی فتح کی مہم سامنے تھی۔ کون سا اسکندریہ؟ وہی اسکندریہ جس کے کتب خانہ کو مقدس عیسائیوں نے حذ دربرباد کر کے بعد کے زمانہ میں اس کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا۔ اسکندریہ مصر کا دارالحکومت اور فوجی لحاظ سے نہایت مضبوط اور مستحکم شہر تھا۔ اور مصر کی فتح کے لئے سب سے پہلے اس کا فتح ہونا ضروری تھا۔
سپہ سالار نے حکم دیا "کل بعد نماز ظہر فوج اسکندریہ کی طرف کوچ کرے گی"۔
صبح کوچ کی تیاری تھی۔ مگر جس وقت روانگی کے لئے حضرت عمرو بن عاص نے اپنا خیمہ اکھاڑنا چاہا۔ تو دیکھا کہ خیمہ کی چھت میں ایک کبوتر نے گھونسلہ بنا لیا ہے اور بےفکری کے ساتھ اپنے ننھے ننھے بچوں کو لئے اس میں بیٹھا ہے اسلامی سپہ سالار نے کمال رحم دلی کے ساتھ خیمہ کو اسی طرح چھوڑ دیا۔ تاکہ خیمہ اکھاڑنے سے غریب کبوتر کو تکلیف نہ ہو۔ نیت کا ثمرہ دیکھو۔ اسی خیمہ کے گرد آہستہ آہستہ ایک عظیم الشان شہر آباد ہوگیا۔ جو تاریخ میں فسطاط (یعنی خیمہ) کے نام سے مشہور ہے۔

(۴)

میدانوں اور گھاٹیوں کو عبور کرتے اور راستے میں چھوٹے چھوٹے مقامات کو فتح کرتے ہوئے مسلمانوں نے ۲۲ روز میں ۱۲۵ میل کا سفر طے کیا اور اب وہ اسکندریہ کے سامنے تھے۔
رومی اسکندریہ کو جتنا بنا سکتے تھے۔ اتنا مستحکم بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ شہر پناہ نہایت پختہ بنی ہوئی تھی۔ عرصۂ دراز کا سامان رسد فراہم کر لیا گیا تھا۔ کافی فوج پہلے ہی سے وہاں بھیجدی گئی تھی اور سامان حرب بھی نہایت افراط کے ساتھ موجود تھا۔ غرض مقوقس نے جو ہرقل کی طرف سے مصر کا گورنر تھا۔ مدافعت اور مقابلہ کی پوری تیاری کر لی تھی۔
ان تیاریوں اور استحکامات کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کا یہاں سے کامیاب لوٹنا بظاہر امر محال نظر آتا تھا۔
مسلمان فتح اور کامرانی کے نشے میں چور۔ شاداں و فرحاں جھومتے جھامتے آئے اور شہر پناہ کے سامنے ڈال دئے۔

وسیع میدان میں اُتر پڑے۔ اسلامی سپہ سالار آگے بڑھا اور اُس نے اپنا جھنڈا دروازۂ شہر پناہ کے سامنے نصب کر دیا۔

دوسرے دن مسلمان کیا دیکھتے ہیں۔ کہ بیشمار سپاہی فصیل پر گشت لگا رہے ہیں۔ دراصل مقوقس نے مسلمانوں کو مرعوب کرنے اور اپنی فوج کی کثرت اور بہتات دکھانے کے لئے تمام فوج اور سارے اہلِ شہر حتیٰ کہ عورتوں تک کو حکم دیا تھا۔ کہ وہ فوجی لباس پہن کر فصیل کا چکر لگائیں۔ تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں رومی فوج کی عظمت اور ہیبت بیٹھ جائے اور بغیر لڑے بھڑے ہی اپنا ڈیرہ ڈنڈا اُٹھا کر فرار ہو جائیں۔ مگر اس مظاہرہ کی سپہ سالار اور مسلمانوں کے دلوں میں کیا وقعت ہو سکتی تھی۔ سپہ سالار مقوقس کی اس حماقت پر ہنسا اور اُس نے ایک قاصد کے ہاتھ مقوقس کو کہلا بھیجا کہ ہمیں فوج کی کثرت سے ڈرایا جاتا ہے۔ یہ تمہارا ایک خیالِ خام ہے۔ جب ہمارے مٹھی بھر نوجوانوں نے تمہارے شہنشاہ ہرقل کی لاکھوں کی فوج کا جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ اور بالآخر اُس کو ہمارے مقابلہ سے بھاگنا پڑا۔ تو تمہاری ہمارے آگے کیا حقیقت ہے؟ یہ تو کچھ بھی نہیں اگر اس سے دس گنی فوج اور بھی تمہارے پاس ہوتی۔ تو مسلمان اس سے گھبرانے والے نہیں تھے۔ ہمارا بھروسہ فوج کی کثرت اور اسلحہ کی فراوانی پر نہیں بلکہ ہمارا بھروسہ اُس خدائے واحد پر ہے۔ جس نے ہمیشہ ہر میدان میں محض اپنے فضل و کرم سے ہمیں فتح عطا فرمائی ہے۔ ہمارے پیارے نبی معصوم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف تین سو تیرہ نہتے۔ غریب اور کمزور انسان تھے۔ جب مکّہ کے کافروں نے بدر کے مقام پر گیارہ سو آدمیوں کے ساتھ اُن پر حملہ کیا۔ اور وہ گیارہ سو کے گیارہ سو پوری طرح اسلحہ اور سامان سے آراستہ تھے۔ اُدھر غریب مسلمانوں کے پاس اُونٹ گھوڑے تو کجا بدنوں پر کپڑے اور ہاتھوں میں تلواریں بھی بہت سوں کے نہیں تھیں۔ ایسی بے سروسامانی کی حالت میں خدا نے اپنے پیارے رسولؐ کو ایسی عظیم الشان فتح دی۔ کہ کافروں کے تمام بڑے بڑے سردار مارے گئے اور سارے عرب میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ پس تمہارا یہ مظاہرہ فضول اور تمہاری یہ نمائش بیکار ہے۔ ہاں اگر ہمت ہے۔ تو کھلے میدان میں فوج لے آؤ۔ خدا تعالیٰ خود فیصلہ کر دیگا۔ کہ کون زیادہ بہادر ہے؟ اس طرح دور کی نمائش بہادری کی علامت نہیں۔ بلکہ بزدلی کا ثبوت ہے۔ اور ہم تو اس یقین کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ کہ اسکندریہ کو فتح ہی کر کے جائیں گے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو ہم کو ہمارے ارادہ سے روک سکے۔ خواہ تم دس لاکھ فوج ہمارے مقابلہ پر لے آؤ۔ فتح یقیناً ہماری ہو گی کیونکہ رسول اللہ صلعم کی غلامی کے بعد شکست کھانا ہم لوگ بھول گئے ہیں۔ تمہارے شہنشاہ کی لاکھوں کی فوج کا جب ہم نے ہمیشہ چند ہزار جوانوں سے مقابلہ کیا ہے اور کبھی بھی نہیں ہارے۔ تو کیا تم اب سمجھتے ہو۔ کہ اس مضحکہ خیز فوجی نمائش سے ڈر کر ہم فوراً بھاگ جائیں گے۔ اگر تمہارا ایسا خیال ہے۔ تو اس خیال کو دل سے

مقابلہ کرو اور بہادروں کی طرح میدان میں نکل کر مقابلہ کرو"

―― (۵) ――

مقوقس نے جواباً کہلا بھیجا کہ تم کو اب تک عیش پرستوں اور نو آموز سپاہیوں سے واسطہ پڑا ہے۔ اور اُن پر فتح حاصل کر کے ہی تم اتنے مغرور ہو گئے ہو۔ کہ تمہیں اس قدر دُور دراز سفر کر کے یہاں آنے کی جسارت ہوئی یقیناً تمہاری موت تمہیں یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ اب اگر پر لگا کر بھی اُڑو گے تو عرب نہیں پہنچ سکتے۔ اور اسی میدان میں گدھ اور چیل کوّے تمہاری لاشوں کو کھاتے نظر آئیں گے۔ تمہاری خواہش کے مطابق کل شہر کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور شاہی فوج میرے زیر کمان تمہارے مقابلہ کے لئے میدان میں نکلے گی۔ اُس وقت پتہ لگ جائیگا کہ عرب کے وحشی اور گنوار زیادہ بہادر ہیں۔ یا مصر کے شائستہ اور مہذب باشندے!

―― (۶) ――

رات خیریت سے گزر گئی۔ صبح ہوتے ہی شہر کا دروازہ کھل گیا اور رومی فوجیں باہر نکل کر میدان میں صف آرا ہوئیں۔ مسلمان بھی تیار تھے۔ لڑائی شروع ہوئی اور تھوڑی دیر تک بڑے زور کی تلوار چلتی رہی۔
ابھی اس دست بدست جنگ عظیم کو جاری ہوئے تین گھنٹے بھی نہیں گذرے تھے کہ رومی فوج میں ضعف کے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے مقوقس نے ہر چند بہادرانہ الفاظ سے فوج کا دل بڑھانا چاہا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد رومی سپاہ کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ بے تحاشا قلعہ کی طرف بھاگی مسلمانوں نے سختی کے ساتھ تعاقب کیا اور نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تمام فوج لڑتی اور مغرور رومیوں کو قتل کرتی قلعہ میں داخل ہو گئی قریب تھا۔ کہ رومیوں کو شکست فاش ہو اور قلعہ پر کلیتہً مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے کہ دفعتہً مقوقس نے نہایت غیرت دلانے والے الفاظ سے اپنی فوج کو خطاب کیا۔ اور خود تلوار کھینچکر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ رومی سنبھلے اور انہوں نے بہادری کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ شروع کیا اور اس بے جگری کے ساتھ لڑے کہ ساری اسلامی فوج قلعہ سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئی۔ فوراً دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور تھکے ہوئے رومیوں نے اس کو غنیمت جان کر اطمینان کا سانس لیا۔ مسلمانوں کی یادگار شہر میں وہ بیشمار لاشیں تھیں۔ جو رومی سپاہیوں کی وہاں چھوڑ گئے تھے

―― (۷) ――

شہر پر حملہ کے وقت سب سے آگے سپہ سالار فوج مع اپنے غلام وردان اور ایک سردار مسلم ابن المخلد کے تھے اور بہادری کے ساتھ رومی فوج کو قتل کرتے ہوئے سب سے پہلے قلعہ میں داخل ہوئے تھے۔ جس وقت لڑائی کا پانسہ پلٹا اور مسلمان لڑائی پر مجبور ہوئے۔ تو تینوں اپنی فوج سے بہت دُور ایک بڑے گروہ سے مصروف پیکار تھے اس لئے نہ اپنی فوج کی مدد کر سکے اور نہ جھپٹ کر شہر سے نکل سکے۔ الغرض دروازہ بند ہو گیا۔ اور یہ تینوں شہر کے اندر نرغہ میں

دشمنوں کے درمیان تنہا رہ گئے۔

عیسائیوں نے جب سپہ سالار کو اس طرح بالکل غیر متوقع طور پر اپنے کثیر گروہ میں گھرا ہوا پایا تو اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُنہوں نے چاہا کہ کسی طرح مسلمان سپہ سالار کو زندہ گرفتار کر لیا جائے اور پکڑتے ہی فوراً قیصر کے پاس بھیجدیا جائے۔ جو اس وقت مسلمانوں سے بھاگ کر قسطنطنیہ میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ مگر حضرت عمرو بن عاصؓ بھلا زندہ کس طرح گرفتار ہو سکتے تھے؟ رومیوں کی تمام تدابیر اس ارادہ میں ناکامیاب رہیں اور اُن کے بہت سے آدمی اس کوشش میں عمرو بن عاص اور اُن کے بہادر ساتھیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ جب رومیوں نے دیکھا کہ ہم یوں اُن سے برسر نہیں آ سکتے۔ تو اُنھوں نے حضرت عمرو بن عاص سے کہا کہ آخر اس طرح کب تک لڑو گے؟ خواہ ہزار جتن کرو۔ شہر سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اگر اس طرح برابر لڑتے بھی رہے تو یا تو کسی بہادر کی تلوار تمہارا سر اُڑا دیگی یا تم خود ہی زخموں سے چُور ہو کر گر پڑو گے اور گرفتار ہو جاؤ گے۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ ہتھیار ڈال دو اور اپنے آپ کو ہمارے رحم پر چھوڑ دو۔ عمرو بن عاص نے ہنس کر کہا۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ میری زندگی میں تم میں سے کسی کو مجال نہیں۔ جو میرے جسم کو ہاتھ لگا سکے۔ مجھے ہرگز اس کا غم نہیں کہ میں تمہارے درمیان اس وقت شہر میں اکیلا ہوں۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے اور وہ ضرور میری مدد کریگا۔ اور ایسی حالت میں جب کہ میرا پیارا خدا میرے ساتھ ہے۔ مجھے تمہاری کیا پرواہ ہو سکتی ہے؟ مجھے اپنی جان نہ کبھی پہلے عزیز رہی ہے اور نہ اس وقت عزیز ہے۔ مگر آج اس طرح اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دینا ذلت کی علامت اور بزدلی کی نشانی ہے۔ اور مجھ سے اس کی توقع بالکل عبث ہے۔ میں لڑتا رہوں گا۔ اُس وقت جب تک کہ روح میرے جسم میں موجود ہے تم مجھے ہرگز گرفتار نہیں کر سکتے۔ البتہ لاش پر بے شک قبضہ کر سکتے ہو۔ مگر یہ سودا تمہیں یقیناً نہایت گراں پڑیگا کیونکہ میں اور میرے دونوں ساتھی آسانی سے مرنے والے نہیں۔ تمہارے میں سے بہت سوں کا خاتمہ کر چکے ہیں اور بہت سوں کا خاتمہ کرنے کے بعد مرینگے۔ اس لئے تمہارا فائدہ اسی میں ہے۔ کہ دروازہ شہر پناہ کھولدو اور ہمیں نکل جانے دو۔ تاکہ تمہارے مزید آدمیوں کا نقصان نہ ہو۔

رومی باوجود اپنی اس کثرت اور پوری فوج کے صرف تین آدمیوں کو بھی زندہ گرفتار نہ کر سکے۔ اور اس پہ اُنھوں نے عمرو بن عاص کا یہ کورا جواب سُنا تو بڑے جھلائے۔ مگر آخر کر بھی کیا سکتے تھے۔ پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ آخر اُنھوں نے مشورہ کرنے کے بعد یہ بات کہی۔ کہ اے اسلامی سردار! سب سے اکھٹا لڑنے کی بجائے زیادہ انسب بات یہ ہے کہ تم ہمارے ایک بہادر آدمی سے نبرد آزمائی کرو۔ اگر تم اس مقابلہ میں جیت گئے۔ تو ہم دروازہ کھول کر تمہیں جانے دیں گے۔ اور اگر ہمارا بہادر جیت گیا تو وہ یا تو تمہیں زندہ گرفتار کریگا یا قتل کر ڈالیگا اس وقت تمہارے باقیماندہ دونوں ساتھیوں کو ہتھیار ڈالدینے ہونگے۔ عمرو بن عاص نے فرمایا۔ مجھے نہایت خوشی کے ساتھ

یہ بات منظور ہے۔ تمہارا بہادر اگر مجھے زندہ گرفتار کر سکے تو بیشک کر لے۔ مغلوب ہونے کی صورت میں میرے دونوں ساتھی ہتھیار ڈال دیں گے اور تمہارے ہاتھوں میں گرفتار ہو جائینگے۔ مگر دیکھو اگر میں جیت گیا۔ تو تم وعدہ خلافی مت کرنا۔ رومیوں نے کہا۔ نہیں تم خاطر جمع رکھو۔

چنانچہ ایک نہایت گرانڈیل اور شہ زور شخص جو اسکندریہ میں سب سے بہادر انسان مانا جاتا تھا مقابلہ پر آیا۔ عمرو بن عاص فوراً تیار ہو گئے۔ مگر مسلمہ ابن المخلد نے اُن کو روکا اور کہا ٹھہریئے۔ آپ کا اس کے مقابلہ پر جانا مناسب نہیں۔ یہ بیچارہ ہے کیا چیز؟ اس کے لئے تو میں ہی کافی ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کا مقابلہ کروں کچھ اصرار کے بعد حضرت عمرو بن عاص نے کہا اچھا! اگر یہ ثواب آپ ہی کی تقدیر میں لکھا ہے تو مبارک ہو۔ چنانچہ مقابلہ شروع ہوا۔ اور صرف چند لمحے کی کشمکش کے بعد مسلمہ نے تلوار کا ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ رومی بہادر کی گردن اُڑ کر عمرو بن عاص کے قدموں میں آن پڑی۔ رومیوں میں شور پڑ گیا۔ اور انھوں نے ایک ساتھ مسلمہ پر حملہ کر دیا۔ عمرو بن عاص للکارے۔ "او دغا بازو! یہ کیا فریب ہے؟ اپنے وعدہ کو یاد کرو۔ خبردار جو کسی نے قدم آگے بڑھایا۔ ہم لوگ کچھ موم کے بنے ہوئے نہیں ہیں۔ تمہارا کیا وعدہ تھا اور کیا تمہارا طرزِ عمل ہے۔ کچھ شرم کرو۔ رومی بہادر کا انجام جس کو تم نے بڑے فخر سے ہمارے سامنے پیش کیا تھا۔ تمہارے سامنے ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ اپنے وعدہ کو پورا کرو اور راستہ چھوڑ دو تاکہ ہم چلے جائیں۔ ورنہ پھر یاد رکھو ہماری تلواریں ہیں۔ اور تمہارے سر ہیں۔ نہ معلوم کتنے لوگ آن کی آن میں بے سر ہو جائیں گے۔ کیا تمہارے نزدیک وعدہ کی کوئی قدر نہیں اور وعدہ کر کے اس کا ایفا کرنا تم نے نہیں سیکھا؟ یہی باتیں ہیں جو تمہاری سلطنت کی تباہی کا موجب ہو رہی ہیں۔ کاش تم اب بھی سمجھو تو مزید بربادی سے شاید بچ جاؤ۔"

بیچارے رومی اس للکار سے ڈر کر اپنی اپنی جگہ رُک گئے اور خاموشی کے ساتھ اپنے درمیان سے مسلمانوں کو رستہ دے دیا۔ مگر اُن کی آنکھوں سے بدستور خون ٹپک رہا تھا۔

(۸)

دن گزرتے گئے اور محاصرہ طول پکڑتا گیا۔ اس دوران میں کبھی کبھی مقوقس باہر نکل کر حملہ کرتا اور پھر فوراً شہر میں ہو رہتا۔ یہاں تک کہ محاصرہ کو دس مہینے گذر گئے۔

آخر ایک روز مسلمانوں نے محاصرہ کی طویل مدت سے تنگ آن کر پوری قوت کے ساتھ رومیوں پر حملہ کر دیا۔ جب کہ وہ دروازہ شہر پناہ سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہے تھے حسب عادت رومی بھاگے اور انہوں نے دروازہ بند کرلینا چاہا۔ مسلمانوں نے پہلے ہی سے اس کا خیال رکھا تھا کہ وہ دروازہ بند نہ ہونے پائے۔ دو سو سپاہیوں کا ایک دستہ خاص اس کام کے لئے پہلے سے مقرر کر دیا گیا تھا جو تیر کی طرح دروازہ شہر پناہ پر پہنچ گیا۔ اور رومی دروازہ بند نہ کر سکے۔ فوراً باقی اسلامی لشکر بھی پہنچ گیا۔ گھمسان کا رن پڑا

رومی تلوار نے بھی اپنے جوہر خوب دکھائے اور سر توڑ مقابلہ کیا۔ لیکن مسلمان ارادہ کر کے آئے تھے کہ خواہ کچھ ہو آج شہر پر ضرور قبضہ کرنا ہے۔ اس لئے باوجود ہزار کوشش اور سعی کے مسلمانوں کا سیلابِ عظیم رومیوں کے روکے نہ رُکا۔ اور مسلمان شہر میں داخل ہو گئے۔ آئے دن کی جنگوں اور محاصرہ کی اتنی طویل مدت کے باعث اب رومیوں میں لڑنے کی مزید سکت باقی نہیں رہی تھی۔ اُنھوں نے ہتھیار ڈال دئے اور شہر و شاہی محلات پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

(۹)

کسی دوسری قوم کا سپہ سالار ہوتا تو اتنے طویل عرصہ کے محاصرہ کی جھنجلاہٹ میں شہر پر قبضہ ہوتے ہی قتل عام کا حکم دیدیتا۔ یہاں تک کہ بلا مبالغہ خون کی ندیاں بہ جاتیں اور جب کبھی بھی عیسائی فاتحین نے مسلمانوں پر قابو پایا ہے۔ تو بالعموم اس سنت کی پیروی کی ہے۔ گاڈفرے فاتح بیت المقدس اور فرڈیننڈ والی ہسپانیہ اس کا ایک معمولی سا نمونہ تھے۔ مگر عزیب اسلامی سپہ سالار نے نہ خون کی ندیاں بہائیں۔ نہ قتل عام کیا۔ نہ لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ بلکہ سارے شہر کو امن دے دیا۔ اور شہر کی فتح کے فوراً بعد ہر شخص بدستور اپنے اپنے کاروبار میں بے فکری کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

(۱۰)

شہر پر قبضہ ہوئے ابھی دس دن بھی نہیں گذرے تھے کہ ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ بیچ شہر میں ایک چوراہے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بہت بڑا بُت پتھر کا بنا ہوا رکھا تھا۔ (جیسے آج کل ملکہ معظمہ یا ایڈورڈ ہفتم یا انگریز فاتحین کے مجسمے دہلی۔ لاہور۔ امرتسر۔ کلکتہ اور بمبئی وغیرہ بڑے بڑے شہروں کے بازاروں یا پارکوں میں رکھے ہوئے ہیں) اب خدا کا کرنا ایسا ہوا۔ کہ ایک روز رات کو اُس بت کی ناک کسی منچلے سپاہی نے نہ معلوم کس طرح صاف اُڑا دی۔ صبح باشندگانِ شہر نے ناک بریدہ بُت دیکھا۔ تو سارے شہر میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ ہزاروں عیسائیوں کے غول کے غول آتے۔ کٹی ہوئی ناک دیکھتے اور سخت رنجیدہ اور مضمحل واپس چلے جاتے سارا دن یہی تانتا بندھا رہا۔ اور شہر میں کوئی عیسائی باقی نہ رہا۔ جس کو بُت کی ناک کا علم نہ ہو گیا ہو۔

مظلوم عیسائیوں نے اس ظلم عظیم کا فوراً تدارک کرنا ضروری سمجھا اور شرفا اور معززینِ شہر کا ایک منتخب وفد سپہ سالار کے پاس اس مصیبت عظمیٰ کی فریاد لیکر حاضر ہوا۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نہایت خلق و مروّت کے ساتھ عیسائی وفد سے پیش آئے اور پوچھا۔

سپہ سالار۔ کہئے آپ صاحبان کیسے تشریف لائے؟ میں اگر آپ کے کسی کام آسکتا ہوں تو نہایت خوشی سے اس کے لئے حاضر ہوں۔

عیسائی۔ حضور! ہمارے اس بے وقت حاضر ہونے کی غرض یہ ہے۔ کہ چوک میں حضور نے دیکھا ہوگا کہ خداوند یسوع مسیح کا ایک مجسمہ بنا ہوا رکھا ہے۔

سپہ سالار۔ ہاں! ہاں! میں نے دیکھا ہے۔ پھر کیا وہ غائب ہو گیا؟

عیسائی۔ نہیں حضور۔ اتنی بڑی بھاری چیز بھلا کس طرح اڑائی جا سکتی ہے؟ غائب تو نہیں ہوا مگر اس کی ناک کسی شخص نے رات کو اُڑا دی اور ظاہر ہے کہ یہ کام کسی مسلمان ہی کا ہو سکتا ہے۔ عیسائی تو بھلا ایسی بے ادبی کیوں کرنے لگا تھا۔

سپہ سالار۔ مجھے تم سے یہ سُن کر نہایت افسوس ہوا۔ واقعی میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ کسی مسلمان ہی کی حرکت ہے۔ اسلام اگرچہ بتوں کے پوجنے یا اُن کو مقدس سمجھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر یہ بھی نہیں کہتا کہ دوسروں کے معبودوں اور بتوں کی ہتک کرو۔ یہ بات واقعی افسوسناک ہے۔ اور اس کی مرمت اگر ہو سکے تو آپ کرا لیں۔ اس میں جو کچھ رقم خرچ ہوگی۔ وہ میں دینے کے لئے تیار ہوں۔

عیسائی۔ نہیں حضور۔ اب اس کی مرمت نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو ٹوٹی ہوئی ناک موجود نہیں۔ اور اگر وہ موجود بھی ہو تو پھر اُس کا جوڑنا ہمارے لئے بہت محال ہے۔

سپہ سالار۔ اچھا! اگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو اِس قصور کے عوض میں آپ لوگ ہم سے کچھ تاوان لے لیں۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو رقم اس نقصان کے معاوضہ میں آپ مقرر کریں گے۔ انشاء اللہ ہم وہ آپ کو ادا کر دینگے۔

عیسائی۔ حضور آپ واقف ہیں کہ ہم پیارے یسوع مسیح کو خدا اور خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ پھر خیال فرمائیں کہ اُن کی اتنی بڑی ہتک کا معاوضہ چند درہم یا دینار کس طرح ہو سکتے ہیں؟ ہاں البتہ ایک صورت ہے اگر وہ حضور منظور کریں تو اس ہتک کا معاوضہ ہو سکتا ہے۔

سپہ سالار۔ کہئے۔ وہ کیا صورت ہے؟

عیسائی۔ وہ یہ بات ہے کہ آپ کے پیغمبر حضرت محمدؐ کا ایسا ہی ایک بُت بنایا جائے اور ہم اُس کی ناک اُڑا دیں بس پھر ہمارا بدلہ پورا ہو جائیگا۔

یہ گستاخانہ فقرہ سُنتے ہی سپہ سالار کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اُس وقت کوئی دوسرا ہوتا۔ تو بلا تامل ایک وار میں سارے وفد کا صفایا کر دیتا۔ عالی ہمت۔ بہادر اور متحمل مزاج سپہ سالار یہ سُنکر اگرچہ خاموش ہو گیا۔ مگر اس ناپاک فقرہ سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ پاس ہی تلوار رکھی تھی۔ بے اختیار سپہ سالار کا ہاتھ اُس پر جا پڑا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر رکھ دی۔ غصہ کا یہ عالم تھا۔ کہ اُس کا خون کھول رہا تھا۔ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس پر بھی غصہ کم نہ ہوا۔ تو تھوڑا سا ٹھنڈا پانی منگا کر پیا۔ اب کچھ کچھ غصہ کم

ہوا۔ تو اُس نے عیسائیوں کو مخاطب کر کے کہا۔" تم لوگ سخت بدتہذیب اور بے ادب ہو۔ اس وقت بے اختیار دل چاہتا ہے۔ کہ تم سب کی گردنیں اُڑا دوں۔ مگر کیا کروں۔ میں نے تمہیں امن دیا ہے۔ دراصل تمہارے خیال میں بھی اُس محبت اور عشق کا اندازہ نہیں آسکتا۔ جو ہم غلاموں کو اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ ہماری اولاد کا ہمارے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کیا جانا۔ ہمارے مال و منال کا ہماری آنکھوں کے سامنے غارت ہو جانا۔ خود ہمارے جسموں کا بوٹی بوٹی ہو جانا ہمارے لئے بہت زیادہ آسان ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ ہم کوئی خفیف سا کلمہ بھی اپنے پیارے آقاؐ کی شانِ اقدس میں سنیں۔ دنیا کی ہر بات گوارا کی جاسکتی ہے۔ لیکن مسلمان کے لئے اگر نہیں گوارا کی جاسکتی۔ تو وہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک ہے۔ تم نے اس وقت یہ گستاخانہ فقرہ کہہ کر میرا اور یہ جتنے آدمی میرے پاس بیٹھے ہیں۔ سب کا نہایت درجہ دل دکھایا ہے۔ تم لوگ جانتے ہو۔ کہ ہم نہ بتوں کو پوجتے ہیں۔ نہ اُن کو مقدس سمجھتے ہیں۔ نہ اُن کو بناتے ہیں۔ نہ اُن کو بیچتے ہیں۔ اور نہ نعوذ باللہ ہمارے کبھی وہم و گمان میں بھی یہ بات آسکتی ہے۔ کہ ہم اپنے پیارے آقاؐ کا بُت بنائیں اور پھر اُس کی ناک کاٹی جائے۔ لہٰذا تمہاری یہ درخواست نہایت لغو اور بالکل فضول ہے۔ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سخت ہتک کے بعد تم ہرگز اس قابل نہیں رہے کہ تم سے بات بھی کی جائے۔ لیکن اس کے باوجود میں اقرار کرتا ہوں۔ کہ چونکہ تم اس بت کو مقدس سمجھتے ہو۔ اس لئے اس کی ناک کٹنے سے تمہارا دل رنجیدہ ہونا فطری امر ہے۔ اگر اس نامعقول درخواست کے علاوہ کوئی اور صورت تمہارے ذہن میں ہو تو بیشک پیش کرو۔ جس سے تمہارے اس رنج کی تلافی ہو سکے۔ نعوذ باللہ! اپنے پیارے آقاؐ کا بُت بنا کر اُس کی ناک کاٹنے سے بدرجہا زیادہ آسان یہ امر ہے کہ تم ہم میں سے ایک شخص کی اپنے بت کے بدلہ میں ناک کاٹ لو۔

عیسائی۔ حضور معاف فرمائیں کہ ہماری اس وقت کی گفتگو حضور کے لئے ملال اور رنج کا باعث ہوئی۔ ہمیں اُس محبت کا اندازہ نہیں تھا۔ جو آپ کو اپنے نبی سے ہے۔ ورنہ اس قسم کی گستاخی نہ ہوتی۔ ہمیں حضور کی پیش کردہ یہی صورت منظور ہے۔ ہم بت کے بدلے ایک آدمی کی ناک کاٹ لیں گے۔

سپہ سالار۔ اچھا اگر تم نے یہی صورت منظور کی ہے تو کل میں تمام فوج میں منادی کرا دوں گا۔ کہ سب لوگ جمع ہو جائیں۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ سب کی موجودگی میں یہ انتقام لیا جائے۔ تم بھی اپنے آدمیوں کو لیکر آجانا۔

—— (۱۱) ——

صبح ہوئی تو حضرت عمرو بن عاصؓ نے تمام فوج کو شہر سے باہر کھلے میدان میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ عیسائی بھی ناک کا انتقام لینے کے لئے جوق در جوق آنے شروع ہوئے اور تھوڑی دیر میں میدان میں تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ تمام شہر اُمنڈ آیا۔ شاید ہی کوئی بدقسمت شہر میں باقی رہ گیا ہوگا۔

اب حضرت عمرو بن عاصؓ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا "اے میرے پیارے بھائیو! اور اے باشندگانِ اسکندریہ! آپ لوگ جانتے ہیں کہ آپ کس لئے جمع ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کل رات کسی مسلمان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس مجری مجسمے کی ناک اُڑا دی۔ جو چوک میں رکھا ہوا ہے۔ عیسائی میرے پاس فریادی آئے۔ واقعی یہ حرکت جس شخص نے بھی کی بُرا کیا۔ ہم مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے بتوں اور معبودوں سے کیا مطلب۔ وہ جو چاہیں کرتے پھریں اور جسے چاہیں پوجتے رہیں۔ ہمیں ان کے مذہبی امور سے کسی قسم کی پرخاش نہیں ہونی چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہی تعلیم دی ہے اور خدا نے قرآن میں اسی طرح فرمایا ہے۔ ہاں یہ ہمارا فرض ضرور ہے کہ ہم ان معبودوں کا باطل اور ہیچ ہونا دلائل اور شواہد سے لوگوں پر ظاہر کر دیں نہ کہ جبر اور ظلم سے جس کو اللہ تعالیٰ توفیق دے وہ اُن کو چھوڑ کر خدائے واحد لم یلد ولم یولد کی پرستش کرے۔ تو ہاں اُن کے اس بت کی ناک اُڑ جانے سے واقعی تمام عیسائیوں کی دل شکنی اور ہتک ہوئی۔ میں نے بطور تاوان اور جرمانہ کے اس امر کو منظور کر لیا ہے۔ کہ اپنے اُس بت کی ناک کے بدلہ میں عیسائی صاحبان ہم میں سے ایک شخص کی ناک اُسی طرح تلوار سے اُڑا دیں۔ جس طرح ان کے بت کی ناک کاٹی گئی ہے پس عیسائیوں کی طرف سے جو صاحب ناک کاٹنی چاہیں وہ آگے آ جائیں"۔ اس پر شہر کا بطریقِ اعظم آگے بڑھا اور سپہ سالار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

تمام لوگ حیرت کے ساتھ اس عجیب و غریب نظارہ کو دیکھ رہے تھے۔ اور اتنا بڑا عظیم الشان مجمع کامل سکوت اور خاموشی کے ساتھ چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کہ دفعۃً حضرت عمرو بن عاص بطریقِ اعظم کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا "اچھا آپ ہیں عیسائیوں کے نمائندے"۔ یہ کہہ کر بہادر سپہ سالار نے میان میں سے ننگی تلوار نکالی۔ جو سورج کی طرح چمک رہی تھی۔ اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا" پادری صاحب! آپ جانتے ہیں۔ میں اسلامی فوج کا افسر اور شہر کا حاکم ہوں۔ میں نے جو امان نامہ اہلِ شہر کو لکھ دیا ہے اُس پر میرے دستخط ثبت ہیں۔ پس میری موجودگی میں اگر شہر میں کوئی بدامنی پیدا ہو۔ یا کسی شخص یا قوم کو کوئی تکلیف پہنچے تو اُس کا ذمہ دار میں ہوں۔ چونکہ یہ افسوسناک واقعہ بھی میری یہاں کی موجودگی میں وقوع پذیر ہوا ہے۔ لہٰذا میں ہی اس کا تنہا ذمہ دار بھی ہوں۔ اگر میں رات کو گشت لگایا کرتا۔ تو شاید ایسا رنجدہ واقعہ نہ ہوتا۔ پس میری غفلت کا نتیجہ بھی مجھے ہی بھگتنا چاہیئے۔ یہ لیجیئے تلوار اور میری ناک اُڑا دیجیئے"۔ یہ کہتے ہوئے عدل و انصاف کے اس پیکرِ مجسم نے اپنی تلوار پادری کے ہاتھ میں دے دی۔

یہ دیکھتے ہی تمام افسرانِ فوج اور سارے مسلمان تڑپ اُٹھے۔ مگر سپہ سالار کی نورانی پیشانی پر اسی طرح طمانیت کا آفتاب چمک رہا تھا۔

معاً صف میں سے ایک سپاہی نکلا جس کے ہاتھ میں پتھر کی ایک ناک تھی اور بطریق سے کہنے لگا "ٹھیریئے۔ ٹھیریئے میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ کام میرا ہے۔ اور مجھ ہی سے یہ قصور سرزد ہوا ہے۔ یہ رہی ناک اور یہ رہا مجرم۔ سپہ سالار بالکل

بے قصور ہیں۔ چونکہ میں نے جرم کیا ہے۔ لہذا میں اپنی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ لیجیے میری ناک کاٹ لیجیے۔"
سارا شہر اس عجیب نظارہ کو دیکھتا رہ گیا۔ کیونکہ عیسائیوں کی عقلیں یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ یہ مسلمان انسان ہیں یا فرشتے!

بطریق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "خداوند یسوع مسیح کی قسم دراصل عیسائیت کا کامل اور اکمل ترین نمونہ تم لوگ ہو۔ انصاف وعدل تم پر ختم ہے۔ وہ مقدس وجود جس کے مذہب کو تم دنیا میں پھیلا رہے ہو کس قدر پاک اور مطہر ہوگا۔ اور کیسا نیکی وتقویٰ کا نمونہ ہوگا۔ وہ انسان جس کے پیرو ایسے ہیں کاش میں اس کے زمانہ میں ہوتا۔ تو اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتا۔ بت کی ناک کاٹنا میں مانتا ہوں کہ بیشک بہت بڑی غلطی ہے۔ مگر تم لوگوں سے بدلہ لینا بھی یقیناً بہت بڑا ظلم اور بیرحمی ہے۔ جاؤ میں بحیثیت بطریق اعظم تمام اہل شہر کی طرف سے تمہاری اس غلطی کو معاف کرتا ہوں۔ اور دعا ہوں۔ کہ تمہاری حکومت رہتی دنیا تک اس شہر پر قائم رہے۔"

اس واقعہ کے چند منٹ بعد اہل شہر اپنے اپنے گھر اور اہل فوج اپنی جگہ جاتے ہوئے نظر آئے۔
کیا دنیا کی کسی ملک کی تاریخ عدل وانصاف۔ بے تعصبی اور عالی حوصلگی کا ایسا محیر العقول کارنامہ پیش کر سکتی ہے؟

(محمد اسماعیل)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بے تعصبی

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حضور
برہمن گئے گاؤں کے ذی شعور

کہا یہ کہ "کر دیں مسلمان بند
اذاں سے پہنچتی ہے ہم کو گزند"

بلا کر مؤذن سے پوچھا گیا
"اذاں تم نہ دو تو ہے نقصان کیا؟"

وہ بولا "نہ ہو یہ طریقہ اگر
نمازی اکٹھے نہ ہوں وقت پر"

یہ سن کر ہوا ہندوؤں سے خطاب
"تمہیں اس سے ہے کس لئے پیچ وتاب؟

وہ بولے کہ "ہیں دیوتا خشمگیں
یہ آواز ان کو گوارا نہیں"

"وہ ناخوش رہیں تو نہیں زندگی
ہے ان کی خوشی میں ہماری خوشی"

نرالا جواب اُن سے جب یہ ملا　　موذن سے اس طرح پوچھا گیا
"نمازی چلے آئیں جو بے اذاں　　تو پہنچے گا اس میں تمہیں کیا زیاں؟"
وہ بولا کہ "نقصان نہیں کچھ حضور　　اذاں بند کر دیں گے ہم بالضرور"
دیا جب موذن نے ایسا جواب　　تو پھر ہندوؤں سے ہوا یوں خطاب
"شکایت ہے باقی کوئی اور بھی　　تمہاری تمنا ہے یا بس یہی؟"
وہ کہنے لگے "صرف اس کے سوا　　ہمارا نہیں دوسرا مدعا"
جرح کا ہوا کام یوں ختم جب　　فریقین کو یہ ملا حکم تب
"مسلماں تو اب سے اذاں ہی نہ دیں　　مگر اس پہ پابند ہندو رہیں
بلانے کو جائیں انھیں دربدر　　نمازی اکٹھے ہوں تا وقت پر
کسی دن بلانے میں جو دیر کی　　تو ہوگی نہ اس جرم سے مخلصی"
فریقین سنکر گئے اپنے گھر　　اُسی دن سے چلنے لگے حکم پر
مصیبت مگر ہندوؤں پر پڑی　　نظر آئی اُن کو قباحت بڑی
گئے ہو کے مجبور پھر عرض کی　　"حضور اس سے تو ہے اذاں ہی بھلی"
مہاراجہ نے جب سنا اُن کا حال　　کہا "تم کو پہلے نہ تھا یہ خیال

اذاں کے لئے حکم دیتا ہوں خیر
مگر تم بھی رکھو کسی سے نہ بیر"

اندر جیت شرما

پُر اسرار خط

سراغرسانی کا ایک حیرت انگیز فسانہ

(از جناب شیخ محمد بدر الاسلام صاحب فضلی بی۔اے۔بی۔ٹی سابق پروفیسر ٹوکیو یونیورسٹی جاپان)

پہلا باب

صبح کے تقریباً نو بجے ہونگے۔ کپتان عباس علی خاں اپنی کوٹھی واقع دریا گنج کے برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے صبح کی ڈاک دیکھ رہے ہیں۔ سب سے پہلے اخبار و رسائل کھول کر اُن پر ایک نظر ڈالی۔ پھر جلد جلد ان کو اکٹھا کر کے قریب کی میز پر رکھ دیا۔ اس کے بعد کھلے ہوئے کارڈ دیکھے۔ ان میں سے بعض پر پنسل سے نشان لگا کر ایک طرف رکھ دیئے اور اکثر کو پھاڑ کر ٹوکری میں ڈال دیا۔ اس کے بعد بند لفافوں کا نمبر آیا۔ پہلے سب لفافوں کے پتوں کو غور سے دیکھا اور اُن میں سے ایک پر کسی قدر حیرت کی نظر ڈالی۔ کیونکہ طرزِ تحریر کاتب خط کی نرم و نازک انگلیوں کی غمازی کر رہی تھی۔ کپتان کے چہرے پر خفیف مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور چہرے سے معلوم ہونے لگا۔ کہ وہ یہ راز معلوم کرنے کے لئے بیچین ہے کہ اس خط کا لکھنے والا کون ہے۔ مگر اُس نے آہستہ آہستہ لفافے کا ایک کنارہ چاک کر کے خط نکالا۔ لکھا تھا:۔

"کپتان صاحب آپ مجھے نہیں جانتے۔ مگر میں نے آپ کو ہزاروں انسانوں میں سے ایک خاص مقصد کے لئے انتخاب کیا ہے۔ یہ تو بتانا مشکل ہے۔ کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے۔ کہ آپ کے جو کارنامے اس سے قبل میں اخبارات میں دیکھ چکی ہوں۔ شاید انہیں کا اثر ہے۔ کہ اپنی مصیبت کے وقت میں مجھے آپ کا خیال پیدا ہوا۔ اور میں آپ سے مدد کی طلبگار ہوتی ہوں۔ میں اپنے متعلق اس وقت اس سے زیادہ کچھ نہیں بتاؤنگی۔ کہ میں سیٹھ قاسم بھائی کی بیٹی ہوں۔ جن کے بمبئی اور احمد آباد میں چوبیس بہت بڑے بڑے سوتی کپڑا بننے کے کارخانے ہیں۔ دو تین روز ہوئے میرے والد کسی تجارتی کام سے دہلی تشریف لا رہے تھے۔ میں دہلی کی سیر کے خیال سے اُن کے ہمراہ تھی۔ راستے میں ہمارے ہی فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ایک اور شخص نہایت خوش پوش خوش مزاج اور اُس کے قول کے مطابق دہلی کا رئیس اعظم نواب محی الدین مرزا بھی ہمارا شریک سفر تھا۔ اُس کے ہمراہ اُس کی حسین بیٹی انجم آرا بھی تھی۔ جس کے متعلق یہ بھی معلوم ہوا تھا۔ کہ

وہ انگلستان ہی میں پیدا ہوئی تھی اور وہیں اُس نے تعلیم پائی تھی۔ ہمارا سفر نہایت لطف کے ساتھ گذرا۔"
کپتان اس قدر دلچسپی سے اس خط کے پڑھنے میں مصروف تھا۔ کہ وہ قطعاً بھول گیا۔ کہ اُس کی اُنگلی میں جلتا ہوا سگرٹ سلگتے سلگتے آخر اس حد تک پہنچا کہ کپتان کی انگلیوں میں چرکا لگا اور کپتان نے گھبرا کر اس زور سے ہاتھ جھٹکا کہ سگرٹ کے ساتھ خط بھی زمین پر گر پڑا۔ ساتھ ہی کسی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ کپتان نے نظر اُٹھائی دیکھا۔ علی شبیر کھڑے ہیں۔
"یہ کس کافر ادا کا خط تھا۔ جس نے آپ کو اس قدر حواس باختہ کر دیا۔ کہ سگرٹ کی بھی خبر نہ رہی۔ واللہ کپتان تم بھی کسی عجائب خانہ میں رکھنے کے قابل ہو۔" یہ کہتے کہتے علی شبیر ایک قریب کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کپتان نے پہلے تو جلدی سے خط اُٹھایا اور پھر علی شبیر کی طرف دیکھ کر بولا" ہو تو تم بڑے منحوس اس وقت صبح ہی صبح کہاں سے آمرے سارا مزا کرکرا کر دیا"
"ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ آج کوئی نئی دھن ہے۔ آخر ہم بھی تو سنیں آپ نے کہاں دل لگایا ہے۔
"اچھا زیادہ بکواس نہ کرو۔ لو سنو اس وقت کی ڈاک سے ایک بڑا مزیدار خط آیا ہے۔ پہلے تو خاموشی سے آخر تک سُن لو۔ پھر کچھ رائے زنی کرنا۔ دیکھو بیچ میں نہ بولنا" یہ کہہ کر کپتان نے پھر ابتدا سے شروع کیا اور جتنا حصہ اوپر ختم ہو چکا ہے۔ اُس کے آگے یوں پڑھا:-
" لڑکی نہایت شائستہ الاطوار تھی۔ مگر اُس کا مغربی لباس اور اُس کی سگرٹ نوشی مجھے روحانی اذیت پہنچاتی تھی۔ نواب مذکور کی خوش گفتاری نے اس قدر والد پر اثر کیا کہ میں خوف زدہ ہو گئی۔ اُن کی حالت ایک مسمریزم کے معمول جیسی ہوتی جاتی تھی۔ چنانچہ دہلی آنے سے قبل میرے والد نے نواب کی میزبانی قبول کر لی اور یہ بات طے پا گئی کہ ہم نواب کی ہی کوٹھی میں قیام کریں جو پُرانی چھاؤنی خیبر پاس کے قریب واقع ہے۔ پرسوں شام کو جب کہ میرے والد اپنے کاروبار کی وجہ سے باہر گئے ہوئے تھے۔ انجم آرا مجھے اور میری بوڑھی دایہ کو موٹر میں سیر کرانے کے لئے لے گئی۔ مغرب کے بعد ہم اپنی قیام گاہ پر واپس آئے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ والد میرے نام ایک رقعہ چھوڑ گئے ہیں۔ جس میں مجھے اطلاع دی تھی کہ وہ اسی وقت کسی اشد ضروری کام سے شملہ جا رہے ہیں۔ اور تین روز میں واپس آجائیں گے۔
مجھے اطمینان دلاتے ہوئے اس دوران میں انجم آرا کے پاس قیام کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ لکھنا فضول ہے۔ کہ اس واقعہ نے میرے دل میں انتہائی تشویش پیدا کر دی۔ رات میں نے سخت بے چینی کے ساتھ گذاری۔ کل دن بھر میں نے نواب کو نہیں دیکھا لیکن کل شب کو میں نے اپنی خوابگاہ سے جو بالائی منزل پر پورب کی طرف واقع ہے۔ رات کے گیارہ بجے ایک چیخ کی آواز سُنی۔ میں نے فوراً اپنی کھڑکی کھولی۔ پورب کی طرف ہمارے بنگلے سے ملا ہوا ایک اور دو منزلہ بنگلہ ہے۔ اس کی اُوپر کی منزل میں بجلی کی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ کہ جس کھڑکی سے روشنی نکل رہی تھی اُس پر کچھ ایسے عکس پڑے جیسے دو آدمی کسی تیسرے آدمی کو ہاتھ اور ٹانگیں پکڑ کر اُٹھائے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ میں کئی گھنٹہ تک اپنی کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی۔ لیکن میں نے نہ کوئی اور آواز سُنی اور نہ کچھ دیکھا۔ مگر جو کچھ دیکھ اور سُن

منشی منوہر لال صاحب طالب بی-اے-ایل ایل - بی-
چکوال

حضرت عشرت رحمانی آف نیرنگ دہلی

سید ابوطاہر داؤد صاحب بی۔ ایس۔ سی۔ (ایگ)

شیخ محمد بدرالاسلام صاحب فضلی
بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔

چکی تھی۔ اُس نے میرے دل میں ایک طوفان بپا کر رکھا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ کیا ہو چکا اور کیا ہونے والا ہے۔ بہر حال مجھے ایک عظیم الشان خطرے کا احساس ہے۔ کپتان صاحب مجھے اپنی جان کی فکر نہیں۔ مگر مبادا ابا جان کو کوئی تکلیف پہنچی ہو یا پہنچے۔ اس خیال سے میری رُوح لرزتی ہے۔ مَیں پولیس کی مدد طلب کر سکتی تھی۔ لیکن میں ڈرتی ہوں۔ کہ پولس کی مداخلت کوئی نیا فتنہ نہ کھڑا کر دے۔ میرا دل اندر سے کہتا ہے کہ اس معاملہ میں صرف آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ اس لئے میں جرأت کر کے نہایت لجاجت کے ساتھ آپ سے التجا کرتی ہوں۔ کہ خدا کے لئے اس مصیبت میں آپ میری مدد کریں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دیگا۔

پتہ یہ ہے۔ کہ خیبر پاس کے مارکیٹ کے بالکل سامنے جو راستہ شمال کی طرف جاتا ہے۔ اُس پر سیدھے چلے جائیں جہاں بنگلوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک قبرستان شروع ہوتا ہے اور اُس سے گذر کر سڑک کے کنارے بائیں ہاتھ کی طرف برابر برابر دو بنگلے ہیں۔ جس بنگلے میں مَیں مقیم بلکہ مقید ہوں۔ وہ پہلے آتا ہے اور اُس کے دروازے پر دونوں طرف دو بڑے بڑے یوکلپٹس کے درخت کھڑے ہیں۔ بنگلے کے پشت کی طرف ایک اور چھوٹا سا راستہ ہے جس سے نکل کر پگڈنڈی قبرستان میں سے ہوتی ہوئی بہت دور تک چلی گئی ہے۔ فقط

پریشان حال سلطانہ"

کپتان عباس علی خاں نے خط ختم کر کے لفافے کے اندر رکھ دیا۔ اور علی شبیر کی طرف دیکھنے لگا۔

علی شبیر "معاملہ تو بڑا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ مگر یار کپتان کہیں کسی نے تمہیں فول تو نہیں بنایا" کپتان نے ایک منٹ تک کوئی جواب نہ دیا۔ اور ایک بار اُس کے حیرت انگیز دماغ نے اسی طویل خط کے ضروری اجزا کو یکجا کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ "واقعات میں حقیقت کی جھلک ہے۔ جس خوش اسلوبی کے ساتھ کام کیا گیا ہے۔ اُس کو دیکھتے ہوئے پلاٹ تیار کرنے والے کی ذہانت اور فن سے اُستادانہ واقفیت کی داد دینی پڑتی ہے۔ قیاس غالب ہے کہ نواب محی الدین مرزا کی شکل میں کنور سین نے جنم لیا ہے۔ یہ تو کنور سین ہی کے ہتھکنڈے ظاہر ہو رہے ہیں۔ اور ہو نہ ہو اُس کے جرائم کی شریک اُس کی بیٹی بملا ہی کا دوسرا نام انجم آرا ہے"۔

"یار کپتان تمہیں تو خواب میں بھی کنور سین ہی نظر آتا ہوتا"۔

"خیر اصل حقیقت تو تحقیق کے بعد ہی معلوم ہو سکے گی۔ لیکن ہماری زندگی میں پھر ایک بار دلچسپی کے سامان ہو چلے ہیں۔ خدا بھی کیسا مسبب الاسباب ہے۔ ورنہ میں تو اس خشک زندگی سے بہت ہی اُکتا گیا تھا۔ اب سوال ہے کہ کرنا کیا چاہیئے . . . . دن کے وقت تو کوئی خاص کام ہو نہیں سکتا۔ صرف یہی ہو سکتا ہے۔ کہ موٹر میں جا کر موقعہ واردات دیکھ آئیں۔ آج کل میاں رحمت علی خاں کہاں ہیں"۔

"ابھی ایک ہفتہ ہوا۔ قیصر گنج گئے ہیں"۔

"میں نے سنا تھا۔ کہ پچھلے دنوں صاحبزادہ نے کوئی ہوائی جہاز بھی تو لیا تھا"۔

"جی ہاں ہوائی جہاز کیا کھلونہ ہے۔ صرف دو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ میں نے بھی رحمت علی خاں کے ساتھ پرواز کی مشق کی ہے۔ اور اُن کے ساتھ ہی میں بھی دہلی فلائنگ کلب کا ممبر بنا تھا۔ بلکہ کل بھی میں نے یہ جہاز اُڑایا تھا۔ مشین بڑی نفیس ہے۔

کپتان" ہوں ...... اچھا تو آپ بھی اس فن میں دسترس رکھتے ہیں۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے۔ ہوائی جہاز سے اگر جائیں تو قیصر گنج کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے"۔

"جی ہاں ایک روز ہم دونوں گئے تھے۔ ہوائی جہاز سے ہم پورے پچاس منٹ میں رحمت علی خاں کی کوٹھی قیصر منزل کے سامنے جو وسیع میدان ہے اُس میں جا اُترے تھے"۔

"تو یہ جہاز آج کل یہیں ہے؟"

"جی ہاں کہتا ہوں نا کہ میں نے کل شام بند کیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد موٹر تیار ہو کر آ گیا۔ اور یہ دونوں دوست اس میں بیٹھ کر پرانی چھاؤنی کی طرف روانہ ہوئے اور خیبر پاس کے مارکیٹ سے شمال کی طرف مڑ کر سیدھے چلے گئے۔ جب اُس کوٹھی کے بالمقابل پہنچے جس کے دروازے پر دو یوکلپٹس کے درخت کھڑے تھے۔ تو کپتان نے اپنی کار روک اور علی شاکر کو وہیں چھوڑ کر خود کوٹھی کے اندر گیا۔ ابھی دس قدم بھی نہ گیا تھا۔ کہ جھاڑی سے نکل کر ایک شیر افگن کتے نے کپتان پر حملہ کیا اور بڑے زور سے بھونکنے لگا۔ کپتان کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ سیٹی بجانے لگا۔ رفتہ رفتہ کتے نے بھونکنا بند کر دیا۔ اور دُم ہلانے لگا۔ کتے کی آواز سُن کر ایک گوشے سے جدھر شاگرد پیشہ لوگوں کے مکانات تھے۔ ایک بہت بوڑھا آدمی کسی قدر لنگڑاتا ہوا باہر نکل آیا۔ اور کپتان سے پوچھنے لگا۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔ کپتان نے کہا" میں بہت دُور سے آ رہا ہوں اور کشمیری دروازہ سے جانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ کہ میں راستہ بھول کر ادھر چلا آیا ہوں۔ کیا آپ مجھے صحیح راستہ بتا دیں گے۔

"آپ جس راستے سے آئے ہیں اُسی راستے پر واپس جائیے۔ یہ راستہ دہلی شہر کی طرف نہیں جاتا"۔

کپتان" کیوں بھئی ذرا سا پانی بھی پلاؤ گے؟"

"مجھے افسوس ہے کہ نہ میرے پاس یہاں پانی ہے اور نہ پانی پلانے کا کوئی برتن"

"مگر کیا اس کوٹھی میں کوئی نہیں رہتا۔ یہ تو آباد معلوم ہوتی ہے"۔

"جی ہاں نواب محی الدین مرزا کی صاحبزادی یہاں رہتی ہیں۔ آج کل کچھ علیل ہیں کسی کو اُدھر جانے کی اجازت نہیں"۔

"اچھا اور یہ برابر کی کوٹھی میں کون رہتا ہے۔ میں وہیں جا کر پانی پی لوں"؟

"اس میں نواب صاحب کے دوست مسٹر لارنس رہتے ہیں۔ اس وقت تو وہ بھی موجود نہیں ہونگے"

"مسٹر لارنس کیا کوئی انگریز ہیں"؟

"نہیں انگریز تو نہیں عیسائی ہیں"

"تو کیا ان کا کوئی نوکر بھی موجود نہ ہوگا۔ جو پانی پلا دے؟ شاید یہ سامنے والا راستہ تو اندر ہی اندر اس کوٹھی سے اُس کوٹھی کو جاتا ہے"۔

"نہیں راستہ تو ادھر سے تھا۔ مگر بند کر رکھا ہے اور مسٹر لارنس کے پاس کوئی نوکر نہیں ہے"۔

دورانِ گفتگو میں کپتان کی تیز و متجسس نگاہوں نے تمام کوٹھی کا بہت اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ اور پشت کی طرف کا راستہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس وقت کوٹھی کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بالکل بند تھیں اور یہی حالت سامنے والی کوٹھی کی تھی۔ کپتان معذرت کر کے اپنی کار پر واپس چلا گیا۔ اور اُس میں بیٹھ کر سیدھا گھر آ گیا۔

باب دوم

(۲)

رات کے دس بجے عباس علی خاں اور علی شیر خاں اپنی موٹر سے خیبر پاس کے قبرستان کی پشت پر اُترے۔ علی شیر اور عباس علی بغیر کچھ کہے ہوئے قبرستان کی طرف چل دئے اور اُس سے گذر کر اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے نہایت خاموشی کے ساتھ اُس احاطے میں داخل ہوئے۔ جس میں نواب محی الدین مرزا کے دوست مسٹر لارنس رہتے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہایت تاریک رات تھی۔ کالے کالے بادلوں نے تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی پر بھی سیاہ پردہ ڈال دیا تھا۔ ہوا بھی بالکل بند تھی۔ کپتان کو اندھیرے میں بغیر چاپ کی آہٹ پیدا کئے چلنے کی بڑی مشق اور مہارت تھی۔ اس لئے پیڑوں کی آڑ لیتے ہوئے تھوڑی ہی دیر میں وہ کوٹھی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ نیچے کی منزل میں ایک کمرے کے اندر برقی لیمپ جل رہا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور جس درخت کے پیچھے عباس علی چھپا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی سے تقریباً نو فٹ کے فاصلے پر تھا اس لئے جو کچھ کمرے کے اندر ہو رہا تھا۔ عباس علی اُس کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ بلکہ کمرے کے اندر کی آوازیں بھی سُنائی دیتی تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ ایک دوہرے بدن کا بوڑھا آدمی جس کی لمبی داڑھی میں آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے ہیں۔ ایک چھوٹی میز کے قریب کرسی پر بیٹھا ہے۔ اُس کے چہرے پر دہشت اور فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ اُس کی آنکھیں مخمور اور غمگین معلوم ہوتی ہیں۔ اُس کے دونوں جانب دو آدمی انگریزی لباس

پہنے ہوئے کھڑے ہیں اور اُن کے چہروں پر ایک ظالمانہ مسکراہٹ نمایاں ہے۔ کمرے کے ایک گوشے میں ایک لمبے صوفے پر ایک جوان لڑکی عریاں لباس میں ملبوس لیٹی ہوئے بڑے انہماک کے ساتھ سگریٹ پی رہی ہے۔ بوڑھے آدمی کے سامنے میز پر ایک کاغذ رکھا ہوا ہے۔ اور کھڑے ہوئے دونوں آدمی اُس کو اس کاغذ پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔ بوڑھا اگرچہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن نیم بیہوشی کی حالت میں بھی اُس کو خطرے کا احساس ہے۔ قلم اُس کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے۔ مگر وہ نارضامندی کا اظہار کرنے کے لئے سر ہلاتا ہے اور قلم ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ ایک شخص اپنی جیب سے ایک عجیب قسم کا آلہ نکالتا ہے۔ اُس کو دیکھ کر غریب بوڑھے کی گھگی بندھ جاتی ہے۔ اور وہ کانپنے لگتا ہے۔ وہ شخص بوڑھے سے پوچھتا ہے۔ دستخط کرو گے؟ بوڑھا گردن ہلا کر انکار کرتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہی شخص آگے بڑھتا ہے اور بوڑھے کا بایاں ہاتھ پکڑتا ہے۔ اور جھٹک کر چھوڑ دیتا ہے۔ مگر اس دوران میں کپتان عباس علی اپنی جگہ سے یہ دیکھ لیتا ہے۔ کہ بوڑھے کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر ایک کتر لپٹی ہوئی ہے۔ وہ شخص بوڑھے کا داہنا ہاتھ پکڑ کر اُس کا انگوٹھا اس خوفناک آلے کے اندر رکھتا ہے۔ ٹھیک اس وقت کپتان نے برقی لیمپ کا نشانہ باندھ کر فائر کیا۔ اور ساتھ ہی دوڑ کر کود کر کمرے کے اندر کھڑا تھا۔ وہ چونکہ اندھیرے سے آیا تھا۔ اس لئے ہر چیز صاف دیکھ سکتا تھا۔ لیکن جو لوگ کمرے کے اندر تیز برقی روشنی میں تھے۔ دفعتاً اندھیر ہو جانے سے بالکل کچھ نہ دیکھ سکتے تھے۔ دوسرے اس اچانک اور غیر متوقع حملے نے اُن کو اس قدر ششدر کر دیا کہ قبل اس کے کہ وہ ہاتھ پیر ہلاتے۔ کپتان نے ان دونوں کھڑے ہوئے آدمیوں کی کنپٹیوں پر اپنی پستول کے پچھلے سرے سے ایسی کاری چوٹ لگائی۔ کہ دونوں چکرا کر زمین پر گرے اور اس سے پیشتر کہ وہ اُٹھ سکتے۔ کپتان نے بوڑھے آدمی کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور پھرتی سے کھڑکی تک لے جا کر بڈھے کو علی شیر کی گود میں دے دیا۔ اور اس کے بعد کمرے کی طرف مڑا۔ اتنی دیر میں لڑکی نے سوئچ دبا کر دوسرا برقی لیمپ روشن کر دیا تھا۔ دونوں ضرب خوردہ جوان اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو چکے تھے۔ لیکن کپتان کے دونوں ہاتھوں میں دو ریوالور تھے۔ جن کی نالیاں انہی دونوں کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔

کپتان۔ "خبردار! اگر جان عزیز ہے۔ تو اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا" دونوں اپنی اپنی جگہ بے حس وحرکت کھڑے رہے۔ مگر ان میں سے ایک نے غصّے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ کیا اندھیر ہے تم کون ہو جو اس طرح ایک شریف آدمی کے گھر میں گھس کر قتل کی دھمکیاں دیتے ہو"۔

"بے شک آپ سے زیادہ شریف اور کون ہوگا۔ کیونکہ ابھی تو ایک کروڑپتی تاجر کو مقید کر کے اور دھمکیاں دے دے کر جعلی دستاویزوں پر اُس سے دستخط کرا رہے تھے۔

"میں آپ کو حکم دیتا ہوں۔ کہ آپ میری کوٹھی سے نکل جائیں۔ ورنہ میں پولیس کی مدد طلب کرنے پر مجبور ہوں گا۔"

کپتان۔ "جی ہاں۔ بیشک۔ ضرور طلب کیجئے۔ پولس کو بھی آپ کی طلب ہے۔ ..... کہو بملا تمہارا کیا حال ہے۔

وہی شخص۔ "یہ کیا بکواس ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میرا نام محی الدین مرزا ہے۔ اور یہ میری لڑکی انجم آرا ہے"۔

"جی ہاں میں خوب جانتا ہوں۔ آپ تو ہمارے پرانے دوست ہیں۔ آخر اس قدر تجاہل عارفانہ کی کیا ضرورت ہے۔ مدت کے بعد آپ کی زیارت ہوئی ہے۔ آپ کسی پردے میں نمودار ہوں۔ کم از کم عباس علی اپنے مہربان دوست کنور سین کو بھلا کب بھول سکتا ہے۔ پچھلی دفعہ تو خوب بھاگے تھے۔ مگر اب فرمائیے۔ جہنم رسید کردوں"

محی الدین مرزا (کنور سین) تم جیسے بزدلوں سے اور کیا امید ہوسکتی ہے۔ میاں صاحبزادے میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں۔ کہ خواہ مخواہ مجھ سے نہ اڑو۔ تمہارے کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔ ایک نہ ایک دن نقصان اٹھاؤ گے۔" یہ کہہ کر کنور سین نے لارنس کی طرف دیکھا۔ بملا نے اپنے بائیں پیر کو سوفے کے نیچے کھینچ کر جوتے کی نوک سے فرش پر زور دیا۔ کنور سین اور لارنس دفعتاً اپنی جگہ سے اچھلے کپتان جس جگہ کھڑا تھا۔ اس جگہ کمرے کے فرش کا بہت بڑا ٹکڑا یکایک نیچے کی طرف دھس گیا۔ اور کپتان ایک تہ خانے کے اندر گرا۔ تہ خانہ اس قدر نیچا تھا۔ کہ گرتے ہی کپتان بے ہوش ہوگیا۔ کنور سین اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

کنور سین۔ "شاباش بملا تمہیں بڑی وقت کی سوجھی ورنہ اس وقت کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ مگر اب سب سے پہلے اس کم بخت کو پوری طرح قابو میں لانا ہے۔ اور پھر ہاتھ سے نکلے ہوئے شکار کو دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ مجھے یقین کامل ہے۔ عباس علی کے آدمی بڈھے کو اس کی کوٹھی پر لے گئے ہوں گے۔"

لارنس۔ خیر کہیں لے گئے ہوں۔ جب تک یہ شخص ہمارے قابو میں ہے۔ مفرور کا پتہ لگانا کچھ مشکل نہیں .... یہ کون شخص ہے"۔

کنور سین "کپتان عباس علی خاں۔ خواہ مخواہ لوگوں کے کاموں میں دخل دیتا پھرتا ہے۔ لیکن آدمی نہایت خطرناک ہے۔ تم ابھی اس کے ہتھکنڈوں سے واقف نہیں ہو۔"

لارنس۔ خیر دیکھا جائیگا۔ ایسے ایسے چھوکرے میرے ناخنوں میں پڑے ہیں"۔ کنور سین نے لارنس کی طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ خود کنور سین عباس علی خاں کا سچا قدردان ہے اور لارنس کی شیخیوں کو وہ کچھ وقعت نہیں دیتا۔ کنور سین نے تین بار گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر میں ایک کابلی پٹھان اور دو اور مضبوط ملازم کمرے میں داخل ہوئے۔ تینوں کو کنور سین نے حکم دیا کہ تہ خانے میں جاکر جو شخص وہاں بیہوش

پڑا ہے۔ اُسے اچھی طرح رسّوں میں جکڑ کر یہاں لے آؤ۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور تینوں آدمی عباس علی خاں کو اُٹھائے ہوئے کمرے میں لائے اور کنور رسین نے خود عباس علی کی تلاشی لی۔ صرف چند کارتوس ملے۔ یا وہ دونوں ریوالور ہاتھ لگے۔ جو ایک ملازم تہ خانے میں سے عباس علی خاں کے ہاتھ سے چھڑا کر لایا تھا۔ یہ تینوں ملازم پہرے پر مقرر ہوئے اور ان کو اسی کمرے میں چھوڑ کر کنور رسین اور اُس کے ساتھی اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے گئے۔ عباس علی کو جب ہوش آیا۔ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور اُس کے تینوں محافظ آرام سے سو رہے تھے۔ اُس نے آہستہ آہستہ دانتوں سے اپنے ہاتھوں کی بندشیں کھولیں۔ اس کے بعد آزاد ہو جانا صرف چند منٹ کا کام تھا۔ اُس نے دروازے کو کھولنا چاہا۔ لیکن اُس میں تالا لگا ہوا تھا۔ اسی طرح کھڑکی بھی مقفل تھی۔ اب صرف ایک ہی صورت ہو سکتی تھی۔ اسی کمرے میں اُوپر کی منزل پر جانے کے لئے ایک زینہ بھی تھا۔ عباس علی نے جانے کے لئے یہی راستہ اختیار کیا۔ اور بیٹھ کر آہستہ آہستہ ایک ایک سیڑھی ٹٹول ٹٹول کر اُوپر جانے لگا۔ زینہ بہت کافی چوڑا تھا۔ اُس کے ایک طرف دیوار تھی۔ مگر دوسری طرف لکڑی کا جنگلا تھا۔ جب اُس نے چھٹی سیڑھی پر قدم رکھا۔ تو کمرے کے دوسری طرف سے ایک لمبی اور آگے سے گول چیز بڑی تیزی کے ساتھ آئی اور اُس کے سر کے قریب سے گذرتی ہوئی دیوار میں کھٹ سے لگی۔ اگر وہ سیدھا کھڑا ہو کر اس زینہ پر قدم رکھتا، تو بلا شبہ یہ چیز اُس کا سر توڑ دینے کے لئے کافی تھی۔ عباس علی مزید احتیاط کے ساتھ باقی سیڑھیاں طے کر کے اُوپر کی منزل پر جا پہنچا۔ یہاں صرف ایک کمرہ تھا۔ لیکن اس کی وضع نہایت عجیب تھی۔ اس کی چاروں دیواروں میں چار کھڑکیاں تھیں۔ ان کھڑکیوں پر چوڑا چھجا آگے کی طرف نکلا ہوا تھا۔ اُس چھجے کی زیریں سطح آئینہ کی تھی۔ چھت کے وسط میں ایک پانچ فٹ مربع روشندان تھا۔ اُس کی چھت ڈھائی تین فٹ اُونچے چار پاؤں پر قائم تھی۔ اس کی چھت بھی نیچے کی طرف آئینے کی تھی۔ اس روشندان کے بالکل نیچے ایک بہت بھاری میز تقریباً ۸ فٹ مربع رکھی ہوئی تھی۔ اس میز کے وسط میں ایک آئینہ لگا ہوا تھا۔ عباس علی نے ذرا سی دیر غور کیا۔ تو اس آئینہ اور کھڑکیوں اور چھت کے آئینوں کی غایت معلوم ہو گئی۔ ان تمام چیزوں کی ترکیب کچھ اس طرح رکھی گئی تھی۔ کہ کوٹھی کے احاطے میں جتنی چیزیں ہوں۔ ہر چیز کا عکس اس میز والے آئینے پر پڑتا تھا اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ کہ اس کمرے میں اس میز پر بیٹھ کر کام کرنے والا یہ چاہتا ہے۔ کہ کوٹھی کے اندر آنے جانے والوں سے ہوشیار رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی احتیاط کسی خلافِ قانون کام ہی کے لئے کی جا سکتی ہے۔ کپتان میز پر چڑھ گیا۔ ہاتھ اُوپر کی طرف پھیلائے۔ جو ابھی چھت سے تقریباً ایک فٹ نیچے تھے۔ کپتان نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ کمرے کے ایک گوشے میں ایک کرسی رکھی تھی۔ پہلے تو اُس کی نشست پر کپتان نے اپنا پیر رکھ کر یہ دیکھنا چاہا۔ کہ بوجھ سہارے گی یا نہیں۔ فوراً کرسی میں ایک عجیب قسم کی کھٹ پٹ پیدا ہوئی۔

کپتان نے اپنا پیر کھینچ لیا۔ اب کرسی کو غور سے دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اگر پیر کا زور دینے کی بجائے خود بیٹھ جاتا۔ تو دونوں ہاتھ دونوں پیر اور جسم ایسا جکڑا جاتا کہ کرسی سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہو جاتا۔ مگر جن چیزوں سے گرفت ہوتی تھی۔ ایک دفعہ اُن میں حرکت پیدا ہو جانے کے بعد تالا لگ چکا تھا اور اب کرسی بالکل محفوظ تھی۔ کپتان نے کرسی اُٹھا کر میز پر رکھی۔ اور اس پر قدم رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اُس کا ہاتھ روشندان کے پاؤں تک پہنچ گیا۔ وہ چھت پر جانا چاہتا تھا۔ اور جا سکتا تھا۔ لیکن وہ کرسی کو میز پر رکھا ہوا چھوڑ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے نیچے اُتر کر کرسی کو اُس کی جگہ رکھ دیا۔ اور خود پھر میز پر چڑھ کر اس زور سے اُچھلا کہ روشندان کا نیچے کا کنارہ ہاتھ آ گیا۔ بظاہر یہ بڑا خطرناک کام تھا۔ لیکن عباس علی نے اپنی عمر بھر میں سوائے جمناسٹک اور ورزشی کھیلوں کے اور کیا ہی کیا تھا۔ اُس کے لئے چھت پر پہنچ جانا چند سیکنڈ سے زیادہ کام نہ تھا۔ اس کمرے کی چھت بالکل سپاٹ تھی اور کناروں پر کوئی منڈیر بھی نہ تھی۔ خوش قسمتی سے رات تاریک تھی۔ لیکن پھر بھی احتیاطاً عباس علی روشندان کی آڑ لیکر چھت پر سیدھا لیٹ گیا اور روشندان میں نیچے کی طرف جھانکنے لگا۔ اُس نے نیچے کی منزل میں لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنیں۔ اس وقت نصف شب گذر چکی تھی۔ بلکہ صبح ہونے میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت باقی نہ ہو گا۔ کنور سین اپنی خوابگاہ سے اُس کمرے میں آیا۔ جس میں عباس علی مقید تھا اُس نے دیکھا کہ تینوں پہرے دار غافل پڑے سو رہے ہیں۔ اور عباس علی کمرے سے غائب ہے۔ اُس نے فوراً لارنس کو جگایا۔ اور تحقیقات شروع کی۔ سب سے پہلے کمرے کے تالوں کی آزمائش ہوئی۔ سب بدستور لگے ہوئے تھے۔ ان کی کنجیاں خود کنور سین کے پاس تھیں کمرے کا گوشہ گوشہ دیکھ ڈالا۔ لیکن عباس علی خاں کا پتہ نہ چلا۔ نیچے کے تہ خانے کی تلاشی لی گئی۔ اس کا دروازہ بھی بدستور مقفل تھا اور اندر سے تہ خانہ بالکل خالی تھا۔ اب اوپر والے کمرے کی باری آئی۔ لارنس اور کنور سین اوپر چلے۔ مگر زینہ پر چڑھنے سے پیشتر لارنس نے دیوار پر لگا ہوا ایک بٹن دبایا جس سے چھوٹی سیڑھی کا تعلق اس خوفناک آلے سے منقطع ہو گیا۔ جو ایک بے خبر زینے پر چڑھنے والے کی سرکوبی کے لئے بنایا گیا تھا۔ دونوں اُوپر پہنچے۔ لارنس نے سب سے پہلے اُس میز کا معائنہ کیا جو کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی تھی۔ عباس علی اس خطرے سے خوب واقف تھا۔ اس لئے جب اُس نے اُوپر کی منزل پر آنے کی آہٹ سُنی تو اُسی وقت وہ روشندان کی چھت پر چڑھ گیا۔ جہاں سے وہ خوب جانتا تھا کہ اُس کا عکس میز پر نہ پڑ سکیگا لارنس نے بجلی کی روشنی میں میز کا بغایت نظر معائنہ کیا اور اُس کو پورا اطمینان ہو گیا۔ کہ عباس علی اس کمرے میں نہیں آیا۔ دفعتاً اُس کی نظر کرسی پر پڑی۔ اب تو گمان غالب ہوا۔ کہ عباس علی اس کرسی پر ضرور بیٹھا ہے۔ لیکن سوال یہ تھا۔ کہ بیٹھا تو آزاد کیونکر ہوا۔ بڑی دیر تک آپس میں بحث ہوتی رہی۔ اور عباس علی چھت پر بیٹھے بیٹھے اس بحث سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ یہ دونوں حیران تھے۔ کہ تمام کھڑکیوں اور دروازوں پر تالے بدستور

لگے رہے۔ پھر عباس علی کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ یہاں سے اکتا کر یہ لوگ نیچے اترے۔ تمام کوٹھی کے احاطے کی تلاشی کی گئی۔ مگر مقصد حل نہ ہوا۔ اس جستجو میں سپیدۂ صبح نمودار ہوا۔ اور راستے چلنے لگے۔ کچھ چرواہے اپنے جانور لیکر نکلے اور کچھ دودھ بیچنے والے دودھ بہنگیوں پر رکھ کر یا سروں پر اٹھائے ہوئے لے چلے۔ ان کی ایک پارٹی کوٹھی کی پشت کی طرف سے ہوکر گذر رہی تھی۔ کہ عباس علی نے چھت پر سے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ پہلے تو یہ لوگ حیران رہ گئے اور چاروں طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ لیکن آخر عباس علی نے ان کو اپنی طرف متوجہ کر ہی لیا۔ ان میں سے کچھ نوجوان چھوکرے بھی تھے۔ جو ایک مردِ معقول کو چھت پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑے۔ بعض پر جن بھوت کا خیال کر کے ایک خوف طاری ہو گیا۔ اور بعض تو ایک طرف کو بے تحاشا بھاگ لئے۔ اس غل شور میں کوٹھی کے آدمی بھی باہر نکل آئے۔ عباس علی نے دودھ والوں اور چرواہوں کی موجودگی میں خود کنورسین کو مخاطب کر کے یوں کہنا شروع کیا۔ "ارے بھئی یہ کیا مذاق ہے۔ سیڑھی لگواؤ نہ ہم تو یہاں بیٹھے بیٹھے سوکھ گئے"۔ کنورسین نے دل میں سوچا کہ عباس علی تو ہاتھ سے چلا۔ لیکن اگر سیڑھی لگانے میں پس و پیش کیا۔ تو دن کا وقت ہے۔ غیر لوگ موجود ہیں۔ معاملہ پولس تک ضرور پہنچیگا۔ لہذا جو مذاق کی صورت عباس علی نے پیش کی ہے۔ اس کو چار و ناچار قبول کرنا چاہیئے۔ سیڑھی منگوائی گئی اور عباس علی خان نہایت مزے سے نیچے اترے اور مسٹر لارنس اور کنورسین سے نہایت گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کر کے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے " افسوس ہے صبح کا ناشتہ میں آپ کے ساتھ نہیں کر سکا"۔

باب سوم

(۳)

عباس علی کو رخصت کر کے کنورسین اور مسٹر لارنس کمرے کے اندر آئے۔ دونوں کے خیالات کی دنیا فراوانیٔ جذبات سے آباد تھی۔ کچھ دیر خاموشی کا عالم رہا۔ ادھر کنورسین چوٹ کھائے ہوئے شیر کی طرح دل ہی دل میں بپھر رہا تھا۔ اور ہاتھ سے نکلے ہوئے شکار کو دوبارہ پھانسنے کی تدابیر سوچ رہا تھا۔ اُدھر کمینہ طبیعت لارنس کبھی یہ سوچتا تھا۔ کہ اگر عباس علی پھر پھنس گیا۔ تو بغیر جوتے مارے نہ چھوڑوں گا۔ اور کبھی یہ خیال کرتا تھا۔ کہ لعنت بھیجو مجھے اپنے کام سے کام ہے۔ مجھے جو کام آج کرنا ہے اُس کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ کنورسین خود عباس علی کو سمجھ لیگا۔ کبھی اپنی چالاکی پر ناز کرتا تھا۔ کہ دیکھو عباس علی میرے راز کا پتہ نہ چلا سکا۔ آخر کنورسین نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔ ایک ایسی متحکمانہ آواز سے جو حکومت کرنے ہی کے لئے بنی تھی۔ "دیکھو لارنس تمہیں ٹھیک تین بجے مہاراجہ صاحب بہرام پور کی کوٹھی پر پہنچ جانا چاہیئے۔ تمہیں کس وقت سے اپنا کھیل دکھانا ہے

ساڑھے تین بجے سے ۔۔۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے۔ تم کو جو کچھ تیاری کرنی ہے کرلو۔ مجھے بھی کئی ضروری کام آج دن میں کرنے ہیں ۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں چلا جاؤنگا ۔ شام کو ٹھیک سات بجے یہاں واپس آجانا کسی حالت میں اس وقت میں تاخیر نہ ہونی چاہیئے ۔"

عباس علی خاں کنور سین سے رخصت ہوکر علی شبر کے مکان پر پہنچے معلوم ہوا کہ ابھی واپس آگئے ہیں۔ عباس علی نے دریافت کیا "خیریت سے پہنچ گئے تھے " علی شبیر " بالکل عافیت سے ۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ لوگ راہ میں مزاحم نہ ہوں ۔ لیکن ہم بغیر کسی وقت کے فلائنگ اسٹیشن پر پہنچے ۔ لائسنس میں لے ہی آیا تھا ۔ دکھا کر رحمت علی کا ہوائی جہاز نکلوا کر اور اُس کو بٹھا کر روانہ ہوئے ۔ اور خیریت سے منزل مقصود پر پہنچے ۔

عباس علی ۔ رحمت علی خاں کو بڑا تعجب ہوا ہوگا ۔ علی شبیر " اُن کو واقعات بتا دئے تھے ۔ وہ تو فوراً آنا چاہتے تھے ۔ مگر میں نے کہدیا ۔ کہ اس ڈرامہ میں تمہارا پارٹ یہی ہے کہ یہاں بیٹھے بڈھے کی حفاظت کرتے رہو یہاں کہو تمہارے ساتھ کیسی گذری " عباس علی " اس کا وقت بالکل نہیں ہے ۔ اب تو میں جاتا ہوں ۔ شام کو چھ بجے میرے مکان پر آجاؤ اور اپنے ہمراہ راجپال سنگھ کو بھی لیتے آنا ۔ وہیں مجلس جمیگی ۔ لو بھئی اب جاتے ہیں ۔

ساڑھے تین بجے کپتان عباس علی مہاراجہ صاحب بہرام پور کی عالیشان کوٹھی پر پہنچے ۔ اور اپنا کارڈ بھیجا ۔ راجہ صاحب اگرچہ کپتان سے واقف نہ تھے اور اُس وقت اُن کے چند خاص خاص احباب چائے پر مدعو تھے ۔ ایک مدراسی جادوگر کچھ تماشا دکھانے والا تھا ۔ مگر راجہ صاحب نے کپتان صاحب کو بھی اُسی کمرے میں بلا لیا ۔ جہاں اور سب لوگ جمع تھے اور بڑے تپاک سے ملے ۔ آمد کی غرض دریافت کی تو جواب میں عباس علی خاں نے صرف یہ کہدیا " عرصے سے آپ کی تعریف سنتا تھا ۔ بیٹھے بیٹھے آج خیال آیا کہ خود ہی حاضر ہوکر نیاز حاصل کروں ۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ ازراہ عنایت کریمانہ خاکسار کی اس جسارت کو معاف فرمائیں گے "

مہاراجہ صاحب نے کپتان کا مختصر تعارف اپنے دوستوں سے بھی کرایا ۔ اور تماشا بدستور شروع ہوگیا ۔ کئی کھیل نہایت صفائی سے دکھائے گئے ۔ لیکن عباس علی خاں نے دیکھا کہ مدراسی جادوگر نے لوگوں کی نظر بچا کر کئی بار اُس کی طرف دیکھا اور ایک لمحہ کے لئے متفکر ہوگیا ۔ آخر میں مدراسی جادوگر نے ایک چھوٹا سا لکڑی کا بکس نکالا اور سب حاضرین کو دکھا دیا ۔ اب جادوگر نے درخواست کی کہ تمام حاضرین نہایت غور سے اُس لکڑی کے ڈبے کو دیکھ لیں ۔ جو اُس نے اپنے ہینڈ بیگ سے نکالا تھا ۔ چنانچہ سب نے اُس بکس کو خوب غور سے دیکھ لیا ۔ یہ ایک معمولی بکس تھا جس میں صرف ایک خانہ اندر سے نکلتا تھا ۔ پھر جادوگر نے کہا " اب خواتین میں سے کوئی اپنی موتیوں کی مالا صرف تھوڑی دیر کے لئے دے دیں " مہاراجہ خود اپنی جگہ سے اُٹھے اور رانی صاحبہ کی مالا لیکر جادوگر کو دے دی ۔ جادوگر نے یہ مالا دونوں ہاتھوں میں لیکر سر سے اوپر بلند کی اور سلام کے لئے راجہ صاحب کے

کے سامنے جھک گیا۔ اس عرصے میں تمام حاضرین نے یہ ہار اچھی طرح دیکھ لیا۔ جس کے بڑے بڑے موتیوں کی آب پر نظر نہ ٹھیرتی تھی۔ جادوگر نے نہایت صفائی کے ساتھ یہ ہار بکس کے اندر بند کر دیا اور ایک لمحہ کے بعد بکس کھول کر خالی بکس سب حاضرین کو دکھایا۔ سب نے اچھی طرح اپنی تسلی کر لی۔ بکس کے اندر سے کچھ برآمد نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر رانی صاحب بہت آزردہ ہوئیں اور جلسے سے رخصت ہونے کے لئے کھڑی ہوگئیں۔ خود راجہ صاحب اور تمام حاضرین بھی سخت پریشان نظر آنے لگے۔ کیونکہ ہار کم از کم آٹھ دس ہزار روپے سے کم کا نہ تھا۔ جادوگر نے باآواز بلند کہنا شروع کیا۔ "شاید آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے مالا جیسی قیمتی چیز کھو دی۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ جو مؤکل چیزوں کو اڑا لے جاتے ہیں۔ وہی اُن کو واپس بھی لا سکتے ہیں۔ دیکھئے ذرا اُستاد کی تربیت کا کرشمہ دیکھیے" اس کے بعد جادوگر بڑے زور زور سے کچھ بے معنی منتر پڑھنے لگا۔ اور بار بار اپنی آبنوس کی چھڑی سے اس بکس کو چھونے لگا۔ جو اُس کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ کئی بار اُس نے بکس کو زور زور سے ہلایا۔ اور پھر سب کے سامنے بکس کھولا۔ اور اندر سے مالا نکال کر بکس کو ایک میز پر رکھ دیا۔ اور مالا کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر جادوگر مہاراجہ صاحب کے سامنے جھک گیا۔ حاضرین نے بہت تالیاں بجائیں اور مہاراجہ صاحب نے مالا جادوگر سے لیکر رانی صاحبہ کے گلے میں پہنا دی۔ تماشہ ختم ہوا۔ اور راجہ صاحب نے سو روپے دے کر جادوگر کو رخصت کیا۔

کپتان صاحب بہت کچھ معذرت کے بعد راجہ صاحب سے رخصت ہوئے اور پھر ملنے کا وعدہ کر گئے۔

شام کے چھ بجے کپتان اپنی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ راجپال سنگھ اور پورن سنگھ اور علی شیر کوٹھی کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ عباس علی نے اختصار کے ساتھ تمام واقعات دہرائے جو گذشتہ چوبیس گھنٹے میں پیش آچکے تھے اور آخر میں ایک لفافہ جیب سے نکال کر راجپال سنگھ کو دیا۔ اور کہا۔ "فی الحال اس کو حفاظت سے رکھو جب واقعات سے ذرا مہلت ملیگی۔ تو اس کو دیکھیں گے۔ بڑے کام کی چیز معلوم ہوتی ہے" یہ کہکر عباس اپنے تینوں ساتھیوں کو ہمراہ لے کر اپنے کمرے میں گیا۔ کمرے کے تمام دروازے بند تھے اور مکان پر خوفناک سکوت چھایا ہوا تھا جس کو عباس علی خاں نے فوراً محسوس کیا۔ نوکروں میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو خود ہی تمام دروازے اور کھڑکیاں کھولنی پڑیں۔ ان لوگوں نے محسوس کیا۔ کہ کمرے میں کسی ہلکی قسم کی بو موجود تھی۔ خیال ہوا کہ کمرے بند رہنے کی وجہ سے ہوگئی ہوگی۔ تینوں اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ عباس علی نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرکے کہا۔ "ابھی صرف آدھا کام ہوا ہے۔ جب تک سلطانہ اُن لوگوں کی قید میں ہے۔ ہم ہرگز محفوظ نہیں ہیں۔ اب شام کے واقعہ نے کچھ نئے شبہات پیدا کر دئے ہیں۔ یہ لفافہ جو میں نے تم کو دیا ہے اور مجھے لارنس کے مکان کے بالائی کمرے میں میز کی دراز سے دستیاب ہوا ہے۔ بہت جلد اس کا غائب ہو جانا اُن لوگوں پر

ظاہر ہو جائیگا اور وہ اس کے لئے بے چین ہونگے۔ اس لئے راجپال سنگھ اس کو بہت حفاظت سے رکھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نا

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہوں۔

کہتے کہتے عباس علی خاں کا سر آگے کو جھک گیا اور صوفے کے ایک طرف ڈھلک کر وہ خرّاٹے لینے لگا۔ اس کے دونوں ساتھی اس سے پیشتر ہی سو چکے تھے۔ کچھ دیر کے بعد ایک روشندان کھلا اور بند ہو گیا۔ پھر کسی نے چھت پر سے اشارہ کیا۔ اور ایک موٹر جو کچھ دیر سے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ آگے بڑھی اور کوٹھی کے اندر داخل ہوئی۔ چھت پر سے بھی آدمی نیچے اُترا اور نہایت احتیاط کے ساتھ عباس علی خاں کو ایک برقعہ اوڑھا کر موٹر کی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر پردے ڈال دئے اور موٹر روانہ ہوئی۔

چوتھا باب

(۴)

رات کے دس بج چکے ہیں۔ ایک موٹر مسٹر لارنس کی کوٹھی واقع پرانی چھاؤنی دہلی کے سامنے آ کر رُکی اور اندر سے ایک سگنل ہوتے ہی آہستہ آہستہ کوٹھی کے اندر داخل ہوئی۔ صدر دروازے پر لارنس اور کنور سین دونوں کھڑے گویا اس موٹر ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ موٹر رُکتے ہی دونوں نے ہاتھ پکڑ کر بیہوش عباس علی خاں کو موٹر سے نکالا۔ اور دونوں طرف سے ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے کمرے کے اندر لائے اور فرش پر ڈال دیا۔ پھر دروازے بند کر کے دونوں نے دو موٹے موٹے رسوں سے اس کو خوب جکڑ کر باندھ دیا۔ حتیٰ کہ بجز سر اور چہرے کے اُس کے جسم کا کوئی حصّہ رسّے سے کھلا نہ رہا اور تمام جسم تختہ بن گیا۔ پھر اُسے پکڑ کر دونوں اوپر لے گئے اور ایک طرف فرش پر ہی ڈال دیا اور دو آدمی نگراں مقرر کئے۔ جن کو لارنس نے یہ ہدایت کی کہ جس وقت عباس علی کو ہوش آئے فوراً اطلاع کی جائے۔ اس کے بعد لارنس اور کنور سین نیچے کے کمرے میں آئے اور بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے

تھوڑی دیر کے بعد اطلاع آئی کہ عباس علی ہوش میں آگیا ہے۔ کنور سین نے اشارہ کیا اور لارنس ایک چمڑے کا ہنٹر لے کر اُوپر گیا اور عباس علی کو آنکھیں کھولے دیکھ کر گالیاں دیکر اور دھمکا کر پوچھنے لگا۔" قاسم سیٹھ کہاں ہے؟"

عباس علی نے ہوش میں آکر خود کو رسّوں سے جکڑا ہوا پایا اور کمرے کو دیکھ کر پہچان لیا۔ وہ لارنس اور کنور سین کے آنے کی توقع کر ہی رہا تھا۔ کہ لارنس اُس کے سامنے آیا۔ عباس علی نے اُس کی بکواس کا قطعی کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ وہ سوچنے لگا۔ کہ وہ کیونکر یہاں آیا۔ اُس کو یاد آیا۔ کہ وہ اپنے کمرے میں دوستوں کے پاس بیٹھا ہوا۔ نہایت اہم امور پر مشورہ کر رہا تھا۔ کہ دفعتاً نیند آگئی۔ اُسی حالت میں وہ زبردستی یہاں لایا گیا۔ یقیناً کمرے میں جو بدبو اُس نے محسوس کی تھی ضرور کسی خواب آور گیس کی تھی۔ جو اُس کی غیر موجودگی میں کسی روشندان کے ذریعہ کمرے کے اندر پھیلائی گئی ہو گی۔

لارنس نے جواب نہ پاکر اور غصّے سے بیتاب ہوکر زور سے تین چار ہنٹر پے در پے عباس علی کے مُنہ پر ملے جس سے عباس علی کا منہ سُوج گیا اور سخت تکلیف ہوئی۔ لیکن عباس علی نے اُف تک نہ کی۔ یہ دیکھ کر لارنس سخت متعجب اور پریشان ہوا۔ مگر اُس کو ایک نئی تدبیر سوجھی اور وہ فوراً نیچے گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد ایک حسین دوشیزہ کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔

لارنس (لڑکی کو مخاطب کرکے) مس سلطانہ! آپ ہیں کپتان عباس علی خاں صاحب۔ ہمارے معزز مہمان سے ملاقات کیجئے۔" یہ کہہ کر لارنس نے ایک ایسا قہقہہ لگایا جس سے اُس کی فطرت کی خباثت و شیطنت ظاہر ہوتی تھی۔ سلطانہ کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ گویا بس چلتا تو زمین میں سما جاتی۔ اُس نے چاہا کہ وہ اپنی ساری کے آنچل سے اپنا مُنہ چھپا لے۔ لیکن لارنس نے زور سے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس زور سے مروڑا کہ درد و تکلیف سے معصوم لڑکی نے جس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ زور سے دانت بھینچے۔ مگر پھر بھی چیخ نکل گئی۔ اس وقت عباس علی خاں کی جو کیفیت تھی۔ وہ ناقابل بیان ہے۔ اگر کسی طرح وہ آزاد ہو جاتا تو لارنس کی شامت ہی آجاتی۔ وہ اس بُری طرح اُسے جھنجھوڑتا۔ جیسے چوہے کو بلی۔ مگر افسوس وہ بے بس تھا۔ تاہم اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس نے غصہ سے چیخ کر کہا۔ "او رذیل کمینے ایک بے بس لڑکی کے ساتھ یہ ظلم کرکے کیوں اپنی نامردی کا ثبوت دیتا ہے۔ آخر بے قصور۔۔۔۔۔"

لارنس نے سلطانہ کو چھوڑ کر عباس علی کے منہ پر ایک اور ہنٹر رسید کیا۔ اور پھر مسلسل ایک درجن ضربیں لگائی ہونگی۔ ہر ضرب پر سلطانہ تڑپ کر چاہتی تھی۔ کہ مداخلت کرے مگر ہر بار نسوانی حجاب و حیا اُس کو اس بات سے باز رکھتی تھی کہ وہ لارنس جیسے خبیث کو ہاتھ لگائے یا بیچ میں آجائے اور ہر بار وہ آگے بڑھ بڑھ کر پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ وہ اس مکان سے وہ خوب واقف ہو چکی تھی اور جانتی تھی کہ اس کمرے میں چیخ و پکار کی آواز باہر نہیں جا سکتی۔ پھر بھی کئی بار وہ مدد کے لئے بے اختیار چلا پڑی۔ آخر اُس نے ہمت کرکے کُرسی اُٹھائی اور چاہتی تھی کہ لارنس کے سر پر دے مارے کہ لارنس نے دیکھ لیا۔ اور کرسی چھین کر ایک رسّی سے اُس کے دونوں ہاتھ کس کر باندھ دئے اور پھر ایک کرسی پر بٹھا کر ایک رسّے سے اُس کو جکڑ دیا اور اُس کے بعد نہایت وحشیانہ طریقے سے عباس علی پر ہنٹر برسانے لگا۔ عباس علی خاموش تھا۔ سلطانہ بے قرار تھی۔ مگر بے بس۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے۔ جب لارنس مارتے مارتے تھک گیا اور عباس علی اور سلطانہ دونوں نے قاسم سیٹھ کا پتہ نہ بتایا۔ تو مجبور ہو کر ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر خود نیچے چلا گیا۔ اگرچہ سلطانہ کو خود یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ اُس کے باپ کا کیا حشر ہوا۔ لیکن عباس علی کو اس حالت میں دیکھ کر اُس کو یہ یقین ہو گیا۔ کہ عباس علی کی مدد سے وہ کسی محفوظ مقام پر پہنچ چکا ہے اور عباس علی اسی جرم کی پاداش میں مظالم سہ رہا ہے۔ سلطانہ جب یہ سوچتی تھی۔ کہ عباس علی نے

اُس کی وجہ سے اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے۔ تو وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرتی تھی۔ لارنس کے چلے جانے کے بعد وہ چاہتی تھی۔ کہ عباس علی سے معافی مانگے۔ مگر اُس کے جذبات میں ایک ایسا طوفان بپا تھا۔ کہ آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ اور مُنہ سے آواز تک نہ نکلتی تھی۔ مگر عباس علی باوجود اس قدر زدوکوب کے نہایت سکون کے ساتھ موجودہ صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔ کم از کم اُس کا دماغ بالکل صاف تھا۔ اگرچہ سلطانہ کی موجوگی سے آج کپتان کے جذبات میں ایک خفیف سی لہر اُٹھ رہی تھی۔ تاہم اس مختصر وقت کو غنیمت جان کر اُس نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

کپتان۔ "تم ہرگز نہ گھبراؤ۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا۔ تمہارے والدان ظالموں کے پنجے سے محفوظ اور خیریت سے ہیں۔ دیکھو رونے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ہمت نہ ہارو۔ دل مضبوط کرو۔ جو واقعات ان دو دن میں پیش آئے ہیں۔ وہ مختصر بیان کر دو۔ شاید کوئی کام کی بات مل جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ہاں کہو۔ خاموش رہنے کا وقت نہیں ہے۔

سُلطانہ۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) "مجھے سخت افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اس مصیبت میں پھنسا دیا۔"

عباس علی۔ "ہرگز نہیں۔ تم نے بہت اچھا کیا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جس کنور سین کے واقعات تم نے اخبارات میں دیکھے ہیں۔ اُسی خوفناک مجرم کی سازش میں تم اور تمہارے والد گرفتار ہو گئے تھے۔ کنور سین ہی اس دفعہ نواب محی الدین مرزا کے بھیس میں ہے۔ لارنس اگرچہ ایک عیار مجرم ہے۔ لیکن اس سے کچھ زیادہ اندیشہ نہیں کنور سین کے سامنے وہ محض طفلِ مکتب ہے۔"

سلطانہ۔ "آج صبح ہی سے ان لوگوں کا برتاؤ مجھ سے بہت ہی سخت ہے۔ میری بوڑھی آیا غائب ہے۔ اور انجم آرا کو بھی میں نے کل شب کے بعد سے نہیں دیکھا۔ آج دن بھر میں نے رو رو کر گذارا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ کہ ایک نوکر نے مجھ سے کہا۔ کہ تمہارے والد آ گئے ہیں اور تمہیں بلاتے ہیں۔ مَیں جانتی تھی کہ یہ سب دھوکا ہے مگر سوائے ساتھ چلے آنے کے اور کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔ اس کوٹھی میں آ کر لارنس نے بتایا۔ کہ آپ اس کمرے میں میرے والد کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ میرے ایسے ہاتھ پیر پھولے ہوئے تھے۔ کہ جب مجھے یہاں آنے کے لئے کہا گیا تو مَیں یہاں چلی آئی۔"

عباس علی کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کہ نیچے سے کچھ آوازیں آنے لگیں۔ جن کو عباس علی غور سے سُننے لگا۔

ایک نئی آواز۔ "جی ہاں تو میں قیمت ابھی تو ادا نہیں کر سکتا۔ میرا آدمی کلکتہ گیا ہوا ہے۔ آپ کی چیز لے گیا ہے۔ آڑھتی سے سودا کریگا۔ پھر مجھے تار دیگا۔ تب آپ کی رقم چکا سکتا ہوں اس سے پہلے تو مشکل ہے۔

لارنس کی آواز۔ "مشکل! مشکل کیا معنے چیز تم نے خرید لی۔ کھری ہے۔ پھر جو کچھ تم سے ٹھہر چکا ہے۔ وہ کیوں نہیں دے دیتے آڑھتی سے مجھے کیا غرض۔ تم جانو تمہارا آڑھتی جانے۔"

نئی آواز۔ عرض کیوں نہیں۔ مَیں جب تک یہ نہ دیکھ لوں۔ کہ مال ٹھکانے لگ گیا۔ آپ کو دام کیسے دے دوں۔ کوئی گاجر مولی کا سودا تو ہے نہیں"۔

لارنس۔ " یہ آج تم کو کیا ہو گیا ہے۔ اگر نہیں لینا تھا۔ تو پہلے ہی کیوں نہ انکار کر دیا۔ ہم کچھ اور بندوبست کر لیتے۔ یہ تو صریح بے ایمانی ہے"۔

نئی آواز۔" جی ہاں ایک آپ ہی تو بڑے ایماندار ہیں"۔

لارنس۔ بس جی خیر روپے نہیں دیتے تو چیز واپس کرو"۔

نئی آواز۔" کیسی چیز۔ کس کو دی تھی۔ تم جیسے میں نے تین سو ساٹھ چرا ڈالے آپ بڑے شاہ ہیں۔ جو ہمیں چور بتاتے ہیں"۔

لارنس (غیض و غضب سے چیخ کر) " ہار واپس کرو۔ ورنہ ابھی جان نکال دوں گا۔

اس کے بعد بہت زیادہ شور و غل کی آوازیں سُنائی دیں۔ جن میں کنور سین کی آواز بھی شامل تھی۔ جو معاملے کو رفع دفع کرنے میں کوشاں معلوم ہوتا تھا۔ مگر دونوں اس قدر جوش میں تھے۔ کہ کسی طرح سمجھوتہ نہ ہوتا تھا۔ ایک کو روپیہ لینے پر اسرار تھا۔ دوسرے کو اس سے انکار تھا۔ اسی گفتگو میں عباس علی کو یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ اجنبی بولنے والا انڈرسن اینڈ کمپنی جوہریان کناٹ پیلس نیو دہلی کا مینجر جیکب ہے۔ جس کو مہارانی صاحبہ بہرام پور کا بیش قیمت ہار لارنس نے فروخت کرنے کے لئے دیا تھا۔ لیکن اس راز سے جیکب بھی واقف تھا کہ لارنس مصنوعی موتیوں کے بنانے میں کمال رکھتا ہے۔ اور وُہ یہ بھی جانتا تھا کہ لارنس نے مدراسی جادوگر کا بھیس بھر کر راجہ صاحب کی کوٹھی پر کھیل دکھایا۔ اور اپنا جعلی ہار رانی صاحبہ کے اصلی ہار سے بدل لایا۔ چونکہ جیکب نے اس راز کا پتہ لگا لیا تھا۔ اس لئے افشائے راز کی دھمکیاں دیکر چاہتا تھا کہ اس شکار کا نصف حصّہ حاصل کرے۔ اُدھر کنور سین کو لارنس کے ساتھ اس خاص معاملے میں کوئی ہمدردی نہ تھی کیونکہ گو وہ اپنے فطری غرور کے باعث اُس نے لارنس سے اس شکار کا حصّہ طلب نہیں کیا لیکن وہ سمجھتا تھا۔ کہ لارنس کا فرض ہے۔ کہ ہار کی قیمت میں سے نصف رقم وہ کنور سین کو پیش کرے۔ برخلاف اس کے اسی شام کو لارنس کنور سین کے سامنے اپنی دون فطرتی اور لالچ کے باعث کچھ اس قسم کا اظہار کر چکا تھا۔ کہ اس رقم سے کنور سین کو کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے۔ اور سیٹھ قاسم کے معاملے میں جو چھبیس لاکھ روپیہ ہاتھ لگنے والا تھا۔ اُس میں وہ نصف کا شریک ہو گا۔ اس بات نے کنور سین کے دل میں لارنس کے خلاف ایک نفرت پیدا کر دی تھی اور یہ نیا قضیہ جو درپیش آیا۔ اس سے وہ ایک حد تک خوش تھا۔ اس قضیہ کے طے ہونے میں دو گھنٹے سے زیادہ صرف ہو گئے۔ معاملہ پھر بھی کسی طرح سلجھتا ہوا نہ معلوم ہوتا تھا۔

اُدھر عباس علی نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ کان اس معاملے کی طرف رکھے۔ مگر آہستہ آہستہ سرک کر وہ سلطانہ کی کرسی

سے قریب ہو گیا۔ اور دانتوں سے اُس کے ہاتھوں کے بند کھول دیئے۔ ہاتھ کھلتے ہی سُلطانہ نے بہت جلد اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔ اور عباس علی کی ہدایات کے مطابق اُس کے ہاتھ بھی کھول دیئے۔ پھر دونوں نے مل کر باقی جسم کی گرہیں بھی کھول دیں۔ عباس علی نے چاہا کہ کوئی کھڑکی کھل سکے۔ مگر اس میں کھڑکا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے پھر مجبوراً اُس نے روشندان کا پُرانا راستہ اختیار کیا۔ رسّوں کو باندھ کر ایک لمبی سیڑھی بنائی اور میز پر کھڑے ہو کر اس سیڑھی کو روشندان کے دو پاؤں سے مضبوط باندھ دیا۔ اور پہلے سلطانہ کو اس رسّی پر چڑھایا۔ سلطانہ کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ اور اُس کو اپنی زندگی میں رسّوں کی سیڑھی تو ایک طرف کبھی بانس کی سیڑھی پر بھی چڑھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ یہ منزل بڑی کٹھن تھی۔ لیکن عباس علی کی مدد سے سلطانہ چھت پر پہنچ ہی گئی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں عباس علی رسّوں سمیت اس کے برابر کھڑا تھا۔ عباس علی نے پھر ایک بار روشندان سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ کمرہ خالی تھا۔ اور سب نیچے کی منزل سے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔ اب اس چھت سے زمین بائیس۲۲ تئیس۲۳ فٹ نیچی تھی۔ خود عباس علی کے لئے رسّوں کی مدد سے نیچے اُتر جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن سوال سلطانہ کا تھا۔ عباس علی نے رسّے میں گرہیں لگا کر ایک چھینکا سا بنایا اور سلطانہ کو اس کے اندر بٹھا دیا۔ سلطانہ نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ عباس علی نے اُس کے کان میں ہمت دلانے والے الفاظ کہے۔ رسّوں کا ایک سرا روشندان سے مضبوط باندھ کر اور رسّے کے بیچ میں ایک ایک فٹ کے فاصلے پر گرہیں لگا کر اور اللہ کا نام لیکر چھینکے کو نیچے لٹکایا۔ خود عباس علی کو یہ خطرہ تھا۔ کہ اگر کسی کو شبہ ہو گیا۔ تو بنا بنایا کام بگڑ جائیگا۔ مگر خوش قسمتی سے رات نہایت تاریک تھی۔ اور آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ پشت کی طرف کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ اور کوئی روشنی دُور دُور تک نظر نہ آتی تھی۔ عباس علی خاں نے پہلے تو سلطانہ کو نیچے پہنچایا۔ اور پھر خود تیزی کے ساتھ نیچے پہنچا۔ اور چھینکے میں سے سلطانہ کو نکال کر اور ہاتھ پکڑ کر کوٹھی کے پشت کی طرف بھاگا۔ کوٹھی کے چاروں طرف معمولی آہنی جنگلہ تھا اور اُس میں خاردار تار کھنچے ہوئے تھے۔ پشت کی طرف جو چھوٹا دروازہ تھا۔ وہ ان دونوں سے کسی قدر فاصلے پر تھا۔ اور کوٹھی کے ایک کمرے کی روشنی اس دروازے تک پہنچتی تھی۔ اس لئے عباس علی نے سوچا کہ اس دروازے سے گذرنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں تاروں کے بیچ میں سے نکل جائیں۔ لیکن دفعتہً غل مچ گیا۔ "پکڑو پکڑو" اور ایک آواز یہ بھی سُنائی دی۔ "کرنٹ" عباس علی نے جلدی سے سلطانہ کو تاروں کے اُوپر سے نکال دیا اور خود پلٹ کر دیکھا تو ایک شخص نے دوڑ کر پیچھے کے دروازہ کا آہنی دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بند ہوتے ہی تمام آہنی تار تپتے ہوئے لوہے کی طرح سُرخ ہو گئے۔ اب عباس علی کی سمجھ میں آیا کہ "کرنٹ" کا یہ منشا تھا کہ دروازہ بند کر کے برقی حلقہ مکمل کر دو تاکہ بجلی کی رو تمام تاروں میں دوڑ جائے اور راہِ فرار مسدود ہو جائے۔ عباس علی نے آواز سے سلطانہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "سیدھی بھاگی چلی جاؤ۔ اور سڑک آنے پر بائیں ہاتھ کو مڑ جانا" سلطانہ سخت پریشان ہوئی۔ مگر عباس علی پر اُس کو اتنا

بھروسہ تھا۔ کہ وہ سیدھی بھاگی ہوئی چلی گئی۔ اُدھر عباس علی نے اندھیرے میں ایک شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا عباس علی نے اپنے جاپانی اُستاد اراکی سے اس فن کو خوب سیکھ رکھا تھا کہ اندھیرے میں بغیر آواز کے نہایت تیزی کے ساتھ حرکت کر سکے۔ اُس نے آہستہ سے ایک سیٹی بجائی۔ اور تیزی سے اپنی جگہ بدل کر ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا جب وہ شخص آگے بڑھا تو عباس علی اپنی کمین گاہ سے نکل کر اُس شخص کے سر پر موجود تھا۔ اور اُس نے اس زور سے ایک مکّہ اُس شخص کی گردن پر مارا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ کپتان نے جھک کر کارتوسوں کی پیٹی اُس کی گردن سے نکالی۔ اور پستول اپنے قبضے میں کیا۔ اسی وقت آٹھ دس آدمی اُس طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ عباس علی نے اِس بیہوش آدمی کو ایک جھاڑی میں الجھا کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ اور سیٹی بجائی۔ یہ لوگ اس طرف بھاگے۔ عباس علی دور نکل چکا تھا۔ مگر اُنھوں نے جھاڑی کے قریب ایک آدمی کھڑا دیکھ کر اُسے مارنا شروع کیا۔ عباس علی خاں نے ایک فائر کیا اور اُن میں سے ایک گولی کھا کر گرا۔ یہ لوگ حیران ہو گئے۔ کہ عباس علی کو تو وہ مار رہے تھے یہ فائر کہاں سے ہوا۔ اس طرح تھوڑی دیر میں ہر گوشے سے عباس علی نے فائر کئے۔ جس سے کوٹھی کے محافظوں نے یہ خیال کیا کہ عباس علی کے بہت سے ساتھی مسلّح اس کوٹھے کے احاطے میں موجود ہیں۔ ہر شخص بتّی لے کر کوٹھی سے نکلتا ہوا ڈرتا تھا۔ کیونکہ اتنی بڑی جگہ میں اور ایسے سخت اندھیرے میں لالٹین لے کر نکلنے والا تو دوسروں کو نظر آ سکتا تھا۔ لیکن خود لالٹین والا کسی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ ایک بیوقوف نے یہ جرأت کی تو فوراً عباس علی نے اُس کو نشانہ بنایا۔ اب تو ہر طرف سے بھاگڑ پڑ گئی اور لوگ کوٹھی سے باہر نکلتے ہوئے ڈرنے لگے۔ کنور سین اور لارنس نے بھی یہی فیصلہ کیا۔ عباس علی اور اُس کے ساتھی بجلی کے تاروں سے باہر نہیں جا سکتے۔ اس لئے اطمینان سے غور کر کے ان کو پکڑنے کی تدبیر کرنی چاہیئے۔ اور احتیاطاً کچھ لوگ اِدھر اُدھر حفاظت کے لئے مقرر کر دئے گئے۔ لارنس اور کنور سین سخت پریشان تھے کہ جیکب کے سامنے یہ ایک نیا واقعہ پیش آ گیا۔ اور اب دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سوچ رہے تھے۔ کہ کسی طرح جیکب کو جانے نہ دیا جائے۔ اور کسی ایسی تدبیر سے اُس کو موت کے گھاٹ اتارا جائے کہ دنیا اُس کو خودکشی یا حادثہ تصور کرے۔ مگر ایسا کرنے میں لارنس کو اپنے ہار کا فکر تھا۔ نیز وہ خوب جانتا تھا۔ کہ جیکب جیسا عیار آدمی بغیر کسی انتظام کے یہاں ہرگز نہ آیا ہوگا اور بالخصوص جب وہ بے ایمانی کرنے اور لڑنے جھگڑنے کے منصوبے باندھ کر آیا ہے۔ جیکب کی موجودگی کی وجہ سے لارنس اور کنور سین باہم مشورہ بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس واقعے نے جیکب کو اور زیادہ شیر کر دیا تھا۔ اور وہ نہ صرف اپنی بات کو منوانے پر اڑا ہوا تھا۔ بلکہ اس نئے راز کو بھی دھمکیاں دے دے کر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ جس کا تعلق اس نئے واقعے سے تھا۔ غرض واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی تھی۔ کہ کچھ بنائے نہ بن پڑتی تھی۔ اُدھر عباس علی کو یہ فکر تھی۔ کہ اندھیری رات میں غریب سلطانہ کا کیا حشر ہوگا۔ ایک اور مصیبت یہ آئی کہ نہایت زور شور سے بارش شروع ہو گئی۔ ہوا نہایت تیز

چلنے لگی۔ اور بادل کی گرج اور بجلی کی چمک نے پریشان حال سلطانہ کو بالکل مخبوط الحواس بنا دیا۔ وہ دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔ اُسے داہنے اور بائیں کا کچھ ہوش نہ تھا۔ سڑک پر پہنچ کر جدھر کو منہ اُٹھا اُدھر ہی کا رخ کر لیا۔ اُس نے موٹر آتے ہوئے دیکھی تو بیچ سڑک میں کھڑی ہو گئی۔ غالباً وہ چاہتی تھی۔ کہ موٹر والے کسی امن و حفاظت کی جگہ پر اُسے پہنچا دیں۔ کیونکہ اب اُس کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ پاؤں لہولہان تھے۔ سر کے بال بکھر گئے تھے۔ ساڑھی کا آنچل سر سے گر کر کچھ عجیب طرح سے سینے اور گردن کے گرد لپٹ گیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ مُنہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ تمام جسم خوف و تکان سے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ڈرائیور یہ صورت دیکھ کر خوفزدہ سا ہو گیا۔ مگر اُس نے خوش قسمتی سے عین موقع پر بریک لگا کر گاڑی روک لی۔ ڈرائیور کے علاوہ موٹر کے اندر چار لحیم شحیم آدمی بیٹھے تھے۔ جن کے چہروں سے شہدہ پن ٹپکتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ شراب کے نشے میں مست ہیں۔ گاڑی کے رکنے سے یہ سب چونک پڑے اور گالیاں بکتے ہوئے بعض نے ڈرائیور سے رکنے کی وجہ پوچھی اور بعض نے باہر جھانکا اور ایک نوجوان عورت کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر سب کے سب گاڑی سے نکل پڑے۔ سلطانہ نے ان کی صورت اور وضع کو دیکھ کر بھاگنا چاہا۔ مگر اُس کی تمام قوتیں سلب ہو گئیں۔ اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ یہ لوگ اُسے اُٹھا کر موٹر میں ڈالنا ہی چاہتے تھے۔ کہ پیچھے سے ایک اور موٹر آپہنچی۔ جس میں عباس علی خاں کے یار غار علی شیر، راجپال سنگھ اور پورن سنگھ سوار تھے۔ باوجود تاریکی، بارش اور ہوا کے اُنھوں نے اپنے سے اگلی موٹر کو ٹھیرتے آدمیوں کو اُترتے اور کسی کو زمین سے اُٹھاتے ہوئے یہ خیال کیا کہ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ اس لئے یہ موٹر روک کر یہ تینوں اُتر پڑے اور مدد کرنی چاہی۔ آگے بڑھ کر راجپال سنگھ نے پوچھا "کیا کوئی حادثہ ہو گیا۔ کیا موٹر کی ٹکر لگ گئی"۔

پہلی موٹر کے آدمیوں میں سے ایک " جاؤ جی جاؤ اپنا کام کرو آئے وہاں سے (گالی)

راجپال سنگھ (اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہو کر) بھئی عجیب وحشی لوگ ہیں ہم تو مدد کے لئے آئے (علی شیر کے کان میں) معاملہ مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں اُدھر جانا ہے۔ ورنہ پیچھا کرنا چاہیئے تھا"۔

علی شیر نے بڑھ کر اُس آدمی کی گدی پر ایک مکہ رسید کیا۔ جس نے گالی دی تھی اور جو سلطانہ کو موٹر میں ڈالکر خود بھی موٹر میں سوار ہونا چاہتا تھا۔ مکہ لگتے ہی اُس شخص نے پلٹ کر لڑنا شروع کیا۔ اور اُس کے چاروں ساتھی لڑائی میں شریک ہو گئے۔ بارش کی کثرت اور ہوا کی تیزی سے اُس سنسان مقام پر کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی اور یہ آٹھوں آدمی ایک خوفناک جنگ میں مشغول تھے۔ پانچوں بدمعاش لڑنے میں بہت مشاق تھے۔ پہلے مُکّے بازی کا مقابلہ ہوتا رہا۔ لیکن ان میں سے ایک نے جیب سے ایک بہت بڑا چاقو نکال کر علی شیر پر حملہ کیا۔ علی شیر نے پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر وار خالی دیا۔ اور چاقو اُچٹتا ہوا خود اُس بدمعاش کے ایک ساتھی کی ران

ہیں لگا۔ تاہم رفتہ رفتہ علی شیر اور اُس کے ساتھی دبتے چلے جاتے تھے کہ دفعتاً ایک موٹر لاری بھی اس طرف آنکلی۔ اس کو دیکھ کر علی شیر نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ اور بدمعاش بھاگ نکلے۔ مگر موٹر وہیں چھوڑ گئے۔ علی شیر نے لاری کو روک لیا۔ اُس میں مسٹر جیفرسن سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی۔ ایک سب انسپکٹر اور چوبیس کنسٹیبل سوار تھے۔ علی شیر (مسٹر جیفرسن سے ہاتھ ملاتے ہوئے) آپ نے بڑی عنایت کی کہ میرے عریضے پر آپ نے خود تکلیف کی۔ مگر معاملہ نہایت اہم تھا۔ مجھے قطعی اُمید ہے کہ آپ کے دوست عباس علی خاں کسی انتہائی مصیبت میں گرفتار ہیں اور اُن کا سراغ صرف اس کوٹھی سے نکل سکتا ہے۔ جس کا پتہ میں آپ کو لکھ چکا ہوں۔

مسٹر جیفرسن۔ "اچھا چاہئے! مگر آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے تھے؟

"ہم یہاں ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے۔ کہ پانچ بدمعاش جو اس موٹر میں سوار رات کے ایک بجے اس طوفان و بارش میں ادھر سے گذر رہے تھے۔ ضرور ان کا تعلق کنورسین سے ہے۔ ہم نے تو یہ سمجھا تھا۔ کہ کوئی حادثہ پیش آگیا۔ اس لئے ان کی مدد کے واسطے ٹھہرے تھے۔ لیکن ان کے دل میں چور تھا۔ اس لئے ہم سے لڑنے اور گالیاں دینے لگے۔ لڑائی ضرور خطرناک صورت اختیار کر لیتی اگر آپ نہ آتے آپ کو دیکھ کر یہ لوگ بھاگ نکلے ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ چور اُچکے ہی ہونگے۔ ورنہ بھاگنے کے کیا معنی"۔

اِدھر اِن لوگوں کی توجہ تو رہی باتوں کی طرف، اُدھر بدمعاشوں میں سے وہ شخص جس کی ٹانگ پر زخم آیا تھا۔ چپکے چپکے زمین پر رینگتا ہوا اپنی موٹر کے قریب تک آیا اور ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کر موٹر سٹارٹ کر کے پوری رفتار سے چھوڑ دی۔ سٹارٹ کرتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ نے دیکھ لیا اور ڈرائیور کو پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ اِدھر علی شیر اور اُس کے دونوں ساتھی اپنی موٹر میں جلدی سے سوار ہوئے اور علی شیر نے اپنی کار لاری کے پیچھے ڈال دی۔ تھوڑی ہی دُور جا کر لاری بدمعاشوں کی موٹر کے قریب آگئی۔ اور سپرنٹنڈنٹ نے موٹر کے پچھلے ٹائر کو نشانہ بنا کر تین فائر کئے۔ ٹائر پھٹ گئے اور موٹر کھڑی ہو گئی اور ڈرائیور کود کر بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک سپاہی نے لاری سے کود کر اُس کا تعاقب کیا۔ اور تھوڑی دیر میں پکڑ کر لے آیا۔ اور لاری میں ٹھونس دیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے ایک رسّے کے ساتھ بدمعاشوں کی موٹر کو علی شیر کی موٹر کے پیچھے بندھوا دیا۔ اور سب علی شیر کی ہدایت کے مطابق مسٹر لارنس کی کوٹھی کے صدر دروازے سے پچاس قدم اِدھر رُکے۔ پانچ سپاہی لاری اور موٹر کی حفاظت کیلئے چھوڑے باقی نے سپرنٹنڈنٹ کے حکم سے کوٹھی کا محاصرہ کر لیا۔ یہ دیکھ کر سب کو تعجب ہوا کہ بارش کے باوجود کوٹھی کے احاطے کا آہنی جنگلہ اندھیرے میں آگ کی طرح دہک رہا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ نے صدر دروازے پر ایک لکڑی کا دروازہ دو ستونوں کے درمیان بند دیکھا اور ایک چور لالٹین سے اس دروازے کو اچھی طرح دیکھ کر

جیب سے ایک آلہ نکالا۔ جو ایک بہت لمبی قینچی سے مشابہ تھا۔ جس کی دستیاں بلور کی تھیں۔ اس آلے کی مدد سے سپرنٹنڈنٹ نے دروازے کے دونوں کواڑوں میں جو حلقہ پڑا ہوا تھا۔ اُس کو کھول دیا۔ کرنٹ بند ہو گئی دروازہ کھولا گیا۔ باوجود تاریکی کے عباس علی خاں نے یہ تبدیلی محسوس کی۔ مگر وہ اپنی کمینگاہ سے نہ ہلا۔ اُس نے یہ بھی دیکھا۔ کہ کوٹھی کے گرد کچھ شکلیں متحرک ہیں۔ تھوڑی دیر میں پچھلا دروازہ کھُلا اور کچھ لوگ اندر آئے۔ ان پر جو روشنی کی جھلک پڑی۔ تو عباس علی نے پہچان لیا۔ کہ پولس آ پہنچی۔ اور معاً اُس کا خیال علی شیر کی طرف گیا۔ اور دل ہی دل میں وہ علی شیر کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ پولس کا حلقہ تنگ ہوتا گیا۔ اور اصل عمارت بالکل پولس کے قبضہ میں آ گئی۔ مگر عباس علی خاں پولس کی آنکھوں میں خاک ڈال کر نہایت اطمینان سے اُن کے حلقے میں سے گذر کر کوٹھی کے اندر داخل ہوا۔ اور کئی کمروں میں سے ہوتا ہوا اُس کمرے میں پہنچا۔ جس میں کنور سین۔ لارنس اور جیکب یکجا بیٹھے اب بھی معاملے کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ عباس علی کو دیکھ کر کنور سین اور لارنس اس قدر متعجب ہوئے کہ کچھ دیر تک اُن کو اپنی نظر پر یقین نہ آیا۔ مگر کنور سین نے آخر عباس علی کو مخاطب کر کے کہا "عباس علی آخر تمہیں یقین ہو گیا۔ کہ تم کوٹھی سے باہر نہیں جا سکتے۔ اور سلطانہ بھی صبح سے پہلے پہلے یہیں آجائے گی"۔

عباس علی۔ "جی بجا درست ارشاد ہوا۔ کنور سین تم کو معلوم ہونا چاہیئے۔ اور اگر تم کو نہیں معلوم تو بحیثیت ایک پُرانے دوست کے مَیں تمہیں اطلاع دینے آیا ہوں کہ پولس نے اس کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اور اب تم اس کوٹھی کے باہر نہیں جا سکتے"۔

کنور سین (قہقہہ لگا کر) "میاں صاحبزادے ان گیدڑ بھبکیوں سے کام نہیں چل سکتا۔ مَیں نے تم سے بارہا کہہ دیا ہے۔ کہ تم میرے معاملات میں دخل نہ دیا کرو۔ ایک نہ ایک دن نقصان اُٹھاؤ گے۔ مجھے تمہاری جوانی پر ترس آجاتا ہے۔ لارنس کے تحفے تو تم ابھی نہ بھولے ہو گے"۔

عباس علی۔ "میں اس ذلیل مردک کو ہرگز اپنا مدِمقابل نہیں سمجھتا۔ ہاں تمہاری ذہانت اور دلیری کی ضرور تعریف کرتا ہوں۔ کاش یہ ذہانت و دلیری نیک کاموں کے لئے وقف ہوتی"۔

لارنس نے نوکروں کو طلب کرنے کے لئے گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھُلا اور سپرنٹنڈنٹ۔ علی شیر۔ راجپال سنگھ۔ پورن سنگ ہاتھوں میں پستول لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور ان کے پیچھے تین سپاہی آئے۔ جنہوں نے اشارہ پاتے ہی کنور سین۔ لارنس اور جیکب کو گرفتار کر لیا۔ کنور سین عباس علی کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ جیکب اپنے ہونٹ چبا رہا تھا اور لارنس سپرنٹنڈنٹ کے قدموں پر گر کر اور رو رو کر کہہ رہا تھا۔ کہ حضور میرا کچھ قصور نہیں۔ تھوڑی دیر میں ایک سپاہی بملا کو گرفتار کئے ہوئے اس کمرے میں لایا۔ مگر اُس کے چہرے پر بھی ہرگز کسی قسم کا انتشار نہ تھا۔ عباس علی کے قریب سے گذرتے ہوئے اُس نے آہستہ سے کہا "آپ کا شکریہ"۔

پانچواں باب

مذکورہ بالا واقعہ سے آٹھ روز بعد صبح کے ساڑھے سات بجے کپتان عباس علی خاں کی کوٹھی کے برآمدے میں کپتان عباس علی خاں اور اُن کے یارِ غار صاحبزادہ رحمت علی۔ راجپال۔ پورن سنگھ اور علی شیر اور سیٹھ قاسم معہ اپنی صاحبزادی سلطانہ کے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ نہایت پُرلطف گفتگو ہو رہی ہے۔ اور حال ہی میں جو واقعات پیش آئے ہیں۔ اُن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ سیٹھ قاسم نے بیان کیا کہ کنور سین نے جو نواب محی الدین کے بھیس میں تھا۔ اُن کو اس بات پر مجبور کیا۔ کہ وہ ایک جعلی دستاویز پر دستخط کریں۔ اس دستاویز میں یہ لکھا تھا۔ کہ سیٹھ قاسم نے نواب محی الدین مرزا سے پچیس لاکھ روپیہ قرض لیا ہے۔ انھوں نے دستخط کرنے سے انکار کیا۔ تو کنور سین اور لارنس نے تشدد شروع کیا۔ اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دیں اور ایک خوفناک آلے کے اندر بائیں ہاتھ کا انگوٹھا دبا کر اُس کا قیمہ کر دیا۔ اور اس ظالمانہ تجربے کو داہنے ہاتھ پر بھی کرنا چاہتے تھے۔ کہ عباس علی نے اس مصیبت سے نجات دلائی۔ سیٹھ صاحب نے یہ بھی بیان کیا۔ کہ ان ظالموں نے اُن کو کسی ایسی دوا کا انجکشن دیا۔ کہ اُس کے اثر سے دماغ میں ایک دھواں سا بھر گیا۔ جب علی شیر اُن کو لیکر ہوائی جہاز میں قیصر گنج لے گئے۔ تو وہاں رحمت علی خاں نے ان کا علاج قابل ڈاکٹر سے کرایا۔ اور تین روز کے بعد اُن کے ہوش و حواس درست ہوئے۔ اُسی روز شام کو دہلی سے قیصر گنج خیریت کا تار پہنچا اور بلانے کا حکم۔ چنانچہ اُسی وقت رحمت علی خاں اور سیٹھ قاسم ڈاک سے روانہ ہوئے۔ اور رات ہی کو دہلی پہنچ گئے۔ اور سیٹھ قاسم نے اپنی بیٹی سے عباس علی خاں کی بے غرضانہ ہمدردی، ناقابلِ تقلید ایثار اور انتہائی دلیری کے واقعات سُن کر اس بات کا فیصلہ کر لیا۔ کہ سلطانہ کی شادی عباس علی خاں سے کر دے۔ عباس علی خاں نے اس بات کو نہایت خوشی سے منظور کیا اور شادی ہو گئی۔ اُدھر جیکب۔ لارنس اور کنور سین وبملا سب حوالات میں ہیں اور اُن کے خلاف مقدمہ دائر ہو چکا ہے۔ اُن پانچ بدمعاشوں میں سے جنہوں نے سلطانہ کو اپنی موٹر میں ڈال لیا تھا۔ ایک بدمعاش پکڑا ہی جا چکا تھا۔ اور موٹر بھی پولس کے قبضے میں تھی۔ ان کے نمبروں سے پتہ لگ گیا۔ کہ یہ جیکب کی موٹر تھی اور اس سے صاف یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا۔ کہ مقررہ وقت پر یہ لوگ جیکب کی اعانت کے لئے جا رہے تھے۔ واقعات نے کچھ اور ہی صورت اختیار کر لی۔ جیکب کے مکان کی تلاشی ہوئی اور رانی صاحبہ بہرام پور کا ہار برآمد ہوا۔ واقعات پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے عباس علی خاں کا بیان ہوا۔ جس کے ساتھ اُنھوں نے ایک لفافہ عدالت کے سامنے پیش کیا۔ جو اُن کو پہلی رات میں لارنس کی کوٹھی کے بالائی کمرے سے ملا تھا۔ اس لفافے کے اندر رانی صاحبہ کے ہار کا فوٹو بالکل ہار کے برابر کھینچا ہوا رکھا تھا۔ اور رانی صاحبہ کے ایک خادمِ خاص کا مختصر خط بھی تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ اس سازش میں شامل تھا۔ لارنس کے مکان سے جعلی موتی بنانے کے بہت سے آلات اور سامان برآمد ہوا۔

اور وہ ڈبہ بھی نکلا۔ جس میں لارنس نے بحیثیت ایک مدراسی جادوگر کے رانی صاحبہ کا اصلی ہار بند کر کے غائب کیا تھا۔ اور جعلی ہار اُس کے بدلے میں واپس کیا تھا۔ یہ جعلی ہار اس خوبی سے بنایا گیا تھا۔ کہ خود رانی صاحبہ نے اس کے اصلی ہونے میں ذرا بھی شبہ نہ کیا۔ حتیٰ کہ پولس نے یہ ہار لیکر اُن کے سامنے ہی ایک ماہر کو دکھایا۔ جس نے اس کی قیمت ڈیڑھ دو روپے سے زیادہ نہ رکھی۔

غرض یہ کہ انہیں باتوں پر گفتگو ہو رہی تھی۔ آج ڈاک آنے میں کسی قدر دیر ہو گئی۔ ڈاک آئی اور عباس علی خاں نے اخبار کھولا سب سے پہلے صفحہ پر نہایت جلی قلم سے لکھا ہوا تھا۔

"کنور سین کا جیل سے حیرت انگیز فرار"

کنور سین ایک مشہور مجرم جس کے حیرت انگیز کارنامے اور خوفناک جرائم اس سے قبل اخبار میں شائع ہو چکے ہیں اور جو کپتان عباس علی خاں کی کوشش سے تقریباً ایک ہفتہ ہوا گرفتار ہو گیا تھا، کل شب کو مع اپنی بیٹی بملا کے نہایت حیرت انگیز طریقے سے جیل سے فرار ہو گیا۔ تحقیقات کی جا رہی ہے۔"

عباس علی خاں نے زور سے پڑھ کر یہ خبر سب کو سنائی۔ سب نے بے حد حیرت کا اظہار کیا۔ اور دیر تک اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر سب لوگ رخصت ہوئے اور سیٹھ قاسم بھی کسی دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ عباس علی اور سلطانہ برآمدے میں تنہا رہ گئے۔ یہ صبح نہایت خوشگوار تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سلطانہ سب لوگوں کی موجودگی میں عباس علی سے کچھ فاصلے پر نیچی نظریں کئے بیٹھی تھی۔ جب سب لوگ چلے گئے اور سیٹھ صاحب بھی اُٹھ گئے۔ تو سلطانہ نے ڈرتے ڈرتے نظر اُٹھا کر عباس علی کی طرف دیکھا۔ عباس علی پہلے ہی اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں دو چار ہوتے ہی عباس علی اپنی جگہ سے اُٹھا اور سلطانہ سے قریب والی کرسی پر آ بیٹھا۔ اور آہستہ سے مگر پُر اشتیاق آواز کے ساتھ کہا "سلطانہ تم نے میری زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا۔"

(محمد بدر الاسلام فضلی)

معمّہ کا حل

(از جناب ماسٹر سنتوکھ سنگھ صاحب عاجز گیانی خالصہ کالج لائل پور)

میں لائبریری میں بیٹھ کر اخبار کے ورق اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ کہ میری نظر "ضرورت ہے" کے کالم پر جا پڑی سب سے پہلے ہی لکھا تھا۔

"ضرورت ہے"

ایک لائق اور تجربہ کار گیانی کی۔ جو گورو گرنتھ صاحب کی کتھا اچھی طرح کر سکے اور دھارمک تعلیم میں خاص طور پر ماہر ہو۔ رہائش اور خوراک مفت۔ تنخواہ ۴۰ روپیہ ماہوار دیجاویگی۔ درخواستیں مندرجہ ذیل پتہ پر آنی چاہئیں۔ ظفر اللہ بیرسٹرایٹ لا کوہاٹ (N.W.F.P)"

پڑھ کر میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ ضرورت ہو۔ ایک گیانی کی اور درخواستیں آئیں ظفر اللہ بیرسٹرایٹ لا کوہاٹ کے پاس۔ بہت دماغ لڑایا۔ مگر کچھ سمجھ نہ آئی۔

شام کو میں گھر آیا۔ اپنے چند دوستوں سے اس بات کا ذکر کیا۔ میں نے کہا۔ میرا ارادہ درخواست بھیجنے کا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ پتہ غلط چھپ گیا ہے۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔ چلو بات تو پانچ پیسے کی ہے۔ درخواست بھیج دو۔ کوئی جواب آیا۔ تو بہتر ورنہ نہ سہی۔ دوسرے ہی دن سویرے کی ڈاک میں میں نے اپنی درخواست بھیج دی۔

پورے ایک ہفتہ بعد چپراسی نے مجھے ایک لفافہ لاکر دیا۔ کھول کر دیکھا تو لکھا تھا۔

کوہاٹ
1.10.28

پیارے گیانی صاحب

آپ کی درخواست کے جواب میں تحریر ہے۔ کہ بمشاہرہ ۴۰ روپیہ ماہوار آپ کو بطور دھارمک ٹیچر رکھا جاتا ہے۔ آپ کو پانچ سال کی ملازمت کا اقرار نامہ لکھ کر دینا پڑیگا۔ اگر منظور ہو۔ تو ایک ہفتہ کے اندر اندر حاضر ہو جاؤ۔ ورنہ اطلاع دو۔ تاکہ کوئی اور بندوبست کیا جائے۔

آپ کا صادق
ظفر اللہ بیرسٹرایٹ لاء

میں نے اُسی روز بیرسٹر صاحب کو اپنی آمد کے متعلق چٹھی لکھدی۔ اور چوتھے دن لائل پور سے گاڑی پر سوار ہو کر کوہاٹ چلا گیا۔

وہاں پہنچ کر میں نے لوگوں سے بیرسٹر صاحب کے مکان کا پتہ پوچھا اور اُن سے جا کر ملاقات کی۔ وہ کمال مہربانی اور اخلاق و مروت سے پیش آئے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اصل معاملہ پر گفتگو شروع کی اور اُن کی بھیجی ہوئی چٹھی اُن کے آگے رکھ کر کہا۔ بندہ حضور والا کے حکم کے مطابق حاضر ہو گیا ہے۔ اُنھوں نے نوکر کو آواز دی۔ نوکر آیا۔ تو کہا۔ سردار صاحب کے لئے سامنے والے مکان کا دروازہ کھول دو اور ان کا اسباب وغیرہ اندر رکھ دو۔ اور پھر جا کر بی بی اندر کور کو بلا لاؤ۔

نوکر ایک دس سال کی لڑکی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ اُس نے آتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے کہا۔ ست سری اکال میں نے بھی اُس کا جواب ست سری اکال میں دیا۔ بیرسٹر صاحب نے کہا۔ بی بی کرسی پہ بیٹھ جاؤ اور پھر مجھ سے یوں گویا ہوئے۔

گیانی صاحب! آپ میری لڑکی اندر کور کے آج سے ٹیوٹر ہیں۔ خوراک اور رہائش کا انتظام میرے ذمہ ہو گا۔ آپ چار گھنٹہ ہر روز لڑکی کو مذہبی تعلیم دیا کریں۔ جپ جی صاحب۔ راہ راس۔ سکھ منی صاحب اور دیگر بانیاں زبانی یاد کرانے کے علاوہ ایک گھنٹہ گورو گرنتھ صاحب کے معنی سمجھانے پر صرف کیا کریں۔ اُمید ہے کہ پانچ سال کے عرصہ میں یہ کام بوجہ احسن سرانجام پا جائیگا۔

میں نے دوسرے دن سے ہی لڑکی کو پڑھانا شروع کر دیا۔ لڑکی بلا کی ذہین اور فہم رسا تھی۔ جو کچھ میں پڑھاتا دوسرے دن فر فر سنا دیتی۔ ایک سال کے عرصہ میں میں نے جپ جی صاحب اور دیگر بانیاں بی بی اندر کور کو زبانی یاد کرا دیں۔ اور ساتھ ساتھ گورو گرنتھ صاحب کے ارتھ بھی پڑھانے شروع کر دئے۔ دل میں بھی سوچا کرتا تھا۔ اور ایک دن لڑکی سے بھی پوچھا۔ کہ یہ بیرسٹر صاحب آپ کے کیا لگتے ہیں۔ وہ کہنے لگی باپ۔ "اور آپ کی والدہ؟" "وہ ساتھ والے کمرے میں رہتی ہیں"۔

لڑکی روزانہ پڑھ کر مکان کے اوپر چلی جاتی تھی۔ اور مجھے نیچے رہنے کے لئے ایک کمرہ ملا ہوا تھا۔ گنگا رام ایک پہاڑی ملازم تھا۔ جو ایک علیحدہ کمرہ میں روٹی تیار کر کے مجھے بھی دے جاتا اور اندر کور کو بھی کھلا دیتا تھا۔

مجھے اسی طرح وہاں کام کرتے پورے دو سال ہو گئے۔ ایک دن میں اور بیرسٹر صاحب بالمقابل کرسیوں پر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ میں نے بیرسٹر صاحب کہا۔ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو بتانے میں کوئی تامل نہ ہو۔

بیرسٹر صاحب۔ خوشی سے پوچھئے؟ کوئی قانونی بات ہے؟ میں آپ سے کوئی فیس تو نہیں مانگتا۔

میں۔ بیرسٹر صاحب قانونی بات نہیں۔ ایک اور ہی بات ہے۔

بیرسٹر صاحب! ہاں ہاں! پوچھو!

ایک پُرلطف صحبت کی یاد

جناب بسمل الہ آبادی لاہور میں

سالگزشتہ الہ آباد کے مشہور شاعر منشی سکھدیو پرشاد صاحب بسمل الہ آبادی لاہور تشریف لائے اور میرے غریب خانہ پر قیام فرما ہوئے۔ اہل لاہور نے آپکا خوب خوب خیر مقدم کیا جو ایک ایسے ادیب کے لئے موزوں تھا۔ انگریزی اور اردو اخبار میں ایک ہفتہ تک آپکا اچھا چرچا رہا تھا۔ آنریبل خان بہادر سر عبدالقادر صاحب جج ہائیکورٹ لاہور نے ایک پُرلطف ٹی پارٹی بسمل صاحب کے اعزاز میں اپنے بنگلے پر دی جس میں ڈاکٹر گوکل چند صاحب وزیر لوکل سلف گورنمنٹ۔ راجہ نریندر ناتھ صاحب۔ کرنل بھولا ناتھ صاحب۔ ملک برکت علی اور دیگر معزز اصحاب لاہور شریک تھے شعر و سخن کا بھی ذکر تھا۔ جناب حفیظ جالندھری کے بعد حضرت بسمل نے اپنی فلسفہ ہستی کی رباعیاں پڑھیں اور اپنے دیگر نایاب کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ دوسرے دن راجہ نریندر ناتھ صاحب نے ایک پارٹی اعلیٰ پیمانہ پر حضرت بسمل کو اپنی عظیم الشان کوٹھی پر دی۔ اس پُرلطف جلسہ میں لالہ ہرکشن لال صاحب۔ جناب محبوب عالم صاحب مرحوم اڈیٹر پیسہ اخبار۔ آنریبل ملک فیروز خاں نون وزیر تعلیم و دیگر شہر کے معزز رؤسا، بیرسٹران۔ وکلاء اور اڈیٹر صاحبان کافی تعداد میں موجود تھے لاہور کے مشہور قومی شاعر لالہ لال چند صاحب فلک نے بسمل صاحب کا خیر مقدم نظم میں کیا جس کو حاضرین نے بہت پسند فرمایا۔ راجہ نریندر ناتھ صاحب نے بسمل صاحب کا تعارف حاضرین جلسہ سے کرایا اور خاص طور سے درخواست کی کہ وہ فلسفہ ہستی کی رُباعیاں پہلے پڑھیں اور پھر اُس کے بعد اپنے تازہ کلام سے ہم لوگوں کو مستفیض فرمائیں۔ حضرت بسمل نے ہستی کی رُباعیاں پڑھیں جس سے لوگ بہت لطف اندوز ہوئے۔ ہر طرف سے واہ وا کی صدا آنے لگی۔ اُردو دنیا میں یہ ہستی کی رباعیاں اپنا جواب نہیں رکھتیں بسمل صاحب کی پُرکیف غزلوں نے حشر برپا کر دیا۔ یہ جلسہ بہت کامیاب ہوا۔ انگریزی اُردو اخبارات میں بسمل صاحب کے کلام کی بہت بہت تعریف ہوئی۔ پنڈت برجموہن صاحب کیفی دہلوی نے بھی ایک ٹی پارٹی بسمل صاحب کو دی جس میں مقامی شعراء زیادہ تعداد میں شریک تھے۔ یہ بھی صحبت خوب تھی۔ سر عبدالقادر صاحب کے ہمراہ میں اور بسمل صاحب سر اقبال صاحب سے نیاز حاصل کرنے کے لئے اُنکے بنگلے پر گئے جذبات بسمل[1] کا ایک نسخہ بسمل صاحب نے علامہ اقبال کو نذر کیا جس کو دیکھ کر وہ بہت محظوظ ہوئے ہستی کی رباعیاں علامہ اقبال کو بھی بہت پسند آئیں ایک گھنٹہ کے قریب اُن سے گفتگو ہوتی رہی۔ بعد اس کے ہم لوگ واپس آئے۔ بزم سخن لاہور نے بسمل صاحب کو خاص طور سے مدعو کیا تھا۔ وہاں بھی انکا خیر مقدم بڑی شان سے ہوا۔ اڈیٹر صاحب ملاپ۔ اڈیٹر صاحب گورو گھنٹال نے بھی پُرتکلف دعوت بسمل صاحب کو دی۔ ہر جگہ اپنے کلام سے بسمل صاحب حاضرین کو محظوظ فرماتے رہے۔ پنجاب اُردو ایسوسی ایشن میں بھی بسمل صاحب خاص طور سے مدعو کئے گئے۔ یہاں بھی خوب مجمع تھا۔ ملک برکت علی خاں صاحب صدر جلسہ تھے۔ مقامی شعرا نے بھی اچھی اچھی غزلیں پڑھیں۔ بسمل صاحب کا تعارف صدر جلسہ نے پُرزور لفظوں میں کیا۔ بعد اس کے بسمل صاحب نے اپنے کلام سے سب کو تڑپا دیا۔ بسمل صاحب کا پڑھنا اور کہنا دونوں غضب کا ہے۔

---

[1] جذبات بسمل باتصویر قیمت ایک روپیہ۔ مینیجر انڈین پریس لمیٹیڈ، روڈ انارکلی لاہور یا مینیجر انڈین پریس الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

اسلامیہ کالج میں بھی بسمل صاحب سر عبدالقادر صاحب کے ہمراہ گئے اور وہاں اپنے پُرلطف کلام سے طلبا کو بسمل بنایا۔ ایک ہفتہ کے قریب رہ کر بسمل صاحب الہ آباد کے لئے روانہ ہوگئے۔ یہ جب تک یہاں رہے شعر و سخن کا چرچا رہا۔ میرے غریب خانہ پر بھی شعرا کا جمگھٹ رہتا تھا۔ یہ سب بسمل صاحب کے دم قدم سے تھا۔ خوش قسمتی سے پنجاب یونیورسٹی کے جوبلی مشاعرہ میں بسمل صاحب خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے۔ رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی نے جوابی تار دیکر طلب فرمایا تھا۔ ۶ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو سر عبدالقادر صاحب کی صدارت میں ایک عظیم الشان مشاعرہ جو برجی گراؤنڈ پر شامیانہ کے نیچے منعقد ہوا۔ آٹھ دس ہزار آدمی کا مجمع تھا۔ پنجاب اور بیرون پنجاب کے متعدد اصحاب اس مشاعرہ میں موجود تھے۔ مشاعرہ میں لاؤڈ اسپیکر لگا دیئے گئے تھے تاکہ ہر شخص شعرا کے کلام سے محظوظ ہوسکے۔ مقامی شعرا کے علاوہ نواب سائل دہلوی اور جناب ظریف لکھنوی اور جناب بسمل الہ آبادی مشاعرے کی زینت کو دوبالا کر رہے تھے۔ شعرا نے اچھے اچھے نمونے اپنے لاجواب کلام کے حاضرین کے سامنے پیش کئے اور داد حاصل کی۔ اس کے بعد سر عبدالقادر صاحب نے بسمل صاحب کا تعارف شستہ الفاظ میں مجمع سے کرایا اور بسمل صاحب کی بہت بہت تعریف کرتے ہوئے اُن سے اپنا کلام سُنانے کی درخواست کی۔ بسمل صاحب کے خیر مقدم کے لئے ہر طرف سے تالیاں بجنے لگیں۔ بسمل صاحب نے اپنے خاص انداز سے پڑھ کر تمام محفل کو بسمل کر دیا۔ مختصر یہ کہ بسمل صاحب مجمع پر چھا گئے۔ جس نے یہ منظر دیکھا ہے وہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ بسمل صاحب محفل پر اپنا رنگ کس خوبی سے جماتے ہیں۔ نواب سائل دہلوی نے بسمل صاحب کی سر مشاعرہ پیٹھ ٹھونکی اور گلے سے لگالیا۔ اسکے بعد مولانا ظریف لکھنوی نے اپنے نایاب کلام سے پبلک کو خوب خوب ہنسایا۔ جناب ظریف جس رنگ میں فرماتے ہیں اُنکا جواب نہیں۔ یہ اُنہیں کا حصہ ہے۔ آخر میں نواب سائل دہلوی نے مجمع کو بیحد محظوظ کیا۔ سائل صاحب کا کہنا ہی کیا ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ لاجواب تھا۔ پبلک اس پر بھی سیر نہیں ہوئی اور جناب بسمل حضرت ظریف اور جناب سائل دہلوی کو دوبارہ اپنے کلام سنانے کی زحمت دی گئی۔ اس پر ان سب نے اپنے کلام سے حاضرین کو پھر محظوظ کیا۔ اور مشاعرہ ختم ہوا۔ یہ مشاعرہ خوب تھا اور ہر پہلو سے کامیاب ہوا۔ دوسرے روز سر عبدالقادر صاحب نے ٹی پارٹی جناب بسمل حضرت ظریف اور جناب سائل دہلوی کے اعزاز میں اپنے بنگلے پر دی۔ ۵ بجے شام کے قریب معزز مہمانوں کا ایک گروپ لیا گیا جس میں سر سکندر حیات خاں۔ آنریبل جسٹس رنگی لال۔ ڈاکٹر نند لال۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین۔ آنریبل جسٹس جے لال۔ رائے بہادر کنور سین۔ لالہ ایشور داس رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی۔ سر عبدالقادر۔ پروفیسر عبداللطیف تپش۔ ڈاکٹر ہرچرن سنگھ۔ مسٹر بشیر احمد بارایٹ لاء وغیرہ وغیرہ موجود تھے۔ بعد گروپ کے ٹی پارٹی میں ان اصحاب نے شرکت فرمائی اور اس کے بعد شعر و سخن کی محفل گرم ہوئی۔ اور جناب بسمل حضرت ظریف اور جناب سائل نے اپنے کلام سے علم دوست اصحاب کو محظوظ فرمایا۔ یہ صحبت عمر تک لوگوں کو یاد رہے گی۔ جناب بسمل اسی رات کو الہ آباد روانہ ہوگئے۔ اس سالہ میں وہ گروپ دیا جا رہا ہے۔ اہل لاہور کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جو کامیابی بسمل صاحب کو لاہور کے علم دوست حلقہ میں ہوئی ہے وہ کسی دربا ہر کے شاعر کو آجتک نصیب نہیں ہوئی۔ کالج کے طلبا تو بسمل صاحب کی شاعری کے عاشق ہیں۔ ہم بسمل صاحب کو اور نیز اُنکے قابل قدر اُستاد ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی کو دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ حضرت نوح بسمل صاحب پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ بسمل صاحب سے میں معذرت چاہتا ہوں کہ اگر کوئی زحمت میرے غریب خانہ پر اُنہیں ہوئی ہو تو نظرانداز کریں اور آئندہ جب کبھی لاہور تشریف لائیں تو میرے ہی غریب خانہ پر قیام فرما ہو کر مجھے مسرور و ممنون فرمائیں۔

جگت سنگھ مینجنگ پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

رائے بہادر کا خطاب

(از جناب پروفیسر رام سروپ صاحب کوشل ایم اے - ودّیا بھوشن)

جاڑے کا موسم ہے۔ رات کو آٹھ بجکر بائیس منٹ پر[1] ڈائمنڈ ہاربر سے کلکتے کو روانہ ہونے والی گاڑی سنگرام پور سٹیشن پر آ گئی۔ چند مسافروں کے چڑھتے اُترتے ہی گاڑی کی روانگی کی گھنٹی بجی۔

عین اسی وقت ہاتھ میں بیگ لٹکائے ، ادھیڑ عمر کے ایک موٹے تازے شریف آدمی دوڑ کر پلیٹ فارم پر آئے۔ مگر ان کی دوڑ دھوپ رائیگاں گئی۔ سیٹی بجاتے بجاتے انجن دیوتا دھک دھک کر کے بھاگنے کیا لگے۔ گویا بابو صاحب کو طعنے دینے لگے۔ بابو صاحب کھڑے کھڑے اس دوڑتی ہوئی گاڑی کو دیکھتے رہ گئے۔

گاڑی نکل گئی تو بابو صاحب بحالت مجبوری پھر واپس پھاٹک کیطرف بڑھے۔ وہاں پر ہاتھ میں گول لالٹین لئے سٹیشن کا چھوٹا بابو مسافروں کے ٹکٹ لے رہا تھا۔ ہمارے بابو صاحب اس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ جب سب مسافر چلے گئے۔ تو انہوں نے چھوٹے بابو سے پوچھا "کیوں صاحب! اب دوسری گاڑی کب آئے گی؟"

چھوٹے بابو نے لالٹین کی روشنی میں ٹکٹ گنتے گنتے کہا "کہاں کی گاڑی؟"

"کلکتہ جانے کے لئے"

"رات کو ایک اٹھارہ پر"

ہمارے بابو صاحب دلمیں حساب لگانے لگے "ایک اٹھارہ۔ ہمارا ہُوا [illegible] چوبیس۔ ایک بجکر بیالیس منٹ۔ پونے دو سمجھو"

اتنے میں چھوٹے بابو صاحب وہاں سے غائب ہو گئے۔ ایک خلاصی پہیہ دار سیڑھی کو دھکیلتا جاتا اور اوپر چڑھکر پلیٹ فارم کی لالٹینیں بجھا رہا تھا۔ بابو صاحب آہستہ آہستہ گیٹ سے نکلکر سیڑھیاں طے کر کے نیچے جا کھڑے ہوئے سامنے دیکھا تو پاس ہی ایک حلوائی کی دکان پر دیا ٹمٹما رہا ہے ——— اس کے بعد جدھر دیکھو۔ اُدھر ہی تاریکی ہے گاؤں بھی سٹیشن سے ایک کوس کے فاصلے پر ہوگا۔ اور اور گاؤں تو اس سے بھی دور ہیں۔ راستے کے دونوں طرف گھنے پیڑ اور جنگل ہیں۔ اس جنگل میں جھینگر کا خوفناک شور ہو رہا ہے۔ بیچ بیچ میں گیدڑوں کا ہُوا ہُوا بھی سنائی دیتا ہے۔

---

[1] جمع سے کلکتہ میں سٹینڈرڈ ٹائم نہیں ہے اسلئے دیگر مقامات کے ٹائم سے وہاں چوبیس منٹ کا فرق رہتا ہے۔

وہاں کھڑے کھڑے بابو جی نے محسوس کیا۔ اگر کچھ کھاپی کر پیٹ کی پوجا نہ کی جائیگی۔ تو رات کیسے کٹیگی۔ جن کے ہاں گئے تھے۔ وہاں اگرچہ شام کو ناشتہ کچھ زیادہ مقدار میں کرلیا تھا۔ اور اس ناشتے کی تیاری میں دیر ہونے سے ہی گاڑی نکل گئی۔ اور یہ مصیبت نازل ہوئی ہے ۔۔۔ تاہم ناشتے کی مقدار اس قدر زیادہ کہاں تھی۔ کہ پیٹ رات بھر کچھ شکایت نہ کرے۔ حلوائی کی دکان موجود ہے۔ یہی غنیمت ہے۔ ورنہ آدھے پیٹ رہ کر ہی رات گذارنی پڑتی۔ یہی سوچتے ہوئے بچلیرے بابو صاحب حلوائی کی دوکان کے آگے جا کھڑے ہوئے۔

بوڑھا حلوائی چشمہ لگائے رامائن پڑھ رہا تھا۔ اس نے کہا "آئیے سرکار۔ بیٹھئے" دوکان کے اندر دیوار سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا بنچ پڑا تھا۔ اس پر بیٹھکر بابو نے پوچھا "کیا کیا ہے"؟

حلوائی: "آپ کو کون چیز چاہیئے؟ رس گلہ ہے۔ سندیش ہے۔ کچوری ہے۔ پوریاں ہیں۔ سنگھاڑے ہیں۔ آج ہی بھونے ہیں"

بابو جی کو جو چیزیں پسند تھیں۔ لیکر پیٹ پوجا کرنے لگے۔

اس موقعہ پر آپ کے حالات سے ناظرین کو آگاہ کر دینا ہمارا فرض ہے۔ انہیں مزے سے کھانا کھانے دیجئے۔ اس وقت تک ان کا حال سنئے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کیلئے ہمیں بہت محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ صرف نام بتا دینا ہی کافی ہوگا۔ کیونکہ آپ کے اشتہار کے مطابق "اردو زبان کے علم ادب میں آپ کا از سر نو تعارف کرانا بالکل غیرضروری ہے۔" اردو زبان کے جاننے والوں نے آپ کے قلم سے نکلا ہوا کوئی نہ کوئی جاسوسی ناول ضرور پڑھا ہوگا۔ خود نہ پڑھا ہو۔ تو گھر میں پوچھ دیکھئے۔ کسی نہ کسی نے پڑھا ہوگا۔

آپ کا اسم گرامی ہے "بابو گوبردھن دت" کلکتہ میں رہتے ہیں۔ اس اسٹیشن سے دو کوس پر ایک گاؤں ہے وہاں کے کسی شریف آدمی کی بیٹی کے ساتھ ان کے بھتیجے کا بیاہ ہونے کو ہے۔ آج دن کے تین بجے یہ کلکتے سے آئے تھے لڑکی دیکھکر آٹھ بجکر چوبیس منٹ والی گاڑی سے واپس جاسکتے۔ تو پونے دس بجے کلکتے پہنچ جاتے۔ اور گرماگرم پوریاں۔ کئی طرح کی ترکاریاں۔ تازہ پکائی ہوئی روہو مچھلی۔ اور بطخ کے انڈے کے قلئے وغیرہ پر ہاتھ صاف کرتے۔ کھاپی کر کپڑا اوڑھ کر خواب راحت کی آغوش میں چلے جاتے۔ مگر ہونی کو کون مٹا سکتا ہے؟

باسی کچوریوں اور ردی رس گلوں وغیرہ سے کسی طرح پیٹ بھر کر گوبردھن دت نے ہاتھ دھو ڈالے۔ اور کلی کرلی حلوائی سے پوچھا "تمہاری دکان کب تک کھلی رہتی ہے"؟

"یہی تو ساڑھے نو بجے تک"

"اس کے بعد"؟

دکان بڑھا کر شام کا کھانا کھانے جاتا ہوں۔ اور پھر چارپائی کی پناہ لیتا ہوں"۔

گوبردھن دت نے بیگ اٹھالیا۔ حلوائی نے پوچھا: "تو بابو صاحب سٹیشن پر جا بیٹھے گا؟"

"اور کیا کریں؟" یہ کہکر گوبردھن دت پھر سٹیشن پر پہنچے +

(۲)

سنگرام پور چھوٹا سا سٹیشن ہے۔ ایک ہی کمرے میں تار گھر ٹکٹ گھر وغیرہ سب کچھ ہے سٹیشن پر وٹینگ روم تک نہیں۔ بابو گوبردھن دت نے پلیٹ فارم پر پہنچکر دیکھا کہ اس دفتر والے کمرے میں قفل پڑا ہے۔ باہر کمبل اوڑھے ایک خلاصی بیٹھا بیٹھا انگڑائیاں لے رہا ہے۔ صرف ایک لالٹین جل رہی ہے۔ اس کی بھی بتی بہت ہی کم کر دیگئی ہے۔

گوبردھن دت نے اس خلاصی سے پوچھا "بابو کہاں ہیں"؟

"کھانا کھانے گھر گئے ہیں"

"کب تک آئیں گے"؟

"ابھی آنے کو کہہ گئے ہیں"

ایک بنچ پڑی تھی۔ گوبردھن دت اُسی پر بیٹھ گئے۔ بیگ کھول کر پان کا ڈبہ نکالا۔ سگریٹ اور دیاسلائی بھی نکالی۔ جوتے اُتار دیئے۔ بنچ پر ہی پاؤں رکھ لیئے۔ اور کپڑے کھینچ تان کر پیروں کو ڈھانپ لیا۔ پھر پان چبانے اور سگریٹ کشی کرنے لگے۔

چاروں طرف میدان ہے۔ سرسر ہوا چل رہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں گوبردھن بابو کو سردی لگنے لگی۔ کہاں تو اسوقت مکان کے دروازے اور دریچے بند کرکے مزے سے پلنگ پر رضائی اوڑھکر سو رہنا اور کہاں کھلے میدان کی یہ تکلیف۔ نہ کنیا دیکھنے آتے۔ اور نہ اس مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا۔ لڑکی کے والدین نے ناشتے کی تیاری میں غیر ضروری آڈمبر کرکے دیر کردی جس سے گاڑی نکل گئی۔ چنانچہ گوبردھن دت پہلے انہی پر ناراض ہوئے۔ پھر اپنی بیوہ بھاوج پر خوب بگڑے۔ لڑکا بیاہنے میں کیوں وہ ایسی جلدی کرتی ہے؟ گوبردھن نے کہا تھا۔ اب کے رہنے دو۔ اگلے سال دیکھا جائیگا ــــ مگر اس نے مانا ہی نہیں! بہو آتے ہی کیا چتر بھج (چار بانہوں والا) کر دے گی؟ بچپن کی شادی پر بھی بابو جی کو غصہ آگیا جاڑے کے مارے کانپتے کانپتے انہوں نے عہد کیا۔ اب کی بار ایک نئی قسم کا عمدہ ناول تصنیف کرونگا۔ جس میں بچپن کے بیاہ کی خوب مٹی پلید کی جائے گی +

اب ذرا دیر میں سیڑھیوں پر کسی کے جوتوں کی آہٹ ملی۔ پلیٹ فارم پر ذرا سا اُجالا بھی ہوا۔ ہاتھ میں لالٹین لئے چھوٹے بابو صاحب تشریف لائے۔ دفتر کھولا اور اندر جاکر کواڑ بند کر لئے۔

کچھ دیر تک اور گوبردھن دت ٹھنڈ میں بیٹھے سکڑتے رہے۔ آخر کار انہوں نے ہار مان کر ذرا سا کواڑ کھولا۔ اور کہا "سٹیشن ماسٹر صاحب! اپنے دو بجے والی گاڑی کے لئے تو ابھی بہت دیر ہے۔ باہر جاڑا لگتا ہے۔ کیا میں اندر بیٹھ سکتا ہوں؟" بابو سٹیشن ماسٹر نہیں ہے بلکہ اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر ہے۔ اس بات کو گوبردھن دت جانتے تھے۔ مگر

اُسے خوش کرنے کی غرض سے ہی اُنہوں نے ایسا کہا تھا۔

چھوٹا بابو۔" ہاں ہاں آئیے۔ خوشی سے تشریف رکھیئے۔"

اندر جاکر گوبردھن دت ایک ٹوٹی سی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اب اُنہوں نے بخوبی دیکھ لیا۔ کہ چھوٹے بابو کی عمر چالیس برس سے اُوپر ہے۔ سفید زین کے پتلون پر موٹا گرم کوٹ پہن رکھا ہے۔ موٹے موٹے گول گول بوتاموں پر کچھ انگریزی میں لکھا ہے۔ تار کے آلے کے پاس بیٹھے کھٹ کھٹ کرکے کام کر رہے ہیں۔

گوبردھن دت جہاں بیٹھے تھے۔ وہاں قریب ہی ایک لمبی سی میز پڑی تھی۔ اس پر بڑی سی لالٹین رکھی تھی۔ لائن کلیر کا رجسٹر اور رجسٹر اور کاغذ پتر پھیلے پڑے تھے۔ ٹین کی ایک گونددانی رکھی تھی۔ دوسرے کونے پر اس سٹیشن کے نام کی مُہر اور چھاپنے کی سیاہی کا پیڈ رکھا تھا۔ رول پنسل۔ قلم اور دوات بھی تھی۔

تار کے کام سے فراغت پاکر چھوٹے بابو نے گوبردھن دت کی طرف دیکھکر جمائی لی۔ پھر کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ پیٹھ کی طرف کرکے انگڑائی لی۔ اس کے بعد ایک دراز کھول کر اس میں سے ایک کتاب نکالی۔ اور روشنی کے پاس بیٹھکر پڑھنا شروع کردیا۔ گوبردھن نے ذرا اونچی گردن کرکے دیکھا۔ انہی کی تصنیف کردہ "خوفناک خون" ناول ہے۔

گوبردھن دت کوئی نئے مصنف نہیں ہیں۔ نہ ایسے مصنف بھی نہیں۔ جن کی تصنیف کردہ کتب کا آدھا رسول المارنیو میں بند پڑے رہنے سے دیمک کو کرنا پڑتا ہو۔ پھر بھی شہروں سے دور اس چھوٹے سے مقام میں اپنی لکھی ہوئی کتاب پڑھنے میں ایک شخص کو اسقدر محو دیکھکر ان کا دل خوشی سے لبریز ہوگیا۔ جاڑا معلوم نہیں کہاں بھاگ گیا۔

چھوٹا بابو سٹرا سٹر صفحے اُلٹتے پڑھتا جاتا تھا۔ گوبردھن دت ٹکٹکی باندھے اس کا منہ دیکھ رہے تھے۔ خودستائی سے ان کا سینہ معمور تھا۔ وہ دل میں کہنے لگے:" اشتہار میں جو یہ لکھتا ہوں۔ کہ ایک بار کتاب ہاتھ میں لیتے ہی بھوک پیاس اور نیند بھاگ جاتی ہے۔ کتاب ختم کئے بغیر اٹھنے کو جی نہیں چاہتا ——" تو یہ بات جھوٹ تھوڑا ہی ہے؟

کچھ وقت اور اسی طرح گذرا۔ اب اس عقیدت مند ناظر کو اپنا نام ونشان بتانے کے لئے گوبردھن دت بے حد بیتاب ہو اُٹھے۔ اُنہوں نے سوچا میں ایک پرانا دُھسّہ اوڑھے، کیچڑ اور مٹی سے لت پت جوتا پہنے۔ بالکل ہی سیدھے سادھے آدمی کی طرح بیٹھا ہوں۔ جب انہیں میرا حال معلوم ہوگا۔ یہ چونک اُٹھیں گے۔ اس کے بعد لوگوں سے بڑے گھمنڈ کے ساتھ کہا کریں گے۔ کہ ایک مرتبہ جاسوسی ناولوں کے مشہور مصنف بابو گوبردھن دت سے ملاقات ہوئی تھی۔ اتنی سادگی سے رہتے ہیں۔ کہ یقین نہیں ہوتا۔ کہ یہی بابو گوبردھن دت ہیں۔ بہت ہی اعلیٰ خیالات کے آدمی ہیں۔"

—— تو پھر پہلے میں ہی کیوں نہ ان کا نام ونشان پوچھوں۔ ایسا کرنے پر یہ بھی میرا نام وغیرہ پوچھیں گے۔

اونچی گردن کرکے بابو گوبردھن دت نے دیکھا۔ چھوٹا بابو تئیسواں باب پڑھ رہا ہے۔ جہاں مشہور ڈاکو مرزا بیگ پندرہ سالہ حسینہ ہیروئن نُبل بالا کو اس کے میکے سے آدھی رات کو ڈاکہ ڈال کر لے بھاگا ہے —— یہ باب خاص طور

دلچسپ ہے۔ اسلئے چھوٹے بابو کا لطف بگاڑنے کو اُن کا جی نہ چاہا۔ وہ باب پورا ہوتے ہی گوبردھن دت نے پوچھا۔
"کیا میں آپ کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"
بابو نے کتاب پر نگاہ جمائے ہوئے ہی جواب دیا "بیرندر ناتھ داس گھوش"
اس کے بعد چوبیواں باب شروع ہو گیا۔
گوبردھن دت بھی ایسے آدمی نہیں۔ جو آسانی سے پیچھا چھوڑ دیں۔ پھر پوچھا "آپ کا دولت خانہ؟"
بابو نے پہلے کی طرح جواب دیا "ہگلی کے پاس"
"کس گاؤں میں؟"
"شکر پور" کہکر بابو نے چوبیویں باب کا دوسرا ورق اُلٹا۔
گوبردھن دت نے اپنے دل میں کہا "کہاں کا گنوار ہے!" بظاہر بولے "آپ کا نام و پتہ وغیرہ پوچھا ہے اس سے آپ ناخوش تو نہیں ہوئے؟ آج کل دوسرا زمانہ ہے۔ انگریزی فیشن کے مطابق یہ باتیں بے ادبی میں داخل ہیں۔ مگر ہم تو بوڑھے پرانے آدمی ہیں۔ ان باتوں کا خیال نہیں کرتے۔ ناراض نہ ہو جئے گا"
بابو نے ان کی طرف ایک نظر دیکھ ذرا سا مسکرا کر کہا "نہیں"
اپنا نام و نشان بتانے کی سہولیت نہ پا کر گوبردھن دت بڑی اُداسی سے چھت کی کڑیاں شمار کرنے کی کوشش کرنے لگے ـــ مگر وہاں کڑیاں تھیں ہی کہاں؟ وہاں تو ڈاٹ کی پکی چھت تھی۔
چھوٹے بابو نے کتاب پڑھ ڈالی۔ اسوقت آدھی رات ہو چکی تھی۔ کتاب کو بند کر کے اُنھوں نے لمبی سانس لی۔ کوئی ایک منٹ تک وہ سامنے والی دیوار کو ٹکی ہوئی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد گوبردھن دت کی طرف پلٹ کر کہا "آپ اسی وقت سے بیٹھے ہیں؟"
"اور کرتا ہی کیا؟"
"تب تو آپ کو بڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔ پان کھائیے"
جیب سے پان کا ڈبہ نکال کر بابو صاحب کے آگے رکھدیا۔ پان لگا کر گوبردھن دت نے سوچا ـــ "ہائے! یہ نہیں جانتا کہ جسے بیڑا دیا ہے وہ کون ہے اور کتنا بڑا آدمی ہے؟
چھوٹے بابو نے کہا ـــ "معاف کیجئے گا جناب ـــ آپ یہاں تین گھنٹے سے بیٹھے ہیں۔ اور میں نے آپ کی کچھ بھی خاطر تواضع نہیں کی۔ اس کتاب کے پھندے میں پڑ کر مجھے بیرونی دُنیا کی خبر ہی نہ رہی تھی۔ آپ کہاں سے آرہے ہیں؟ اور آپ کا اسم مبارک؟
"گوبردھن" بابو نے کہا "آیا تھا کلکتے سے ـــ پاس ہی کے ایک گاؤں میں اپنے بھتیجے کے بیاہ کے لئے لڑکی پسند

کرنے گیا تھا۔ میرا نام گوبردھن دت ہے"!

نام سنتے ہی چھوٹے بابو نے اس ناول کے سرورق کو ذرا اُجالے میں غور کے ساتھ دیکھا۔ اور پھر کتاب کو میز پر رکھکر گوبردھن دت پر نگاہ ڈالی۔۔۔ ناول کے سرورق کو وہ پھر دوبارہ دیکھنے لگا۔

ان کی یہ حالت دیکھکر گوبردھن دت نے ہنس کر کہا۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں"؟

بابو نے پس و پیش کے ساتھ کہا۔ "جناب۔۔۔ کیا آپ۔۔۔ ہی۔۔۔ نے۔۔۔ یہ کتاب۔۔۔"

گوبردھن بابو نے ناواقف آدمی کی طرح پوچھا۔۔۔ "کون سی کتاب"؟

"خوفناک خون"

"جی ہاں۔۔۔ وہ میری ہی لکھی ہوئی ایک کتاب ہے"

چھوٹے بابو نے کہا۔۔۔ "ہیں!۔۔۔ آپ ہی!۔۔۔ آپ ہی بابو گوبردھن دت ہیں؟ آپکے ساتھ جیسا سلوک ہؤا ہے۔ وہ بہت ہی بے جا ہے۔ رام رام! مجھے سخت افسوس ہے"!

گوبردھن نے کہا۔ "نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ کچھ بے جا نہیں ہے۔ آپ نے کیا ہی کیا ہے"؟

"بے جا اور ہو گا ہی کیا۔۔۔ آپ یہاں تین گھنٹے سے بیٹھے ہیں۔ اور میں نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آپ کون ہیں آپ کو کچھ تکلیف تو نہیں ہے۔۔۔ میں کتاب کے مطالعہ میں بالکل ہی محو ہو گیا تھا۔ بے جا کیوں نہیں ہؤا۔ سراسر بے جا ہؤا ہے"

"نہیں۔ کچھ بے جا نہیں ہے۔ میری کتاب پڑھنے میں آپ اسطرح محو ہو گئے۔ یہ میرے لئے فخر کی بات ہے۔ آپنے میری اور کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں"؟

"اور تو میں نے آپ کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ہاں آپ کی بہت سی کتابوں کے اشتہار البتہ دیکھے ہیں۔ اب ایک ایک کتاب منگوانے کا خیال ہے۔ آج بھی یہ کتاب پڑھنے کیلئے کہاں رکھی تھی۔ یہ تو کسی مسافر کی رہ گئی ہے۔ پانچ بجے والی گاڑی سے کلکتے سے آیا تھا۔۔۔ مسافروں کا ٹھٹھ تھا۔ باہر پلیٹ فارم پر وہ جو بنچ پڑی ہے۔ اسی پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ان کے چلے جانے پر دیکھا۔ بنچ کے نیچے یہ کتاب پڑی ہے۔ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ الگ رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اچھا صاحب! ایک بات بتائیے۔ یہ سب باتیں سچی ہیں۔ یا آپ کی من گھڑت ہیں"؟

اب جاں بلب ہو تو شائد یہ کہنا ہو گا کہ انگریزی ناول سے "اس کا ذکر کئے بغیر ہی" ترجمہ کیا ہے۔ واسطے گوبردھن بابو نے ٹال مٹول کر کے کہا۔۔۔ "یہ میری اپنی تصنیف ہے"

"تو صاحب آپ کا دماغ خوب اڑان بھرتا ہے! عجب مہارت ہے! اگر آپ پولیس کے محکمے میں ہوتے

تو بڑے زبردست جاسوس ہوتے۔ ہاں۔ ابھی یاد آئی آپ آ گئے۔ اچھا ہی ہوا۔ ایک بات پوچھتا ہوں۔ اس کتاب میں مجھے ایک عجیب چٹھی ملی ہے۔ میں کچھ زیادہ نہیں سمجھ سکا۔ لیجئے۔ آپ پڑھیئے"!

یہ کہکر دراز میں سے انہوں نے چٹھی نکال کر گوبردھن بابو کو دی۔

بیگ میں سے چشمہ نکالکر انہوں نے لگالیا۔ اور اُجالے میں چٹھی پڑھنا شروع کیا۔۔۔

"بھائی کنج!

کچھ خبر بھی ہے۔ منگل وار کی رات کو غنیم کے قلعہ پر حملہ ہوگا۔ تم لاؤ لشکر لے کر پانچ بجے والی گاڑی سے آجانا۔ دیکھنا کہیں بھول نہ جانا۔ یہاں سب لوگ جمع ہوں گے۔ شام کے بعد ہی سب لوگ کوچ کر دیں گے۔ رات کے دس بجے جنگ چھڑ جائے گی۔ فتح حاصل کر کے تم لوگ رات کو ہی تین بجے والی گاڑی سے لوٹ سکتے ہو"

تمہارا

نتائی"

چٹھی پڑھکر گوبردھن دت نے سوچا۔ یہ سودیشی ڈکیتی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اُنہوں نے پوچھا"آپ نے ان کا گروہ دیکھا ہے"؟

"جی ہاں"

"کتنے آدمی تھے"؟

"کوئی بیس آدمی ہوں گے"۔

"ان کی کیا عمر ہے؟ چہرہ مہرہ کیسا ہے"؟

"پندرہ سولہ سال سے لیکر بیس برس تک تو ان کی عمر ہے۔ چہرے بھرے ہوئے ہیں۔ سبھی ہٹے کٹے ہیں۔ خوب چہل پہل مچا رکھی تھی ہنسی دل لگی کرتے گئے ہیں"؟

"سبھی شریف گھرانوں کے لڑکے ہیں"؟

"جی ہاں۔ خوب بھڑکیلی پوشاک پہنے ہیں۔ کوئی کوئی سنہرے فریم کا چشمہ لگائے ہے"۔

"کس درجہ کا ٹکٹ لے کر آئے تھے"؟

"انٹر کا"

"سنگل یا ریٹرن"؟

"ریٹرن"

"اچھا ذرا ان کے ٹکٹ تو نکالئے"!

چھوٹے بابو نے دراز کھول کر ٹکٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ اس میں سے سرخ رنگ کے آدھے آدھے ٹکٹ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بابو گوبردھن دت کے آگے رکھ دیئے۔ گوبردھن دت نے گن کر دیکھا۔ کل اٹھائیس ہیں۔ ہر ایک ٹکٹ کلکتہ سے لی گئی ہے۔ نمبر بھی سلسلہ وار ہیں۔ پاکٹ بک میں بابو گوبردھن دت نے ٹکٹوں کے نمبر اور ان کے چیک کیئے جانے کے نشان وغیرہ نوٹ کر لیئے۔ اس کے بعد بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "سودیشی ڈکیتی!"

چھوٹے بابو نے کہا "ایں! سودیشی ڈکیتی! ڈاکہ؟ آپ فرماتے کیا ہیں؟"

"صاف سودیشی ڈکیتی۔ آپ کے پاس (Magnifying Glass) ہے؟"

"جی نہیں۔ کیوں۔ کس لیئے؟"

چٹھی پر ایک جگہ کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے گوبردھن بابو نے کہا۔ "یہ دیکھئے۔ لفافہ پر جو مہر لگائی گئی تھی اسی کا سادہ نشان چٹھی پر آ گیا ہے جو Magnifying Glass ہوتا۔ تو اسکی مدد سے مہر کو پڑھ سکتے۔"

چھوٹے بابو نے چشمہ لگا کر نشان کو پڑھنے کی کوشش کی۔ بالآخر کہا۔ "کچھ پڑھا نہیں جاتا۔"

بابو گوبردھن دت اس کانچ کی لالٹین کے دروازے کو کھول کر اندر کچھ ڈھونڈھنے لگے۔ آخرکار کاغذ کے ٹکڑے سے لالٹین کے اندر ایک جگہ گھسنے لگے۔ کاغذ میں سیاہی لگ گئی۔ پھر باہر نکال کر اس پر بابو گوبردھن دت نے دو ایک بار پھونک لگائی۔ اور چٹھی کے اس مقام پر جہاں مہر کا نشان تھا ہلکے ہاتھ کے ساتھ رگڑ دیا۔ چھوٹا بابو بڑی حیرت کے ساتھ یہ کارروائی دیکھتا رہا۔

مہر کا بخوبی معائنہ کر کے بابو گوبردھن دت نے سنجیدگی کے انداز سے کہا۔ "آج ہی ۹ بجے والی ڈیلیوری سے بہو بازار ڈاک خانہ سے یہ چٹھی تقسیم ہوئی ہے۔" انہوں نے وہ چٹھی چھوٹے بابو کو دی۔ چھوٹے بابو نے اسے روشنی میں دیکھا۔ کالی زمین پر سفید حروف A Z A OW اس کے نیچے۔ 9A اس کے نیچے UJ 5 اُٹھ آئے ہیں۔ گوبردھن دت کو چٹھی واپس دے کر چھوٹے بابو نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ "دھنیہ ہے آپ کی ہوشیاری کو! آپ میں جو یہ کرامات نہ ہوتی تو آپ ایسے ایسے ناول لکھ ہی کیسے سکتے؟"

بابو گوبردھن دت نے کہنا شروع کیا۔ "ان ڈکیتوں میں کم از کم ایک شخص جس کا نام کنج ہے — بہو بازار کے آس پاس رہتا ہے۔ گروہ کا ایک آدمی نتائی پہلے آیا تھا — جو دیکھنا سننا تھا۔ جو خبر لینی تھی۔ سب کا مناسب انتظام کر کے اُس نے یہ چٹھی لکھی ہے۔ یہیں — قریب ہی — کسی مقام کے کسی مالدار آدمی کے گھر آج رات کے دس بجے انہوں نے ڈاکہ ڈالا ہے — علی الصبح تین بجے والی گاڑی سے وہ لوٹ جائیں گے۔"

اسی وقت کلکتہ والی گاڑی آ گئی۔ اُسے 'پاس' کرنے کے لئے چھوٹا بابو لالٹین لے کر جلدی جلدی دوڑا۔

(۴)

گوبردھن دت اکیلے بیٹھے بیٹھے سوچنے لگے " جیسے بھی ممکن ہو۔ ان ڈاکوؤں کو گرفتار کرنا چاہئے۔ اگر کسی طرح انہیں پکڑ سکوں۔ تو سرکار میں میری خوب ناموری ہوگی۔ اور ممکن ہے " رائے بہادر" کا خطاب بھی مل جائے۔ رائے بہادر بننے کی گوبردھن دت کی ایک عرصہ سے آرزو ہے۔ ناول لکھ لکھ کر انہوں نے روپیہ تو خوب پیدا کیا ہے۔ مگر لٹریری فیلڈ میں ان کی ویسی عزت نہیں ہوتی۔ انہوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں۔ ان سے آدھی سے بھی آدھی جنہوں نے نہیں لکھی ہیں اور جن کی کتابیں الماریوں میں ہی سڑا کرتی ہیں۔ سال بھر میں صرف دس بیس ہی جلدیں بک جاتی ہیں ــــــ ان کی کسقدر عزت ہے۔ کتنی خاطر ہے! متقدر رسائل میں ان کی زندگیوں کے حالات اور تصویریں شائع ہوتی ہیں۔ کئی جلسوں کے صدر ہوکر وہ لمبے چوڑے لکچر دیتے ہیں۔ اور تعریفیں لوٹتے ہیں۔ مگر گوبردھن دت کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ ان کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ بابو گوبردھن دت کہتے ہیں کہ اس کی ایک ہی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ محض مصنف ہی نہیں ہیں ــــــ لٹریری فیلڈ میں تو یہ مصنف ہیں۔ اور دوسری جگہ کہیں اعلیٰ عہدوں پر سرافراز ہیں۔ اسی وجہ سے بہت عرصہ سے ان کے جی میں آتا ہے کہ اگر کسی موقعہ پر وہ " رائے بہادر" یا کم از کم " رائے صاحب" ہی بن سکیں۔ تو ان کے کورے مصنف ہونے کا کلنک کا ٹیکہ دھل جائے ــــــ سوسائٹی میں جو عزت ہونی چاہئے۔ وہ ہونے لگے۔ گوبردھن بابو نے دل میں کہا کہ یہی وہ موقعہ ہوگا ــــ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو بھگوان میری ہی تصنیف کردہ کتاب میں جڑ بنیاد کے طور پر اس چٹھی کو رکھ کر بھیجتے ہی کیوں؟

گاڑی نکل گئی۔ مسافروں سے ٹکٹ لیکر چھوٹا بابو دفتر میں لوٹ آیا۔ پاکٹ سے ڈبہ نکال کر چھوٹے بابو نے بیڑا اٹھایا اور گوبردھن دت کو بھی دیا ــــ پاس والی کرسی پر بیٹھکر انہوں نے کہا " معلوم نہیں آج کس کے سر پر تباہی آئی ہوگی؟"

بابو گوبردھن دت بولے " دیکھئے صاحب۔ آج ان ڈاکوؤں کو پکڑنا ہوگا!"

" کون پکڑے گا"؟

" آپ اور میں "

" میں؟ بے موت مرجاؤں گا! ــــــ ان لوگوں کے پاس ریوالور ہیں کھوپڑی نہ اڑا دیں گے؟"

بابو گوبردھن دت نے ہنس کر کہا ــــ " نہیں صاحب۔ اب ان کے پاس ریوالور نہیں ہیں۔ وہ لوگ تو کسی جگہ اپنے ہتھیار اور سامان اسلحہ چھپا کر یہاں آدیں گے "

" پھر بھی انہیں پکڑ لینا آسان کام نہیں ہے انیس بیس آدمی ــــ!"

" جھگڑا کر کے انہیں تھوڑا ہی پکڑنا ہے۔ حکمت عملی سے کام لینا ہے "

" اس کے بعد کیا کیا جاویگا "؟

"پھر پولیس کو بلا کر انہیں اسکے حوالے کر دیں گے"

"اس کے بعد؟"

"پھر ان لوگوں کو بڑے گھر کی ہوا کھلائی جائے گی"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد اور کیا"

"ان کی پارٹی کے جو اور اور آدمی ہوں گے وہ آپ کو اور مجھے کتے کی موت مار ڈالیں گے"

یہ بات سُنکر بابو گوبردھن دت کے دل میں خوف کے جذبے نے سرایت کی۔ تھوڑی دیر وہ کچھ سوچتے رہے۔ آخرکار رائے بہادری کی ترغیب کی ہی فتح ہوئی۔ اُنہوں نے کہا:-

"آپ فرماتے کیا ہیں بابو صاحب؟ کیا ہم کسی رانڈ کے راج میں رہتے ہیں۔ جو کتے کی موت مار ڈالے جائیں گے۔ اس کام میں اگر ہمیں کامیابی ہوگی۔ تو گورنمنٹ ایسا انتظام کر دیگی جس میں ہمارا کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ اس کام میں اگر لاکھ روپے بھی خرچ ہونگے۔ تو بھی پس و پیش نہ کی جائے گی۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔ آئیے اس کام میں میری مدد کیجئے دیکھئے یہ سودیشی ڈاکو ملک کو کس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں۔ غریب آدمیوں کو تباہ کئے ڈالتے ہیں — کیا اسی کو دھرم کہتے ہیں۔ کیا یہی حب الوطنی ہے؟ ان لوگوں کے کام میں اڑنگا لگانا۔ ان سے مناسب بدلہ لینا ہر ایک راج بھگت مرد اور عورت کا فرض ہے"

چھوٹا بابو سر میں ہاتھ لگائے بیٹھا رہا۔ اس نے کچھ بھی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر تک جواب کا انتظار کرنے کے بعد گوبردھن دت نے کہا:- "کہئے۔ میری مدد کیجئے گا؟"

چھوٹے بابو نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بابو صاحب مجھے معاف کیجئے میں عیالدار۔ غریب آدمی ہوں۔ مجھ سے یہ کام نہ ہوگا۔ مجھے بچائیے!"

"میں بھلا کیا بچاؤں گا؟ اگر آپ میری مدد نہ کریں گے۔ تو میں تنہا ہی جو بنے گا کرونگا۔ مگر یہ جگہ میرے لئے پرائی ہے۔ میں یہاں سے ناواقف ہوں۔ میں اکیلا ہوں۔ بھلا کر ہی کیا سکوں گا؟ سوچئے۔ میری مدد نہ کرنے سے آپ کا بچاؤ کس طرح ہو سکتا ہے۔ جب گورنمنٹ کو معلوم ہوگا۔ کہ آپ نے میری امداد نہیں کی۔ اس لئے ڈکیت گرفتار نہیں ہو سکے تو آپ کے بارے میں کیا سوچا جائے گا؟ یہی نا کہ آپ بھی اُن سے ملے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کو نکل بھاگنے کا موقعہ دیدیا — گرفتار نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ آپ کو سزائے قید بھی ہو سکتی ہے"

یہ کہکر گوبردھن دت بغور چھوٹے بابو کے چہرے کو دیکھکر اس کے دلی جذبات تاڑنے کی کوشش کرنے لگے۔

چھوٹے بابو نے غیر متوقع طور پر اُٹھکر گوبردھن بابو کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور اُن سے گڑگڑا کر کہا "آپ بڑے

آدمی ہیں۔ مہاتما ہیں۔ ناول نویس ہیں ___ رحم کیجئے مجھ غریب پر ___ اگر کسی بات کی ضرورت ہو تو مجھے حکم دیجئے ___ آپ کا جو ارشاد ہو۔ پوشیدہ طور سے اُسے بجا لانے کے لئے میں تیار ہوں بکھلم کھلا میں کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔"

اُٹھیے! اُٹھیے!! کہکر گوبردھن نے چھوٹے بابو کو ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ انہیں سمجھایا "اچھا جو آپ اس قدر ڈرتے ہیں۔ تو جانے دیجئے۔ جو ممکن ہوگا میں اکیلا ہی کروں گا۔ اچھا سنیئے "

بابو گوبردھن دت سوچنے لگے۔ اگر یہ امداد کرے۔ تو بھی کام فتح ہوتے پر فخر و شہرت میں شریک نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا "اچھا یہاں پاس ہی کوئی ایسا مکان بھی ہے جہاں وہ سب کے سب رو کے جاسکیں"؟

چھوٹا بابو "جی ہاں ۔ ہے۔ بہت اچھی جگہ ہے "

"کہاں"؟

" باہر چلیئے دکھادوں "

چاند ابھی طلوع ہؤا ہی تھا۔ بابو گوردھن دت کو پلیٹ فارم کے ایک کنارے سے جاکر چھوٹے بابو نے کہا۔

" یہ جو بڑا مکان ہے۔ یہ رالی برادرس کا گودام ہے۔ چاول بھرنے کے لئے ابھی حال ہی میں تعمیر کرایا گیا ہے۔ یہ چالیس فٹ لمبا اور پچیس گز چوڑا ہے خالی پڑا ہے۔ ابھی یہاں رالی برادرس کی آڑھت کا کام شروع نہیں ہؤا۔ اگر کسی طرح حکمت عملی سے اس گروہ کو اس کے اندر لایا جائے۔ اور باہر کا پھاٹک بند کر کے قفل لگا دیا جائے۔ تو بس پھر کام بن گیا۔ جب تک پولیس نہ آوے گی۔ وہ لوگ یہیں پھنسے رہیں گے "

گوبردھن دت نے کہا "مہربانی کر کے اپنی لالٹین تو لے آئیے۔ روشنی میں مکان کو اچھی طرح دیکھ لوں"

چھوٹا بابو لالٹین لینے چلا گیا۔ گوبردھن دت اسی جگہ اندھیرے میں کھڑے کھڑے تدبیر سوچنے لگے۔

لالٹین آگئی۔ تو دونوں نے اس گودام کو دیکھا۔ صرف ایک دروازہ ہے۔ اور چھت کے پاس ہوا کی آمد و رفت کے لئے دو کھڑکیاں اسطرف ہیں اور دو اُسطرف۔ ان میں ابھی کواڑ نہیں لگائے گئے۔ گوبردھن دت نے دیکھا۔ کہ وہ کھڑکیاں نیچے سے کوئی بیس فٹ کی بلندی پر ہیں۔ چنانچہ وہاں سے بھاگنے کا کوئی امکان نہیں۔ دیکھ بھال کر انہوں نے گودام کو پسند کر لیا گودام سے باھر نکل کر بابو گوبردھن دت نے دروازے کو بغور دیکھا۔ کواڑ مضبوط سال کے دلدار تختوں کے ہیں مضبوط کیلے لگائے گئے ہیں۔ دوہری زنجیریں ہیں۔ ایک نیچے اور ایک اوپر۔ مضبوطی میں رتی بھر بھی شک نہیں یہیں آسانی سے توڑ کر کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا۔

چھوٹے بابو نے کہا "ریل کا پکا قفل ہے۔ چلیئے آپ کو دکھادیں "

" چلیئے۔ اور سامان بھی تو چاہئے۔ دفتر میں بیٹھکر صلاح مشورہ کریں گے "

لوٹتے وقت راستے میں چھوٹے بابو نے عجز و انکسار کے لہجے میں کہا "دہائی ہے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے

پاتے۔ کہ میں اس معاملے میں آپ کی مدد کر رہا ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔ آپ بے کھٹکے رہیں۔"

دفتر میں کوئی گھنٹہ بھر تک صلاح ہوتی رہی۔ اتنے میں پونے دو بجے والی گاڑی آئی اور چلی گئی ۔

(۵)

کلکتہ کے وہ سب نوجوان اپنے ایک دوست نتائی کے بیاہ میں براتی بنکر آئے تھے۔ نتائی کا دل بہت دنوں سے کچھ کچھ ملٹری جذبات سے معمور رہے۔ مزے کیلئے جب اس نے چٹھی میں بیاہ کو "حملہ" اور اپنے سسرال کو "غنیم کا قلعہ" لکھ دیا تھا۔ اُسوقت اسے خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا ہوگا۔ کہ اسکی بدولت میں اپنے دوست احباب کو کسی مصیبت میں مبتلا کر رہا ہوں۔

جس گاؤں میں بیاہ ہوا تھا۔ وہ ریلوے سٹیشن سے دو کوس پر ہے۔ بیاہ کی رسم کی ادائیگی کے بعد جب دعوت ہو چکی۔ تو دولہا سے سب رخصت ہوئے۔ بیل گاڑی انہیں سٹیشن تک پہنچانے کے لئے تیار تھی۔ مگر نوجوانوں نے پیدل جانے کی ہی ضد کی۔ سبھی سٹیشن کیطرف چلے۔ سرکاری پکی سڑک ہے۔ کہیں راستہ بھولنے کا ڈر نہیں۔ چاندنی میں گانا گاتے ہوئے بڑے ہی مزے سے وہ راستہ طے کرنے لگے۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ جب انہوں نے سٹیشن کی لالٹین کی روشنی کو دیکھا۔ ایک نوجوان نے کہا۔ "آؤ بھائی "بھارت ہماری ماتا" گاتے چلیں۔" "بھارت ہماری ماتا!" گاتے اور ہر ایک تال پر قدم بڑھاتے ہوئے وہ دس منٹ میں سٹیشن پر پہنچ گئے

پلیٹ فارم پر جا کر دیکھا۔ کہ وہاں ایک شریف آدمی صافہ باندھے دھسّہ اوڑھے کھڑا ہے۔ ایک نے اُن سے پوچھا۔ "کیوں صاحب! گاڑی کتنی دیر میں آئیگی؟"

شریف آدمی نے سوال کیا۔ "کیا آج شام کو پانچ بجے والی گاڑی سے آپ ہی لوگ تشریف لائے تھے؟"

"جی ہاں؟"

"کلکتہ سے روانہ ہوتے وقت کیا آپ کا کوئی ساتھی وہیں رہ گیا تھا؟"

یہ نہیں کہہ سکتے۔ ہاں تین آدمی اور آنے والے تھے۔ مگر وہ آئے نہیں۔ شاید وقت پر سٹیشن پر نہ آسکے ہوں۔ کیوں؟"

شریف آدمی نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ وہ آپ ہی کے ساتھ والے ہیں۔ تین تو نہیں۔ مگر دو آدمی شام کی سات بجے والی گاڑی سے آگئے ہیں۔ اُن میں سے ایک کو بڑا زور کا بخار چڑھا ہوا ہے۔"

"کہاں ہیں ۔۔ وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"یہیں۔ رالی برادرس کے گودام میں۔ جو تندرست ہیں۔ اُنھوں نے آکر مجھ سے کہا۔" یہ مصیبت ہے۔ ذرا پناہ دیجئے گا؟" میں بھلا ٹھہرنے کو جگہ کہاں دیتا؟ اسی گودام میں ٹھہرا دیا۔ اپنے گھر سے پلنگ۔ بستر۔ رضائی۔ وغیرہ کپڑے منگوا دیئے ــــ دو تین بار دیکھ بھی آیا ہوں ــــ بڑی شدت کا بخار ہے۔ ایکسو پانچ ڈگری سے کم نہ ہوگا۔ اور پیاس؟ دس دس منٹ پر مریض پانی کے لئے چلاتا ہے۔ مریض کے ساتھی ہی سے معلوم ہوا کہ آپ لوگ رات کو تین بجے والی گاڑی سے کلکتے کو واپس جائینگے۔"

نوجوان آپس میں کہنے لگے ــ" معلوم ہوتا ہے شانتی اور تسکین ہیں۔ شانتی کو ہی بخار چڑھ آیا ہے ــــ اسی کے پیچھے پڑا ہوا ہے ملیریا۔"

شریف آدمی بولا ــ" جی ہاں۔ شانتی بابو ہی بیمار ہو گئے ہیں نام کا مجھے خیال نہ رہا تھا۔ چلئے۔ دیکھ لیجئے!

یہ کہکر وہ خود آگے ہو گیا۔ ناظرین سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ کہ یہ شریف آدمی گوبردھن دت کے سوا اور کوئی نہ تھے نوجوان کی پارٹی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ وہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ اگر بخار ہلکا ہو۔ ریل میں لے جانے کے لائق حالت ہو۔ تب تو ساتھ ہی لے چلیں گے۔ ورنہ ہم سب کو یہیں ٹھہرنا پڑے گا۔"

رالی برادرس کے گودام میں پہنچکر اس بھلے مانس نے کہا۔" اس طرف آئیے۔ یہیں ہیں۔"

دروازے کی دراز سے ذرا سی روشنی نظر آتی تھی۔

شریف آدمی نے دروازہ کھولا۔ اور سب کو اندر بلا کر کہا ــ" معلوم ہوتا ہے سو گئے ــــ فیور مکسچر سے کچھ آرام ہوا ہوگا۔ دونوں سوتے ہیں۔ پیروں کی آہٹ بچا کر چلئے۔"

نوجوانوں نے دیکھا۔ اس لمبے کمرے کے ایک کونے میں دو پلنگ بچھا ہے ــــ پاس رکھی ہوئی ایک میز پر دواؤں کی دو تین شیشیاں بھی نظر آئیں۔ ایک لمپ بھی وہاں دُھندلی سی روشنی کر رہا ہے۔ جوتوں کی ایڑیاں اُٹھا کر نوجوان بڑی احتیاط سے مریض کے پلنگ کی طرف بڑھنے لگے۔ چلنے کی ذرا بھی آہٹ نہ ہوئی۔

قریب قریب سبھی ایک ہی ساتھ مریض کے پلنگ کے پاس پہنچے۔ ایک آدمی نے آہستہ سے رضائی کا ایک کونہ ہٹا کر مریض کا بدن ٹٹولنا چاہا۔ دور تک ہاتھ ڈالا۔ مگر مریض نہ ملا۔ اسپر اس نے پوچھا۔" کہاں ہے؟"

رضائی کو اِدھر اُدھر ہٹا کر دو تین نوجوانوں نے دیکھکر کہا۔" ایں کہاں گیا؟"

باقی سب نے کہا۔" وہ بابو صاحب کہاں گئے؟ وہ کس وقت لوٹ گئے؟"

بعض بولے۔" دیکھنا بھلا۔ کہاں گئے؟ باہر ہوں شاید۔"

تین چار نوجوانوں نے کواڑ کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو باہر سے بند تھے۔ اُنھوں نے زور سے چلا کر کہا۔" ارے کواڑ تو بند ہیں!"

اس پر سبھی لوگ دروازے کے پاس پہنچے۔ کواڑوں کے ساتھ سبھی زور مارنے لگے۔ لیکن دروازہ تِل بھر بھی نہ کھلا۔ یہ دیکھا تو سبھی کے دل پر خوف غالب آیا۔ بعضوں نے کہا۔" ارے کُنج! یہ کیا معاملہ ہے؟"

کُنج بولا" کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمیں اس طرح بند کیوں کر گیا؟ اس کا مطلب کیا ہے؟"

ابھے نے کہا" ایک بار پکارو تو سہی"

اس نے دروازے کے پاس جاکر زور سے پکارا" بابو صاحب! اجی بابو صاحب!! او بابو صاحب! صافے والے بابو جی ہو! صاحب دروازہ کس لئے بند کر دیا؟ کھول دو۔ جلدی کھول دو"

وہ لوگ اس طرح ایک ایک دو دو مل کر آوازیں دے دے کر تھک گئے۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ بعضے تو مایوس ہو کر وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔

پرتھوی نے کہا" بھائی آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ اس میں پھنسے رہیں گے۔ تو جان نہ بچے گی۔ یہ مضبوط کواڑ ٹوٹنے سے بھی رہے۔ ذرا وہ لمپ تو اٹھا لاؤ۔ لمپ میں جو تیل ہے۔ وہ کواڑوں پر انڈیل کر آگ لگا دو۔ جلا ڈالو کواڑوں کو"

کُنج۔" بے آئی مر جائیں گے۔ مارے دھوئیں کے دم گھٹ گھٹ کر جان نکلے گی۔ مہربانی کرو۔ کواڑوں میں آگ مت لگاؤ۔ مکان میں دریچے بھی تو نہیں ہیں۔ صرف چھت کے پاس یہی دو روشندان ہیں۔ ان میں بھی معلوم ہوتا ہے۔ شیشہ لگا ہوا ہے۔ اور کوئی تدبیر کرو"

شیام" وہ تو بھاگ گیا۔ آؤ خوب زور سے چلائیں۔ کسی نہ کسی کے کان میں آواز پہنچے ہی گی"

کیشو" جاڑے کی رات ہے۔ یہاں کون بیٹھا ہے۔ جو ہماری آواز سُن کر چھڑانے کو دوڑا آئیگا"

تب سب سر پر ہاتھ رکھکر غور کرنے لگے۔

تقریباً نصف گھنٹہ بعد باہر سے بھک بھک کی آواز سنائی دی۔ ابھے نے کہا" لو یہ ہماری گاڑی بھی آ گئی"

اسی طرح بات چیت میں اور آدھ گھنٹہ گذرا۔ سبھی یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ اس آدمی نے ہمارے ساتھ یہ شرارت آخر کی کیوں؟ بہت مغز زنی کی۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بالآخر یہی طے پایا کہ وہ ضرور دیوانہ ہوگا۔

کُنج اس گودام میں چکر کاٹ رہا تھا۔ پلنگ کو اِدھر اُدھر سرکا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سب کو بلا کر بولا" دیکھو۔ اوپر یہ جو روشن دان ہیں۔ ان میں تختے وختے کچھ نہیں نظر آتے۔ میں دیر سے خوب دھیان لگا کر دیکھ رہا ہوں۔ یہی ایک ترکیب ہمارے بچاؤ کی ہے"

ابھے" وہ تو بیڈھب اونچے ہیں۔ وہاں کیسے پہنچ سکیں گے"

کُنج" لو اڑے پلنگ کو توڑ مروڑ دو۔ پلنگ کی پاٹی کے چار ٹکڑے اور میز کے چار پائے۔ انہی کو نواڑ میں کسکر

ایک سیڑھی سی بنالو۔ یہ سیڑھی دیوار کے ان طاقوں تک میرے خیال میں پہنچ جائے گی۔"

تین چار اور نوجوانوں نے بھی اندازہ لگاکر اسے ٹھیک مانا۔

گنج "۔تین کوڑی! قد میں تم ہم سب سے چھوٹے ہو۔ بتاؤ۔ چڑھ سکو گے؟"

تین کوڑی "۔ چڑھ تو جاؤں گا۔ مگر اس کے بعد؟ اس طرف اتروں گا کس طرح؟"

"اس سیڑھی کو اسطرف لگا لینا اور اتر جانا۔"

"اگر زمین تک نہ پہنچے؟ اسطرف زمین بہت نیچی ہو تو؟"

گنج نے کہا "پہلے چڑھ کر تو دیکھو۔"

لیمپ کے اُجالے میں نواڑ ادھیڑی گئی۔ اس کے بعد کئی نوجوانوں نے مل کر پلنگ کی پاٹیاں الگ الگ کر ڈالیں۔ اسی طرح میز بھی توڑی گئی۔ پلنگ کی پاٹیاں اور میز کے پائے وغیرہ نواڑ سے خوب کس کر باندھے بھی نہ گئے تھے۔ کہ کوّے بولنے لگے۔ پو پھٹنے سے جو روشنی پھیلی تھی۔ وہ دریچوں کی راہ گودام میں بھی پہنچی۔

سب نے پکڑ کر اس سیڑھی کو دیوار کے سہارے کھڑا کیا۔ وہ اس ہواکش سے کچھ اُونچی ہی نکلی۔ یہ دیکھکر سبھی کے دلوں میں اُمید پیدا ہوئی۔

تین کوڑی نے کہا "اگر نکل سکوں گا۔ تو باہر جاکر کیا کروں گا؟ اسٹیشن پر جاؤں گا۔"

گنج بولا "نہیں۔ نہیں۔ سٹیشن پر جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ وہی سٹیشن والے تو ہمارے دشمن ہیں۔ پہلے جاکر دروازے کو دیکھو۔ اگر صرف زنجیر ہی لگی ہو تو کھول دینا۔ اگر قفل بند ہو۔ تو تھانہ میں جاکر داروغہ سے سب حال بیان کرنا۔ کہیں آس پاس ضرور ہی پولیس کا تھانہ ہوگا۔ وہاں سے آکر داروغہ ہمیں چھٹکارا دلائے گا۔"

سب لوگ اس سیڑھی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہے۔ تین کوڑی بڑی تکلیف سے نواڑ کی گانٹھوں میں پاؤں پھنسا پھنسا کر اوپر چڑھنے لگا۔ روشندان کے پاس پہنچکر وہ چڑھکر اس کے اندر جا بیٹھا۔

نیچے سے ساتھیوں نے پوچھا "تین کوڑی کیا نظر آیا؟"

"میدان۔ میدان میں ایک گیدڑ جا رہا ہے۔"

"کوئی آدمی نہیں دکھائی دیتا؟"

"کوئی بھی نہیں۔"

"زمین کتنی نیچی ہے؟ یہ سیڑھی پہنچ جائیگی یا نہیں؟"

"نہیں۔ بہت نیچی ہے۔ ایک کام کیوں نہیں کرتے؟"

"کیا؟"

" نواڑ کھول دو۔ سب ٹکڑے گانٹھ لگا کر جوڑ لو۔ پھر اُسے دوہرا کر کے رسّی کی طرح کر لو۔ ایک سرا مجھے دو۔ ایک کو تم مضبوطی سے پکڑے رہو۔ وہی سرا پکڑ کر میں نیچے اتر دوں گا"

سبھی بول اُٹھے " واہ! خوب ترکیب بتائی ہے"

اب وہ اٹھارہ جوڑی ہاتھ نواڑ کھولنے۔ گانٹھ لگانے اور اُسے رسی کی طرح مضبوط کرنے لگ گئے۔ پندرہ بیس منٹ میں کام انجام پا گیا :

نیچے سے سب نے کہا " پہلے دیکھو۔ زنجیر لگی ہے یا قفل۔ اگر قفل ہو تو ہم سے باہر سے ہی کہدینا۔ جسقدر جلد ممکن ہو۔ تھانے کو جانا ——— داروغہ سے سب باتیں بیان کرنا اور اُسے اپنے ساتھ یہاں بلا لانا "

" اچھا تو اُترتا ہوں ——" کہکر تین کوڑی اس دریچے سے باہر نکلا۔ اور نواڑ پکڑ کر نیچے کو لٹک گیا :

(۶)

جان جانے کے خوف سے چھوٹا بابو کوئی نصف گھنٹہ بعد ہی چپ چاپ گودام کے پھاٹک پر آیا تھا۔ اور اپنی ڈپلیکیٹ چابی سے تالا اور زنجیر کھول کر چلا گیا تھا۔ اسوقت ایک بھی نوجوان دروازے کے پاس نہ تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ قفل اور زنجیر کے کھولے جانے کی آہٹ کسی کو نہیں ملی ——— چھوٹے بابو نے سوچا تھا۔ انہیں بہت ہی جلد یہ بھید معلوم ہو جائے گا۔ اسوقت دروازہ کھلا ہو گا۔ تو وہ بھاگیں گے۔ وہ بھاگ جائیں گے۔ تو "کتے کی موت" مارے جانے کے ڈر سے جان چھوٹیگی۔

کواڑوں کی زنجیر کھول کر چھوٹا بابو لوٹ کر اپنے دفتر میں چلا گیا۔ وہاں اُس لمبی میز پر لائن کلیر وغیرہ کے چند رجسٹر سرہانے رکھے گوبردھن دت اطمینان سے پڑے سو رہے تھے۔ ڈپلیکیٹ چابی کو ایک جگہ چھپا کر چھوٹا بابو اپنا کام کرنے لگا۔

کچھ دیر میں گوبردھن دت نے انگڑائیاں لیں۔ وُھسّے سے باہر سر نکال کر اُنہوں نے پوچھا " ہیں صبح ہو گئی! تھانے میں خبر بھیجی؟"

چھوٹا بابو ——" جی نہیں۔ ابھی تک خلاصی یا چپڑاسی نہیں آیا۔ بھیجوں کسے؟"

" تو میں خود ہی جاؤں؟ یہاں سے کتنی دور ہے تھانہ"؟

" ایک میل ہو گا"؟

" اچھا تو ایک کام نہ کروں۔ یہاں تھانے میں اطلاع دینے کے بجائے کلکتہ انسپکٹر جنرل پولیس کو ایک تار دیدوں۔ ملٹری پولیس کی معیت میں ہتھیاروں سے مسلح ہو کر وہ آ جائیں گے۔ بھئی یہاں کی پولیس کا اعتبار ہی کیا ہے؟ میں نے اتنی محنت سے ملزموں کو گرفتار کیا ہے۔ داروغہ اپنی ناموری کے لئے مجھے بھٹکنے بھی نہ دیگا۔

ساری عزت اور نیک نامی خود ہی لوٹ لیگا — اسلئے ایک تار بھیج ہی دینے دو۔ کیوں کیا کہتے ہو؟

"ٹھیک تو ہے۔ آپ یہاں بیٹھکر تار لکھئے۔ اتنے میں میں کوارٹر میں جاکر چائے کا انتظام کر آؤں۔"

"اہا! اس وقت گرما گرم چائے کا ایک پیالہ مل جائے۔ تو کیا ہی بات ہے! — ایک تو ٹھنڈ۔ دوسرے رات بھر جاگنا پڑا ہے۔"

چھوٹا بابو کوارٹر کی طرف چلا گیا — اِدھر کاغذ قلم لے کر بابو گوبردھن دت تار لکھنے بیٹھے۔ بہت کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد بالآخر یہ مسودہ بنا:۔

"میں ایک کام کی غرض سے اس طرف آیا تھا۔ پاس کے کسی گاؤں میں سو پچاس ڈکیتی ہونے کی خبر پاکر بعد دقت حکمت عملی سے میں نے ۱۹ ڈاکوؤں کو پکڑ کر ایک جگہ محصور کر لیا ہے۔ اس مکان میں باہر سے مضبوط تالا لگا دیا ہے۔ ملٹری پولیس لیکر فوراً آ جیئے۔"

گوبردھن دت"

مسودہ کو دو تین بار پڑھکر بابو گوبردھن دت نے اخیر میں اپنے دستخط کے نیچے لکھ دیا — "اردو نا ولسٹ"۔ اس کے دو مقصد تھے۔ اوّل یہ کہ انسپکٹر جنرل صاحب یہ نہ سمجھیں کہ کسی غیر ذمہ دار شخص نے تار بھیجا ہے۔ دوسرے یہ کہ ڈاکوؤں کو گرفتار کرا دینے کا سہرا اپنے سر لینے کے لئے بعد ازاں کوئی دوسرا شخص نہ کھڑا ہو جائے۔

اسی وقت باہر بہت آدمیوں کا شور و غل سُن کر اور ان کے جوتوں کی آہٹ پاکر بابو گوبردھن دت مارے اشتیاق کے باہر گئے۔ تار کا مسودہ اُن کے ہاتھ میں ہی تھا۔

جو کچھ دیکھا۔ اس سے ان کے ہوش کے طوطے اُڑ گئے۔ یہ تو وہی ہیں — وہی پارٹی ہے — اُن کے کندھے پر میز اور پلنگ کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں۔ ایک نوجوان نے کڑک کر کہا — "یہی ہے صافہ والا بدمعاش!"

گوبردھن دت سمجھے "میرا وقت آ گیا۔ زندگی تمام ہو چکی۔ مگر جان ہی سب کچھ ہے۔ اس کے بچانے کی ایک بار کوشش کر کے دیکھنی چاہیئے۔"

چنانچہ وہ بھاگے۔ ڈاکوؤں کا گروہ بھی "پکڑو بدمعاش کو! پاجی بھاگنے نہ پائے!" وغیرہ کہکر تعاقب کرنے لگے بابو گوبردھن دت بھاگے۔ پلیٹ فارم کے تار کے جنگلے کو پھاند کر انہوں نے میدان چھوڑ جنگل کا رُخ کیا۔ درختوں کے کانٹوں نے ان کے کپڑے تار تار کر دیئے۔ بدن پر کئی جگہ چوٹ لگی۔ خون نکلنے لگا۔ پھر بھی وہ بھاگتے ہی گئے ایک پاؤں کا جوتہ نکل کر راستے میں گر پڑا۔ تب وُہ ایک ہی پیر میں جوتہ پہنے بھاگتے گئے۔ اب دوسرا جوتہ بھی کھُل کر گر گیا۔ پاؤں میں کانٹے چھدنے لگے۔ قدم قدم پر ٹھوکریں لگنے لگیں۔ رفتہ رفتہ ان کی چال بھی دھیمی ہونے لگی۔ آخرکار ہانپتے ہانپتے ایک جگہ انہیں بیٹھ جانا پڑا۔ چاروں طرف گھنگھور جنگل ہے۔ کان لگا کر آہٹ لی۔ کہ ڈاکو کہیں تعاقب تو نہیں کر رہے ہیں۔ دیر تک انتظار کرتے رہے۔ کہیں کچھ آہٹ نہ ملی۔

تب بابو گوبردھن دت نے سوچا۔ وہ لوگ سٹیشن پر دیر تک میری تلاش میں بیٹھے نہ رہیں گے۔ کیونکہ آخر انہیں بھی تو اپنی جان کی فکر ہے۔ چنانچہ تقریباً دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ اس جنگل سے روانہ ہوئے۔ پاؤں میں کانٹے چبھ گئے تھے۔ ٹھوکریں بھی لگی تھیں۔ اس سے لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگے۔ راستہ بھول گئے۔ چکر کھا کر کوئی ۹ بجے کے بعد سٹیشن پر پہنچے۔

کہیں کسی بھی ڈاکو سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ چھوٹا بابو کوارٹر میں ہے۔ وہاں جا کر گوبردھن دت اس سے ملے چھوٹے بابو نے ہنس کر کہا۔ "ابتک کہاں رہے؟ ڈاکو تو آپ کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔"

گوبردھن نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "کہاں چلے گئے وہ؟"

"وہ تو اب کلکتہ پہنچ گئے ہوں گے۔"

چھوٹے بابو نے نوجوانوں سے ان کا جو کچا چٹھا سنا تھا۔ بارات وغیرہ میں شامل ہونے کا۔ وہ سب گوبردھن جی کو سنایا بابو گوبردھن دت نے پوچھا۔ "وہ لوگ گودام سے نکل کیونکر آئے؟"

چھوٹے بابو نے کہا۔ "یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے جناب۔ سات بجے والی گاڑی سے جب وہ لوگ چلے گئے اسوقت میں اس گودام میں گیا۔ باہر قفل پڑا تھا۔ جانچ کی تو دیکھا۔ کہ ان لوگوں نے پلنگ توڑ تاڑ کر نواڑ کی ایک سیڑھی بنائی بنائی تھی۔ اور اسی کے سہارے وہ روشندان میں چڑھے۔ اور ایک ایک دھڑا دھڑ باہر کود آئے تھے۔ کمال ہوشیاری سے انہوں نے کام کیا۔ بڑے ہمت ور ہیں!"

گوبردھن نے ذرا سوچ کر کہا۔ "وہ تو ڈاکو ہی معلوم ہوتے تھے۔ باراتی نہیں۔ آپ سے جھوٹ موٹ کہہ گئے ہیں کہ بارات میں آئے تھے۔ خیر۔ ان کو ہمارا نام اور پتہ ٹھکانا تو نہیں بتا دیا؟"

"رام کا نام لیجئے — کئی بار ہیچ در پیچ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔ مگر میں نے ایک ہی بات کہی میں نے کہا۔

"صاحب! یہ سٹیشن ہے۔ یہاں معلوم نہیں کہاں کہاں سے کتنے آدمی آتے جاتے ہیں۔ میں کس کس کی خبر رکھ سکتا ہوں ہاں! میں نے ایک آدمی کو پلیٹ فارم پر رات کو دیکھا ضرور تھا۔ صافہ باندھے اور دُھسّہ اوڑھے تھا۔ یہی حلیہ تو آپ بھی بتلاتے ہیں۔ کوئی دیوانہ دیوانہ ہوگا۔"

بابو گوبردھن دت نے لمبا سانس لے کر کہا۔ "آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ جو میرا اصلی نام بتا نہیں دیا۔ اب اگر یہی لوگ یا ان کی پارٹی کا کوئی آدمی میرے بارے میں کچھ پوچھ تاچھ کرنے آئے۔ تو مہربانی فرما کر اسی طرح ٹال دیجئے گا میرے بارے میں کچھ نہ بتلائیے گا۔ اس احسان کو میں کبھی فراموش نہ کرونگا۔"

یہ کہکر گوبردھن دت نے محبت بھرے انداز سے چھوٹے بابو کے ہاتھ دبا لئے۔

چھوٹا بابو۔ ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ میری زبان کٹ جائے۔ یہ مجھے منظور ہے۔ مگر میں انہیں آپ کا نام اور

پتہ ٹھکانا کبھی نہ بتلاؤں گا۔"

چھوٹے بابو ہی کے کوارٹر میں بابو گوبردھن دت نہائے دھوئے۔ اور وہیں انہوں نے کھانا کھایا۔ دوپہر کی گاڑی سے وہ کلکتہ کو روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت راستے بھر بہادر ہوتے۔ یہی غنیمت سمجھئے کہ جان بچ گئی ؛

اگلے دن ڈاک سے چھوٹے بابو کو کتابوں کا ایک بڑا سا پارسل ملا۔ بابو گوبردھن دت نے اپنی تصنیف کردہ تمام کتابوں کی ایک ایک جلد تحفۃً بھیجی ہے۔ ہر ایک کتاب پر "پیشکش" لکھکر اس طرح دستخط کئے ہیں ___

"آپ کا احسان مند گوبردھن دت"

(ترجمہ)

پابندئ عہد کی ایک حیرتناک مثال

(از جناب مولوی محمد سعید صاحب سعید مولوی فاضل فسٹ اورنٹیل ٹیچر سنٹرل ماڈل سکول لاہور)

ابن خطاب وہ عمر فاروقؓ کہ تھے برحق خلیفۂ ثانی
سادگی میں تھے دلق پوش فقیر اُمرا اُن کا بھرتے تھے پانی
اُن کی ہیبت سے کانپتے تھے سبھی خواہ رُومی تھے خواہ ایرانی
اُن کے عدل وہدیٰ کے ہیں مشہور بیسیوں واقعات لاثانی
اک اچھوتا سا قصّہ اور سنو! خُوب کی قول کی نگہبانی
اُن کی پیشی میں ایک دن لائے واجب القتل ایک زندانی
جس کے ہاتھوں سے نذر خاک ہوئے کتنے معصوم نفس انسانی!
موت کی مِل گئی سزا اُسکو کہ یہی تھا اصُولِ فُرقانی
سر پہ آکر کھڑا ہُوا جلّاد کھینچی تلوار قتل کی ٹھانی
عرض کی اس نے یہ کہ پیاسا ہوں ٹھنڈے پانی کی کر دو ارزانی
اس کی تعمیل کی گئی فوراً لائے بھر کر پیالہ برفانی

ہاتھ میں تھا پیالہ قیدی کے
اور ننگا ہوں میں تھی پریشانی

آپ نے پوچھا دیکھتا کیا ہے؟
کیوں نہیں پیتا شوق سے پانی

عرض کی پیتے پیتے ہی نہ کہیں
مجھ پہ چل جائے تیغِ سلطانی

بولے حضرت نہ ماریں گے جبتک
پانی پی لے نہ تو بہ آسانی

یہ سُنا اُس نے تو پیالے کو
خاک پر مارا بہہ گیا پانی

اور کہا میں نہ پی سکوں گا اِسے
اور نہ ٹوٹے گا عہدِ سلطانی

قتل کر سکتا ہے مجھے اب کون؟
عہد خود کرتا ہے نگہبانی

اِس پہ حضرت عمرؓ ہوئے ششدر
اہلِ مجلس پہ چھائی حیرانی

غصے میں آپ نے یہ فرمایا
"او مجسم فریب شیطانی"

کچھ نہیں اور تو سزائے فریب
پائے گا تو بحکم ربانی

یہ نیا جرم ہے سزا بھی نئی
دور کر دل سے وہم نادانی

اِس پہ احباب نے یہ عرض کیا
آپ کا فیصلہ ہے حقانی

ٹل سکے عفو سے سزا لیکن
کیوں ٹلے وعدۂ مسلمانی

آپ بولے کہ سچ کہا تم نے
میں ہوں پابندِ عہدِ ایمانی

ہے سزا میں خلافِ عہد کا وہم
کیوں ہو یہ بھی بجدِّ امکانی

اُسکو شیطان نے سکھایا مکر
مجھ کو اَوْفُوْا[۱] ہے حکمِ یزدانی

چھوڑتا ہوں اُسے۔ نہیں ہوتا
میں کبھی نقضِ عہد کا بانی

جب یہ دیکھا سلوک ملزم نے
لے اُڑا اسکو اوجِ ایمانی

دل سے تائب ہوا سعید بنا
پائی ایمان کی فراوانی

[۱] وعدہ پورا کرو۔

نیا نو دِن پرانا سو دِن

[از جناب فیض محمد صاحب فیض لدھیانوی (منشی فاضل)]

(۱)

اکرم اور اسلم دو نوجوان جالندھر کے اسلامیہ ہائی سکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ ایک ہی محلے کے رہنے والے تھے۔ صبح کو اکٹھے سکول جاتے چھٹی ہوتی۔ تو اکٹھے گھر واپس آتے۔ اور شام کو سیر کے لئے بھی اکثر اکٹھے ہی باہر جایا کرتے تھے۔ اُن کے اوقات کا زیادہ تر حصہ ایک ہی جگہ صرف ہوتا تھا۔ ان کے باہمی اختلاط کو دیکھکر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ حقیقی بھائی نہیں ہیں۔ فی الحقیقت اُن کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ قدرتی طور پر ان کی محبت اسقدر بڑھ گئی تھی۔ کہ ایک کو دوسرے کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اسکول کی دُنیا میں جہاں اُنکی رفاقت اور محبت بے مثل تھی۔ وہاں اُن کی لیاقت اور ذہانت کا بھی شہرہ تھا۔ ان کا شمار جماعت کے ہوشیار لڑکوں میں تھا۔ ہر اُستاد اُن کی تعلیمی کارکردگی سے ہمیشہ خوش رہتا تھا۔ خصوصاً ہیڈ ماسٹر صاحب ان کے نتائج سے متاثر ہو کر اُن دونوں کی سرگرمیوں کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ میٹرک کا امتحان ہوا تو یہ دونوں نوجوان نہایت عمدہ نمبروں پر کامیاب ہوئے ۰

(۲)

نتیجہ کے بعد اکرم کے والد نے اُسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جالندھر سے لاہور بھیجدیا۔ جہاں وہ ایک سرکاری کالج میں داخل ہو کر اپنے مقررہ نصاب کی تکمیل میں منہمک ہو گیا۔ اسلم بے چارہ ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔ میٹرک کے بعد تعلیم کو جاری رکھنا اُس کیلئے دشوار تھا۔ اس نے چاہا۔ کہ وہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت تلاش کرے۔ لیکن فی زمانہ کساد بازاری کے ہاتھوں تعلیم یافتہ لوگوں کی جو قدر و قیمت باقی رہ گئی ہے۔ وہ سب پر ظاہر ہے۔ جب اچھے اچھے قابل بی اے اور ایم۔ اے بیکاری کا شکار ہو رہے ہیں۔ تو اسلم بے چارہ میٹرک پاس کس گنتی میں تھا۔ کبھی کبھار کوئی عارضی جگہ نکل آتی۔ تو چار دن لگ جاتے۔ ورنہ وہی بیروزگاری کا سامنا رہتا تھا۔ اس مصیبت نے اُسے اس قدر رنجیدہ خاطر بنا دیا۔ کہ وہ کسی سے ملنا جلنا بھی پسند نہ کرتا۔ خوشی کے جذبات اُس کے دل سے رخصت ہو چکے تھے۔ اور وہ ہر وقت ملول سا رہتا تھا۔ ہفتہ عشرہ میں اکرم کا کوئی خط لاہور سے آتا۔ تو وہ بادلِ نخواستہ اس کا جواب دیدیتا۔ کچھ دنوں تک مراسلت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ پایانِ کار یہ بھی بند ہو گیا۔ اب نہ اسلم کو اکرم کا پتہ تھا۔ نہ اکرم کو اسلم کا۔ ایک

لحاظ سے وہ ایک دوسرے کو فراموش کر چکے تھے ؛

(۳)

انسان کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے کسی سے راہ و رسم پیدا کئے بغیر وقت نہیں کٹ سکتا۔ کوئی پاگل ہی ہوگا جس نے ساری عمر ایک بند کمرے میں بیٹھکر گذار دی ہو۔ اسلم بھی اس تنہائی سے ناچار ہوگیا۔ اُس نے خیال کیا کہ کوئی ایسا رفیق بنانا چاہیئے۔ جس کی رفاقت سے دل کا غم غلط ہوتا رہے۔ شریف ایک مالدار کا بیٹا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد کافی دولت اس کے حصّے میں آئی تھی۔ نوعمری کے باعث اُسے کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ اسلئے وہ اکثر ناشائستہ اور بیہودہ کاموں میں دولت کو برباد کیا کرتا تھا۔ فضول خرچی اُس کا شعار بن گیا تھا۔ دُنیا کا کوئی عیب ایسا نہ تھا۔ جو چوری چھپے اس نے اختیار نہ کر لیا ہو۔ ان تمام باتوں کے باوصف اس میں ایک خوبی یہ تھی۔ کہ وہ شاعری اور مضمون نویسی کا بے حد شائق تھا۔ اس کی دلی خواہش لے دے کر یہ تھی کہ وہ اخبارات و رسائل کے ذریعے سے ادبی و علمی دنیا میں ایک زبردست شاعر اور مضمون نویس مشہور ہو جائے۔ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ ایسے نوجوانوں سے یارانہ گانٹھتا۔ جو نظم و نثر میں اسے کسی قسم کی امداد دے سکیں۔ مبدا فیض سے اسلم کو بھی ذوقِ سلیم عطا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسم بامسمیٰ تھا۔ مضامین نظم و نثر لکھنے میں اُسے کافی دسترس تھی۔ اس کا رنگین کلام شمالی ہند کے اکثر بلند پایہ معیاری صحائف میں اشاعت پذیر ہوتا رہتا تھا۔ شریف نے اسلم کا علمی شغف دیکھکر یہ خواہش کی۔ کہ وہ کسی طرح اس کو اپنے حلقۂ احباب میں شامل کرے۔ اتفاقاً ایک محفل میں دونوں کا تعارف ہوا۔ اور باضابطہ دوستی کا آغاز ہوگیا۔ اسلم کو چونکہ خود ایک رفیق کی ضرورت تھی۔ اسلئے اختلاط بڑھانے میں ہر دو جانب سے کوشش ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ میل ملاپ بڑھ گیا۔ اور دوستانہ تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے۔ قصّہ کوتاہ اب یہ حالت ہوگئی تھی۔ کہ اسلم جسطرح کسی زمانے میں اکرم کے ساتھ اپنے وقت کا زیادہ تر حصّہ گذارا کرتا تھا۔ اسی طرح شریف کے ساتھ بھی پیش آنے لگا۔ اکرم کی یاد اس کے دل سے مفقود ہو چکی تھی۔ اور وہ ہر وقت شریف ہی کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اُسے یہ غلط فہمی ہوگئی تھی۔ کہ شریف بھی اکرم کی طرح اخلاص مند ہے۔ تازہ تازہ دوستی تھی۔ اتنی جلدی اُسے معلوم بھی کیا ہو سکتا تھا ؛

(۴)

شریف کا ذریعہ معاش کچھ نہیں تھا۔ چار پیسے کمانا تو بڑی بات ہے۔ وہ باپ کی اندوختہ پونجی کو بھی اعتدال سے خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ اسے ضائع کرنا اسکے نزدیک زندگی کا ایک اہم ترین فرض تھا۔ ایک روز اسلم اور شریف دونوں بیٹھے تھے۔ کہ شریف نے اسلم کو مخاطب کر کے کہا :-

" میں کل لاہور جا رہا ہوں۔ میرا ارادہ ہے۔ کہ وہاں سے ایک ادبی ماہانہ رسالہ نکالا جائے۔ تم میرے ساتھ چلو

اس رسالہ کی ترتیب میں میرا ہاتھ بٹا دیا کرنا۔ حق القلم کے طور پر میں تمہیں کچھ نہ کچھ مشاہرہ دیدیا کرونگا۔ صبح چلیں گے۔ تیاری شروع کردو۔ تمہارا ریل کا کرایہ بھی میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔ اور لاہور میں تمہارے اخراجات میرے سے ہی سر پر ہوگا۔“

اسلم بیکار تو تھا ہی۔ اس بات کو اس نے غنیمت جانا۔ اور دوسرے دن صبح کو اپنا بستر لے کر شریف کے ہمراہ لاہور کو روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچکر شریف نے پندرہ روپے ماہوار پر ایک مکان لیا۔ اور ان تمام چیزوں کو جو ایک دفتر کے لئے ضروری ہوتی ہیں سلیقہ سے مرتب کردیا۔ یہ امر اوپر بیان ہوچکا ہے کہ شریف ایک ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ اور وہ اپنے والد مرحوم کی دولت کو ناشائستہ اور بے سود کاموں میں برباد کیا کرتا تھا۔ اس کا خاندانی نام شریف تھا۔ لیکن حقیقت میں وہ ”آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ“ کا مصداق تھا یعنی شرافت کا اس میں شائبہ بھی نہیں تھا۔ ادبی رسالہ کے اجرا میں وہ کہاں تک حق بجانب تھا۔ اس پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ لاہور پہنچکر اس نے اپنی بداعتدالیوں کی ڈور کو اور ڈھیلا کردیا۔ جالندھر میں تو اُسے یہ خوف تھا کہ اسکے رشتہ دار مانع ہونگے لیکن یہاں اسکے لئے میدان فراخ تھا۔ اور وہ ہر طرح بے باک ہوکر دولت کو برباد کرسکتا تھا۔ اس سے پہلے اُس نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ مگر اب وہی شریف تھا۔ کہ وہ دو بوتلیں چڑھائے بغیر اس کا نشہ پورا نہیں ہوتا تھا۔ جس مکان کو اس نے رسالہ کے دفتر کے لئے کرایہ پر لیا تھا۔ وہ اب ایک اچھا خاصا ”میخانہ“ بنا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے اس مذموم اور ناپاک شغل میں اسلم کو بھی شریک کرنا چاہا۔ لیکن چونکہ وہ ایک پارسا باپ کا بیٹا تھا اور خود بھی پارسائی میں کچھ کم نہیں تھا۔ اس لئے اس نے شریف کی اس رندانہ دعوت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔

(۵)

اسلم کے انکار کو دیکھکر شریف خاموش ہورہا۔ لیکن اُس کی اس خاموشی میں سینکڑوں شرارتیں مضمر تھیں۔ اس نے اپنے دل میں ٹھان لیا تھا۔ کہ وہ اب اسلم کو پرائے شہر میں ذلیل وخوار کرکے چھوڑیگا۔ اُسے زیادہ تر خوف اس بات کا تھا۔ کہ اسلم جالندھر میں جاکر لوگوں سے اسکی بداعمالیاں اور خامکاریاں بیان کرے گا۔ اور اسکے رشتہ دار اور دوسرے عزیز واقارب اسکی شراب نوشی کا حال سُنکر اُسپر لعنت بھیجیں گے۔ چنانچہ جس اسلم کو وہ ماہانہ ادبی رسالہ کا جھکمہ دیکر اپنے ہمراہ لاہور لایا تھا۔ اب مجبوری کے عالم میں اُسے اپنے مکان سے چلے جانے کو کہہ رہا تھا۔ اسلم بھانپ گیا کہ اسکا شرابنوشی سے انکار کرنا اس کیلئے مصیبت کا پیغام بن گیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ شرابنوشی کو ایک اخلاقی اور مذہبی گناہ خیال کرتا تھا۔ اس لئے اس نے اس بات کی مطلق پروا نہ کی۔ کہ اس کا نادان دوست اس کے لئے کس طرح جی کا جنجال بن رہا ہے وہ اب شریف جیسے ”شریر“ انسان سے گفتگو کرنی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن چونکہ گھر کو واپس جانے کیلئے اس کے پاس ریل کا کرایہ پورا نہیں تھا۔ اسلئے اس نے بادل نخواستہ شریف سے اتنا کہا۔ ”تم نے مجھے

وعدہ کیا تھا۔ کہ تم میرا ریل کا کرایہ اپنی جیب سے ادا کرو گے۔ اسلئے اب مہربانی کرتے ہوئے مجھے ٹکٹ خریدنے کے لئے ڈیڑھ روپیہ دیدو۔ تاکہ میں اپنے گھر پہنچ سکوں۔ اور اگر تم میرا ریل کا کرایہ برداشت نہیں کر سکتے۔ تو دوستی کا پاس کرتے ہوئے اُدھار کے طور پر یہ رقم مجھے عنایت کر دو۔ میں جالندھر پہنچکر شکریہ کے ساتھ تم کو واپس کر دونگا۔"

اسکے جواب میں شریف نے نہایت متکبرانہ لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے فرعون بے سامان بن کر کہا۔ "میرے سامنے زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں کرایہ ورایہ کچھ نہیں دے سکتا۔ تمہیں یہاں سے چلے جانے میں جلدی کرنی چاہئیے"

(۶)

اسلم نے جب دیکھا کہ شریف کسی طرح بھی نہیں مانتا۔ تو مجبور ہو کر وہاں سے چل دیا۔ اس کے دماغ میں ایک خیال چڑھتا اور دوسرا اترتا تھا۔ کبھی وہ سوچتا۔ کہ شریف نے کسی پرانی عداوت کا پرائے شہر میں اس سے بدلا لیا ہے۔ کبھی خیال کرتا۔ کہ اس نے شریف کے ہمراہ لاہور آنے میں حماقت کی ہے۔ علی ہذا القیاس اور بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ اور وہ پریشانی کی حالت میں چلا جا رہا تھا۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ کہ وہ کیا روش اختیار کرے۔ کہاں جائے اور کہاں نہ جائے۔ اُسے یہ اندیشہ کھائے جاتا تھا۔ کہ اس بے سروسامانی کے عالم میں وہ لاہور سے جالندھر کیسے پہنچے گا۔ اس کے اخلاقِ عالیہ اُسے یہ اجازت نہیں دیتے تھے۔ کہ وہ ٹکٹ کے بغیر گاڑی میں سوار ہو جائے اور گرفتار ہونے پر ذلیل و رسوا ہوتا پھرے۔ اسکی جیب میں اسوقت صرف دس آنے کے پیسے تھے۔ مگر وہ اس قلیل رقم میں لاہور سے جالندھر تک کیونکر جا سکتا تھا۔ جو دو ڈھائی روپے آتے وقت اس کے پاس موجود تھے ان کی وہ کتابیں خرید چکا تھا۔ اس سے پہلے ایسا زہرہ گداز صدمہ اس نے کبھی برداشت نہیں کیا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اُسے ایک گونہ مسرت تھی۔ کہ وہ ایک مذموم اور ناپاک شغل میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہوا ہے۔ وہ اپنے دل کو ان معقول باتوں سے تسلی دے رہا تھا۔ کہ نیکی کرنے میں ہمیشہ زحمت۔ محنت اور نفس کشی کا سامنا ہوتا ہے میں نے شراب نوشی سے انکار کر کے ایک اچھا کام کیا ہے۔ اور اچھے کاموں میں بڑے بڑے اوتاروں اور پیغمبروں کو مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ میری یہ مصیبت عنقریب دور ہو جائیگی۔ لیکن شراب نوشی کا بدنما داغ میرے دامن سے ہرگز دور نہیں ہو سکتا تھا۔

اس مصیبت کے وقت میں اسلم کو یاد آیا کہ اس کا بچپن کا دوست اکرم آج کل یہاں لاہور میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس کے پاس چل کر یہ تمام ماجرا بیان کرنا چاہئیے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ قدیمی دوستی کا خیال کرتے ہوئے اس آڑے وقت میں میری دستگیری کرے۔ ابتداء میں اسکے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ رہ چکا تھا۔ اسلئے اسلم کو اکرم کا پورا پتہ معلوم تھا۔ وہ چند منٹ میں اکرم کی قیامگاہ پر پہنچا۔ وہاں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ اکرم فلاں نمبر کے کمرے میں اقامت گزیں ہے۔ عہد طفولیت میں ایک حد تک بے تکلفی رہ چکی تھی۔ اسلئے اسلم بغیر کسی قسم کی جھجک کے کمرہ کے

اندر چلا گیا۔ اکرم نے خلافِ آرزو اسلم کو دیکھا۔ تو حیران رہ گیا۔ اس حیرانی کے عالم میں بھی اس نے اسلم کا خیر مقدم نہایت تپاک سے کیا۔ وفا کا نقش اُبھرا۔ دونوں نے معانقہ کیا۔ آن واحد میں بچپن کے تمام واقعات یاد آ گئے۔ فرطِ خوشی کے باعث آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ باہمی مزاج پُرسی کے بعد اسلم نے شریف کی بدسلوکی کا ذکر کیا۔ تو اکرم کو از حد صدمہ پہنچا۔ صدمہ کیوں نہ پہنچتا آخر کسی زمانے میں "دو قالب ایک جان" رہ چکے تھے۔ اکرم نے اسلم کو راحت و آسائش کے اسباب مہیّا کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش فروگذاشت نہ کیا۔ دوسرے دن نے جالندھر جانے کو کہا لیکن اکرم نے اصرار کیا اور کہا کہ مدت کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ کم از کم دو چار دن ٹھہر کر چلے جانا ابھی کیا جلدی ہے۔ اسلم نے اکرم کی خواہش کے مطابق کچھ دن قیام کیا۔ اس دوران میں اُنہوں نے نہایت شادمانی سے اپنے اوقات کو گذارا۔ رخصت کے وقت اکرم اسلم کو اسٹیشن تک چھوڑنے کے لئے آیا۔ اور اپنی جیب سے اسے ریل کا ٹکٹ خرید کر دیا۔

اسلم لاہور سے روانہ ہو کر چند گھنٹوں کے بعد خیریت کے ساتھ جالندھر پہنچ گیا۔ اس افسوسناک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اب وہ اکثر بزرگوں کے اس زرّیں قول کو دُہرایا کرتا ہے :-

"نیا نو دن پرانا سو دن"

جاہل گریجویٹ

ایک پُر لطف مزاحیہ افسانہ

(از شوکت تھانوی)

ہمارے میر صاحب گریجویٹ تھے ۔ جی ہاں گریجویٹ مگر خدا جانے کو دن دیکر پڑھے تھے ۔ یا کیا ۔ کہ ان کا جہل ہم غیر گریجویٹوں کیلئے بلائے جان بنکر رہ گیا تھا ۔ پھر مصیبت یہ تھی ۔ کہ بات بات پر اُلجھتے تھے ۔ اور چاہتے یہ تھے کہ ان کی جہالت کو بھی ہم ان کا تبحر تسلیم کر کے مرعوب ہو جائیں ۔ اور وہ اپنی تمام حماقتوں کے ہم سب پر محض اسلئے حاوی رہیں کہ خدا جانے کسطرح اُنہوں نے بی اے کی ڈگری اُڑا لی تھی ۔ روز کسی نہ کسی بات پر ایک طویل بحث چھڑ جایا کرتی تھی ۔ اور اسی بحث میں میر صاحب پوری قوت کے ساتھ اپنے تمام جہل کا ناقابلِ تردید ثبوت بہم پہنچا دیا کرتے تھے ۔ چنانچہ کل بھی یہی قصہ ہوا کہ ہمارے احباب میں سنجیدگی کے ساتھ تعلیم اور بیروزگاری کے موضوع پر بحث ہو رہی تھی :۔

مسعود نے کہا " حقیقت تو یہ ہے ۔ کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بطور حق کسی ذریعۂ معاش یا روزگار کا مطالبہ کرنا ہی غلطی ہے ۔ اور اگر تعلیم کا مقصد یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ محض کھانے کمانے کا ڈھنگ ہے ۔ تو اس تعلیم کو تعلیم نہیں کہا جا سکتا "

ریاض نے جواب دیا " تو پھر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تعلیم کا تعلق معاش اور معاش کا تعلق تعلیم سے نہ رکھا جائے تو ہندوستان ایسے ملک میں جو اقتصادی مشکلات کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے تعلیم زیادہ ضروری ہے یا فکرِ معاش " ؟

مسعود نے کہا " بالکل صحیح ہے ۔ یقیناً یہ سوال درست ہے ۔ اور میں بہانگِ دہل کہونگا کہ جو لوگ اپنے بچوں کو اسلئے تعلیم دلوانا چاہتے ہیں ۔ کہ وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد روپیہ کمانے کی مشین ثابت ہوں ۔ ان کو چاہیئے کہ وہ صرف ضروری تعلیم دلانے کے بعد اپنے بچوں کو صنعت و حرفت کی طرف رجوع کر دیں ۔ تاکہ انکی امیدیں سرسبز رہیں ۔ ان کے بچے یقیناً دولت حاصل کریں گے ۔ لیکن یہ ناممکن ہے ۔ کہ دولتِ علم اور دولتِ زر یکساں طور پر ان کو حاصل ہو جائے حالانکہ اس کو کلیہ قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ بعض صورتوں میں یہ ناممکن بات بھی ممکن ہو جایا کرتی ہے ۔ مگر شاذ و نادر ۔ بہرحال بچے کو تعلیم شروع کرانیکے خیال کے ساتھ ہی یہ خیال کہ یہ بچہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی قارون کے خزانہ کا خزانچی ہو جائیگا اگر سودائے خام نہیں تو حماقت ضرور ہے ۔ اور اسی ذہنیت نے ہندوستان کے تعلیمی مقصد کو تباہ کر رکھا ہے "

ریاض نے قائل ہو کر کہا " میں اس سلسلہ میں آپ سے بالکل اتفاق کرتا ہوں ۔ کہ ہندوستان میں اکثر و بیشتر تعلیم

حاصل کرنے کی جو نیت ہوتی ہے۔ اسی میں دراصل نقص ہے
اور تعلیم کو تعلیم کیلئے نہیں بلکہ کسب زر کیلئے حاصل کیا جاتا ہے
جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ پڑھنا لکھنا آتا ہے نہ روپیہ ملتا ہے
مسعود نے زور دیکر کہا "آپ دیکھ لیجئے۔ کہ یوں
پڑھنے کو تو تمام ہندوستان کے بچے پڑھ رہے ہیں۔ مدرسوں
سے لے کر اسکول اور کالج سب بھرے پڑے ہیں۔ اور ہر
سال ایک معقول تعداد میں نوجوان فارغ التحصیل ہو کر کالجوں
سے نکلتے ہیں۔ بلکہ یہ کہئے کہ گریجویٹوں کی فوج ظفر موج ہر کالج
سے ہر سال نکلا کرتی ہے۔ لیکن اگر آپ ان گریجویٹوں کو دیکھیں
تو آپ کو حیرت ہوگی کہ خدا جانے انہوں نے بھاڑ جھونکا ہے
یا کیا کیا ہے کہ ان کو اپنی درسی کتب کے علاوہ الف کے نام
لٹھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ بس وہ تو یہ چاہتے ہیں۔ کہ چونکہ ہم
گریجویٹ ہیں۔ لہذا ڈپٹی کلکٹری ہمارا پیدائشی حق ہے۔ یہ اور
بات ہے کہ بعد میں ان کو ٹھوکریں کھانے کے بعد بیس پچیس
روپیہ کی کلرکی سے زیادہ اور کوئی جگہ نہ ملے۔ لیکن وہ صرف
ڈپٹی کلکٹری کے لئے بی اے پاس کرتے ہیں۔ ورنہ ان کو
نہ بی اے سے کوئی خاص محبت ہے۔ نہ انگریزی کے یہ دو
حروف ان کے لئے نعمت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک
استعداد علمی کا تعلق ہے۔ وہ بالکل کورے بلکہ بقول شخصے
جوں کے توں ہوتے ہیں"۔

میر صاحب ابتک تو منہ لٹکائے ہوئے سنتے رہے
اسلئے کہ جو بحث چھڑی ہوئی تھی وہ ان کے ادراک سے بالاتر
تھی۔ مگر بحیثیت ایک گریجویٹ ہونے کے گریجوٹوں کی یہ
کھلی ہوئی توہین کیونکر گوارا کرسکتے تھے۔ فوراً آستین چڑھا کر
بولے "کیا کہا جناب مسعود صاحب! یعنی گریجویٹ کچھ پڑھے
لکھے ہی نہیں ہوتے"؟

مسعود اور ریاض دونوں اپنی بحث چھوڑ کر جناب میر
صاحب بی اے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور مسعود نے دست
بستہ عرض کیا "یہ تو میں نے عرض نہیں کیا کہ کچھ پڑھے
لکھے نہیں ہوتے۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل کے ڈھلے
ہوئے بی اے اپنی درسی کتابوں سے آگے بس اور کچھ نہیں
جانتے اور پھر روتے ہیں کہ ہم کو ملازمت نہیں ملتی اور ہمارے
گریجویٹ ہونے کی قدر نہیں کیجاتی۔ جو قدر کے قابل ہوتے
ہیں۔ وہ زبردستی اپنی قدر کرا لیتے ہیں۔ اور باقی جس استعداد
کے ہیں۔ وہیں تک رہ جاتے ہیں"۔

غالباً میر صاحب کچھ سمجھے نہیں۔ لہذا انہوں نے کہا۔
"تو ان تمام باتوں سے آپ کا سلیس اردو میں مطلب کیا ہے"؟
ریاض نے شرارت سے کہا "سچ پوچھتے ہو۔ تو مطلب
یہ ہے کہ تم بی اے ہونے کے باوجود بودم کے بودم ہی
رہے۔ اور اسی طرح عام طور پر بہت سے بودم گریجویٹ
ہوتے ہیں۔ جو درسی کتب رٹ رٹ کر بی اے تو ہو جاتے ہیں
لیکن انسان نہیں رہتے"۔

میر صاحب نے تحقیر آمیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا "بھائی
صاحب یہ تو انگور کھٹے ہیں والا معاملہ ہے"۔

مسعود نے طنز آمیز قہقہہ دیتے ہوئے کہا "آج یہ پہلا
اتفاق ہے۔ کہ میر صاحب نے کسی ضرب المثل کو صحیح موقع
اور محل پر استعمال کیا ہے"۔

ریاض نے کہا "تو کیا آپ میر صاحب کو اپنے جیسا غیر
گریجویٹ سمجھتے ہیں۔ جناب وہ گریجویٹ ہیں۔ گریجویٹ یعنی
بی اے۔ یہ اور بات ہے کہ ریلوے ٹائم ٹیبل بھی پڑھنا نہیں آتا"!

میر صاحب مشتعل ہو کر اچھل پڑے "کیا آپ لوگ ہمیشہ ٹائم ٹیبل ٹائم ٹیبل کہا کرتے ہیں۔ کیا ٹائم ٹیبل دیکھ لینا کوئی کمال ہے۔ یا ٹائم ٹیبل کو نہ دیکھ سکنا کوئی خامی ہے میں کوئی ریلوے کا قلی تو ہوں نہیں کہ ٹائم ٹیبل پر عبور حاصل کرتا پھروں۔"

ٹائم ٹیبل والا قصہ میر صاحب کی دکھتی ہوئی رگ ہے اصل میں سال گذشتہ ہوا یہ تھا۔ کہ میر صاحب بی اے کا امتحان دینے علیگڑھ جا رہے تھے۔ اور چونکہ ٹرینوں کے اوقات میں جدید تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ لہذا آپ کو یہ نہیں معلوم تھا۔ کہ کسوقت کی ٹرین سے جانا چاہئے۔ اور آپ چند دن کے بعد گریجویٹ ہو جانے کے قبل از وقت زعم میں اسٹیشن سے جا کر ایک ٹائم ٹیبل خرید لائے۔ اور گھنٹوں اس ٹائم ٹیبل کو دیکھ بھال کر اپنے نزدیک اپنی روانگی کا وقت آپ نے طے کر لیا۔ اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔ جسدن آپ کو روانہ ہونا چاہئے تھا۔ اس دن بھی آپ اطمینان سے بیٹھے رہے۔ اور اپنے دیکھے ہوئے وقت پر معہ اپنے سامان کے اسٹیشن جا پہنچے۔ تھوڑی دیر تک ٹرین کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد یہ سمجھے۔ کہ ٹرین بہت لیٹ ہے۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد اپنی خودداری سے مستعفی ہو کر آپ نے قلی سے پوچھا کہ ٹرین کب آئے گی۔ اس نے جواب دیا کہ اسوقت تو کوئی ٹرین علی گڈھ جانے کے لئے نہیں ملسکتی۔ علیگڑھ سے آنے والی ٹرین ابھی آپ کے سامنے آ کر چلی گئی۔ اب ذرا میر صاحب سٹپٹائے۔ اس لئے کہ اگر واقعی اسوقت کوئی ٹرین نہیں ملتی ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ کل صبح کا پرچہ گیا۔ اور پرچہ جانے کے یہ معنی ہوئے کہ سال بھر اور انڈر گریجویٹ رہے۔ مگر آپ ٹائم ٹیبل کے مقابلہ میں قلی کی بات پر کیونکر یقین کر سکتے تھے۔ لہذا قلی سے "ہش" کہکر اسٹیشن ماسٹر کے کمرہ میں گھس گئے۔ اور وہاں بھی یہی مسئلہ چھیڑ دیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے بھی قلی کی تائید کی لیکن چونکہ میر صاحب کے پاس قانونی حوالہ یعنی ٹائم ٹیبل موجود تھا۔ لہذا آپ نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا:۔

"مجھکو افسوس ہے۔ کہ آپ غیر ذمہ دارانہ اور غلط اطلاع دے رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ کہ میرا بی اے کا امتحان محض اسی ٹرین پر منحصر ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر بیچارہ تھا شریف قسم کا انسان۔ اس کو ہنسی آ گئی۔ اور اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "جناب من مجھکو افسوس ہے کہ اگر اسی ٹرین پر آپ کا بی اے کا امتحان منحصر تھا۔ تو یہ ٹرین صبح ہی جا چکی۔ اب آپکو علیگڑھ کے لئے کل صبح سے پہلے کوئی ٹرین نہیں مل سکتی۔"

مگر میر صاحب اسٹیشن ماسٹر کی اس شرافت کے باوجود غصہ سے کانپ اٹھے۔ اور سوٹ کیس سے ٹائم ٹیبل نکالکر اسٹیشن ماسٹر کے سامنے دے مارا۔ کہ "یہ لیجئے جناب یا تو یہ ٹائم ٹیبل غلط ہے۔ ورنہ آپ کی اطلاع غلط ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر نے یہ کہتے ہوئے۔ کہ "یہ بھی صحیح ہے۔ اور میری اطلاع بھی صحیح ہے" ٹائم ٹیبل کھولکر میر صاحب کو علیگڑھ جانے کا وقت دکھا دیا۔ اب ذرا میر صاحب ڈھیلے ہوئے۔ مگر آپ نے جو وقت دیکھا تھا۔ وہ کیسے غلط ہو گیا۔ اس خیال نے آپ کو مجبور کر دیا۔ کہ ٹائم ٹیبل لیکر اپنی حماقت کا مدلل ثبوت پیش کریں۔ چنانچہ آپ نے اپنا دیکھا ہوا وقت نکال کر اسٹیشن ماسٹر کو دکھایا کہ:۔ "اور جناب یہ کیا ہے؟"

اسٹیشن ماسٹر نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "بی۔اے کا امتحان دینے سے قبل آپ کو چاہیئے تھا۔ کہ ٹائم ٹیبل کو بھی سمجھ لیتے۔ اور اپ اور ڈاؤن کے فرق کو ذہن میں رکھتے اپ ٹرین دیکھنے کے بجائے آپ نے ڈاؤن دیکھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آپ کا ایک سال برباد ہو گیا۔"

خیر اسٹیشن سے تو میر صاحب روتے پیٹتے واپس آ گئے مگر اب یہ حماقت بالائے حماقت ملاحظہ فرمائیے۔ کہ آپ نے یہ تمام قصہ من و عن اپنے تمام احباب کو سنا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹائم ٹیبل کا نام میر صاحب کی چڑ ہے اور جہاں کسی نے ٹائم ٹیبل کا نام لیا۔ میر صاحب خود اپنے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس وقت بھی میر صاحب کو غصہ آ گیا۔ اور ان کے غصہ سے تمام یارانِ میکدہ کو لطف حاصل ہوا۔

مسعود نے کہا "اچھا میر صاحب تم ٹائم ٹیبل کو جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ آجکل جرمنی کا بادشاہ کون ہے؟"

میر صاحب نے فوراً جواب دیا "ہر ہٹلر مگر شاید وہ بادشاہ نہیں۔ بلکہ صدر ہے۔"

ریاض نے کہا "ارے واہ رے میرے گریجویٹ شیرا"

مسعود نے ریاض کو روکتے ہوئے کہا "یہ غلط ہے جناب۔ ان کے لئے یہی بہت ہے۔ انہوں نے ہر ہٹلر کا نام بتا دیا۔ ورنہ آجکل بہت کم تعلیمیافتہ اس خاتون سے واقف ہیں۔"

میر صاحب نے اکڑ کر کہا "میں نے ان کا ذکر اسی وقت کسی جگہ پڑھا تھا۔ جب یہ جرمنی میں شروع شروع میں نمودار ہوئی ہیں۔"

ایک فلک شگاف قہقہہ نے میر صاحب کو چونکا دیا اور ابھی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آخر یہ حضرات کیوں ہنس رہے ہیں آخر ریاض نے خود ہی مسعود کو ایک دوہتڑ مارتے ہوئے کہا "تم ہو بڑے پاجی۔ لفظ خاتون کہکر اس غریب کو بہکا دیا۔"

میر صاحب نے چین بجبیں ہوتے ہوئے کہا "واہ رے بیوقوفو اگر خاتون نہ کہا جاتا۔ تو گویا میں سمجھتا ہی نہیں۔ کہ ہر ہٹلر عورت ہے۔ حالانکہ اس میں ہاتھ بھر کی علامت تانیث "ہر" لگی ہوئی ہے۔"

اب کے جو قہقہے کی باڑ بلند ہوئی۔ وہ پہلے فلک شگاف قہقہہ سے بھی بلند تھی۔ مگر مسعود نے فوراً ہی سنجیدہ بنکر کہا۔ "جیسے "ہر میجسٹی" "ہر ہائینس" وغیرہ ویسے ہی جرمنی کی ملکہ ہر ہٹلر کہلاتی ہے۔ کہتے کیوں نہیں۔"

میر صاحب نے منہ پھلا کر کہا۔ "نہیں صاحب ہم کچھ نہیں کہتے۔ آپ حضرات قابلیت میں بقراط کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز خاک نہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بہت کچھ ہیں۔"

ریاض نے ہنسی سے چھٹی پا کر آنسو پونچھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "میر صاحب مذاق تو خیر ختم ہوا مگر ہم ایمانداری کے ساتھ تم کو یہ رائے دیتے ہیں۔ کہ تم اخبار وغیرہ پڑھا کرو۔ ورنہ یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ آج اگر تعلیم یافتہ طبقہ میں تم بحیثیت گریجویٹ کے بیٹھو اور وہاں کوئی سیاسی اقتصادی یا معاشرتی مسئلہ چھڑ جائے تو تم اپنی اور اپنی ڈگری کی ساتھ ساتھ بھد کرا دو گے۔"

مسعود نے کہا "بھائی صرف اخبار دیکھنے سے کیا ہوتا ہے

یہ کہو کہ اپنا مطالعہ وسیع کریں۔ اب دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ صرف درسی کتابوں سے حاصل کیا ہوا علم کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ فرض کر لیجئے کہ انہوں نے اخبارات کے مطالعہ سے حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھی۔ تو اس کا کیا علاج ہے۔ کہ اگر کسی مجمع میں ادبی بحث چھڑ گئی۔ تو ان غریب کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہے۔ کہ ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

کس شاعر کا شعر ہے۔"

ریاض نے بات کاٹ کر کہا "نہیں یہ شعر تو غالب کا ہے۔ اسلئے کہ غالب کے تمام کلام پر ان کو عبور حاصل ہے۔"

میر صاحب نے جل کر کہا "نہیں بھائی ان کو کہنے دو۔ میں تو گویا کچھ جانتا ہی نہیں ہوں۔ اب ان کی شاگردی کرونگا۔ تو مجھکو سب معلوم ہوگا۔"

پھر ایک قہقہوں کا طوفان برپا ہوگیا۔ اور اس کے بعد پھر ریاض نے سنجیدگی سے کہا "اچھا تم ہی بتاؤ۔ کہ یہ ایک گریجویٹ یعنی ایک پڑھے لکھے کے لئے شرم کی بات ہے یا نہیں۔ کہ پڑھے لکھوں کے مجمع میں کوئی سیاسی مسئلہ چھڑ جائے اور ان حضرت کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ڈاکٹر اینی بیسنٹ کا کب انتقال ہوا۔

میر صاحب نے فوراً کہا "حال ہی میں تو مری ہیں"

ریاض نے کہا۔ "کیا کہا مرے ہیں"

میر صاحب نے کہا "جی ہاں۔ شاید آپ کو خبر بھی نہیں۔ وہ مر گئے"

یہ حال تھا کہ ہر ایک ہنسی کے مارے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اور میر صاحب غصہ سے سُرخ منہ کھولے ہوئے سوالیہ نشان کی طرح بیچ میں بیٹھے تھے۔ آخر پندرہ بیس منٹ کے بعد جب ذرا حواس بجا ہوئے۔ تو مسعود نے ہانپتے ہوئے کہا "میاں صاحبزادے وہ مرد نہیں عورت تھیں عورت"

میر صاحب نے ڈانٹ کر کہا "بکو مت۔ اگر وہ عورت تھیں تو یہ ریاض صاحب کی جہالت تھی کہ ان کو ڈاکٹر کہا ان کو لیڈی ڈاکٹر کہنا چاہیئے تھا ۔۔۔"

میر صاحب یہیں تک کہنے پائے تھے۔ کہ سب مارے ہنسی کے قلابازی کھا گئے۔ اور میر صاحب مارے تاؤ کے خدا جانے کیا بکتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

کل کے مذاق میں وہ اسقدر برہم ہوئے ہیں کہ شاید دس پندرہ روز تک ہم لوگوں سے نہ ملیں مگر سنا ہے کہ آج سے پانیر خریدنا شروع کیا ہے۔

سلکِ مروارید

کوئی شخص حقیقی معنوں میں سچا کہلانے کا مستحق نہیں۔ جب تک کہ اسکے الفاظ، حرکات، اور خیالات تینوں سچائی پر مبنی ہوں

مزدور کو اسکا پسینہ خشک ہونے سے پیشتر اسکی مزدوری ادا کردو۔

اعمال کی جزا و سزا نیت کے مطابق ہوگی۔

دولت ان لوگوں کے پاس نہیں جاتی۔ جو مسرف اور فضول خرچ ہوں

لالچی انسان کسی کے ساتھ نیکی نہیں کرسکتا۔ دولت کے لالچی ہمیشہ وہمی اور حالتِ غریبی میں رہتے ہیں۔

مقبرۂ ہیر رانجھا

(از شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی)

میں بسلسلہ ملازمت جھنگ جانے کیلئے پچھلے جون میں لاہور سے گذرا۔ تو مخدومی سردار جگت سنگھ صاحب مینیجنگ پروپرائٹر رہنمائے تعلیم ازراہ عنایت سٹیشن پر مجھ سے ملنے کیلئے تشریف لائے۔ دوران گفتگو میں منجملہ اور باتوں کے آپ نے یہ بھی فرمایا۔ کہ جھنگ جا رہے ہو تو قصہ ہیر و رانجھا کی بھی تحقیق کرنا۔ میں نے وعدہ کیا اور روانہ ہو گیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ تھا۔ کہ اس یادگار کو دیکھا جائے جو ہیر رانجھا کے مقبرہ کی شکل میں جنگل میں اکیلی کھڑی حسرت کے ساتھ آنے جانے والوں کو تک رہی ہے۔ ملازمت کی مصروفیتیں اور کام کی زیادتی بہت دنوں تک مجھے اُدھر نہ لے جا سکی۔ اگرچہ دفتر سے فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ کچھ سردار صاحب کے کہنے کا خیال کچھ اپنا شوق۔ آخر ایک روز شام کو میں اپنے عزیز دوست میاں ناصر علی صاحب بی اے ریکارڈ کیپر صاحب ڈپٹی کمشنر کو ساتھ لے کر مقبرہ کی زیارت کو گیا۔ مگھیانہ سے جائیں۔ تو جیلخانہ اور پولیس لائن کے درمیان سے جو سڑک گذرتی ہے۔ اس کو عبور کرنے کے بعد کچھ فاصلہ پر جھنگ شہر اور مگھیانہ کے درمیان کھیتوں کے بیچ میں ایک خاصے اونچے ٹیلے پر اس حسرت نصیب دوشیزہ کا مزار دور سے نظر آتا ہے۔ جو حسرت و ارمان کی ایک دنیا اپنے سینے میں لئے ہوئے اس جہان سے ناشاد اور نامراد اٹھ گئی۔ فانی اور زوال پذیر دنیا کا جیسا دردانگیز نظارہ میں نے جھنگ میں ہیر کے مقبرے اور پانی پت میں سلطان ابراھیم لودھی کی قبر کی صورت میں دیکھا اتنا اثر بے ثباتی دنیا کا کسی اور نقش کو دیکھکر میرے دل میں نہیں ہوا۔ ہاں میں بھولا۔ بھوپال کی شکستہ و خستہ شاہجہان مسجد ان دونوں سے زیادہ میرے لئے باعث رقت ہوئی تھی۔ خیر یہ کہانی طویل ہے۔ مجھے تو اسوقت ہیر کے مقبرہ کا ذکر کرنا ہے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ ہیر کا مقبرہ ایک اونچے ٹیلے پر بنا ہوا ہے۔ اور اسپر بھی نو سیڑھیاں چڑھکر مقبرہ کا دروازہ آتا ہے۔ مقبرہ کا دروازہ نہایت سادی وضع کا معمولی موٹی موٹی اینٹوں سے خاصا اونچا اور چوکور بنا ہوا ہے۔ جنوب کی طرف سے مقبرہ کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ شمال اور مشرق کی طرف دو معمولی کھڑکیاں ہیں۔ جن میں سے شمال والی کھڑکی ہمیشہ بند رہتی ہے۔ مغرب کی طرف دیوار میں کوئی کھڑکی نہیں۔ سنتے ہیں کہ اسکی وجہ یہ تھی۔ کہ ہیر وصیت کر کے مری تھی۔ کہ للہ! ادھر کی طرف کوئی کھڑکی مت رکھنا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ ادھر سے کوئی ہوا آ کر میری قبر کو چھوئے۔ (کیونکہ ادھر کی طرف وہ شخص رہتا تھا جس کے حوالے ہیر بجائے رانجھا کے کر دیگئی تھی) قبر معمولی اینٹ مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ مگر اسکی تعمیر کچھ اسطرح کی گئی ہے۔ کہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کسی دلہن کا پلنگ رکھا ہوا ہے۔ مقبرہ کی چھت قبر کے اوپر سے گولائی نما کھلی ہوئی ہے۔ اور مشہور ہے کہ کچھ اس ترکیب سے بنائی گئی ہے کہ چاہے کتنی ہی بارش ہو۔ کوئی قطرہ پانی کا

نیچے قبر پر نہیں گریگا۔ نہ معلوم یہ روایت کہاں تک سچ ہے۔ کیونکہ فوراً بارش کے بعد کبھی اُدھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا
قبر کے درے کونے میں ایک صندوقچی بھی اینٹوں میں پیوست کی ہوئی رکھی ہے جس پر لکھا ہے۔ کہ زائرین جو کچھ
چاہیں۔ اسمیں ڈال دیں۔

مقبرہ کے ساتھ ہی ایک پختہ چھوٹی سی مسجد تھوڑا عرصہ ہوا بنادی گئی ہے۔ تاکہ آنے جانے والے وہاں نماز کے اوقات میں نماز ادا کر سکیں۔ مقبرہ کے نیچے ٹیلے پر بہت سی کچی قبریں مختلف لوگوں کی بنی ہوئی ہیں۔ جن میں سے بعض پر کتبے بھی لگے ہوئے ہیں۔ ایک بڑے اونچے بانس پر ایک جھنڈا بھی لہلہا رہا ہے۔ نہ معلوم اس کا مقصد کیا ہے۔ مقبرہ کے دور سے معلوم ہونے کے لئے اگر اڑایا ہے۔ تو غالباً بے سود رہا۔ کیونکہ مقبرہ کافی بلندی پر واقع ہے اور بہت دور سے نظر آتا ہے مقبرہ کے نیچے جنوب کی طرف چند گھروں کی ایک چھوٹی سی بستی بھی بس گئی ہے۔ شاید پچاس ساٹھ گھر ہونگے۔ ہم نے دور سے دیکھا اکثر مکان پختہ بنے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ سال میں ایک مرتبہ اس مقبرہ پر ایک میلہ بھی لگا کرتا ہے۔ جو ناشادہیر کا عرس سمجھئے۔ لوگ اِدھر اُدھر سے جمع ہو جاتے ہیں اور خاصا بازار لگ جاتا ہے کچھ چڑھاوا مجاوروں کو مل جاتا ہے۔ کچھ سودے والوں کی بکری ہو جاتی ہے۔ اور بس! ..... میں نے چاہا کہ اس تاریخی مقبرہ کا فوٹو رہنمائے تعلیم کیلئے سردار صاحب کی نذر کروں۔ اتفاق سے انہی دنوں میرے محترم دوست مولوی عبدالرحمٰن صاحب الور مولوی فاضل جھنگ میں وارد ہوئے۔ ان کے پاس کیمرا تھا میں نے اپنی خواہش کا اظہار اُن سے کیا۔ چنانچہ وہ ایک صبح مجھے اپنے ساتھ مقبرہ پر لیگئے فوٹو لیا گیا اور الحمدللہ کہ نہایت صاف۔ واضح اور روشن آیا۔ جسے ناظرین مضمون کے ساتھ ملاحظہ فرمارہے ہیں

یہ ہے اُس امنگوں اور ولولوں بھرے دل کی آرامگاہ۔ جسنے دُنیا میں آکر کوئی سُکھ نہ پایا۔ آئندہ کی دلخوش کُن امید پر جی رہی تھی۔ کہ یکایک رشتہ حیات ہی قطع ہو گیا۔ اور سب کچھ دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ اُس نامراد نوجوان کے رنج و الم کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ جس نے اپنی عمر کا بیش بہا حصہ ہیر کے حاصل کرنے کی کوشش میں صرف کر دیا۔ اور صد ہزار افسوس کہ جسوقت منزل مقصود بالکل قریب رہ گئی اور رانجھا کو امیدیں چمکتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ تو عین اُسوقت خرمن اُمید پر بجلی گری۔ اور اُس نے دیکھا کہ ہیر کی قبر پر حسرت والم کی بارش ہو رہی ہے۔ اپنی پُر مسرت امیدوں کا یہ حسرتناک انجام رانجھا برداشت نہ کر سکا۔ قبر سے لپٹا اور ہمیشہ کی نیند سو گیا *

اس موقع پر آخر میں مَیں ایک غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ عام طور پر مشہور ہے۔ کہ ہیر اور رانجھا ایک ہی قبر میں مدفون ہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ جب ہیر کی قبر پر پہنچکر رانجھا کا دم یکایک نکل گیا۔ تو اس کے ساتھ والے روتے پیٹتے اُسے اُٹھا کر لیگئے۔ اور اس کے گاؤں تخت ہزارہ میں لے جا کر دفن کر دیا " مقبرہ ہیر رانجھا " شاید اس مناسبت سے نام پڑ گیا ہو کہ اُس ہیر کا مقبرہ جو رانجھا کی تھی " ورنہ حقیقت یہ ہے کہ رانجھا یہاں دفن نہیں ہے۔
میں مصالحہ جمع کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کبھی یہ داستان درد غم تفصیل و تحقیق کے ساتھ بیان کر سکوں * (محمد اسمٰعیل پانی پتی)

شاہ عالم اور رام گور

(از جناب طالب بی۔ اے الہ آبادی)

داتا! کیسی ہوا چلی ہے
پتّے پتّے کو بے کلی ہے

کیوں ہو گئی کور چشم نرگس
سوسن کی زبان کیوں ہے بے حس

پھولوں میں نہیں ہے خوئے الفت
کلیوں میں نہیں ہے بوئے الفت

بھائی سے بھائی لڑ رہے ہیں
ناحق ناحق جھگڑ رہے ہیں

بے وجہ ضدیں بڑھا رہے ہیں
اپنی قوّت گھٹا رہے ہیں

بھارت ماتا سسک رہی ہے
ہمدرد کی راہ تاک رہی ہے

کہتی ہے کوئی سُنے یہ نالے
آلے ہیں مرے جگر کے چھالے

خالی ہے پریم سے جو سینا
آنکھیں تو ہیں پر نہیں ہو بینا

میری فریاد تم جو سُنتے
شعلے کی طرح سر اپنا دھُنتے

ذرّے ہشیار ہو چکے ہیں
قطرے بیدار ہو چکے ہیں

دنیا جاگ اُٹھی ہے مگر تم
اب تک سوتے ہو بے خبر تم

کیوں موت کی نیند سو رہے ہو
جو کچھ ہے گرہ میں کھو رہے ہو

چڑھ آئی ہے دھوپ جاگو جانی
چونکو تو سناؤں اک کہانی

ہیں سو دو سو برس ادھر کی باتیں / دن عید تھے شبرات راتیں

تھا ہند میں میل جول ایسا / گنے اور شکر کا ساتھ جیسا

یوں رہتے تھے مسلم اور ہندو / جس طرح سے عطر میں ہو خوشبو

جب سے ہوئے شاہ شاہ عالم

محکوم نوازیاں تھیں پیہم

اک رام کور برہمنی تھی / منہ بولی بہن وہ شاہ کی تھی

جب رام کور محل میں آتیں / آنکھیں شہزادیاں بچھاتیں

رخصت ہو کر جو سب سے جاتیں / ملکہ پہنچانے در تک آتیں

سب اس لئے تھا کہ والد شاہ (شاہ عالمگیر ثانی)

مارے گئے کوٹلے میں ناگاہ (فیروز شاہ دہلی)

جمنا جی میں بہی تھی وہ لاش / ترتی ہوئی آ رہی تھی وہ لاش

یاں رام کور بھی منہ اندھیرے / اشنان میں تھیں بڑے سویرے

آ کر لگا گھاٹ سے جو لاشہ / پس دوڑ پڑیں وہ بے تحاشہ

باہر کھینچا وہ جسم بے جان / بیٹھی رہیں صبح تک ہراساں

ہوتے ہی سحر یہ سب نے جانا / شہ ہو گیا مکر کا نشانا

مقتول کا ہو چکا جو ماتم

بیٹھے گدی پہ شاہ عالم

عزت یوں شاہ نے بڑھائی / اس دن سے بہن وہ تھیں یہ بھائی

بھارت جب جہاں میں آتی / ہر چیز میں روح دوڑ جاتی

وہ دیکھئے جشن ہو رہا ہے
تہوار سلونو کا مچا ہے

جھولے پر لوگ چڑھ رہے ہیں — الفت کے پینگ بڑھ رہے ہیں
چولھے پہ کڑھائیاں ہیں ہر سو — پکوان کے تلنے کی ہے خوشبو
مسند پہ ہیں بیٹھے شاہ بھائی — مُنہ بولی بہن وہ ہنستی آئی
قطبی طلا ادا سے کھولی — سمرن ہاتھوں میں لے کے تولی
سچّے موتی چمک رہے ہیں — بجلی کی طرح دمک رہے ہیں

باندھی جو کلائی میں وہ سمرن
تب ہو گئی پوری راکھی بندن

لو عزتیں شاہ نے بڑھا دیں — ہیرے کی چوڑیاں پہنا دیں
اب شالے دوشالے بٹ رہے ہیں — دکھ درد جنم کے کٹ رہے ہیں
شاداں ہیں برہمن اور درویش — رقصاں ہیں برہمن اور درویش
رجپوت بھی اور مغل بھی نازاں — موتی سے بھرے ہوئے ہیں داماں
بڑھ بڑھ کے اسیس دے رہے ہیں — مُنہ مانگے دان لے رہے ہیں

ہے رقص و سرود کا وہ عالم
ہر اک ہے مسرّت مجسّم
ہے شور رچھابلی سلامت — بڑھتا رہے جاہ تا قیامت

اے کاش زمانہ بدلے پہلو
آ جائے وہی بہار ہر سو
یوں ایک ہوں مسلم اور ہندو
نہریں دریا میں گل میں خوشبو

(طالب الہ آبادی بی اے)

غزل

(ماسٹر باسط بسوانی)

جو آئے ہو یہاں۔ آتش بیانی دیکھتے جاؤ
لحد پر شمع کی شعلہ زبانی دیکھتے جاؤ

ذرا تم اپنے خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ
قسم ہے تمکو میری سخت جانی دیکھتے جاؤ

سراپا سوز مثلِ شمع ہوں پر اُف نہیں کرتا
زباں ہونے پہ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

بُتو شانِ خدا بھی تم کو کہہ کر جی نہیں بھرتا
ابھی کیا ہے۔ ہماری حق بیانی دیکھتے جاؤ

ذرا سنبھلے ہوئے اے عاشقو بحرِ محبت میں
کہیں سر سے گزر جائے نہ پانی دیکھتے جاؤ

جو تم چاہو وہی اچھا جو تم کہدو وہی بہتر
ہماری ہمخیالی ہمزبانی دیکھتے جاؤ

خلاصہ ہے نگاہِ واپسیں افسانہ غم کا
مرے جذباتِ دل کی ترجمانی دیکھتے جاؤ

کہاں پہ پاؤں رکھتے ہو۔ کہاں پہ پاؤں پڑتا ہے
ذرا تم لغزشِ کیفِ جوانی دیکھتے جاؤ

نظر بھر کر تمہیں کب دیکھنے دیتا ہے یہ ظالم
دلِ رشک آشنا کی بدگمانی دیکھتے جاؤ

ابھی آغاز ہے افسانۂ الفت کا ہنستے ہو
رلائیگی تمہیں میری کہانی دیکھتے جاؤ

تمہارا نام سب لیتے ہیں اور آنکھیں نہیں کھلتیں
ذرا بیمارِ غم کی ناتوانی دیکھتے جاؤ

نہ کچھ اس کی حقیقت ہے نہ باسط اعتبار اس کا
طلسمی گھر ہے یہ دنیائے فانی دیکھتے جاؤ

قصہ دلچسپ ہے مگر جو نتیجہ اس سے اخذ کیا گیا ہے وہ درست نہیں۔ اگر ہر شخص اس کی پیروی میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سنیاس لے اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر بے تعلق ہو جائے تو دم کے دم میں یہ آباد دنیا ویران ہو جائے۔ بہادر۔ عالی ہمت اور حقیقی ریفارمر وہ شخص ہے جو دُنیا میں رہ کر دنیا والوں سے تعلقات رکھ کر اُن کی اصلاح اور فلاح میں کوشش کرتا ہے۔ نہ کہ وہ جو گھبرا کر ہر قسم کے تعلقات سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اسماعیل

خوبصورت اور وفا شعار بیوی کی محبت، معصوم اور اکلوتے لڑکے کا پیار اور بوڑھی ماں کا خیال بابو آتما نند کے راستے میں حائل نہ ہو سکا۔ سردیوں کی ایک ابر آلود رات میں وہ اپنے عزیز ترین متعلقین کو ایک حسرت بھری نظر سے دیکھ کر گھر سے نکل پڑے۔ دُنیاوی جاہ وحشم کی فراوانی تھی۔ عیش وعشرت کے وسائل میسر تھے۔ جائداد معقول ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ تھی۔ لیکن یہ سب باتیں انکی وسیع النظری کے نزدیک بے وقعت اور کم مایہ تھیں۔ انہیں ایک اور ہی دُھن تھی اور وہ اُسے پورا کرنے کے لئے ہر ایک چیز کو قربان کرنے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ دُنیا کی عارضی آسائش انکے نزدیک خود غرضی اور تن پروری کے مترادف تھیں۔ وہ انسان جو بہبودیٔ خلائق کے لئے ذرا بھی مصیبت برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ دُنیا پر ایک بوجھ ہے۔ اخلاق کے نام پر ایک کلنک کا ٹیکا اور صفحۂ عالم پر ایک بدنما داغ ہے۔ اس کی ہست اور نیست میں کوئی فرق نہیں۔ ایام طفولیت سے آج تک انہوں نے خدمتِ خلق کے بہت سے کارہائے نمایاں کئے۔ ان کا رحجان طبعی اس طرف تھا۔ وہ ہمیشہ یہ محسوس کرتے کہ یہ تموّل، امارت اور خانہ داری کی زنجیریں میری آزادی میں بُری طرح حارج ہیں۔ اور وہ تسکینِ قلب جو لاُابالیانہ خدمتِ خلق میں میسّر ہو سکتی ہے۔ مجھے یہاں ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس ادھیڑ بُن میں بہت عرصہ گزر گیا مگر آخر انہوں نے اپنے عزم کو استوار کرکے اسے جامۂ عمل پہنانے کی ٹھان ہی لی۔

سردی کا سخت موسم۔ اندھیری رات۔ آسمان پر بادلوں کی گرج۔ ایک مہیب اور ہولناک منظر تھا مگر ناز ونعم میں پلے ہوئے بابو آتما نند جوشِ خدمت کا خیال دل میں لئے ہوئے ایک روحانی کیف میں مست، اپنے آپ کو خانگی قیود سے آزاد سمجھ کر اس طرح چل نکلے جس طرح شکاری کے جال سے نکل کر کوئی پرندہ فضا میں آزادی سے اُڑتا ہو۔

صبح ہوتے ہی گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ بدنصیب پریم لتا اپنے پتی دیوتا کو کھو کر دیوانہ وار سر پٹکتی تھی۔ معصوم چندر

اپنی ماں کی ان مجنونانہ حرکات کو دیکھ کر سہما ہوا اپنی بوڑھی دادی کی گود میں بلک رہا تھا۔ لیکن بابو جی کی بوڑھی ماں خلاف توقع متحیر اور پریشان نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نورمسرت کی چمک نظر آرہی تھی۔ وہ غالباً خوش تھی کہ اُس کا لختِ جگر اُس کے خیالات پر عمل پیرا ہوتا ہوا میدان عمل میں کود پڑا ہے۔ اس نے پریم لتا کو دلاسا دیتے ہوئے اُسے صبر کی تلقین کی اور تسلیم و رضا کا سبق دیا۔ اس نے کہا مبارک ہیں وہ برگزیدہ ہستیاں جو گرہست کی پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتی ہوئی دُنیا کے کام آتی ہیں۔ مبارک ہے میرا لختِ جگر جو گمراہ دُنیا داروں کے لئے مشعلِ ہدایت بن کر انہیں گناہ اور فریب کی زندگیوں سے نفرت دلائیگا۔ انہیں پاکیزگی اور تقدس کا سبق دیگا۔ خدا کی وحدانیت اور صداقت کے نور سے اُن کے دلوں کے آئینوں کو مجلا کریگا جو کفر و ضلالت سے زنگ آلودہ ہوچکے ہیں۔ بیٹی! جب میں نے اُسے تربیت ہی یہ دی تھی اور جب میں اُس کے راستہ میں ذرا بھی حائل نہ ہوئی تو تُو بھی اس کے اس طرح بلا اطلاع چلے جانے پر غم نہ کر اس سے اس کی رُوح کو جہاں بھی وہ ہوگا ایک صدمۂ عظیم پہنچے گا۔ وہ جس میدانِ عمل میں تن تنہا نکلا ہے اسے وہاں کامیاب ہونے کے لئے دعائے خیر کر!

ساس کے اس بہادرانہ ایثار کو دیکھ کر پریم لتا کے حواس بجا ہوئے اور وہ اس بات پر فخر محسوس کرنے لگی کہ اسکی اُمیدوں کا سہارا؟ اس کی زندگی کا دائمی ساتھی اس سے جدا ہوکر بھی اس کے لئے مایۂ صد افتخار ہے۔ وہ ہمیشہ اُسے اپنے تصور کا مضمون اور تخیل کا موضوع قرار دیگی اور اس کی تمام دعائیں اس کی کامیابی کے لئے صرف ہوتی رہیں گی۔

اسی طرح بہت سال گزر گئے اور بابو آنند کا کوئی پتہ نہ تھا۔ چندر پرکاش کی عمر پندرہ سولہ سال کی ہوچکی تھی۔ باپ کی غیر حاضری کو اوّل اوّل تو اُس نے بہت محسوس کیا مگر جب وہ نیک و بد میں تمیز کرنے کے قابل ہوا اور ماں کی تعلیم کا اُس پر اثر پڑا تو اُس نے اپنے غم کو غلط کرنے کے لئے اس خیال کو دل میں جگہ دی کہ وہ بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر خدمتِ خلق میں اپنی زندگی گزار دیگا۔ بابو آنند کی ماں اس عرصے میں پوتے اور بہو کے لئے سہارا بنی رہی مگر آخر اس کا وقت آپہنچا اور وہ انہیں صبر و تسکین کا سبق دیتی ہوئی اس دُنیا سے چل بسی۔

پریم لتا اب صبر مجسم تھی۔ پتی کی طویل فرقت کا غم سہہ کر وہ اس قابل ہوچکی تھی کہ مصائب کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرسکے۔ معاش کی اسے کوئی فکر نہ تھی۔ کیونکہ جائداد کی آمدنی کافی سے زیادہ تھی۔

چندر پرکاش اب جوان ہورہا تھا۔ فلاح عامہ کے کاموں سے اُسے فطری مناسبت تھی۔ اپنے ہم عمروں میں اسے خاص رسوخ اور وقار حاصل تھا۔ چھوٹے بڑے سب اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ مقامی کالج کا طالبعلم تھا اور کالج کے طلبا کی مجلس کا معتمد عمومی۔ پریم لتا بھی کچھ نہ کچھ عورتوں کی ترقی اور بہبودی کے لئے کرتی ہی رہتی تھی چنانچہ اُس نے اپنے خرچ سے نزدیک کے دیہات میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے دو سکول کھول دیئے۔ اور وہ صوبے کی انجمن خواتین کی مجلس عاملہ کی رُکن مقرر ہوچکی تھی۔

ہاں بیٹا جب اکٹھے بیٹھتے تو بار ہا باپو جی کے متعلق ذکر آجاتا۔ بیٹے کو اپنے باپ سے سن اور عمر کے ساتھ محبت بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ انہیں اپنا روحانی گورو بھی سمجھتا تھا۔ چنانچہ وہ ان کی ایک پرانی تصویر ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتا۔ ایک دن اُس نے اپنی ماں سے ذکر کیا کہ آج انکے کالج میں بین الاقوامی شہرت کے سوامی شنکرانند جی کی تقریر ہوگی۔ اخباروں میں آج کل اِن کے متعلق بہت کچھ لکھا جارہا ہے۔ مغربی ممالک میں سالہاسال انہوں نے بین الاقوامی یگانگت اور اخوت عامہ کا پرچار کیا ہے۔ مشرق اور مغرب دونوں نے انہیں خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔ امریکہ اور یورپ کی بہت سی یونیورسٹیوں میں انہوں نے طلبا کے سامنے اپنے نیک فلسفہ کے متعلق تقریریں کی ہیں۔ حال ہی میں وہ اپنا پیغام سُنانے کے لئے ہندوستان میں تشریف لائے ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی ہندوستان میں کوئی تقریر نہیں کی۔ سب سے پہلے ہمارے صوبہ نے ان کو دعوت دی تھی اور آپ کو سُنکر مسرت ہوگی کہ کالج کے طلباء کی مجلس کے معتمد عمومی ہونے کی حیثیت سے میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگیا ہوں کہ انکی تقریر سب سے پہلے ہمارے کالج میں ہو۔ آج میں اس ذی شان ہستی کا تعارف حاضرین سے کراؤنگا۔ اور میرے لئے یہ باعث فخر ہوگا ماتاجی! آپ ضرور تشریف لائیں۔ آج کا دن ہمارے کالج کی زندگی میں یادگار رہے گا۔

کالج میں خوب چہل پہل ہورہی تھی۔ حاضرین کی تعداد اُمید سے زیادہ تھی۔ عمائدین شہر اور وکلا کی خاصی تعداد پہنچ چکی تھی۔ چندر پرکاش انتظام میں بڑی سرگرمی سے منہمک تھا۔ وقت مقررہ پر سوامی جی کالج کے پرنسپل کے ساتھ ہال میں تشریف لائے۔ ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ ہر شخص شوق سے بیتاب نظر آتا تھا۔ مگر چندر پرکاش ایک کونے میں ساکت ومبہوت کھڑا تھا۔ اس نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور اسے دیکھ کر سوامی جی کی طرف دیکھا۔ تصویر پھر جیب میں رکھ لی۔ ایک بے پناہ جوشِ عقیدت لئے ہوئے سٹیج پر آکھڑا ہوا۔ وہ سوامی جی کا تعارف حاضرین سے کرا رہا تھا۔ جس فصاحت سے اس نے سوامی جی کی تعریف کی اور جس عقیدت سے انکے خیالات کو سراہا اُسے دیکھ کر ہر شخص یہ پیشین گوئی کر رہا تھا کہ یہ لڑکا ایک نہ ایک دن ایک زبردست لکچرار اور ریفارمر ہوگا۔

بیٹا باپ کو پہچان چکا تھا مگر باپ کو یہ علم نہیں تھا کہ چندر پرکاش اس کا اپنا لڑکا ہے۔ سوامی جی اپنے شہر کی دعوت پاکر خوش ہوئے تھے۔ اب وہ سوامی شنکر انند تھے۔ بابو آتما نند نہیں تھے کہ بیوی بچہ یا دوست احباب کے تعلقات میں پھنس کر اپنا راستہ چھوڑ دیتے۔ انہیں اب چھپ کر رہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ انہیں خیال تھا کہ دورانِ تقریر ہی میں سب کو حاضرین میں سے پہچان لونگا۔ انہوں نے بیٹھے ہوئے غور سے دیکھا تو پریم لتا وہاں تھی ہاں چند دوست نظر آرہے تھے جو ان کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ سوامی جی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ خاموشی کا عالم طاری ہوگیا اور وہ یوں کہنے لگے۔

بھائیو اور بہنو! نفسانی دُنیا میں رہ کر جو انسان اپنی حقیقت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ وہ انسانیت کے مفہوم کو نہیں سمجھتے۔ مختلف مذاہب کے پیرو اگر ایک دوسرے کے ساتھ یگانگت اور صلح و آشتی کا برتاؤ رکھیں تو سب کے سب مذہب اچھے ہیں۔ سچائی انسانیت کا دوسرا نام ہے اور پاکیزگی اس کا جزوِ لاینفک۔ گناہ کے تلاطم خیز سمندر کے تھپیڑوں سے بچو اور اپنی ہستیوں کی نازک کشتیوں کو بچاؤ۔ ہوا و حرص خود غرضی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور خود غرضی عیش و عشرت سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان اپنے لئے جس قدر آسائش اور سہولتیں چاہتا ہے اسی قدر خود غرض بن جاتا ہے۔ کمزوروں کو کمزور نہ سمجھو۔ طاقت کا ناجائز استعمال حماقت ہے۔ یکسانیت کا سبق سیکھو۔ سارے انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ تنگ خیالیوں کو ترک کر کے وسیع النظر بنو تاکہ تسکینِ قلب جیسی بے بہا نعمت پا سکو۔"

سوامی جی تقریر کر رہے تھے اور دوران تقریر میں خاموشی کا عالم تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ حاضرین میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے گناہوں کا احساس ہو رہا تھا۔ لفظ سیدھے سادے تھے۔ کوئی دُھواں دھار اور جوشیلی تقریر نہ تھی۔ مگر سب کے دلوں پر ایک خاص اثر ہو رہا تھا۔ تقریر کے دوران میں چندر پرکاش نے سوچا کہ میں بھی اپنے آپ کو خدمتِ خلق کے لئے کیوں وقف نہ کر دوں۔ باپ کے سامنے سرِ نیاز جھکا کر اس کا صحیح معنوں میں مرید کیوں نہ ہو جاؤں۔ لیکن مجھے دیکھ کر وہ متزلزل تو نہ ہو جائیں گے۔ بیوی اور بیٹے سے مل کر انہیں خوشی تو ضرور ہو گی مگر کیا اسی سے ان کی ریاضت شاقہ آلودہ تو نہ ہو جائے گی۔ جنہیں انہوں نے اپنی خوشی سے چھوڑ دینے میں بہتری سمجھی وہ اب اُنکے دامن سے الجھیں تو کیا یہ بجا ہے؟ یہ سوچتے سوچتے اس کے خیالات نے دوسرا رُخ اختیار کیا۔ پیشتر اس کے کہ تقریر کے بعد ان پر یہ ظاہر ہو کہ میں ان کا لڑکا ہوں مجھے بھی ان کے فطری ایثار کا تتبع کرنا چاہئے۔ ان کے دوست احباب انہیں پہچان رہے ہیں اور اب یہ بات چھپی ہوئی نہیں رہے گی کہ سوامی جی در اصل میرے پتا بابو آتمانند ہیں۔ یہ سوچ کر وہ اُٹھا اور باہر آ گیا۔

اُس نے گھر کا رُخ کیا اور سوچنے لگا "ماتا جی تشریف نہ لائیں۔ یہ بہت اچھا ہُوا ورنہ میرے تمام ارادے ناکام رہتے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں اور ماتا جی اب پتا جی سے ملیں۔ اس ایثار کے دیوتا کی برسوں کی ریاضت کو ذرا بھی متزلزل کرنا ایک گناہِ عظیم ہو گا۔ چل کے ماتا جی سے ذکر کرتا ہوں۔ ان سے سارا قصہ بلا کم و کاست کہونگا۔ اور اگر انہوں نے اجازت دی تو پتا جی سے ملے بغیر کہیں چل دونگا۔ لیکن ماتا جی کا بھی تو یہاں رہنا درست نہ ہو گا۔ پتا جی کے دوست احباب ابھی ان کو پتا جی سے ملانے کے لئے لے جائیں گے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے سخت امتحان کا سامنا ہے۔ اسی متذبذب حالت میں وہ گھر پہنچا۔ اور اس خیال سے کہ ماتا جی مجھے درست راستہ بتائینگی۔ وہ اندر داخل ہُوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ماتا جی گھر پر نہیں ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ میز پر ایک رقعہ نظر آیا وہ اُسے پڑھنے لگا۔

پیارے چندر! بس اب تو جوان ہو چکا۔ سن تمیز کو پہنچ چکا۔ ضمیر کی آواز صبح ہی کہہ رہی تھی کہ سوامی شنکرانند دراصل تمہارے پتا ہونگے۔ تمہارے کہنے کے مطابق دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ تقریر سُننے کے لئے گئی مگر ذرا دیر سے نکلی۔ کالج کے ہال کے دروازے کے باہر ہی تھی کہ اُن کی آواز سُنی۔ دو قدم آگے بڑھ کر دیکھا تو صاف نظر آگیا۔ پتی دیو اپنے پُرجلال چہرے کے ساتھ کھڑے دیوتاؤں کی طرح محبت اور پریم کا عالمگیر پیغام حاضرین کو دے رہے تھے۔ مجھے کسی نے دیکھا نہیں۔ میں اسی طرح واپس لوٹ آئی۔ میں آج تک زندہ رہی۔ صرف تمہیں اس قابل بنانے کے لئے کہ تم دُنیا میں کسی قابل ہو سکو۔ اور اپنے پتا جی کے نقشِ قدم پر چل سکو۔ اتنی ہی مدت کے بعد تمہارے پتا جی کو دیکھ کر مجھے قدرتاً خوشی نصیب ہونی چاہئے تھی مگر اس سے ملنے کی خواہش کی بہ نسبت مجھے ایک اور بات زیادہ عزیز ہے اور وہ اُن کا ایثار ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ ان کی اتنی مدت کی کمائی کو رائگاں کھو دوں یا اس کی قیمت کو ذرا بھی کم کروں۔ اس لئے میں خود ہی دُور رہتی ہوں۔ میں اپنی زندگی عورتوں کی مجلسی حالت کو بہتر بنانے کے لئے صرف کر دونگی۔ ہندوستانی عورتوں کا مجلسی درجہ بہت پست ہے۔ اُن میں تعلیم کا بھی فقدان ہے۔ اور یہی دو باتیں ہیں جن کو دُور کرنے کے لئے میں گھر سے نکلتی ہوں۔ تم اپنے لئے جو راستہ چاہو اختیار کر لو۔ ....

.... میں جانتی ہوں کہ تم اب اپنے لئے مناسب لائحہ عمل منتخب کر سکتے ہو۔ میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ ممکن ہے کبھی تم سے یا تمہارے پتا جی سے ملنے کا اتفاق ہو مگر وہ ملاپ کسی دُنیاوی محبت یا رشتہ کی بنا پر نہیں ہوگا بلکہ خلقِ خدا کے ادنٰے خادموں کی حیثیت میں ہم خیال رضا کاروں کا ملاپ ہوگا۔"

چندر نے خط پڑھ کر خط وہیں رکھ دیا اور یہ کہتا ہوا گھر سے باہر چل دیا۔

"باپ کا ایثار تو بے مثال تھا ہی ماں کا ایثار اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ مجھے بھی اپنے والدین کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہئے"۔

عقل کی باتیں

اگر تمہیں حقیقی زندگی کی جستجو ہے۔ تو فراخ سڑکیں اور عظیم الشان عمارتیں چھوڑ کر تنگ و تاریک گلی کوچوں اور ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں چلے جاؤ۔

امارت کی زندگی تصنع کا دوسرا نام ہے اور تہذیب انسانی فطرت کی منافقت کا۔

غریب اصلی زندگی بسر کرتے ہیں اور اُمرا مصنوعی۔ امیر چند ہیں۔ اور غریب لاتعداد۔

دُنیا کو وضع کرنے اور تعلیم دینے والا مرد ہے۔ لیکن مرد کو تعلیم دینے والی عورت۔

عقل مند بے عقل مند آدمی بھی جاہل کسان سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔

انسان مطالعہ سے مکمل مشورہ سے مستعد اور تصنیف سے درست بنتا ہے۔

نئی زندگی

(از جناب کرتار سنگھ صاحب پاتنج)

قریب المرگ نے دنیا کو نظرِ حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا "حیف! اب مجھے اس دنیا کو خیرباد کہنا ہوگا"۔

معاً اس خیال کے آ جانے سے اس کی حالت میں نمایاں تغیر آ گیا اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

اپنے پرائے سبھی نے دلجوئی کی۔ مگر موت کا سکہ اس کے دل میں اچھی طرح سے جم چکا تھا۔

روتے روتے اس نے آنکھیں بھر لیں اور دنیا سے تعلق منقطع کر لیا۔

اسی وقت تمام کنبہ میں کہرام مچ گیا۔ اور آہ و بکا کے پُر حسرت شور نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس کے بعد صرف اتنا ہی بتلا دینا کافی ہے کہ مرحوم کو مذہبی رسومات کے مطابق دفنا دیا گیا۔

(۲)

ریاض کو مرے ہوئے آج تقریباً ۲ سال گزر چکے ہیں۔ دنیا سے اس کا نام و نشان مٹ چکا ہے اور دلوں سے اسکی یاد محو ہو چکی ہے۔

وہ بیچارا اپنی تمام زندگی میں ایک مفلوک الحال اور صابر شخص رہا۔ کنبے بھر کا گزارہ اسی کی وساطت سے چلتا تھا۔

وہ دن بھر کی محنتِ شاقہ سے کماتا اور عیال و اطفال کو کھلاتا تھا۔

بیچاری عباسی کو ریاض کی موت کا اس قدر رنج ہوا کہ وہ چند دنوں میں ہی سوکھ کر کانٹا ہو گئی —— خون اس میں نام کو نہ رہا تھا ——

جب تک ریاض جیتا رہا۔ اس نے عباسی کو گھر سے کبھی باہر تک نکلنے نہ دیا۔ اب تمام کنبہ کی اوقات کا بوجھ یک لخت اس پر آ پڑا تھا۔

چند دن کی محنت و مشقت سے تنگ آ کر عباسی نے محلہ کے ایک متوسط الحال آدمی سے شادی کر لی —— عباسی اب وہ پہلی سی عباسی نہ رہی تھی۔ اب وہ عباس بیگم تھی۔ چند خادمائیں اور کچھ ملازم اس کی خدمت کے لئے مقرر تھے۔ ایسی عیش و عشرت میں بھی ہنوز اُسے وہ پہلا سا زمانہ نہ بھولا تھا۔ حالانکہ اس عرصے میں اس کے ہاں ایک خوبصورت اور ننھا منا سا بچہ بھی ہو چکا تھا۔

(۳)

سردیوں کی ایک شام کو عباسی کے مکان کا دروازہ کھٹکا۔ سائل پھٹے پرانے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک فقیر تھا۔

خادم آیا اور اُسے اپنے ہمراہ اُس کمرے میں لے گیا جہاں عباسی اور مشکور بیٹھے ہوئے آگ تاپ رہے تھے۔

ننھا مشکور کی گود میں تھا اور وہ طفلانہ ناز و ادا سے والدین کا دل خوش کر رہا تھا۔ فقیر یہ عالم دیکھ کر رہ نہ سکا۔ اسکی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی ایک دھار بہ نکلی۔ اور سنبھلتے سنبھلتے بھی اس کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

مشکور نے مغرورانہ انداز سے فقیر کی طرف دیکھا۔ اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "سائیں بابا کیوں روتے ہو؟"

مشکور کے مُنہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا۔ کہ فقیر نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس کے نالوں میں حسرت تھی درد تھا۔ اور تاثیر تھی۔

مشکور جیسا پتھر دل بھی فقیر کی پرسوز آہوں سے محفوظ نہ رہ سکا — اب وہ موم ہو چکا تھا — سائیں کے آسمان ہلا دینے والے نالوں نے اسے بھی چند آنسو بہانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ "سائیں بابا! آخر کچھ تو کہو۔ کہ کیا ماجرا ہے؟"

فقیر چونکا۔ اس سے پہلے وہ بحرِ تخیلات میں غوطہ زن تھا۔ اس نے بصد مشکل دل خراش الفاظ میں کہا:۔

کیا کرو گے؟ اے صاحبِ ثروت! ایک خانماں برباد کی کہانی سُن کر کیا کرو گے؟ لرز جاؤ گے۔ اُف تمہارا نازک دل کانپ اُٹھیگا!!!

عباسی سائیں کی شکل دیکھ کر محسوس کر رہی تھی کہ اسے کہیں دیکھا ہے۔ اور اس کے کان اس آواز سے آشنا معلوم ہوتے تھے۔ اس نے مشتاقانہ لہجے میں کہا:۔

سائیں بابا! ماجرائے دل ضرور کہنا ہوگا۔ کاش کہ ہم تمہاری کچھ مدد کر سکتے!

فقیر اپنا مختصر سا جواب دیکر پھر کسی گہرے مسئلے کو سوچنے لگا۔ عباسی کے ان الفاظ نے اسے پھر چونکا کر دیا۔ اس نے متانت بھری زبان میں کہا۔ اگر تم بغیر سُنے نہیں رہ سکتے تو لو سنو!

آہ! میں وہ حرماں نصیب ہوں جس کے نزدیک آنے سے موت کو بھی موت آتی ہے۔ آج سے چار سال پیشتر کا واقعہ ہے۔ کہ میں ملیریا میں مُبتلا ہوا۔ چنانچہ جان تک کے لالے پڑ گئے — ایک دن جب میں بہت نحیف و زار ہو چکا تھا۔ بسترِ علالت میں پڑا ہوا اپنی موت سے بعد کے مستقبل کو سوچ رہا تھا۔ کہ میرا دل گھبرا گیا اور مجھے غش آگیا۔

جب مجھے ہوش آیا۔ تو میں نے اپنے آپ کو گوشۂ لحد میں پایا — میرا خیال ہے گھر والوں نے یہ سمجھ کر کہ میں راہیٔ ملکِ بقا ہو چکا ہوں۔ میری تجہیز و تکفین کر دی ہوگی۔ وہ میری وفات پر روئے یا نہ روئے اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں — وہاں میں انتہائی تاریکی اور خاموشی میں گھبرا گیا۔ اور باہر نکلنے کی کوشش کی اور جلد ہی اس میں کامیاب ہو گیا۔

بالآخر جب میں باہر نکلا اس وقت رات ڈھل چکی تھی۔ اسی وقت میں پاپیادہ ایک طرف کو بھاگ نکلا اور چند چیتھڑے اکٹھے کرکے یہ گودڑی بنائی۔ جس میں میں ابھی تک ملبوس ہوں۔ انہیں دنوں ایک کارخانہ میں قلی بھرتی ہو گیا۔ نو ماہ تک میرا گزارہ اچھی طرح سے چلتا رہا لیکن بعدازاں میں وہاں سے چلا آیا ــــ نصیب یاور تھے ــــ ہندوستان سے افریقہ جانے والے جہاز میں مجھے زمرۂ خدام میں بھرتی کر لیا گیا ــــ ایک دن جب کہ ہوا موافق تھی جہاز کا لنگر اُٹھا دیا گیا۔ اور وہ سات دن تک متواتر چلتا رہا۔

ایک دن قدرتِ الٰہی سے ایسا ظہور میں آیا۔ کہ ہوا تیز ہو گئی۔ سمندر میں طوفان برپا ہو گیا۔ ہمارا جہاز باوجود لاکھ کوششوں کے بھی طوفان کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔

خوش قسمتی سے میں اور میرے چند ہمراہی ایک تختے پر بیٹھے رہ گئے۔ ہمیں مطلق معلوم نہیں کہ ہمارے دیگر ہمراہیوں کا کیا حشر ہوا۔

شام کے وقت سمندر کی بے قرار موجوں میں سکون آ گیا ــــ تختہ دس دن تک متواتر نہ معلوم کس سمت کو بہتا رہا۔ اس عرصہ میں مارے بھوک پیاس کے ہم بے حال ہو چکے تھے۔

بارے ایک دن ہم کو دُور سے خشکی دکھائی دی۔ اُسی خوشی سے ہمارے مُردہ تنوں میں پھر سے رُوحیں آ گئیں۔

بالآخر جب ہمارا تختہ کنارے لگا تو ہمیں معلوم ہوا کہ جس خشکی پر ہم پہنچے ہیں۔ وہ ہندوستان کا ہی ساحل ہے خیر جوں توں کرکے ہم ایک شہر میں پہنچے۔ اور میرے ہمراہی وہاں مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔

وہاں میں نے پانچ چھ ماہ تک محنت و مزدوری کی۔ لیکن کسی جگہ بھی میرے داغ خوردہ دل کو قرار نہ آ سکا ــــ ــــ اب میں آہستہ آہستہ یہاں تک آ پہنچا ہوں۔ اے صاحبِ ثروت! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں اسی شہر کا ہی باشندہ تھا۔

عباس بیگم اور مشکور دونو بُت بنے ہوئے فقیر کے مُنہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جب اس نے اپنی داستانِ غم ختم کی۔ عباسی روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ مشکور بھی ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار چیخ اُٹھا "آہ! مسٹر ریاض تم ہو! جسے ہم مردہ سمجھ کر حوالۂ قبر کر چکے تھے۔

اب تینوں نے مل کر درد بانٹنا شروع کر دیا۔ وہ رو رہے تھے۔ اور ننھا اُنکی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ چند منٹ ٹھہر کر مشکور نے ریاض کے ہاتھ میں چابیوں کا ایک گُچھا دیتے ہوئے ننھے کے نرم سے رُخسارے پر بوسہ دیا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد آج تک اسے کسی نے نہیں دیکھا ــــ

ریاض محسوس کر رہا تھا۔ کہ اب وہ ایک نئی زندگی میں ہے۔ اور ماجرائے گذشتہ محض ایک خواب ہے۔

ع دیکھا تھا جو کچھ خواب تھا جو کچھ سُنا افسانہ تھا

پھولی ہوئی روٹی

ایک مزاحیہ مضمون حقیقت کے لباس میں

عنوان دیکھ کر بھوکے بچوں کے منہ میں پانی بھر آئیگا۔ کیونکہ خالی پیٹ کے لئے پھولی ہوئی روٹی سے بڑھ کر کوئی دوسری نعمت نہیں۔ اس کا خیال آتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے باورچی خانے کا منظر آجاتا ہے جس میں پتیلیوں ہانڈیوں اور برتنوں کی قطاریں رکھی ہوئی ہیں چولھا سُلگ رہا ہے۔ توا رکھا ہؤا ہے اور ہماری پُرانی ماما گلچمن بیٹھی ہوئی اپنی دونو ہتھیلیوں کے بیچ میں آٹے کے گول پیڑے کو لیکر تھپ تھپا رہی ہے۔ اُس وقت کی یہ آواز بالکل ایک میٹھا اور رسیلا راگ معلوم ہوتی ہے۔ جو دل کی گہرائیوں میں اُتر کر گرتے ہوئے معدے کو تھام لیتا ہے اور بھُوک کو بھلا دیتا ہے۔

دراصل روٹی پکانا ایک ہنر اور فن ہے مگر روٹی پکتے ہوئے دیکھنا ایک سین ہے اور اُس کو بیان کرنا شاعری ـــ یہی وجہ ہے کہ میں روٹی پکتے ہوئے دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہوں بہ نسبت کھانے اور کھلانے کے۔ اگر آپ بھی کوشش کریں تو روٹی کے چہرے سے نقاب ہٹا کر اُس کے حسن خوبصورتی اور نزاکت کو دیکھ کر ہماری گلچمن کی صناعیوں کی داد دے سکتے ہیں۔ اس لئے جب وہ پیڑے کو ہاتھ میں لیکر اُس کا ایسا دائرہ بنا لیتی ہے جو تمہاری پرکار کی مدد سے بھی نہیں بن سکتا تب وہ اپنی نازک اور باریک انگلیوں کو اسی طرح گردش دیتی ہے کہ جیسے ایک چابکدست سازندہ اپنے ستار کو بجاتے وقت راگ کو تخلیق کرنے کے لئے اپنے انگلیوں کے پوروں کو گھماتا ہے ـــ اور واقعی چشم زدن میں ہمارے سامنے کاغذ کی طرح پتلی روٹی ہوا میں معلق ناچتی اور تھرکتی معلوم ہوتی ہے۔ گویا اُسکی تالیوں کی آواز لوٹ پوٹ کر روٹی کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہے

ادھر چولھے کے اندر سوکھی لکڑیاں چٹخارے لے لے کر آگ کے شعلوں میں اس طرح نہا رہی ہیں جیسے کوئی پوتر پجاری گنگا اشنان کرے۔ اُس کے اندر شعلوں کی موجیں چڑھتے ہوئے دریا کی موجوں کی طرح زن زناتی ہوئی اوپر آرہی ہیں جن میں کوئلوں کے چھوٹے چھوٹے ذرات مچھلیوں کی طرح اپنے چھوٹے چھوٹے سر باہر نکالتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ آگ کے نور کی چھوٹ اوپر رکھے ہوئے توے پر اور قریب بیٹھی ہوئی گلچمن کے چہرے پر اس طرح پڑ رہی ہے کہ دونو سُرخ نظر آرہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اوّل الذکر کے گال خشک ہیں اور آخرالذکر کے شفاف پسینہ کے قطروں سے تر۔

گلچمن اب ایک ہاتھ اوپر اُٹھاتی ہے اور دوسرا ہاتھ نیچے۔ اور اسی ردّ و بدل میں ریشم اور سلک کی طرح نرم اور گداز روٹی توے سے آکر اِس طرح پسٹ جاتی ہے جس طرح سُرخ گلاب کی پنکھڑیوں سے تتلی۔ اِس کے جسم میں تھوڑی سی

سنسناہٹ پیدا ہوتی ہے جیسے کہ انجن ہلکی سیٹی دیتا ہے۔ یہ دراصل توے کی گرمی سے گیلے آٹے کا پانی انجرات میں تبدیل ہوکر روٹی کی رگ رگ سے کھینچ کر اُڑا جا رہا ہے۔ چند ہی سیکنڈ میں روٹی کے نرم و نازک جسم پر ایسے کھُردے نشانات اُبھر آتے ہیں جیسے جاڑے کے زمانہ میں تمہارے گالوں پر ـــ گلچمن ان تبدیلیوں کو بڑے غور سے دیکھتی ہے اور چند ہی سیکنڈ میں اُس جلتے ہوئے توے سے روٹی کو اِس آسانی سے اُٹھا لیتی ہے جیسے پھولوں کی سیج پر سے بادشاہ اپنی ملکہ کو اُٹھا لیتا ہے۔ اِس کے بعد وہ اُس کو پلٹ کر پھر توے کی زمین پر دے مارتی ہے اور اس طرح اُس کو چت کر دیتی ہے جیسے ہندوستانی پہلوان گاما نے زبسکو کو دے پٹکا تھا۔

روٹی اب توے سے ہٹا کر چولھے کے دہکتے ہوئے پیٹ میں رکھدی جاتی ہے۔ مجھ کو تو اُس وقت یہ گرم گرم چولھا بالکل ایک مندر معلوم ہوتا ہے اور یہ روٹی ایک پجارن۔ جو دیوی جی سے ایسی پرارتھنا کرتی ہے کہ ہے پرمیشور میرے ہر حصہ میں پریم اور میرے جیون میں سوز بھر دے تاکہ میں پاپ اور گناہوں کی آلودگیوں سے پوتر ہو کر ایسی طاقت حاصل کر لوں کہ جس کے سامنے بادشاہ بھی اپنے سر جھکا دیں۔

شائد روٹی کی دعا قبول ہو جاتی ہے کیونکہ اُس کے جسم میں ایسی تبدیلی واقع ہوتی ہے کہ جس کو دیکھ کر میرے دانت تیز ہو جاتے ہیں۔ زبان اُلٹ پُلٹ ہونے لگتی ہے۔ پیٹ میں آنتیں قلا بازیاں کھانے لگتی ہیں، اور دل میں اس قسم کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اِسکو سینہ سے لگالوں اور سر نیاز کو اس کے سامنے خم کر دوں۔

روٹی پھولتی ہے۔ پھولتی ہے یہاں تک کہ وہ بالکل موٹے میاں کے گال۔ چچا میاں کی توند اور سقّے میاں کی مشک کی طرح ہو جاتی ہے ـــ اوفوہ روٹی کا پھولنا بھی عجیب منظر ہے۔ کبھی تم نے قدرت کی اس کاریگری پر غور بھی کیا ہے؟ تم اپنے فٹ بال میں بائیسکل پمپ لگا کر بھی اس صفائی سے ہوا نہیں بھر سکتے جتنی صفائی نزاکت۔ چابکدستی اور ہوشیاری سے ہوا اپنے جسم کو روٹی کے جسم میں حلول کرتی ہے۔

ذرا خیال تو کرو کہ گلچمن نے روٹی توے پر ڈالی تو وہ صرف ایک پرت رکھتی تھی۔ روٹی کا وہ حصہ جو توے سے ملا ہوا تھا وہ گرم ہو گیا۔ اِس کا اوپر کا حصہ ٹھنڈا ہی رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ٹھنڈے اور گرم حصوں کے بیچ میں ہوا نے جا کر روٹی کو دو پرتوں میں تقسیم کر دیا۔ روٹی پھر اُلٹی گئی تو یہ دونو حصے گرم ہونے کے بعد اور پختہ ہو گئے ـــ اب اِس روٹی کو چولھے میں ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روٹی کے اندر تھوڑا سا پانی تھا اور تھوڑی سی ہوا بھی تھی ـــ جو چولھے کی گرمی سے پھیلی۔ یہاں تک کہ اس کے پھیلنے کے ساتھ ہی روٹی بھی پھُول گئی۔ یہ دیکھتے ہی مجھ کو بھوک بھی لگ آئی۔ اور میں نے قلم چھوڑ کر نوالے ہاتھ میں لیکر.......

سیّد ابوطاہر (اُردو بی۔ ایس۔ سی لالک)

ایک رات کی سرگذشت

(سیّد محمود مورخ ایم اے)

جب سے میں نے اخباری دُنیا میں قدم رکھا ہے۔ رات کا عیش و آرام تو ملازمت کی نذر ہو گیا اور دن کا وقت کچھ تو آرام کرنے میں اور کچھ ننھے میاں کی والدہ کی فرمائشات پوری کرنے میں تمام ہو جاتا ہے۔ اندریں حالات میں مدیرانِ رسائل کی فرمائشات پوری کرنے سے قاصر ہوں۔ لیکن برادر عزیز سردار جگت سنگھ صاحب کا تقاضا یہ ہے۔ کہ "رہنمائے تعلیم" کے افسانہ نمبر کے لئے ایک افسانہ حوالہ قرطاس کروں۔ اگر میں سردار صاحب کے حکم کی تعمیل کرنے سے صاف انکار کر دوں تو اول تو یہ بات اخلاق و مروت وضعداری کے خلاف ہے۔ دوسرے اس سے سردار صاحب کے رنجیدہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس لئے قہر درویش برجان درویش کے مصداق جو کچھ بھی ہو سکا ارقام کرتا ہوں۔

یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ دن کا وقت تو تمام کا تمام "اُن" کی نذر ہو جاتا ہے اور رات کا وقت دفتر میں کانگریس اور گاندھی جی اور انکے مریدوں یا گول میزیوں کے کارناموں کی روداد دیکھنے میں گزرتا ہے۔ ہاں اتوار کی رات کو البتہ فرصت ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ننھے میاں کی والدہ کچھ اسقدر سخت واقع ہوئی ہیں کہ انہیں ہمارا اتوار کی رات کو دس بجے سے زیادہ باہر رہنا گوارا نہیں۔ اگر شومئی قسمت سے کسی مرتبہ دیر ہو جائے تو گھر میں قیامتِ صغریٰ بپا ہو جاتی ہے۔ اسکے علاوہ انہیں ہمارے دوستوں اور خاصکر مرزا صاحب سے کچھ ایسی چڑ ہے کہ انکا نام سُنتے ہی آگ بگولا ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہم سے تو یہ ممکن نہیں کہ اگر کوئی ہم سے ملنے آئے تو ہم اندر سے ہی کہلوا دیں کہ "میں گھر پر نہیں ہوں"۔

ماہ گذشتہ کی پہلی اتوار کو مرزا صاحب و چند دیگر احباب نے مجھے مجبور کیا کہ رات کو لیلےٰ مجنوں کی متکلم فلم دیکھی جائے۔ میں اپنی "اُن" کے ڈر سے رضامند نہ ہوتا تھا۔ لیکن مرزا صاحب کا کہنا ٹالنا بھی تو آسان نہ تھا۔ خیر صاحب میرے اصرار پر یہ فیصلہ ہُوا کہ تماشہ پہلے شو میں دیکھا جائے اور دس بجے سے پہلے ہی ہم گھر پہنچ جائیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ "وہ" ہمیں مرزا صاحب کے ساتھ رات کو باہر ہرگز جانے نہ دینگی لیکن ہیں تو ہم آخر انہی کے شوہر نامدار۔ دن کا وقت اس احتیاط اور ہدایت سے گذارا کہ اس معاملہ کی انکے کان میں بھنک تک نہ پڑی۔ انکی جملہ فرمائشات کو بہ خندہ پیشانی شام ہونے سے قبل ہی پورا کر دیا۔ اور اپنے ننھے میاں کو انکی خالہ جان کے ہاں پہنچا آیا۔ شام کو مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر ہم نے کپڑے بدلے اور چھڑی ہاتھ میں لے کر یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ ذرا ہوا خوری کو جا رہے ہیں۔ گھر سے روانہ ہو گئے اور سینما ہال کا رخ کیا۔ مرزا صاحب معہ دیگر احباب کے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میرے آ جانے پر سب نے فرسٹ کلاس

کے ٹکٹ خرید دے۔ اُس روز چونکہ پہلی مرتبہ لکھنؤ میں متکلم فلم کی نمائش کی جا رہی تھی۔ اس لئے تماشائیوں کا ہجوم غیر معمولی تھا۔ لیکن ہم کسی نہ کسی طرح اندر جا کر صف اوّل میں بیٹھ ہی گئے۔ کوئی پانچ منٹ انتظار کے بعد تماشہ شروع ہؤا۔ ہم نے تماشہ کی دھوم تو بہت سنی تھی اور سینما کے اشتہار نویسوں نے تو اسقدر مبالغہ سے کام لیا تھا کہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔ مگر تماشہ دیکھنے پر معلوم ہؤا کہ اسپر وہی مثل صادق آتی ہے کہ اونچی دکان اور پھیکا پکوان۔ لیلےٰ کا پارٹ مس کجن اور مجنوں کا پارٹ ماسٹر نثار نے کھیلا تھا ایمان کی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پارٹ سے کھیل کو مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ مدرسے کے سین میں چند شکستہ حال بچوں کے ساتھ ان بوڑھے طوطوں کا نظر آنا ہی تماشہ کی درگت کے لئے کافی تھا اور اسپر غضب یہ کہ مدرسہ میں ہی مولوی صاحب کے باہر جاتے ہی مکالمہ کی جگہ لیلےٰ و مجنوں کے مابین اچھا خاصا مشاعرہ شروع ہو گیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سین میں شعر گوئی کا کونسا موقعہ و محل تھا۔ اور یہ نقص تماشہ میں اول سے آخر تک موجود تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسٹیج کے ڈرامہ کو فلم میں زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہے ماسٹر نثار اور مس کجن کے بازاری چہروں نے سامعین کے دل کو جس قدر اذیت پہنچائی ہوگی اسکا حال معرض تحریر میں لانا بہت دشوار ہے۔ علاوہ ازیں بے موقعہ و بے محل لباس اور مصنوعی سین و سینریوں نے تو فلم کو بالکل اس قابل بنا دیا کہ اسے نذر آتش کر دیا جائے۔

ممکن ہے کہ میری بے لاگ تنقید کسی کو گراں گذرے لیکن مجھے اسکی پروا نہیں۔ کوئی طاقت بھی میرے قلم کو حق بات کہنے سے نہیں روک سکتی۔ مجھے اس بات کی آرزو ہے کہ ہندوستان فن فلم سازی میں ترقی کرے اور بدیں وجہ میں فلم کمپنیوں کے مالکوں کو نصیحت کرونگا کہ "تھوڑی لاگت اور زیادہ منافع" کا اصول اس فن کے لئے مہلک ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ انہیں خیال رکھنا چاہیئے کہ ہر وہ ایکٹر جو تھیٹر کے اسٹیج پر کامیاب رہا ہو ضروری نہیں کہ فلم سازی میں بھی اسی طرح کامیاب رہے۔ ایکٹر و ایکٹرسوں کے انتخاب میں ضروری احتیاط سے کام لیا جائے اور بازاری عورتوں کو اس میں ٹھونسنے کی کوشش نہ کی جائے۔

اوّل تو تماشہ کی نمایاں خامیوں اور مضحکہ خیز سینریوں نے ہی بے لطف کر دیا تھا۔ اور اسپر غضب یہ کہ "چار آنے" والوں نے وہ شور و غل مچایا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ رنگ برنگی آوازوں نے ملکر سینما ہال کو آوازوں کا ایک ایسا معجون مرکب بنا دیا تھا کہ اگر کوئی غیر ملکی وہاں سے گذرتا تو ضرور خیال کرتا کہ سینما ہال میں قیامت کبریٰ بپا ہے۔ یا یہ تو ضرور ہی خیال کرتا کہ اندر بھٹیاریوں کی جنگ ہو رہی ہے۔ میرا ارادہ تو شروع میں ہی تماشہ چھوڑ کر چلے آنے کا تھا۔ لیکن اپنے احباب کے مجبور کرنے پر بیٹھا رہا۔ کوئی سوا دس بجے کے قریب تماشہ ختم ہؤا۔ اور ہم دوسرے شو میں جانے والوں کے ساتھ لڑتے جھگڑتے اور دھینگا مشتی کرتے ہوئے بہ مشکل تمام باہر آئے۔ میرا ارادہ وہاں سے سیدھے گھر آنے کا تھا۔ لیکن مرزا صاحب کی تحریک اور انہی کے اصرار پر انکے ساتھ چاء پینے کے لئے ایک ہوٹل میں چلا گیا۔

میر حشمت علی میرے لنگوٹیے یار اور ہم جماعت ہیں۔ ہم دونوں نے بی اے تک ایک ہی جماعت اور ایک ہی کمرہ میں رہکر تعلیم پائی ہے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد میں نے تو اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اور میر حشمت علی لاء کالج میں داخل ہو گئے اور وہاں سے فارغ ہو کر کانپور میں وکالت شروع کر دی۔ گو ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن ہم دونوں کو ملے

ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اب جو میں ہوٹل میں اپنے احباب کے ہمراہ چائے پینے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میر صاحب فرش پر بیٹھے ایک اور صاحب کے ساتھ شطرنج کھیل رہے ہیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور میں ان سے بغلگیر ہو کر وہیں انکے پاس بیٹھ گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک گھنٹہ پیشتر ہی وہ ایک مقدمہ کی پیروی کے لئے آئے ہیں۔ بہت دیر تک انکے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور بلا ارادہ ہی انکے ساتھ شطرنج کھیلنے لگا۔ اس کھیل کا مجھے بیحد شوق ہے۔ اور جب کبھی فرصت ملتی ہے ضرور کھیلتا ہوں۔ لیکن اس کھیل میں ایک عیب یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ بازی لگ جائے تو وہ جب تک ختم نہ ہو اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ میرا ارادہ جلد گھر چلے جانے کا تھا۔ کیونکہ ننھے میاں کی والدہ کی سخت گیری سے ڈرتا تھا۔ لیکن جب میں نے بازی ختم کر کے گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ دو بجے کا عمل ہے۔ اس وقت مرزا صاحب و دیگر احباب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب تو میں گھبرا کر اُٹھا اور میر صاحب سے صبح کو حاضر ہونے کا وعدہ کر کے گھر کی راہ لی۔

مجھے خوب معلوم تھا کہ آج گھر میں ضرور قیامت بپا ہوگی۔ اور اس قدر کہ اہل محلہ کا آرام بھی حرام ہو جائیگا۔ اور یہ بھی ممکن تھا "وہ" دروازہ کھولنے سے ہی انکار کر دیں۔ اس لئے اب میں اس فکر میں تھا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ ہم اندر بھی پہنچ جائیں اور بیگم صاحبہ کو شور و غل مچانے کا موقعہ بھی نہ ملے۔ آدھ گھنٹہ تک اس مسئلہ پر دماغ سوزی کرنے کے بعد ایک نہایت ہی عمدہ تدبیر ذہن میں آئی اور ہم نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے ہر پہلو پر غور کر کے ہم اطمینان کر چکے تھے کہ اس کا ناکام رہنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اس لئے ہم اپنے محلہ میں پہنچ کر اپنے مکان کے دروازہ پر جانے کی بجائے پچھواڑے پہنچے اور سڑک پر سے دو ڈھیلے اُٹھا کر اپنے گھر میں پھینک دیئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم دروازہ پر آئے اتنے میں ہمیں اندر سے چیخ کی آواز سنائی دی اور ننھے میاں کے رونے کا شور بے ہنگام بلند ہوا۔ اس کے جواب میں ہم نے فوراً باہر سے ایک اطاعت شعار خاوند کی طرح آواز دی کہ "بیگم صاحبہ ڈرنے کی بات نہیں ہم حاضر ہیں"۔ ہمارے جواب دینے سے کوئی دو منٹ کے بعد بیگم صاحبہ نے دروازہ کھول دیا۔ پیشتر اس کے کہ بیگم صاحبہ کچھ کہیں ہم نے دریافت کیا کہ اس شور کی کیا وجہ ہے۔ وہ ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائی تھیں کہ ہم نے لالٹین انکے ہاتھ سے لے لی اور باہر آ کر مکان کے پچھواڑے یہ ظاہر کرنے چلے گئے کہ ہم چور کو پکڑنے جا رہے ہیں۔ لیکن وہاں کون تھا جسے ہم پکڑتے۔ پانچ منٹ کے بعد جیسے گئے تھے ویسے واپس آ گئے۔ اس وقت بیگم صاحبہ خوف سے بید کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ہم نے انکو حوصلہ دیتے ہوئے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں کسی کی مجال ہے کہ ہماری موجودگی میں تمہیں کچھ کہہ سکے۔ اسکے بعد ہم نے دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا کر بیگم صاحبہ کے ساتھ اندر گئے۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھا۔ بس آپ ضد نہ کیجئے۔ یہ بات بتانے کے قابل نہیں۔ میری نئی چائے دانی جو پرسوں ہی میں نے کلکتہ سے منگوائی تھی اور جو گھڑونچی کے پاس رکھی تھی کھیل ہو گئی تھی۔ اور ننھے میاں کی نانی اپنے سر کو پکڑے بیٹھی تھیں۔ انکی انگلیاں خون نہیں سُرخ روشنائی۔ یا شائد خون ہی سے بھری ہوئی تھیں اور ننھے میاں پلنگ پر پڑے بے سُرے گانے گا رہے تھے۔ ہم نے اس وقت کچھ کہنا سُننا مناسب نہ سمجھا فوراً ہی بستر پر دراز ہو گئے اور دو کروٹیں لیتے ہی ایسے سوئے کہ جب آنکھ کھلی تو دیوار پر ٹنگا ہوا گھنٹہ گیارہ بجا رہا تھا۔

کیا دیکھا

محترمی جناب قبلہ منشی نظام الدین صاحب جن کی تصویر زیب افسانہ نمبر ہے ادب لطیف کے ایک خاموش مگر ناپیداکنار سمندر ہیں۔ باوجودیکہ مجھے عرصہ دراز سے نیاز دوستانہ حاصل ہے۔ لیکن کبھی اس بات کا گمان تک نہ پیدا ہونے دیا کہ آپ ایک رنگین بیان ادیب ہیں۔ صرف اس قدر معلوم تھا کہ تصوف میں آپ کا پایہ بہت اعلےٰ ہے۔ لیکن جب رسالہ روحانی دنیا کا اجراء آپ کی سرپرستی میں ہوُا اور اُس میں آپ کی جادو نگاریاں دیکھنے میں آئیں تو معلوم ہوُا کہ آپ "سراپا ادب و علم بنے بیٹھے ہیں"۔ ذیل کا واقعہ آپ نے میری فرمائش پر عجالۃ الوقت افسانہ نمبر کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ یہ طلسم بندی یا جادو نگاری نہیں "آپ بیتی" ہے۔ قال نہیں۔ حال ہے۔ تخیلات نہیں سرگزشت ہے جو سادہ الفاظ میں پیش کی جا رہی ہے۔ (اڈیٹر)

آفتاب کی تجلیاں اور ضیا پاشیاں بام عروج پر پہنچتی اور قعر گمنامی میں چلی جاتی ہیں۔ دریا کی لہریں جوش ہستی میں ترنم ریز مسرت ہوتی اور ورطۂ الم فنا میں غرق ہو جاتی ہیں۔ پھول اپنی دلفریب اور دیدہ زیب رعنائیوں پر رنگ آمیزی کرتا ہوُا آغوش خزاں میں محو خواب ابدی ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ کائنات کا ذرہ ذرہ تغیرات و حادثات کا پیکر اور تنوعات و انقلابات کا مجسمہ ہے۔ لیکن اس قانون اور نظریہ سے الگ تھلگ اور بالفاظ صحیح نا آشنا ایک چیز تھی اور وہ زاہد کا نا آشنائے سکون دل تھا۔ اُس کا دل جو اضطراب و التہاب کی دُنیا بن چکا تھا کسی طرح پابند سلسلہ جمعیت و اطمینان نہ ہوتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اُس کی تمنا نئی اور اُس کا ارمان جدید تھا۔ وہ جس دُنیائے موہوم کو وجہ سکون دل بنائے ہوئے تھا۔ اس جنس نایاب سے اِس دُنیا کی جیب خالی تھی بلکہ مضحکہ خیز اور ندامت انگیز ثابت ہو رہی تھی۔ وہ دُنیا کی امارت۔ دولت عزت۔ حتیٰ کہ بادشاہت کا متمنی ہوتا تو حصول مراد ممکن تھی۔ وہ کسی حور پیکر اور ناممکن الوصال محبوب کا خواہاں ہوتا تو میدان سعی و جہد کشادہ تھا۔ لیکن زاہد کی آرزو حیطۂ امکان سے باہر تھی۔ وہ اس بات کا خواہاں تھا کہ میں خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر عین الیقین اور حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جاؤں۔ یہ انوکھی تمنا اُس کے دل میں نادانستگی اور جہالت سے پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ نتیجہ تھا انتہائے تصوف منتہائے زہد و اتقا کا۔ وہ اسم بامسمیٰ تھا۔ تکمیل علوم ظاہری کے بعد اُس نے سالہاسال تصوف کی دُشوار گذار وادیوں کی سیر کی تھی اور یہ تمنا انتہائے تصوف کی آخری خواہش تھی۔ اب اُس کا دل تصوف کی کتابوں سے بیزار ہو چکا تھا۔ وہ عبا۔ قبا۔ تسبیح و عمامہ سے متنفر ہو چکا تھا۔ وہ کیا اچھی اور ناقابل تردید دلیل پیش کرتا تھا۔ کہ جو ذات منزہ من الاشیاء ہو وہ پابند اقوال و دلائل ہو سکے۔ یہ ناممکن ہے جب یہ تسلیم ہے کہ وہ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ ہے۔ تو قول اور دلیل۔ حجت و برہان خود ایک شئے باطل ہیں۔ یہ تمام محیط ہیں اور وہ محاط ہے۔ محیط کا محاط کو اپنے دائرہ عمل میں لے لینا ناممکن اور بعید از عقل ہے۔ اس لئے اُسکی ذات صفات پر براہین

واَدِلّہ قائم کرنا سعی لاحاصل ہے۔

زاہد ان تخیلات و اختراعات سے ممکن ہے دھریہ ہوجاتا اور خدا کی ہستی سے انکار کردیتا۔ مگر ایسا نہ تھا بلکہ وہ ہستی واجب الوجود کا قائل تھا۔ دُنیا کی کوئی دلیل اُسکو اس عقیدہ سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔ بلکہ اُس کو یقین ہوچکا تھا کہ اُس کی ہستی قید کتابت اور محفل حال و مقال سے بالکل الگ ایک شے ہے۔ ڈھونڈھنے والا اُس کو پا سکتا اور ذوق دیدار محرم تماشا ہوسکتا ہے۔ لیکن دنیا کی شاہراہیں اُس معدوم کوچہ سے نابلد ہیں۔ تقوٰے طہارت عبادت و ریاضت کو وہ ایک ذریعہ خوشنودی یا زیادہ سے زیادہ حصول بہشت کا آلہ سمجھتا تھا۔ ان ذرائع ظاہری سے اُس باطنی تجلیوں میں گم ہوجانا یا محفل تقرب و انبساط میں پہنچ جانا اُس کے نزدیک دُشوار تھا۔ اس وجہ سے کہ اتمام حجت یا سامانِ فریب تسلی بن سکے۔ یا شائد تحریر و تقریر سے کوئی گم شدہ کڑی ہاتھ آجائے۔ وہ علماء صلحاء فقراء۔ زہاد کی خدمت میں جاتا اور اپنی آرزو پیش کرتا۔ "میں خدا کو آنکھوں سے اُس کی حقیقی شان میں دیکھنا چاہتا ہوں"۔ لیکن کوئی حامی نہ بھرتا۔ اور بھرتا بھی کوئی کیسے جب کسی کے بس کی بات بھی تو ہو۔ زاہد اس دُھن میں ایسا پختہ ہوچکا تھا کہ دُنیا و مافیہا سے کوئی تعلق اُس کا باقی نہ تھا۔ وہ اہل دُنیا کی اصطلاح میں مجنوں ہوچکا تھا۔ زمانے کے ماہ و سال اسی ژولیدگی اور سراسیگی میں گذر گئے مگر کوئی ایسا دستگیر نہ ملا۔ جو اس کو اس بے نام و نشان سے آشنا کرا دیتا۔

زاہد کبھی کبھی میرے پاس بھی آ بیٹھتا۔ اور جہاں تک مجھ سے ممکن ہوتا میں اُس کی تسلّی و تشفی میں سعی کرتا۔ لیکن اُس کے نظریہ کی تکمیل میرے حیطہ قدرت سے باہر تھی۔

زاہد میرے پاس ہفتہ میں ایک بار کبھی دو ہفتہ میں ایک بار۔ لیکن مہینہ میں ایک بار ضرور آتا تھا۔ مگر اب کی مرتبہ اُسے مسلسل چار مہینہ ہوگئے کہ میری طرف ہوکر نہ نکلا۔ مجھے کئی مرتبہ اُس کا خیال بھی آیا۔ کیونکہ مجھے اُس سے دلی محبت تھی۔ اور میں اس آغاز کا انجام دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس عرصہ تک میں یہ سمجھتا رہا کہ وہ جوش دیوانگی میں کہیں نکل گیا ہوگا لیکن مجھے معلوم ہؤا کہ زاہد بہت بیمار ہے۔ اب مجھ سے صبر نہ ہوسکا۔ میں اُس کی عیادت کو پہنچا۔ اتفاق دیکھئے یا خوبیٔ ارتباطِ دل کہ جب میں اُس بیمار کے سرہانے پہنچا تو آخری سانسیں تھیں۔ اُس وقت قوت نطق جواب دے چکی تھی۔ لیکن آنکھوں میں مسرت و انبساط کے ڈورے نظر آتے تھے۔ کش مکش نزع سے جو چینِ جبیں پیدا ہوتی تھی۔ وہ آنکھوں کے تبسم پر اپنا رعب جمانا چاہتی تھی۔ مگر خدا جانے اُس وقت آنکھیں کس تبسم سے بہرہ اندوز ہورہی تھیں کہ تلخی نزع کا جادو بیکار ہو رہا تھا۔ میں اُس حالت کیف سے بیخود ہُوا جاتا تھا۔ میں نے رُو کر کہا۔ اپنی اجل بدل لو تم میری زندگی سے

میری آنکھیں اشکبار بلکہ خونبار ہوگئیں۔ زاہد نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا کیا حال ہے؟ اُسکے لب متحرک ہوئے۔ میں سمجھ گیا کہ کچھ کہہ رہا ہے۔ لیکن راز کی بات ہے۔ علانیہ کہنا نہیں چاہتا۔ مینے اپنے کان اُسکے ہونٹوں پر رکھدیئے میری سمجھ میں صرف اسقدر آیا۔ کاں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد۔ میں بدستور اپنے کان اُسکے لبوں پر رکھے رہا۔ لیکن اسیقدر کہکر وہ گنگناہٹ بند ہوگئی۔ مینے اپنے کان اُسکے لبوں سے علیحدہ کئے۔ وہاں کیا تھا "خبرش باز نیامد" کا مفہوم کامل ہوچکا تھا۔ زاہد کی موت پر مجھے آجتک رشک ہے۔ کسے خبر ہے کہ وہ اُس وقت کیا دیکھ رہا تھا۔ (نظام الدین)

جذبات بسمل

فخر الشعرا جناب بسمل الہ آبادی

یہ لاجواب غزل بسمل صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کے جوبلی مشاعرہ میں ۱۸ دسمبر ۱۹۳۲ء کو اپنے خاص انداز میں پڑھی تھی جو بہت مقبول ہوئی ہر شعر اس کا بے نظیر ہے۔ (ایڈیٹر)

ہستی کو ذلیل کر رہے ہیں
جینے کے لئے جو مر رہے ہیں

الفت میں وہ کام کر رہے ہیں
مرنے کے لئے جو مر رہے ہیں

مرتے ہیں کہ نہیں ہیں بھی
وہ ہیں کہ تلاش کر رہے ہیں

ہم ہیں کہ آسمان سر پہ
موجود ہے کہ ہم ابھر رہے ہیں

کیا سوچ کے ہم نہیں ہیں کچھ
دنیا بھی نگاہ میں ہیں

دنیا پہ نگاہ کر رہے ہیں
منزل کا نہیں پتہ نہیں ہے
کس راہ سے ہم گزر رہے ہیں

آئیں گے نہ سامنے ابد تک
پردہ وہ جو ازل سے کر رہے ہیں

درشن نہ ہوا نصیب لیکن
بے دیکھے کسی پہ مر رہے ہیں

اللہ رے عالم تصور
ہم بات کسی سے کر رہے ہیں

بس اُن کی قبول بندگی ہے
بندے جو خدا سے ڈر رہے ہیں

منزل کے قریب ہم پہنچ کر
ایک ایک قدم پہ ڈر رہے ہیں

دن رات تڑپنے کا سبب کیا
بسمل بھی کسی پہ مر رہے ہیں

بسمل

آسمان ادب کے چند ستارے

ابتدا میں یہ خیال تھا کہ ان سب ادیبوں اور انشا پردازوں کے فوٹوؤں اور سوانحی حالات سے "فسانہ نمبر" کو زینت دی جائے جنہوں نے اپنے اپنے شاہکار ازراہ عنایت شائع فرمانے کے لئے ارسال کئے ہیں۔ چنانچہ اس کے لئے محترمی سردار جگت سنگھ صاحب مینجنگ پروپرائٹر رسالہ نے بہت سے اصحاب کو فرداً فرداً نہ صرف ایک مرتبہ بلکہ بعض کو متعدد دفعہ خطوط لکھے کہ وہ اپنے اپنے حالات تفصیلِ تصانیف کارنامجات علمی اور فوٹو بھیجدیں تاکہ انہیں شائع کیا جاسکے۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنے اپنے فسانے بھیجنے میں احباب نے جس سرعت سے کام لیا تھا۔ حالات بھیجنے میں وہ چستی سستی سے بدل گئی۔ اور بہت ہی تھوڑے بزرگوں نے اس طرف توجہ فرمائی۔ وجہ بے محل کسر نفسی اور "راجی بن کیا ہوں" کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے۔ حالانکہ اشد ضرورت ہے کہ دور موجودہ کے فسانہ نگاروں کے حالات ایک جگہ جمع ہوجائیں۔ تاکہ آئندہ زمانہ کا مورخ واقعات کی روشنی میں فسانوی دنیا کی تاریخ آسانی کے ساتھ لکھ سکنے میں کامیاب ہو۔ اور خلف کو سلف کے حالات کا تفصیلی اور تحقیقی علم ہوجائے۔ اس کا موقع فسانہ نمبر سے زیادہ اچھا اور کہیں نہیں مل سکتا تھا کہ حالات اور فوٹو کے ساتھ نمونہ کلام بھی موجود ہوتا۔ مگر ہماری یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہی۔ اور ہم فسانوی دنیا کی ساری برادری کو ایک دسترخوان پر جمع نہ کرسکے۔ باقی جس قدر احباب نے اپنے اپنے حالات بھیجے ہیں وہ ذیل میں شکریہ کے ساتھ ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

(خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی)

جوش

کہنے کو یہ ایک سہ حرفی لفظ ہے۔ مگر اس کی معنوی شان نہایت بلند ہے۔ اس کے بغیر دنیا کا کوئی کام مکمل نہیں ہوسکتا کوئی تدبیر عمل میں نہیں آسکتی۔ کوئی اُمید کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی۔ کوئی چارہ کارگر اور کوئی ارادہ بارور نہیں ہوتا۔ ایک تقریر کرنے والا اسی لفظ کی معنوی برکت سے ہزارہا آدمیوں کے قلب و جگر پر حکمران ہوتا اور اپنی سحر بیانی سے مجمع کے مجمع پر چھا جاتا ہے کسی ریفارمر کی کوئی تحریک اسی صورت میں سرسبز ہوتی ہے۔ جبکہ وہ خود اپنے مقصد کی حمایت میں سراپا جوش ہو۔ ایک سپاہی میدانِ جنگ میں پہنچ کر اسی کی بدولت اپنی مردانگی کا جوہر دکھاتا۔ دادِ شجاعت دیتا اور شہید وطن کا خطاب پاتا ہے۔ عروج کامیابی اسی فوج ظفر موج کا حصہ ہے۔ جو فریق مخالف سے زیادہ پُر جوش ہو۔ سیاسیات میں بھی ہر قسم کی سرگرمی اور شرکت عمل کا منبع یہی ہے عشق و محبت میں بھی ہر قوم پر اسی کی ہنگامہ آرائی نظر آتی ہے۔ سچ پوچھو تو دنیا کی تمام رونق اور چہل پہل جوش عمل ہی کا نتیجہ ہے اور حقیقی جوش کے بغیر یہ دنیا بلاشبہ ایک گورستان ہے۔

افراط و تفریط کے نقصانات ظاہر و باہر ہیں۔ اس کلیہ سے جوش بھی مستثنٰی نہیں۔ جب یہ حد سے بڑھ جاتا ہے تو دیوانگی اور جنون اس کے ہم رکاب ہوتے ہیں۔ یہ صورت رونما ہوجانے سے جو خرابی وقوع میں آتی ہے اور جو مصیبت نازل

ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کی پولیٹیکل سرگرمی اس کا زندہ ثبوت ہے جس نے بہت سے خاندان تباہ کر دیئے ہیں اور اب وہ جادۂ اعتدال سے منحرف ہو جانے پر پشیماں اور نالاں نظر آتے ہیں۔ غصہ یا قہر و غضب اسی افراط کا دوسرا نام ہے اور اس کے نقصانات بھی کسی سے مخفی نہیں۔

میں بھی کبھی کبھی جوش میں آجاتا ہوں اور اس عالم میں بعض دفعہ بھلے بُرے کی تمیز نہیں رہتی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں جناب جوش ملسیانی کو بھی بھول جاتا ہوں۔

چند سال پیشتر میں جناب جوش کا کلام۔ ان کی نظمیں مختلف اخباروں اور رسالوں میں پڑھا کرتا اور محظوظ ہوتا تھا۔ یہ آرزو تھی کہ کسی نہ کسی طرح گفتگو یا خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری ہو جائے۔ بھلا ہو سردار جگت سنگھ صاحب منیجر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور کا کہ ان کے رسالہ کی سرپرستی کی وجہ سے یہ آرزوئے دیرینہ بر آئی اور اب خطوط کا سلسلہ اکثر جاری رہتا ہے۔

جناب جوش قصبہ ملسیاں ضلع جالندھر کے باشندہ ہیں۔ یہ قصبہ کیسا ہے۔ اس کے تاریخی حالات کیا ہیں۔ ان کا سنہ ولادت کیا ہے۔ عادات و خصائل کیا کیا ہیں۔ تعلیم کہاں تک ہے۔ خاندانی حالات کیا ہیں۔ اس کے لئے بہت سی واقفیت درکار ہے۔ اور یہاں اس مضمون سے ان تفصیلی باتوں کا تعلق بھی نہیں ہے۔ صرف یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کا ابتدائی حصہ ان لوگوں میں اور ایسی صحبت میں بسر کیا۔ جو شعر و شاعری کا شوق تو درکنار تعلیمی شوق سے بھی بیگانہ محض تھے۔ جس فضا اور ماحول میں ان کی پرورش ہوئی اور جس صورت حالات کے ماتحت ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس کو دیکھ کر یہ بات بلا تصنع اور بغیر کسی مبالغے کے کہی جاسکتی ہے۔ کہ ان کا ایک لائق شاعر اور قابل ادیب ہونا بجز انعام الٰہی اور نعمت وہبی کے اور کسی چیز سے تشبیہ نہیں دیا جاسکتا۔ نہایت مخالف حالات میں کوئی پہلو ایسا نظر نہ آتا تھا۔ جس سے یہ اُمید کی جاسکتی۔ کہ یہ ہونہار مستقبل قریب میں ایک ذہین طالب علم ایک لائق قابل معلم ایک ممتاز سر برآوردہ ادیب ایک مشہور اور اعلےٰ پائے کا شاعر ایسے گم نام اور پست حال قصبہ کی سرزمین کو اپنے اوصاف و کمالاتِ متعدد سے قابلِ فخر اور لائقِ رشک بنا دے گا۔ حسنِ تدبیر کہئے یا حسنِ تقدیر۔ انہوں نے اپنے وہبی جوہر اور خداداد طبیعت کو رہبر بنا کر مشقِ سخن جاری رکھی۔ ذوقِ سخن کامل ہو اور وجدانِ صحیح رہبرِ صادق بن جائے تو خوش بیان ہو جانے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ کافی مشق کے بعد یہ ضرورت خود بخود محسوس ہوئی۔ کہ اب کسی نامور اُستادِ وقت کے سامنے بہ غرض حصول اصلاح زانوئے ادب تہ کریں۔ ان دنوں میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی اور جناب امیر مینائی دُنیائے سخن میں علم امتیاز بلند کئے ہوئے تھے۔ جوش صاحب کی طبیعت روانیِ کلام اور لطفِ زبان کی دلدادہ تھی۔ اس لئے انہوں نے حضرت امیر مینائی کے تلامذہ میں داخل ہونا اپنے رنگِ سخن کے خلاف سمجھا اور میلانِ طبیعت کی وجہ سے

جہاں اُستاد جناب داغ دہلوی کے زمرہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ کچھ تو اپنا حسنِ طبیعت اور کچھ حضرت داغ کی التفات آمیز نوازش۔ تھوڑے ہی عرصے میں نشیب و فراز سے آگاہ ہو گئے۔ میں نے مہینوں حضرت داغ کی خدمت میں رہ کر انہیں اصلاح دیتے دیکھا ہے۔ وہ ایک دو نئے لفظ شعر میں رکھ کر شعر میں روح پھونک دیتے تھے اور اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتے تھے۔ لیکن اصلاح دیتے وقت شاگرد کے رنگِ سخن اور میلانِ طبیعت کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے۔

اس اصلاح سے مستفید ہو کر جوش صاحب بہت جلد ایک مکمل شاعر بن گئے۔ نظم کی ہر ایک صنف میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ غزل۔ رباعی۔ قطعہ۔ مستزاد وغیرہ کے علاوہ قدرتی مناظر۔ اخلاقی۔ ملکی۔ قومی اور بعض خیالی موضوع پر نظم کہنے کا سلسلہ۔ غرض جس چیز کو دیکھو۔ سب میں ان کا حسنِ طبیعت یکساں اور داد طلب نظر آتا ہے۔ بعض اصحاب نظم اچھی کہتے ہیں۔ مگر نثر میں پھیکے رہ جاتے ہیں۔ بعض نثر اچھی لکھ سکتے ہیں۔ مگر نظم میں اکھڑ رہ جاتے ہیں۔ جوش صاحب نظم اور نثر دونوں پر بخوبی قادر ہیں۔ یعنی وہ اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ اچھے ادیب اچھے نثار اور اچھے انشا پرداز بھی ہیں۔ ان کی نثر نگاری بھی ان کے شاعرانہ حسنِ بیان کا آئینہ ہوتی ہے۔

زبان کے متعلق کوئی کچھ کہے۔ مگر میں تو پنجاب کو اُردو زبان کا سب سے زیادہ خدمت گزار۔ سب سے بڑا معاون اور سرپرست بلکہ محسن سمجھتا ہوں۔ صرف لاہور ہی کو لیجئے۔ ایک اسی شہر سے اتنے اخبار۔ رسالے۔ جریدے شائع ہوتے ہیں۔ کہ کسی دوسرے صوبے میں مجموعی طور سے بھی اتنی تعداد اشاعت پذیر نہیں ہوتی۔ پھر ان مختلف رسالوں کے سال نامے جو ہر سال شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا وجود اُردو زبان کا قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ رہنمائے تعلیم کے جوبلی نمبر ہی کو لیجئے۔ آج تک اس ضخامت کا اور اس شان کا کوئی سال نامہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ جوش صاحب نے اس رسالہ کا مدیر حصہ نظم ہو کر اس کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جوبلی نمبر بذات خود ان کے ادبی ذوق و شوق کا ایک مرقع ہے۔

اب اس کا افسانہ نمبر شائع ہونے والا ہے۔ خدا جانے وہ کیا قیامت ڈھائے۔ میں نے ابھی دیکھا تو نہیں لیکن قیاس سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ وہ بھی اپنی نظیر آپ ہوگا جس رسالے کو جناب جوش اور سردار جگت سنگھ صاحب مرتب کریں۔ اس کے بے مثال ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اخیر میں افسانہ نمبر کی کامیابی کا دعا گو ہو کر اس مختصر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ { نوح ناروی

حضرت نوح کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے ؎ خود جو اچھے ہیں وہ اچھا ہی کہینگے سب کو

{ جوش ملسیانی

مولوی محمد حسین صاحب ادیب ایم اے - بی - ای ڈی

مولوی صاحب موصوف ایک بڑے فاضل اور سنجیدہ بزرگ ہیں جو نہایت خاموشی لیکن سرگرمی کے ساتھ ادبِ اُردو کی خدمت کر رہے ہیں - آپ کے اعلےٰ پایہ کے فلسفی اور تنقیدی مضامین بلاشبہ نہایت مفید اور غور سے پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں - مرزا سلطان احمد مرحوم کے بعد (جن کو فلسفی علمی اور تنقیدی مضامین نہایت قلم برداشتہ لکھنے کی حیرت انگیز قابلیت قدرت نے بخشی تھی - اور جنہوں نے سینکڑوں رسالوں میں ہزاروں بے نظیر مضمون لکھے) ہمیں ہرگز اُمید نہیں تھی کہ پھر اس پایہ کا کوئی ادیب پیدا ہوگا - جو اپنی اعلےٰ قابلیتیں یوں علم کی خدمت کے لئے وقف کر دیگا - مگر ہم خوشی اور مسرت کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ اُس جگہ کے جو جناب مرزا سلطان احمد مرحوم کے انتقال سے خالی ہوگئی تھی پُر ہونے کے آثار نظر آ رہے ہیں -

مولوی صاحب موصوف جو کچھ لکھتے ہیں وہ آپکے سنجیدہ اور بلند پایہ علمی مذاق اور آپکے مطالعہ کی وسعت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے - رہنمائے تعلیم کو فخر ہے کہ مولوی صاحب موصوف جیسے فاضل اور یگانۂ روزگار ادیب بھی بڑے شوق کے ساتھ اس میں اپنے بیش بہا علمی - ادبی اور تنقیدی مضامین اشاعت کے لئے ارسال فرماتے ہیں اور رسالہ کے دشمن باوجود کوشش کے بھی ممدوح کو رہنمائے تعلیم کی قلمی سرپرستی و اعانت سے باز رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے - چنانچہ پچھلے ہی دنوں کا واقعہ ہے کہ لاہور کے ایک حسد پیشہ ایڈیٹر نے مولوی صاحب کو لکھا کہ رہنمائے تعلیم کا مالک سکھ اور آپ مسلمان - نہ کچھ میل نہ تعلق - پھر آپ اُسے مضامین کیوں بھیجتے ہیں - اپنے مضامین صرف مسلم جرائد کے لئے وقف رکھئے - یہ ہندو اور سکھ اس قابل نہیں کہ انکے پرچوں میں کوئی اعلےٰ پایہ کا مضمون شائع ہو - مجھے رہنمائے تعلیم میں آپ کا فاضلانہ مضمون دیکھ کر بڑا تعجب ہوا - کیا آپ کو قومیت کا پاس اور مسلمانیت کا احساس بھی نہیں ؟ اس سے قطع نظر آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ رہنمائے تعلیم کا مالک پرائمری کلاسوں کا مدرس وہ آپکے مضامین کی وقعت اور علمیت کو کیا سمجھ سکتا ہے - پس آپ کی معلومات اور واقفیت کے لئے یہ سطور لکھی جا رہی ہیں - مجھے اُمید ہے کہ آئندہ کوئی مضمون آپ رہنمائے تعلیم میں اشاعت کے لئے نہیں بھیجیں گے -

مولوی صاحب ممدوح نے اس فساد انگیز تحریر پر کچھ توجہ نہیں دی اور درحقیقت یہ بغض و عداوت کی پوٹ اسی قابل تھی کہ ردی کی ٹوکری میں بے پروائی کے ساتھ پھینک دی جاتی - کیونکہ ایسے بزرگ فرقہ پرستی کی لعنت سے پاک ہوتے ہیں اور اگر ایک پرائمری کے مدرس کو علم و ادب کی خدمت کرتے دیکھتے ہیں تو اُس کی حوصلہ افزائی کو اپنا فرض سمجھتے ہیں - مولوی صاحب ممدوح نے کس لطیف پیرائے میں اس خط کا جواب دیا وہ سُننے کے قابل ہے - مولوی صاحب فرماتے ہیں "فرقہ داری تعصبات سے ہم لوگ بالاتر ہیں - پرائمری سکول کا معمولی مدرس اگر قوم و ملت کی خدمتگذاری کے لئے مستعد ہو اور گریجویٹ معاون ایڈیٹر اُس کے تحت شوق سے کام کرتے ہوں تو ایسے شخص کی ہمت اور زیادہ قابل تعریف ہے - مجھے .... کی تنگ خیالی پر سخت تعجب ہے - اور افسوس بھی" - مولوی صاحب نے کمال فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے رسالہ کے "جوبلی نمبر" پر ایک زبردست اور تفصیلی تبصرہ بھی فرمایا تھا جو پچھلے دنوں ۱۶ صفحات پر شائع کیا گیا تھا اور جسے ناظرین رسالہ ملاحظہ فرما چکے ہیں - اس "فسانہ نمبر" میں بھی "افسانوی پلاٹ کی تعمیر" ممدوح کا ایک نہایت فاضلانہ اور قابلِ قدر مضمون شائع ہو رہا ہے - اور درحقیقت نہایت موقع کی چیز اور جملہ فسانہ نگار اصحاب کے بہت توجہ کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہے - مجھے یقین ہے کہ مولوی صاحب ممدوح کی عنایات ہمیشہ رہنمائے تعلیم پر مبذول رہیں گی اور وہ ہمیشہ اپنے پُر از معلومات مضامین سے رسالہ کو مفتخر فرماتے رہیں گے -

جب مکرمی سردار جگت سنگھ صاحب نے مولوی صاحب کو اُن کے حالات کے لئے تحریر فرمایا تو اُس وقت مولوی صاحب اپنی ملازمتی مصروفیتوں میں کچھ اس طرح مبتلا تھے کہ قطعاً فرصت نہیں تھی۔ اس لئے آپ نے تحریر فرمایا کہ میرے مختصر حالات جو پچھلے نمبر کے ہمایوں میں شائع ہوئے ہیں وہاں سے نقل کر لئے جائیں۔ اس لئے ممدوح کی اجازت سے ذیل کی سطور جو جناب محمود علی خاں صاحب کے قلم کی رہین منت ہیں۔ مولوی صاحب ممدوح کی اجازت سے رسالہ ہمایوں سے نقل کی جاتی ہیں۔ اور اُس کے لئے ہم قابل اڈیٹر اور لائق مضمون نگار دونو کا نہایت شکریہ ادا کرتے ہیں۔

خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی

یہ لازم نہیں کہ ہر بڑے آدمی کی زندگی پُرشور، ہماہمی اور ڈرامائی ہو ایک پُرامن، عافیت پسند اور ہموار و سادہ زندگی بھی ملک و ملت کے لئے مفید ثابت ہو کر سچی عظمت کے مدارج طے کر سکتی ہے۔ انسان اپنی خاموش علمی و ادبی مصروفیات کے ذریعے سے بھی ابنائے وطن کی سچی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب ادیب کا شمار بھی انہیں قابل قدر لوگوں میں ہے جن کی قومی خدمت گذاری کسی قسم کی ہلچل، شور و شغب اور بلند بانگ دعاوی کی رہین منت نہیں ہے۔ آپ خاموش کام کرنے والے ہیں۔ طبیعت نہایت صلح جو اور آشتی پسند واقع ہوئی ہے۔ آپ کے تنقیدی مضامین میں دل آزاری۔ رشک وحسد یا معاصرانہ چشمک کا کہیں شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

آپ کا اصلی وطن قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد ہے۔ آپ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ قدیم طریقے کے مطابق اُردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم مکان ہی پر ہوئی۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کے لئے آپ آرہ ضلع اسکول میں داخل کئے گئے۔ آپ کی طالب علمی کا زمانہ نہایت شاندار رہا کیا۔ ہر امتحان میں آپ اپنی جماعت میں اول آتے رہے۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ مکان پر فارسی اور عربی کی تعلیم جاری رہی۔ ۱۹۰۹ء میں آپ نے انٹرنس کا امتحان بدرجۂ اوّل کامیاب کر کے سرکاری وظیفہ بھی حاصل کیا۔ اس کے بعد اعلےٰ تعلیم کے لئے آپ پٹنہ کالج بانکی پور میں شریک ہوئے۔ آپ کو لڑکپن ہی سے کتب بینی کا بیحد شوق تھا۔ پٹنہ میں علمی تشنگی کی تسکین کے لئے کافی سامان موجود تھا۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں نصابی مضامین کے علاوہ مختلف علوم وفنون کی کتابیں آپ کے زیر مطالعہ رہا کیں۔ کالج کے کتب خانہ کے علاوہ اورینٹل پبلک لائبریری (کتب خانہ عمومیہ مشرقیہ) بانکی پور سے بھی اچھی طرح استفادہ کیا۔ تعطیلات کا اکثر و بیشتر حصہ آپ اسی لائبریری میں گذارتے تھے۔ بہرحال ۱۹۱۲ء میں آپنے پٹنہ کالج سے بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

اگرچہ کالج ہی میں رہ کر آپ مافوق طیلسانی تعلیم حاصل کرنے کے بیحد متمنی تھے۔ لیکن خانگی مجبوریوں کے باعث آپ کو تعلیم ترک کرنی پڑی۔ بالآخر فکرِ معاش نے آپ کو سررشتہ تعلیمات سے وابستہ کر دیا۔ یہاں خانگی طور پر ایم اے کی تیاری کا بہترین موقع تھا۔ آپ نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور ۱۹۱۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ اب سررشتۂ تعلیمات کی کامیاب ملازمت کے لئے ٹریننگ کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی ٹی ڈی کی سند حاصل کر لینے پر یہ فنی مرحلہ طے ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ترکِ موالات کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ تمام زعمائے ملت تعمیری لائحہ کار ترک کر کے صرف تخریبی عمل کے علم بردار بنے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کے نزدیک انگریزی مدارس کی تعلیم ایمان فروشی کے مترادف اور سرکاری ملازمت گویا شیطان کی حلقہ بگوشی تھی۔ مولوی محمد حسین صاحب کو پٹنہ میں بڑے بڑے رہنمایان قوم وزعمائے ملت کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا۔ ان کے خطبات سے متاثر ہو کر صاحب موصوف نے انگریزی سرکار کی نوکری چھوڑ دینے اور کسی اسلامی ریاست میں ملازمت تلاش کرنے کی ٹھان لی۔ سب سے پہلے ممالک محروسہ سرکار نظام پر نظر پڑنا ایک فطری امر تھا۔ اس وقت یہاں کے سررشتۂ تعلیمات کی باگ نواب مسعود جنگ بہادر کے مبارک ہاتھوں میں تھی جن سے مولوی محمد حسین صاحب کو پٹنہ ہی میں نیاز حاصل ہو چکا تھا۔ نواب صاحب نے موصوف کی درخواست کو شرف پذیرائی بخشا اور انہیں حیدر آباد طلب کر کے ایک گزیٹڈ عہدہ سے سرفراز فرمایا۔

یہاں سے مولوی محمد حسین صاحب کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس ریاستِ ابد مدت کی پُرامن فضا جو ہر قسم کی فرقہ وارانہ کشیدگیوں اور جنبہ وارانہ تنازعات سے پاک ہے۔ شہریار دکن کی غیر معمولی رواداری وحق پژوہی اور سادگی ونصفت شعاری جو خلفائے راشدین کی یاد تازہ کرتی ہے اور شاندار مغلیہ تہذیب وتمدن کے زندہ آثار جو اب بھی یہاں باقی ہیں۔ یہ تمام چیزیں صاحب ممدوح کو اس قدر پسند آئیں کہ بہت جلد انہوں نے حیدر آباد کو اپنا وطن ثانی بنا لیا۔ دس گیارہ سال سے وہ مختلف مدارسِ فوقانیہ کی صدارت پر فائز چلے آرہے ہیں۔ کتب بینی اور مطالعہ کا تو انہیں ابتدا ہی سے بیحد شوق تھا۔ لیکن حیدر آباد آکر قلم کی بھی چٹیک پیدا ہوئی اور وہ نہایت انہماک کے ساتھ اُردو زبان وادب کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

عام طور پر مدارسِ فوقانیہ کا کتابی ذخیرہ تشنہ کامان علم کی آسودگی کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مولوی محمد حسین صاحب کی علمی تشنگی ہمیشہ اس چشمہ کی تنک آبی کی شاکی رہی۔ فی الحقیقت ہائی اسکول کا کتب خانہ آپ کے روز افزوں ذوقِ مطالعہ کا حریف نہ بن سکا۔ اس لئے صاحبِ موصوف کو اپنا ایک علیحدہ کتب خانہ قائم کرنا پڑا۔ آپ کی تنخواہ کا ایک معتدبہ حصہ نئی نئی کتابوں کے خریدنے کے لئے وقف ہے۔ تمام دوسری ضروریات میں کمی ہو لیکن کیا مجال جو کتابوں کے میزانیہ میں کوئی فرق آئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ صاحب ممدوح کے پاس اُردو۔ فارسی۔ عربی اور انگریزی کتابوں کا نادر ذخیرہ جمع ہو گیا۔ جو کتابیں ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوتیں وہ انگلستان اور امریکہ سے منگائی گئی ہیں۔ صاحب موصوف کو اپنے کتب خانہ سے بیحد اُنس ہے۔ وہ کتابوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ مخلص سے مخلص احباب کی صحبت میں بھی آپ کو اتنی خوشی حاصل نہیں ہوتی جتنی اپنے کتب خانے میں۔ خود صاحب ممدوح کا قول ہے کہ "جب میں اپنے کتب خانے میں مشغول مطالعہ ہوتا ہوں تو تمام دنیوی ترددات وتفکرات کو بھول جاتا ہوں اور مجھے ایسا قلبی اطمینان وسکون حاصل ہوتا ہے جو اور کہیں میسر نہیں آسکتا۔"

مولوی محمد حسین صاحب طبعاً قدامت پسند واقع ہوئے ہیں، وہ مغرب کی مادہ پرستی جاہ طلبی حرص زر اور ظاہری طمطراق سے سخت متنفر اور مشرقی تہذیب ۔ قدیم قومی شعائر اور روحانیت کے دلدادہ ہیں ۔ وہ مولوی عبد الماجد صاحب دریا بادی کے خیالات و افکار کے زبردست حامی ہیں ۔ کثرتِ کتب بینی و مضمون نگاری اور دوسرے علمی مشاغل نے مولوی محمد حسین صاحب کو بہت کم آمیز اور تنہائی پسند بنادیا ہے ۔ اس پر طرہ یہ کہ آپ کی طبیعت میں صد درجہ کی متانت ۔ سنجیدگی اور خودداری بھی پائی جاتی ہے ۔ اگرچہ یہ انسانی سیرت کی قابلِ تعریف خوبیاں ہیں لیکن ناواقف اور ظاہر بین شخص کو اس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے تاہم جو لوگ آپ کی طبیعت اور مصروفیات سے واقف ہیں وہ آپ کے خلوص، ہمدردی، وسیع الاخلاقی اور منکسر المزاجی کے معترف ہیں ۔ علاوہ بریں آپ میں ایک خاص صفت بھی موجود ہے جس سے یار باشی اور ملنساری کی کمی کی پوری پوری تلافی ہو جاتی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ صاحب ممدوح ایک زبردست مقرر بھی ہیں ۔ کوئی مذہبی، معاشرتی، خانگی یا عام جلسہ ایسا نہیں ہوتا جہاں وہ تقریر کے لئے مدعو نہ کئے جاتے ہوں ۔ مختلف مذہبی مواقع پر مسجدوں میں آپ کو واعظ کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے ہیں ۔ آپ کی وہ تقریریں خاص طور پر پسند کی جاتی ہیں جن میں آپ علوم جدیدہ اور اکتشافات قریبہ کی مدد سے عقائد بالغیب کی تشریح فرماتے ہیں ۔ ہر معاشرتی مجمع میں آپ کی شرکت کلب میں روزانہ حاضری سے معذوری کی تلافی کردیتی ہے ۔

آج کل آپ کے علمی مشاغل کے تین اہم شعبے ہیں ۔ فن تعلیم، زبان و ادب اور مذہب و اخلاق ۔ آپ کی فنی مہارت کے آئینہ دار وہ تحقیقی مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً المعلم حیدرآباد، اخبار تعلیم لاہور اور رہنمائے تعلیم میں شائع ہوا کئے ہیں ۔ آپ کے ادبی و تنقیدی مضامین آئے دن ملک کے موقر رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں جو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھے اور بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں ۔ لیکن آپ کی وسیع مذہبی معلومات سے صرف وہی لوگ مستفید ہوتے ہیں جنہیں آپ کی تقاریر اور وعظ سننے کا موقع ملتا ہے ۔ آپ اپنے مذہبی مضامین کی اشاعت پسند نہیں فرماتے کیونکہ آپ کا خیال ہے کہ مذہبی مضمون چھپوانا گویا جھگڑے مول لینا ہے ۔

انسان اور حیوان میں بڑا فرق یہ ہے کہ حیوان کو صرف اپنے اور اپنے ننھے بچوں کے پیٹ کی فکر ہوتی ہے لیکن انسان کی ذات سے اس کے ابنائے وطن کو بھی فائدہ پہنچتا ہے ۔ کوئی شخص کتنا ہی مالدار اور صاحب اقتدار کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ دوسروں کے ساتھ کچھ بھلائی نہ کر سکے تو معاشرہ کے لئے اس کا وجود عدم وجود دونو یکساں ہیں ۔ مولوی محمد حسین صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ ملک و قوم کی خدمت گذاری میں صرف ہوتا ہے ۔ فرائض منصبی سے متعلق آپ کا نونہالانِ چمن کو پروان چڑھانے اور آنے والی نسل کی قسمت کو سنوارنے میں گذرتا ہے ۔ مختلف موقعوں پر آپ کی جو تقریریں ہوا کرتی ہیں ان سے عوام کی مذہبی و معاشرتی اصلاح و ترقی وابستہ ہے ۔ اپنی فرصت کی ساعتوں میں آپ ادب و زبان کی جو خدمت انجام دیتے ہیں ۔ وہ فی الحقیقت ملک و قوم کی خدمت ہے ۔ آپ کی مصروف زندگی ہمیں بتاتی ہے کہ کس طرح ایک خاموش کام کرنیوالا

شخص خارزار سیاست سے اپنا دامن الجھائے بغیر بھی اپنے بے ریا مشاغل اور بے غرضانہ کارگذاریوں کے ذریعہ سے سچا محب وطن بن سکتا ہے۔

مولوی محمد حسین صاحب اپنی ملازمت کے سلسلہ میں جہاں کہیں رہے وہاں کے ہر فرقے اور ہر طبقہ کے لوگوں میں آپ کو ہردلعزیزی حاصل رہی چھوٹے بڑے امیر غریب' عوام' معززین اور عہدہ دار سب کے سب آپ کی اعلےٰ علمی قابلیت اور وسیع معلومات کی قدر کرتے اور آپ کو عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

افسوس ہے کہ انتہا درجے کی محنت کے باعث چند سال سے صاحب ممدوح مرض ذیابیطس میں مبتلا ہو گئے ہیں جس نے آپ کو نہایت نحیف و لاغر بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر شروع ہی سے آپ کو دماغی محنت ترک کرنے کا مشورہ دیتے آئے ہیں۔ لیکن آپ اپنے علمی مشاغل ترک کرنے کو ذہنی و روحانی موت کے مترادف سمجھتے رہے ہیں۔ البتہ سال بھر سے آپ نے دماغی کدو کاش کسی قدر کم کر دی ہے جس کا نتیجہ آپ کی صحت کے لئے بفضلِ خدا مفید ثابت ہو رہا ہے۔ دعا ہے کہ خدائے پاک آپ کو جلد صحت کلی عطا فرمائے تاکہ آپ پوری سرگرمی کے ساتھ رفاہِ عام کے کام انجام دے سکیں۔ تصویر جو اشاعت کے لئے روانہ کی جا رہی ہے وہ صحت کے زمانہ کی ہے۔

محمود خاں (از ہمایوں)

ہماری خدمات

ناظرین کرام خوب جانتے ہیں کہ میں رہنمائے تعلیم کے ذریعہ انکی دلچسپی بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ ۲۹ سال سے اپنی بساط سے بڑھ کر میں ملک کی تعلیمی و ادبی خدمت کا فرض اہم ادا کر رہا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ "رہنمائے تعلیم" کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اس کی باقاعدہ اشاعت و شاندار خدمات کی وجہ سے اسے وہ درجۂ قبولیت حاصل ہے۔ جو کسی دوسرے تعلیمی پرچہ کو نصیب نہیں ہُوا۔ کہنے کو تو کمہاری اپنے برتن کی ہی تعریف کرتی ہے۔ مگر کسی چیز کی حقیقی تعریف وہی ہُوا کرتی ہے جسے عام لوگ پسند کریں۔ رہنمائے تعلیم کی شان اس بارے میں بہت ارفع ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح میں ایثار اور قربانی سے اپنے معزز خریداروں کی خدمت کر رہا ہوں۔ وہ بھی اسی طرح اس رسالہ کی سرپرستی میں حصہ لیں' اور اس سال بیش از بیش اس کے خریدار بنا کر میری حوصلہ افزائی کریں۔ **درخواست کا فارم** اسی نمبر کے صفحہ ۴۶۸ پر موجود ہے۔ کرم فرما اصحاب وہ صفحہ رسالہ سے الگ کر کے اپنے احباب کے نام و پتے لکھکر دفتر میں جلد بھیجدیں عنایت ہوگی۔ (مینیجر)
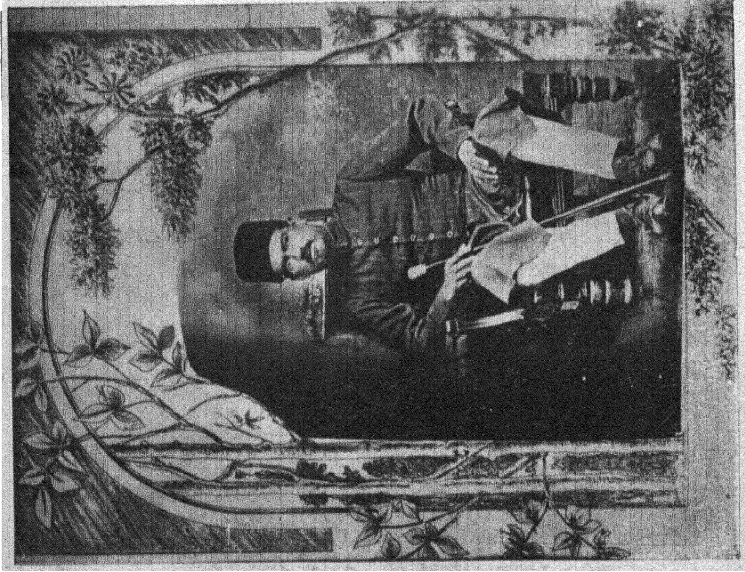
RISALA RAHNUMA-I-TALIM

مولوی محمد حسن صاحب ادیب ایم۔ اے۔ بی۔ ای۔ ٹی۔
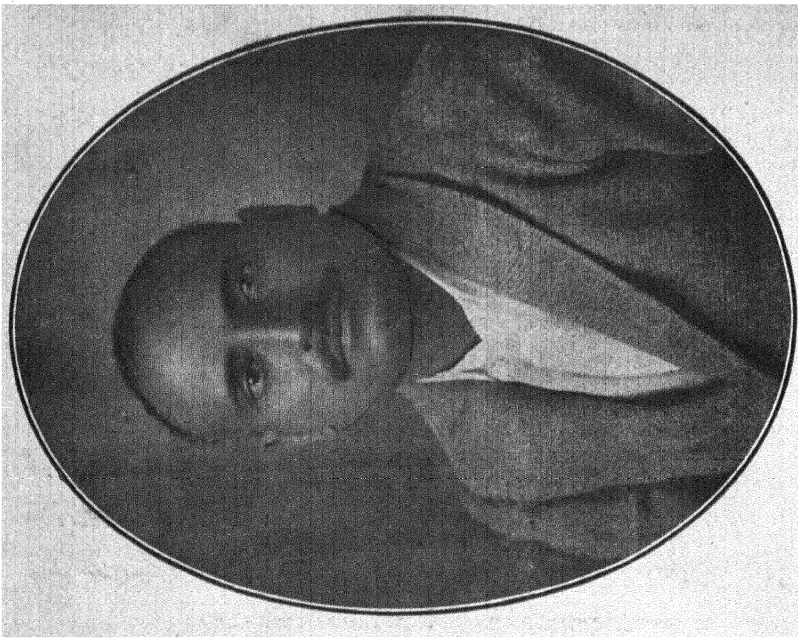
RAMGALI, LAHORE.

پنڈت اندر جیت صاحب شرما

پنڈت شیو ناتھ صاحب کول شاکر گوالیاری
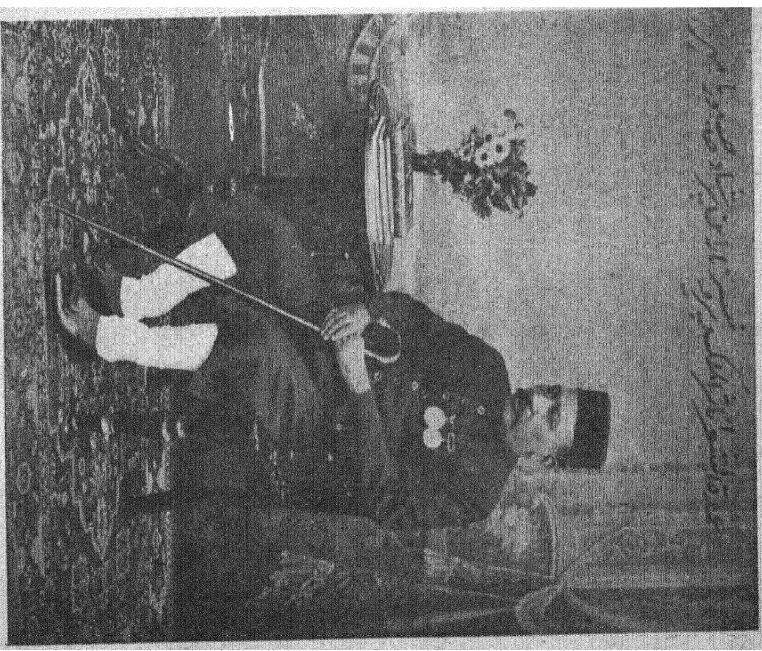
پروفیسر نارائن پرشاد صاحب ورما مہر

مختصر سوانح حیات

پروفیسر نارائن پرشاد ورما مہر

عمدۃ الشعراء ناشر الملک افضل الشعراء ممبر خصوصی و تنقیدی انجمن خاصانِ ادب لکھنؤ جانشینِ فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی پروفیسر نارائن پرشاد ورما مہرؔ قوم کائستھ سکسینا کے ایک معزز رکن ہیں۔ قومی ورما اور خاندانی لقب سٹھولے ہے۔ آپ کا نسبی سلسلہ شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ غازی کے دیوانِ بیوتات رائے پراگ داس تک پہنچتا ہے۔ سلطنت مغلیہ میں آپ کے آباو اجداد عہدہائے جلیلہ پر ممتاز رہکر دہلی میں قیام پذیر رہے۔ مگر مغلوں کے آخری دَور میں آپ کے بزرگوں کو محال بدایوں کی چودھرات و قانونگوئی عطا ہوئی اور وہ کچھ عرصے تک قصبۂ سہاور کے خوشباش رہکر سہسوان ضلع بدایوں میں سکونت گزیں ہوئے اور وہیں رہ پڑے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد آپ کے نانا منشی چھیب لال صاحب جو بانس بریلی کے ایک معزز خاندان کے رُکن تھے پنڈت ہرناتھ صاحب نائب دیوان کے توسط سے گوالیار آکر ریاست کے اضلاع آگرہ اور شاجاپور میں نائب صوبہ رہے۔ اور گوالیار کی قسمت مالوہ میں اُجین کے اسسٹنٹ سر صوبہ کے عہدے سے پنشن یاب ہوئے۔ آپ کے دادا جناب منشی چُنی لال صاحب مُدت العمر ضلع سیالکوٹ میں گورنمنٹ پنجاب کے ملازم رہے۔ آپ کے والد بزرگوار جناب منشی کنہیالال صاحب اپنے خُسر صاحب کی تحریک سے گوالیار آکر پرگنات شیوپور اور بجے پُور میں مدت تک منصرم فوجداری و تحصیلدار رہے۔ پھر پنشن حاصل کر کے ریاست کے دار السلطنت شہر لشکر میں گوالیار کی ہائی کورٹ کے وکیل رہے۔

حضرتِ مہرؔ کی ولادت ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ زبان فارسی کی تکمیل آپ نے مختلف مقامات میں کی۔ گوالیار میں علامہ قاضی ہدایت اللہ صاحب سے اہلِ ایران اور مستشرقین کی جملہ کتب متداولہ نظم و نثر کا درس لیا۔ سہسوان میں جناب مولوی طاہر بیگ و مولوی عنایت اللہ صاحب بدایونی اور بریلی میں چند مولویوں سے مختلف کتب درسیہ پڑھیں۔ نیز اُدبائے مشاہیرِ وقت سے زبان فارسی و اُردو نظم و نثر کے مختلف عُلوم و فنُون کا اکتساب کیا۔ بعدہٗ گورنمنٹ کالج بریلی میں زبانِ انگریزی اور دیگر علومِ مغربیہ کی عرصے تک تعلیم پائی اور یونیورسٹی کے ایک امتحان کی اعلےٰ کامیابی کے صلے میں آپ کو ایک سونے کا تمغا ملا۔

دسمبر ۱۸۹۳ء میں گوالیار آکر آپ ملازم گوالیار گورنمنٹ ہوئے اور چالیس سال تک محکمہ جات تعلیم و مردم شماری پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں مختلف عہدوں پر دیانت و امانت سے کام کر کے آپ نے معزز ترین طریقے سے پنشن پائی۔ آپ اولاد کی جانب سے بھی خوش نصیب ہیں۔ آپ کے ایک صاحبزادی اور چھ فرزند ہیں جو خدا کے فضل و کرم سے اعلیٰ درجے

کے تعلیم یافتہ اور خوش حال ہیں۔ آپ بذاتِ خاص بھی علم دوست۔ خوش خلق۔ مرنجان مرنج۔ بغض و حسد سے پاک۔ اور ہر مذہب و ملّت کے لوگوں سے بے تعصبی کا برتاؤ کرنے والے ہیں۔

آپ کی طبیعت کو فنونِ نفیسہ سے ازلی اور وہبی مناسبت ہے۔ آپ نے موسیقی۔ مصوری و خوشنویسی کے اکتساب میں بھی کچھ وقت صرف کیا ہے۔ اور فنِ سخن میں تو آپ نے سولہ سترہ سال ہی کی عمر میں حضرتِ داغ دہلوی کے سامنے جب وہ ریاست رامپور میں تھے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور تقریباً پچیس سال تک کسب فن میں مصروف و منہمک رہے۔ اگر اُس زمانے کا آپ کا کل کلام جمع کیا جاتا تو ایک ضخیم دیوان تیار ہوتا۔ لیکن آپ کی بے پروائی سے وہ سارا کلام ضائع ہو گیا۔ ۱۳۲۲ھ میں حضرتِ فصیح الملک داغ دہلوی کے انتقال ہو جانے کے بعد کئی سال تک آپ نے فکرِ سخن مطلق نہیں کی اور شعر و شاعری کے مشغلے کو خیر باد کہدیا۔ مگر ۱۹۱۴ء میں دہلی کے رئیسِ اعظم لالہ سری رام صاحب ایم اے نے جب اپنے تذکرۂ ہزار داستان معروف بہ خمخانہ جاوید کی جلد سوم کے لئے نظم و نثر میں تقاریظ اور تاریخی قطعات آپ سے لکھوائے تو آپ کی دبی ہوئی آتشِ سخن گوئی کو پنکھا جھل جھل کر مشتعل کیا اور آپ کو شعر کہنے کی جانب پھر راغب کر دیا۔ چنانچہ اِس ۱۷ سال کے زمانے میں جو کچھ آپ نے از قسم غزلیات۔ رباعیات۔ قطعات تاریخی۔ مسدسات۔ مخمسات۔ مُبارکبادیاں۔ سہرے۔ فردیات وغیرہ کہی ہیں۔ وہ ایک مکمل دیوان کی صورت میں مرتب ہو کر طبع ہونے کے لئے تیار ہیں۔

آپ کا کلام نظم اور نثر کے مضامین ایک مدت تک وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مختلف متعدد ادبی رسالوں میں طبع ہو کر نذرِ ناظرین ہوتے رہے ہیں اور مُلک کے اعلیٰ ادیبوں اور ادبی انجمنوں نے بھی آپ کی فنی قابلیت اور ادبی خدمتوں کی داد دیکر آپ کو اعزازی خطابات اور سندیں دی ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں انجمن نہالِ سخن بانس بریلی نے جس میں دہلی اور لکھنؤ کے مشاہیر شعرا شامل تھے۔ آپ کو خطابِ "افضل الشعرا" کی مہری دستخطی سند دی ستمبر ۱۹۱۹ء میں دہلی سے خطاب "عمدۃ الشعرا و جانشینی حضرتِ داغ دہلویؒ" اور الہ آباد سے خطاب "ناشر الملک" کی مُہری و دستخطی سندیں آپ کو بھیجی گئیں۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں انجمن خاصانِ ادب لکھنؤ نے آپ کو انجمن کا ممبر خصوصی اور تنقیدی منتخب کر کے ۵ا جنوری سنہ مذکور کے اخبار ہمدم لکھنؤ میں اعلان کیا۔ نیز ستمبر ۱۹۲۶ء کے ایجوکیشن ویک اور نومبر ۱۹۲۶ء کے جلسۂ مادھو جینتی میں بہترین مضامین نظم و نثر پیش کرنے کے صلے میں دو اعلیٰ درجے کی سندیں معہ ایک اوّل درجے کے سیمیں تمغے کے آپ کو گورنمنٹ گوالیار سے عطا ہوئیں۔

مضمون نگاری اور شعر و شاعری کے علاوہ آپ نے چند کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں آپ نے کتاب "ہمایانِ ہند" لکھی جس کو علامہ شبلی نعمانی اور مولوی عزیز مرزا مرحوم ہوم سکرٹری حضور نظامِ دکن کی سفارشوں پر انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد نے آپ کو معقول نقد معاوضہ دیکر خان صاحب سید ولایت حسین صاحب آنریری منیجر بکڈپو مدرسۃ العلوم

علی گڑھ کے زیرِ اہتمام مطبع ریاض ہند علیگڑھ میں طبع کرایا۔ باوجود ہنود کے مقدس رہنماؤں کے سوانح عمری اور فلسفہ آموز تعلیمات ہونے کے اِس کتاب کی زبان اور طرزِ تحریر کچھ ایسی پسند خلائق ہوئی کہ اِس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہوئے۔ اور انجمن مذکور نے کثیر فائدہ اُٹھایا۔ آپ کی دو تصنیفیں نثر ثریا و تہنیت نامۂ سندھیا بعد اغذِ حق تصنیف مسلم پریس گوالیار نے شائع کیں مگر اب وہ عنقا کا حکم رکھتی ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں آپ نے اپنے صرفے سے ناول سفید جوگن تصنیف کر کے چھپوایا۔ یہ ناول ایک نادر الوجود فسانہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ قابل دید ہے۔ ماہرانِ فن نے اِس کی طرزِ تحریر کو انگلستان کے جادو نگار مسٹر رینالڈس کی تحریر کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اِس کی جلدیں لندن اور نیویارک کے کتب خانوں میں منگاکر رکھی گئی ہیں۔ اور گورنمنٹ گوالیار نے اس پُر مصنف کو دو سو روپیہ انعام دیا ہے۔

آپ نے اُردو زبان کے محاورات کی ایک کتاب "محاورات مہر" بھی لکھی ہے جس کے ہر محاورے پر اپنا ہی شعر سند میں درج کیا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں اربابِ نشاط کی نغمہ سرائی کے لئے آپ نے ترانۂ مہر۔ زمزمۂ مہر۔ نغمۂ مہر تصنیف کر کے طبع کرائے اور اِن پر گورنمنٹ گوالیار سے ڈیڑھ سو روپیہ انعام پایا۔ اب اُردو میں "رہبرِ مضمون نگاری" ۲۹ صفحوں پر اور آپ کا دیوان "شعاع مہر" جس پر آپ کو گورنمنٹ گوالیار سے دو سو روپیہ انعام مل چکا ہے۔ ..۸ صفحوں کی ضخامت کا معہ رنگین ٹائیٹل و فوٹوئے مصنف نستعلیق خط میں کاپی کئے ہوئے طباعت و اشاعت کے لئے تیار ہیں۔ اہلِ مطابع چھاپ کر نفع کثیر اُٹھائیں۔

آپ فنِ شاعری کے ماہر کامل۔ اُردو زبان کے اعلیٰ درجے کے ادیب اور محسن ہیں۔ آپ کے کلام میں فصاحت۔ بلاغت۔ اور فصحائے دہلی کی زبان کا چربہ نظر آتا ہے۔ جگہ جگہ اشعار سے فصیح الملک حضرتِ داغ دہلوی کا رنگ ٹپکتا ہے۔ آپ نظم و نثر دونو پر بخوبی قادر ہیں۔ غزل گوئی میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ آپ کا رنگ کلام سہل ممتنع ہے۔ زبان دلی کی فصیح ٹکسالی۔ روزمرہ صاف۔ اشعار میں مضمون کے ساتھ زبان کا چٹخارہ۔ معانی لُطف انگیز۔ بیان میں نُدرت۔ معاملہ بندی حسن و عشق کے راز و نیاز۔ اور دلی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی طرزِ ادا قابلِ تحسین و آفرین ہے۔ غرض اس وقت دُنیائے ادب میں آپ کا دم غنیمت ہے۔

نمونۂ کلام

میں کون ہوں جو مجھ سے حمد و ثنا ہو تیری　　　میری زبان تیری۔ میرا کلام تیرا
آتا نہیں کیوں حالِ غمِ عشق زباں پر　　　میں کہہ نہیں سکتا کہ بیاں ہو نہیں سکتا
میں پشیمان ہوا اُس کی پشیمانی سے　　　مجھ سے دیکھا نہ گیا اُس کا پشیماں ہونا
وہ مراسم بھی تمہیں یاد ہیں۔ یا بھول گئے　　　کبھی مہماں مجھے کرنا۔ کبھی مہماں ہونا

آپ پر مرتا نہ کوئی۔ تو جلاتے کس کو آپ
آپ کو تو مرنے والوں نے مسیحا کر دیا

تسکین دے کے وہ تو بڑی چال کر گئے
مجھ کو خبر نہ تھی کہ مرا امتحاں ہے اب

لطف جب ہے۔ ایک کی نیچی نظر ہو ایک سے
ہم وفاؤں سے کریں شرمندہ احسانوں سے آپ

کیا شرارت ہے کہ بھیجا مجھے خط غیر کے ہاتھ
اور پھر اُس پہ لفافے میں ہے کورا کاغذ

کیا ایک ہی کے ہیں یہ ستم میری جان پر
چھ آسمان اور ہیں اس آسمان پر

کچھ کہہ سکے نہ داورِ محشر کے سامنے
آنکھیں بھر آئیں اُن کو گنہگار دیکھ کر

گری بعدِ اسیری چرخ سے کیوں ٹوٹ کر بجلی
کوئی پر رہ گیا تھا کیا مرا شاخِ نشیمن پر

دل نے چھیڑا تھا تمہیں یا تم نے چٹکی دل میں لی
تو تمہیں کہدو ہوئی پہلے کدھر سے چھیڑ چھاڑ

خود مٹے گا یا مٹائے گا مجھے
کچھ تو ہوگی انتہائے دردِ دل

کیا کریں اِس کے سوا دستِ جنوں کی تدبیر
بخیہ گر روز گریباں مرا سی جاتے ہیں

ہم نے نالہ بھی کبھی دل سے نکلنے نہ دیا
یہ سمجھ کر کہ نہ ہو یہ بھی ترا راز کہیں

وفائیں ہم کریں اُن سے۔ جفائیں وہ کریں ہم پر
کسی کا کیا اجارہ ہے ہم اُنکے۔ وہ ہمارے ہیں

پُوچھ کر اس لئے ہم پر وہ جفا کرتے ہیں
لوگ جانیں کہ یہ اِنکا ہی کہا کرتے ہیں

پی لیں گے خونِ دل ہی۔ نہ ہوگی اگر شراب
توبہ تو ہم سے ہو نہ سکے گی بہار میں

وہ کریں بھی کچھ مرے واسطے غرض اس سے کیا مجھے کیا کریں
جو کرم نہو تو ستم کریں۔ جو وفا نہو تو جفا کریں

کوئی دم میں وہی دُنیا سے اُٹھا جاتا ہے
اپنے بیمار سے تم ہاتھ اُٹھاتے کیوں ہو

کیا تماشا ہے مری جان بھی وہ لیتے ہیں
اور پھر پوچھتے ہیں جان سے جاتے کیوں ہو

جل کے ہم ٹھنڈے جو سوتے بھی تو ہوتے کس طرح
آتشِ سوزِ محبت آگ تھی پانی نہ تھی

بتا اے ناتوانی رہ گئی اب بات کیا میری
وہ کہتے ہیں کہ تجھ سے اُٹھ نہیں سکتی جفا میری

قضا ہی جب نہیں قسمت میں تو شفا کیسی
مجھے وہ زہر بھی دیتے نہیں دوا کیسی

ستمگر کی نگاہِ ناز بھی کتنی ستمگر ہے
جو سیدھی ہے تو ناوک ہے جو ٹیڑھی ہے تو خنجر ہے

دم نکلنے کا تماشا دیکھنے آتے ہیں وہ
دم مری آنکھوں میں یارب اور کوئی دم رہے

کئے کچھ ابتک وفا اُنھوں نے کچھ اب وہ آگے وفا کریں گے
بہت سے ایسے ہوئے ہیں وعدے بہت سے ایسے ہُوا کریں گے

تجھپہ قربان ہوئی جاتی ہے
جان اب جان ہوئی جاتی ہے

جان کر تجھ کو جفا کار وفا کی میں نے
جو خطا کی نہیں جاتی وہ خطا کی میں نے

نظر بھی آئی جو دن کی صورت تو یوں شبِ انتظار آئی
سفید آنکھیں ہوئیں جب اپنی تو ہم نے جانا سحر ہوئی ہے

کم نگاہی کی شکایت پر شرارت دیکھنا
وہ مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا کئے

کبھی دل ہی میں دیکھیں ہم اُسے تو کس طرح دیکھیں
کہ شوقِ دید تو ہر بار آنکھیں کھول دیتا ہے

کہیں دیکھا ہے کوئی مہر سا بھی خوش بیاں شاعر
زباں موتی اُگلتی ہے۔ قلم موتی پروتا ہے

مختصر حالات محترمہ ممتاز بیگم صاحبہ مارہروی المتخلص بہ ممتاز مارہروی

میرا اصلی وطن اگرچہ مارہرہ ضلع ایٹہ ہے۔ لیکن اپنے والدین کے قیامِ اٹاوہ کے باعث اٹاوہ میں پیدا ہوئی تھی۔ میرا سالِ ولادت ۱۹۰۴ء ہے اور اس حساب سے میری عمر اس وقت ۲۹ سال کی ہے۔

میرے والد ماجد خانصاحب جناب مولوی عبدالوہاب صاحب زبیری بی اے (علیگ) یو۔پی کی سول سروس میں بعہدہ اسسٹنٹ کمشنری اکسائز (آبکاری) فائز ہیں۔ اور آج کل بریلی ڈویژن کے انچارج ہیں۔ ممدوح نہایت علمدوست اور روشن خیال بزرگ ہیں ۱۹۰۴ء میں آپ علیگڈھ ایم اے او کالج سے گریجویٹ ہوئے اور اس کے بعد گورنمنٹ سروس میں بعہدہ انسپکٹری اکسائز داخل ہو گئے۔ اور آج اپنی حُسنِ خدمات اور اعلےٰ قابلیت کی بدولت موجودہ عہدہ پر پہنچ گئے ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو آپ کو نئے سال کے خطابات کے سلسلہ میں گورنمنٹ ہند نے آپ کی گراں قدر خدمات کے صلہ میں "خاں صاحب" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ والد صاحب قبلہ کے مختلف تبادلے اور مختلف مقامات پر تبدیلیوں کے باعث میں بھی اپنے بچپن سے لے کر شادی کے وقت تک ایک جگہ نہ رہ سکی۔ اور زیادہ تر قیام میرٹھ۔ آگرہ اور الہ آباد میں رہا۔ والدہ کے انتقالِ پُرملال کے بعد سے زیادہ تر اپنے جدامجد مولوی عبدالحکیم مرحوم کے سایۂ عاطفت میں رہی۔ اور مرحوم کا قیام چونکہ زیادہ تر اٹاوہ اور پھر مارہرہ میں رہا۔ اس لئے میرا زمانہ سن بلوغ ان ہی دو مقامات پر گزرا۔

میں ابھی ۶ برس ہی کی تھی کہ میری والدہ نے مجھے میری دادی کی آغوشِ شفقت میں چھوڑ کر خود کنارہ کشی اختیار

کرلی اور یہ پہلا داغ جدائی اور صدمۂ رحلت تھا جو مجھے اِس کم سنی میں اُٹھانا پڑا۔

میری تمام تر تعلیم و تربیت اس لئے جدامجد مرحوم اور میری دادی مرحومہ کے ہاتھوں میں رہی۔ اور اِن ہی دو صاحب فضیلت و لیاقت بزرگوں کا فیضانِ کرم تھا جو آج میں اس قابل ہوں کہ علم و ادب کی کچھ خدمت اپنے ناتواں ہاتھوں سے کر رہی ہوں۔

میرے دادا بڑے عالم اور بڑے فاضل تھے۔ اور نہایت باکمال شاعر۔ فارسی زبان پر اُنہیں بڑا عبور تھا۔ آخر عمر میں مرحوم کی بصارت ضعف کے باعث جاتی رہی تھی۔ حالانکہ والد صاحب قبلہ نے ہر ممکن کوشش کی اور آپریشن بھی ہوا۔ لیکن قوت بصارت ایسی رخصت ہوئی کہ پھر نہ آسکی۔ مرحوم کو لکھنے پڑھنے کا نہایت شوق تھا۔ اور اپنے بیٹے، بیٹیوں اور نواسے نواسیوں وغیرہ کو زیادہ تر منظوم خطوط لکھوایا کرتے تھے۔ غرض مجھے شفقتِ خاص سے اپنا "منشی" دادا مرحوم نے بنایا۔ اور مرحوم کے آخری لمحات تک گھر کا تمام تحریری کاروبار میرے ہاتھوں میں ہی رہا۔

یہ ہی وجہ تھی کہ تھوڑے عرصہ ہی میں مرحوم کے فیضِ توجہ سے میری شاعری کی مشق بڑھ گئی۔ ادھر میرے پھوپھا صاحب قبلہ مولوی محمد راضی زبیری (مختار عدالت فوجداری) نے جو اب بوجہ پیری وضعفِ بصارت مختاری کے کام سے دستبردار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ میری شاعری میں میری حوصلہ افزائیاں فرماکر مجھے اپنے فن کا بہت کچھ حصہ عطا فرمادیا۔

میری تعلیم اسکولی تعلیم نہیں ہوئی۔ اُردو فارسی اور معمولی انگریزی میں نے گھر ہی پر سیکھی۔ اور اس کے علاوہ اپنے ذاتی شوق اور ذوق سے میں نے اپنی استعداد اس قدر بڑھالی کہ تقریباً ہر فن میں مجھے تھوڑی بہت دستگاہ حاصل ہے۔ ہندی کے تراجم بھی کر لیتی ہوں۔ ڈرائنگ سے بھی خاص تعلق رہا ہے اور کلرنگ پینٹنگ میں بھی تھوڑی بہت مشق حاصل ہے۔ اس کے علاوہ خانہ داری کے جملہ معاملات میں میں اپنی دادی مرحومہ اور اپنی پھوپیوں کے فیضِ کرم سے پوری پوری ماہر ہو گئی تھی۔ اور جو کچھ کمی تھی وہ ذاتی شوق و ذوق نے پوری کردی۔

میری شادی ۱۹۲۴ء میں میری پھوپی مرحومہ (جو ایک نیک اور بامحبت بی بی تھیں) کے صاحبزادے محمد رفیع الدین صاحب زبیری (علیگ) سے ہوئی تھی۔ جو اب سی۔ آئی۔ ڈی پولیس بھوپال میں ملازم ہیں۔

میں اب بفضلہٖ تین بچوں کی ماں ہوں۔ میاں محمد رفیع الزمان سلمہٗ (عرف فیروز اختر) سب سے بڑے ہیں۔ جن کی عمر ۵ سال ۲ ماہ کی ہے۔ اور غوثیہ سلطان سلمہا (عرف رفیعہ خاتون) جو اب بفضلہ ۳ سال ایک ماہ کی ہے۔ اور سب سے چھوٹے میاں رفیع القدر اقبال اختر سلمہٗ ہیں جو ابھی ایک سال ۲ ماہ کے ہیں۔

لکھنے پڑھنے کے علاوہ گھر کے تمام کام میرے اپنے ذمہ ہیں۔ صبح سویرے سے لے کر رات کے

۱۲ بجے تک میں مصروف و مشغول ہی رہتی ہوں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت، سینا پرونا۔ کھانا پکانا، گھر کا انتظام، غرض ہر ذمہ داری میرے ہی کمزور و ناتواں شانوں پر ہے۔

سینے پرونے میں بھی مجھے مہارت ہے۔ کشیدہ کاری، اور پتّی کا کام وغیرہ ان سب کاموں سے خاص دلچسپی ہے۔ اور باوجود خانہ داری کی اسقدر مصروفیات کے علمی و ادبی مشاغل بھی جاری ہیں۔ دو کتابیں ممتاز القواعد عربی کی نہایت آسان اور عام فہم گرائمر اور "معارف الایمان" اصولِ مذہب کی ایک بینظیر اور نہایت مدلّل کتاب ہے ۱۹۲۷ء میں تصنیف کر چکی ہوں۔

"انشائے لطیف" کی تیاری و ترتیب میں میں اب مصروف ہوں۔ یہ کتاب تعلیم یافتہ خواتین کے مکاتیب جمیلہ کا ایک حسین و نادر مجموعہ ہوگا۔ اور جن بہنوں کے خطوط اس مجموعہ میں شائع ہونگے اُنکے مختصر سوانح بھی درج کئے جائینگے اور نمونہ تحریر کے عکس بھی شامل ہونگے۔ غرض اس تصنیف کو ایک "یادگار تصنیف" بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

مجھ کو اپنی بہنوں کی علمی و ادبی خدمت کا جہاں بہت شوق ہے۔ وہاں میرا دل اُنکی دردمندی اور ہمدردی سے خالی نہیں اسی لئے اپنی بعض شریف بہنوں کی ناداری اور اُن کے مصائب سے متاثر ہوکر میں نے "امداد المسلمات فنڈ" قائم کیا ہے اور اس کی بُنیاد اپنے ذاتی سرمایہ سے رکھی ہے۔ دس روپیہ ماہوار کی رقم اور اپنی علمی محنت و دماغی کاوش کا تمام ترصلہ میں اس نادار فنڈ پر صرف کرتی ہوں، جس سے میں اپنی بہنوں کی امداد اور اُنکی ضروریات میں اُنکی مدد کرتی رہتی ہوں۔ اور اب میں نے اپنی مستطیع بہنوں اور بھائیوں سے بھی اِس فنڈ میں حصہ لینے کی استدعا کی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ میں اِس فنڈ سے وسیع پیمانہ پر اپنی بہنوں کی ناداری کو ایک حد تک رفع کرنے کی کوشش کروں اور اُن کے مصائب کے انسداد کے لئے اِس فنڈ کو ایک ضمانت قرار دے سکوں۔

میں کئی سال سے مختلف اخبارات و رسائل میں تقریباً ہر موضوع پر مضامین و نظمیں لکھ رہی ہوں۔ رسالہ نور جہاں لاہور کی جو ایک بہتر زنانہ مصور رسالہ تھا۔ میں اعزازی مدیرہ تھی۔ اسی طرح رسالہ "دیہاتی" (جھنگ) کے حصۂ نسواں کی میں ایڈیٹر تھی اور "دلچسپ" لاہور کے ادارہ میں بھی اعزازی طور پر میرا نام شامل تھا۔ اب رسالہ "سہیلی" کے ادارہ میں میرا نام میری علمی خدمات کے باعث شامل ہے۔

کشیدہ کاری پر میرا ایک نہایت قیمتی مضمون با قساط "سہیلی" لاہور میں شائع ہو رہا ہے۔

غزلیات میں میں حمد اور نعت زیادہ لکھتی ہوں۔ یا پھر مناظر فطرت اور تاثراتِ طبیعت پر دلچسپ نظمیں لکھتی ہوں۔

پیام تعلیم (دہلی) اور نونہال (لاہور) میں میرے تعلیمی اور بچوں کے لئے نہایت دلچسپ و مفید مضامین کا ایک سلسلہ شائع ہوتا رہا ہے۔ آجکل بھوپال میں رفیع صاحب کے ملازمتی سلسلہ کے باعث مقیم ہوں۔

ایک نظم بھی بھیجتی ہوں جو بطور نمونہ کلام شائع فرمادی جائے۔ یہ نظم میں نے اپنی پھوپی زاد بہن کی شادی کی تقریب پر تصنیف کی تھی اور وداع کے وقت پڑھ کر سُنائی تھی۔

(نظم دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

تاثراتِ قلبی

چمن چمن جو مسرت کی ہر طرف ہے بہار عروسِ گُل نے کیا ہے نئی ادا سے سنگار
ہر ایک سمت مچی شادمانیوں کی پُکار خلوصِ قلب سے میں بھی ہوں اِس خوشی پہ نثار

مسرتوں کی بھی قسمت ہے کس قدر چمکی
کہ آج شادی رخصت ہے موتی بیگم کی (دلہن)

پھوپھی حلیمہ کی نورِ نظر مبارک ہو تمہارا اپنا ہو آباد گھر مبارک ہو
پھوپھا نعیم کی لختِ جگر مبارک ہو دلی دعاؤں کا میری اثر مبارک ہو

چلی ہو گھر کو تم اپنے رہو بہت دل شاد
نہ اپنے دل سے بُھلانا کبھی ہماری یاد

وہ گھر کہ جس کو کہیں تربیت کا گہوارا جو اِک محبّتِ معصوم کا تھا نظارا
ہر ایک ذرّہ تھا جس سرزمیں کا پیارا جو آسمانِ محبّت کا ایک تھا تارا

تم اس کو چھوڑ کے جاتی ہو گو پرائے گھر
مگر یہ گھر ہیں حقیقی مسرّتوں کے گھر

خدا کرے رہو سسرال میں بھی تم ایسی کہ سب کے دل میں ہو گھر شکوہ سنج ہو نہ کوئی
نہ آنے پائے کدورت کسی کے دل میں کبھی ہمیشہ شاد رہو اور رہے ہمیشہ خوشی

رہے شرافت و انسانیت کا پاس تمہیں
خدا کرے کہ ہوا ہو چمن کی راس تمہیں

یہ گھر جہاں کہ چلی ہو تم آج بن کے دلہن جو چاہو تم تو تمہارے لئے ہو یہ گلشن
ہر ایک دل ہو تمہارے خیال کا مسکن ہر اک خیال تمہاری ضیا سے ہو روشن

رہے جو پاس محبّت کا تم کو ذہن نشین
ضیائے نازشِ اُلفت بنیں ضیاء الدین (دولہا)

خدا کرے کہ ہو روشن تمہارا مستقبل ترقیات کی جانب بہت رہو مائل
ہمیشہ تم پہ ہوں انوار ایزدی نازل ہر ایک وقت خدا کا کرم رہے شامل

خلوصِ قلب سے دیتی ہے یہ دُعا ممتاز جہاں میں سروِ سہی کی طرح ہو سرفراز

"RISALA RAHNUMA-I-TALIM" RAM GALI, LAHORE.

گلشن ممتاز کے پھول

اقبال اختر
عمر ایک سال

محمد رفیع الزمان
عمر ۵ سال

غوثیہ سلطان
عمر ۳ سال
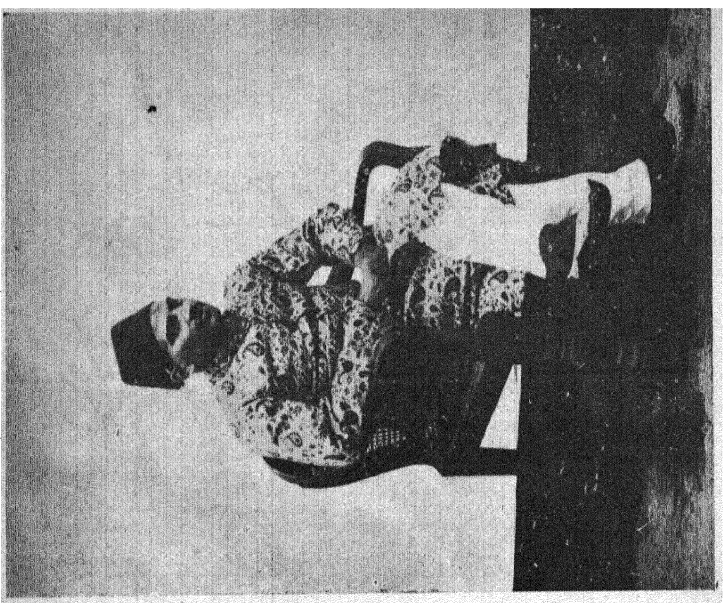
مولوی محمد رفیع الدین صاحب زبیری

"RISALA RAHNUMA-I-TALIM" RAM GALI, LAHORE.
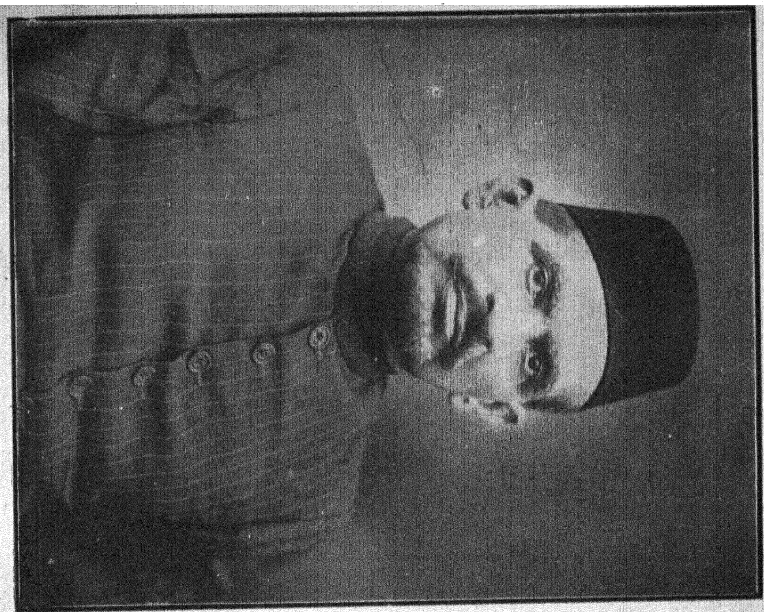
خواجہ عشرت لکھنوی

رائے بہادر پنڈت شونرائن صاحب شمیم
ایڈووکیٹ

طالب الہ آبادی مرحوم

پیدائش ۔ ۲ جنوری ۱۹۰۲ء روز جمعہ یوم عید الفطر ۱۳۲۰ھ ۔ **موت** ۔ غالباً نہیں واقع ہوگی ۔

تعلیم ۔ تعلیم کے ابتدائی منازل گھر پر طے کئے ۔ اسی تعلیم نے طالب کی فطرت کو سانچے میں ڈھال دیا ۔ پندرہ سال کا زمانہ مکمل انسان بنانے کے لئے کافی ثابت ہؤا ۔ اُردو کی تعلیم حاصل کی ۔ ادب فارسی کی تحصیل پایۂ تکمیل تک پہنچائی ۔ عربی کے بھی ابتدائی درس لئے ۔ عرفی ۔ ظہوری ۔ بدر چاچ ۔ حدیقہ نے اوائل عمر ہی میں آئندہ زندگی کی داغ بیل ڈال دی ۔ ادبیات ۔ فلسفہ و منطق ۔ علم کلام و عروض نے حسنِ فطرت کو سنوار دیا ۔ ابتدائی زندگی میں نثر سے رغبت نہ تھی بلکہ ایک حد تک نفرت تھی لیکن نظم ہمیشہ نہایت شوق سے پڑھتے تھے اور یہ شوق اس حد تک تھا کہ نثر بھی حتی الامکان نظم کی صورت میں ٹکڑے کر کر کے لحن کے ساتھ پڑھتے تھے ۔ اُسی زمانہ سے تک بندی ۔ وزن پرستی اور صوت نوازی کے شوق نے کبھی مولوی صاحب کو پریشان کیا کبھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ۔ مزاج میں تیزی اور دل و دماغ میں شوخی ہمیشہ سے تھی ۔ بچپن کی سرمایۂ حیات 'شرارت' اُس وقت بھی تھی اور اب بھی رگ و ریشہ میں سرائت کئے ہوئے ہے ۔

دوسری منزل ۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں مدارس میں اکتساب علم کے لئے داخل ہوئے ۔ صرف ایک سال انگریزی مدرسہ کے چھٹے درجہ میں پڑھتے رہے ۔ حاضری اور باقاعدگی سے دلی نفرت تھی ۔ بالآخر سال ختم ہؤا اور ظاہر بظاہر تعلیم بھی ختم ہو گئی ۔ کھدر پوشی کا شوق ہؤا ۔ اور یہ شوق اس درجہ تک ترقی کر گیا کہ ظاہری نمائش کی ہر شے ترک ہو گئی ۔ چنانچہ جہاں جسم پر کھدر تھا وہاں اسی زمانہ میں جب بغرض زیارت اپنے والد مرحوم کے ساتھ گئے تو کھدر کے دو جھولے بجائے بکس کے ہمراہ تھے اور مٹی کے دو چار برتن بجائے پر تکلف ظروف کے ۔ خود اپنے ہاتھ اپنے قلی تھے ۔ زیارت کے لئے روانہ ہونے سے پیشتر کھدر فروخت کرنا شروع کیا ۔ اور ربجے پوری جوتوں کی تجارت اختیار کی ۔ لیکن آزادیِ فطرت نے دکانداری کے قیود سے بھی باہر نکال لیا ۔ اس عرصہ میں سات سال کا زمانہ گزر گیا ۔ اور کسی کا کیا ذکر اپنی تعلیم کی طرف سے خود طالب بھی مایوس ہو گئے ۔

تیسری منزل ۔ ۱۹۲۵ء میں کسی کے اس طنز نے کہ "طالب وکالت کب کرو گے" ایسا اثر کیا کہ انہوں نے انٹرنس کا امتحان پرائیویٹ طریقہ سے علیگڈھ یونیورسٹی سے پاس کیا ۔ اور ۱۹۲۷ء میں ایف اے کرسچین کالج الہ آباد سے ۔ ۱۹۲۹ء میں بی اے کے امتحان سے تین ماہ قبل ایک خاص قسم کا دورہ ہؤا اور دو سال کے لئے تعلیم بالائے طاق ہو گئی ۔ ۱۹۳۲ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی ۔ اُردو کا گولڈ مڈل ملا ۔ اب ایم اے کے فائنل کلاس میں ہیں اور صرف تین ماہ آزاد ہونے کے لئے باقی ہیں ۔ خدا کرے اب پھر وہی دورہ

نہ ہو۔ اسی دوران میں جدید فارسی کی تکمیل کی۔ ایران و عراق کے سفر کئے۔ ہندی سے بھی پینگ بڑھائے۔

ادبی مشاغل۔ ۱۹۱۵ء میں سب سے پہلی غزل لکھی اور غزل گوئی کا شغل ۱۹۲۲ء تک جاری رہا۔ اب صرف نظمیں لکھتے ہیں۔ اسی دوران میں نثر سے جو نفرت تھی وہ جاتی رہی اور ۱۹۱۸ء میں پہلا مضمون لکھا۔ اس وقت سے نثر نگاری کا سلسلہ جاری ہے۔ طالب کی چند تصانیف بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

(۱) اکبر الہ آبادی (۲) مقتل غریب مغربی محل (۳) مقدمہ ادب اُردو (۴) ذوق (۵) کلیان (۶) گوہر عصمت (۷) معصوم لڑکی (۸) طلسم ساز (۹) بیلا (۱۰) سیتارام (۱۱) پھول (۱۲) انوکھے جادوگر۔

فاتحہ۔ سوادِ مضمون نے چونکا دیا ہوگا لیکن حقیقت یہی ہے کہ طالب الہ آبادی ۳۱ دسمبر ۱۹۳۳ء کو رحلت فرما گئے۔ آئندہ سے نیا چولا بدل کر عابد ایم اے کے بھیس میں جلوہ افروز ہوا کرینگے۔ تبدیلی کے وجوہ یہ ہیں۔

(۱) جب طالب الہ آبادی نے دُنیائے صحافت میں قدم رکھا تھا تو اِنے گنے دو تین طالب تھے اب پونے دو درجن سے کم نہیں۔

(۲) ہر بڑے ادیب اور فطری شاعر نے ایک عرصہ کے بعد اپنا نام بدل دیا ہے جیسے اسد سے غالب۔

(۳) اپنے والد مرحوم سید عابد علی صاحب ایڈوکیٹ کی یادگار قائم رکھنی مقصود ہے۔

(۴) میرے نزدیک اس حرکت میں بھی اُسی دماغی دورہ کی ایک ہلکی سی لہر ہے۔

ارشاد علی ازہر
بی اے وکیل رائے بریلی

پنڈت شیوناتھ صاحب شاکر

میں اس وقت اپنے حالات زندگی کیا لکھوں مختصر یہ ہے کہ میں ابتداً ریاست مہاراجہ صاحب بہادر بنارس میں نائب دیوان نظامت مقرر ہوا تھا۔ اور ریاست کا مختار نامہ عام بھی میرے ہی نام تھا۔ اُس وقت میری تقریباً ۲۷ سال کی عمر ہوگی۔ اس عہدے کے فرائض عرصہ دس سال تک میں نے انجام دیئے۔

اس کے بعد میں مہاراجہ بنارس کی ملازمت ترک کر کے ریاست مہاراجہ صاحب بہادر گوالیار میں آیا اور یہاں مدت دراز تک خدمات تحصیلداری و مجسٹریٹی و سپرنٹنڈنٹی کسٹمس و اکسائز بمشاہرہ دو سو روپیہ ماہوار نہایت محنت و ایمانداری کے ساتھ انجام دیں اور اب عرصہ تقریباً ۳ سال سے پنشن یاب ہو کر لشکر ہی میں مقیم ہوں۔

میری تصنیف سے چند اوراق کی ایک کتاب منظوم موسومہ بہ مرآت الخیال ہے۔

شعر و سخن کا شوق مجھ کو اوائل عمر سے رہا ہے۔ اگر اُس زمانہ سے ابتک کا کلام موجود ہوتا تو واقعی ایک معقول ذخیرہ ہو جاتا مگر چونکہ مجھ میں وہ قابلیت نہیں ہے جو ایک شاعر میں ہونی چاہئے۔ اس لئے اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ اور وہ وقتاً فوقتاً تلف ہوتا رہا۔ یہ ہیں حقیر مختصر واقعات زندگی جو میں نے آپکی خدمت میں گذارش کر دیئے۔

حالات پنڈت اندرجیت شرما

نام۔ اندرجیت شرما تیاگی خلف پنڈت پت رام سنگھ شرما تیاگی۔

تخلص۔ کچھ نہیں رکھا۔

تاریخ پیدائش معہ مقام۔ ۳ ستمبر ۱۸۹۳ء کھرکھودہ ضلع میرٹھ۔

تعلیم اور پیشہ۔ ابتدا میں اُردو ہندی کی تعلیم مڈل تک سرکاری مدارس میں پائی پھر حقیقی دادا پنڈت گنگا سہائے شرما تیاگی نے جو فارسی کے عالم تھے گھر پر فارسی پڑھائی۔ اس کے بعد ٹریننگ اسکول اور نارمل اسکول کے امتحانات پاس کرکے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ انگریزی پرائیویٹ طور پر سیکھی ۱۹۲۲ء میں امتحان میٹریکولیشن میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے مڈل مدارس میں بطور انگلش ٹیچر کام کر رہا ہوں۔ گھر پر زمینداری بھی ہے۔

شعر و شاعری کا شوق۔ یوں تو کبھی کبھی ۱۹۱۲ء میں ایک دو شعر لکھتا رہتا تھا مگر ۱۹۲۵ء میں یہ بھوت سر پر سوار ہو گیا۔ ۱۹۲۷ء سے منشی دیا نرائن صاحب نگم اڈیٹر زمانہ کی ترغیب سے جناب مولانا ندرت صاحب میرٹھی سے مشورہ کرنے لگا نظمیں لکھنے کا زیادہ شوق ہے۔ غزلیں کم لکھتا ہوں۔ کلام اخبارات اور رسالہ جات میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

تالیف و تصنیف۔ سب سے پہلے محاورات اُردو مرتب کی تھی۔ اس کے بعد اور چھوٹی چھوٹی اُردو ہندی کی کتابیں بچوں کے لئے مرتب کیں۔ کلام دو حصوں میں بعنوان نیرنگ فطرت اور جلوہ زار شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کا کلام ہنوز شائع نہیں ہوا ہے۔ آئندہ شائع کرانے کا ارادہ ہے۔ اگر ایشور نے پورا کر دیا۔ نیرنگ فطرت یو۔پی میں مڈل مدارس کے ٹیچروں کے لئے جناب ڈائرکٹر صاحب نے منظور فرمائی ہے اور بمبئی و ممالک متوسط میں لائبریریوں اور انعامات کے لئے منظور ہو چکی ہے۔

حالات جناب عشرت رحمانی مدیر نیرنگ دہلی

سردار صاحب! حالات زندگی کی اشاعت کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ میں حیران ہوں کہ آپ کو اس بارہ میں کیا لکھوں۔ اور کچھ نہ لکھوں تو پھر آپ خفا ہو جائیں گے۔ اس سے بھی ڈرتا ہوں۔ کیونکہ آپ کی شکایتوں میں خلوص کا لطف آتا ہے۔ اس لئے میں اُن کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ میری ۲۷ سالہ زندگی میں اس وقت تک کوئی ایسا واقعہ خاص پیش نہیں آیا جو ذرا بھی اہمیت رکھتا ہو اور میں اس کی اشاعت آپ کے ناظرین کی دلچسپی کا باعث سمجھوں۔ میری آج تک کی غیر مسلسل زندگی میں اگر کچھ ربط ہے تو صرف اس قدر کہ میں زندہ ہوں۔ مخلص احباب و اعزا و اقربا کی سوگواری کے لئے۔ آپ حیرت کرینگے کہ اس بے ربطگی کو "ربط" کہتا ہے۔ مگر مجبور ہوں۔ چارہ بھی کیا ہے۔ میرے پیارے دوستوں اور عزیزوں نے اپنی ماتم گساری کے لئے مجھے انتخاب کیا ہے اور ان داغوں کو میں اپنی بیکار زندگی کی ایک بڑی قیمت سمجھتا ہوں۔ اور مجبوراً اب انہیں کی بدولت حیات ـــــ کی کڑیاں مربوط سمجھتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے زمانہ کے اور حوادث نے مجھے کبھی نشانہ نہ بنایا۔ اور خدا نے میرے نام کی لاج رکھ کر ہمیشہ اطمینان و فراغت کے سامان عطا کئے۔ اور ہیں۔ شائد اس کو بدبین آسمان سے نہ دیکھا جا سکا۔ اور ـــ سوگواری کے لئے میں منتخب ہؤا۔ مگر بہر حال میں عنایات الٰہی کا شکر گذار اور مطمئن ہوں۔ میری زندگی کا سب سے محبوب شغل علم و ادب کی خدمت رہا ہے۔

عمر میں سب سے پہلا عشق مجھے محبوبۂ ادب سے ہؤا اور اسی پر دم دیتا ہوں۔ آپ نے اکثر نامور شعراء کے حالات میں پڑھا ہو گا کہ ۶-۷ سال کی عمر میں سب سے پہلا شعر کہا۔ مجھے یہ فخر تو حاصل نہیں ہؤا کیونکہ ناموری کا گمان بھی نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ دس بارہ سال کی عمر سے میں علم و ادب کا دیوانہ ہوں۔ اور اس دیوانگی کو اپنی ناکارہ زندگی کی سب سے بڑی غایت سمجھتا ہوں۔ گو اس کا مجھے قطعیٔ اعتراف ہے کہ اس سلسلہ میں مجھ سے کوئی قابل ذکر خدمت انجام نہ پا سکی ہے۔ تاہم میں اپنے آپ کو اس کے لئے وقف سمجھتا ہوں۔ میں اُردو فارسی۔ عربی۔ انگریزی اور ہندی ان سب زبانوں کا طالب علم ہوں۔ مجھے ان کے جاننے کا دعوےٰ نہیں۔ ہاں ان کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

نیرنگ میرے جنون ادب کی ایک بھاری کڑی سمجھئے۔ ابتدا سے آپ اس سے واقف ہیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء سے اس کو ۲۵ سال شروع ہونگے۔ میری وابستگی یا ملکیت اس کے ساتھ سنہ ۱۹۲۵ء سے ہے۔ مطمئن ہوں کہ نیرنگ نے ادب و زبان کی کچھ خدمت ضرور انجام دی ہے۔ اگرچہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکا۔ ملک کے مختلف علمی ادبی رسائل میں آپ نے میرے مضامین نثر و نظم تقریباً ہر عنوان پر ملاحظہ فرمائے ہیں۔ ان میں بعض دیوانہ کی بڑ سمجھئے اور اکثر احباب و مخلصین یا مدیرین کے حکم کی تعمیل۔

میری شاعری بھی ادبی دیوانگی کا ایک جزو ہے۔

میری معروفیت نیرنگ کے علاوہ اُردو معلم کی حیثیت سے بھی ہے۔ اگرچہ یہ ستم ظریفی ہے کہ ایک متعلم معلم کے
فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس گذارشِ احوالِ واقعی کو انکسار تصور نہ فرمائیے۔ اور جو کچھ آپ مناسب سمجھیں بے ربط
داستان میں سے اخذ کر کے شائع فرما دیجئے۔ یہ ہیں میرے حالاتِ زندگی۔

ہاں میری ادبی خدمات کی تفصیل کتابی صورت میں یہ ہے۔

(۱) مولانا محمد علی (۲) پنڈت موتی لال نہرو (۳) ٹگور (اور فسانے) (۴) بیوی کی محبت (افسانے) (۵) زندگی یا موت (افسانے) (۶) مرزا غالب (حالات و انتخاب کلام معہ تبصرہ) (۷) بچوں کا شاعر (۸) بچوں کی کہانیاں۔ (۹) بچوں کی دُنیا (افسانے) (۱۰) نعتیہ کلام (دو حصے) (۱۱) نغمۂ توحید (کلام حمد) (۱۲) مستند تاریخ ہند کی کہانیاں

ان کے علاوہ چند کتابیں زیر طبع ہیں۔ اور مضامین نثر جو مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں۔
ان کی تعداد مجھے خود بھی یاد نہیں۔ تقریباً چار سو سے اوپر سمجھئے۔ نظموں اور غزلوں کی میرے پاس کوئی یادداشت
نہیں۔ اب تک ڈیڑھ سو سمجھ لیجئے۔ پس حضور تعمیل حکم ہو گئی۔

خاکسار عشرت رحمانی

سید اشفاق حسین صاحب رمزی ایم اے۔ بی ٹی (علیگ) منشی فاضل

سید صاحب میرے بچپنے کے دوست ہیں۔ نہایت معمولی حالت سے ترقی کر کے ایک اعلےٰ پوزیشن تک پہنچے
بچپنے میں میرے ہم جماعت تھے۔ آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے ایم اے۔ بی ٹی اور فارسی کے فاضل ہو گئے۔
اور میں ویسا ہی بیکار محض اور جاہل کا جاہل رہا۔ حالات میں اس قدر زمین و آسمان کا فرق کیوں ہو گیا؟ اس لئے
کہ ایک نے تکلیف سہہ کر۔ مصیبت اُٹھا کر۔ راتوں کو جاگ کر علم حاصل کیا اور اب عیش کی زندگی گذار رہا ہے۔ اور
دوسرا داستان امیر حمزہ۔ طلسم ہوشربا۔ فسانہ عجائب اور باغ و بہار کی سیر میں مصروف رہا۔ نہ کسی قسم کی لیاقت
پیدا کی۔ نہ کوئی قابلیت حاصل کی۔ اور اب کفِ افسوس مل رہا ہے۔ یہ میں نے اس لئے لکھا تاکہ لوگ محنت اور غفلت
کے فلسفے پر غور کریں۔ سید صاحب نے انٹرنس کا امتحان حالی مسلم ہائی سکول سے پاس کیا۔ اور اُسی کی ایک شاخ میں
دس روپے ماہوار پر مدرس ہو گئے۔ لیکن دل میں ترقی کی اُمنگ اور ارادہ میں استقلال رکھتے تھے۔ نہ محنت سے جی
چرایا۔ نہ مصائب سے گھبرائے اور تھوڑے ہی عرصہ میں پرائیویٹ طور سے منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔ سامنے
ترقی و خوشحالی کی دیوی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ انہیں دیکھا تو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ راستہ تنگ اور دشوار گذار
تھا۔ قدم قدم پر مشکلات سدراہ تھیں مگر انہوں نے پروا نہیں کی۔ ایف اے کی گھاٹی آئی اُسے عبور کیا۔ بی اے کا
دریا آیا اُسے پار کیا۔ بی ٹی کی کٹھن منزل بھی جس طرح بنا طے کر ہی لی۔ اور شاہد مقصود سے ہم آغوش ہو گئے۔ اب وہ شخص

جو مدرسہ میں دس روپے کا معمولی مدرس تھا۔ اُسی ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ سید صاحب نہایت چست و چالاک۔ نہایت عقلمند و زیرک۔ اور نہایت با اخلاق ہیں ضبط و انتظام مدرسہ میں نہایت طاق تعلیم دینے اور پڑھانے میں نہایت ہوشیار واقع ہوئے ہیں۔ مسٹر آتما رام ایم اے انسپکٹر تعلیمات انبالہ ڈویژن ہائی سکول میں معائنہ کے لئے آئے اور ان کی لیاقت و قابلیت کا گہرا اثر لے کر واپس گئے۔ انبالہ پہنچ کر مخدومی جناب خواجہ سجاد حسین صاحب سکرٹری علی گڑھ سکول کو لکھا کہ اشفاق حسین کو ہمیں دیدیں۔ مسٹر آتما رام اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ اور سید صاحب ڈسٹرکٹ بورڈ رہتک کے ایک قابل ترین ہیڈ ماسٹر ہیں علمی شوق بھی بیحد رکھتے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات طیبہ کے متعلق آپنے دہلی کے رسالہ پیشوا اور دیگر رسائل میں بیسیوں دلچسپ مضمون لکھے ہیں۔ پچھلے دنوں اس عنوان پر کہ کیا اکبر اعظم ان پڑھ تھا؟ آپنے ایک بڑا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی مضمون لکھا تھا۔ رہنمائے تعلیم میں بھی آپ ایک ہیڈ ماسٹر کے خطوط ایک نو آموز کے نام بڑی قابلیت کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ فسانہ نمبر میں بھی آپکے دو افسانے موجود ہیں۔ ہر سال عید میلاد النبی کی تقریب پر آپ محض حصول ثواب کی نیت سے حضور سرور عالم صلعم کے متعلق ایک مختصر ٹریکٹ لکھ کر مفت تقسیم فرمایا کرتے ہیں۔ تصانیف میں ایک بےنظیر کتاب "قند پارسی" ہے جو فارسی شعراء کے بہترین اشعار کا بہترین انتخاب ہے جو حالی بکڈپو پانی پت نے شائع کیا ہے۔ دوسری انشاء اللہ خاں کی سوانح عمری ہے۔ جو رائے صاحب منشی گلاب سنگھ نے چھاپی ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔ رمزی تخلص ہے۔ پچھلے سال ایم اے کا امتحان بھی آپنے پرائیویٹ طور پر پاس کیا ہے۔ اور مجھے بڑی خوشی ہوگی جب سنونگا کہ وہ فلاں کالج میں پروفیسر ہوگئے۔ خدا کرے کہ وہ دن جلد آئے۔ خاکسار

محمد اسماعیل پانی پتی

شیخ محمد بدر الاسلام صاحب فضلی (منشی فاضل) بی اے۔ بی ٹی (علیگ)

یہ بھی میرے نہایت عزیز ترین دوست ہیں۔ اور آپنے بھی مساعد حالات اور تکالیف پر خدا کے فضل اور اپنی کوشش ہمت اور استقلال کے زور سے فتح حاصل کی ہے۔ سراوہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ انٹرنس پاس کرنیکے بعد آپ ڈپٹی اے جی کے دفتر میں کلرک ہو گئے۔ پرائیویٹ اوقات میں انتھک محنت کے بعد منشی فاضل کی ڈگری حاصل کی۔ اور پرائیویٹ طور سے ہی ایف اے اور بی اے کے امتحانات پاس کئے۔ اس کے بعد حالی مسلم ہائی سکول میں سیکنڈ ماسٹر ہوکر تشریف لائے۔ یہاں سے بی ٹی میں علیگڈھ چلے گئے اور فراغت کے بعد پھر اپنی جگہ آ گئے۔ بعد ازاں میو کالج اجمیر میں پروفیسر ہوگئے۔ کچھ عرصہ وہاں ملازمت کی۔ اس کے بعد دہلی چلے آئے۔ پھر ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات ممالک غیر میں اُردو زبان کے پروفیسر مقرر ہوکر جاپان چلے گئے۔ قریباً ڈھائی سال تک وہاں رہے اور اپنے فرائض نہایت خوبی اور احسن طریقہ پر انجام دینے کے ساتھ جاپانی رسم و رواج، اُنکی علاوات

وخصائل۔ معاشرت تعلیم۔ تجارت۔ اور حرفت وصنعت وغیرہ کا بھی نہایت گہری اور غائر نظر سے مطالعہ کرتے رہے۔ سینکڑوں کتابیں جاپان کے متعلق پڑھیں۔ بہت سے مقامی آدمیوں سے صحیح معلومات حاصل کیں۔ اور میری درخواست پر نہایت ہی دلچسپ اور پُراز معلومات سفرنامہ تیار فرمایا۔ جو جاپان کے متعلق صحیح اور جدید ترین تفصیلی معلومات کا ایک لاجواب مجموعہ ہے۔ اُردو میں اس سے بہتر کیا معنی اس کے برابر بھی معلومات اور دلچسپی کسی سفرنامہ میں آپ کو نہیں ملے گی۔ جاپان کی ایک چھوٹی سی سائیکلوپیڈیا سمجھئے۔ کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ جاپان کے بہترین مختلف مناظر کے فوٹوؤں سے بھی مزین ہے۔ اور اگر کوئی صاحب ذوق ملاحظہ فرمانا چاہیں تو شیخ صاحب کو حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کے پتہ سے لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔

جاپان میں بدقسمتی سے شیخ صاحب خطرناک طور پر بیمار ہو گئے۔ وہاں انکا اپریشن ہُوا اور جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے فضل فرمایا زندگی تھی کہ بچ گئے۔ مگر صحت اس قدر کمزور ہو گئی کہ ڈاکٹروں نے بھی مشورہ دیا کہ واپس ہندوستان چلے جاؤ۔ جب شیخ صاحب نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو کالج کے دوسرے پروفیسر اور طلبا سخت ملول ہوئے۔ پرنسپل نے مزید قیام پر بہت اصرار کیا۔ یہ بھی کہا کہ کچھ رخصت حاصل کر کے ہندوستان چلے جائیں اور پھر واپس آجائیں۔ مگر شیخ صاحب واپس ہی آنے پر جمے رہے۔ اور الحمدللہ کہ بعافیت ہندوستان پہنچ گئے۔ میں فوراً اُن سے ملنے کے لئے دہلی گیا اور میں نے کہا کہ کہیں نہ کہیں تو اب آپ ملازمت کریں ہی گے پس کیوں نہ قوم کی خدمت حالی مسلم ہائی سکول ہی میں رہ کر کریں۔ آپ پر اُس کا کچھ گذشتہ حق بھی ہے! اور کچھ آپ کو ایثار سے بھی کام لینا چاہیئے۔ ابھی میرے محترم دوست اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرنے پائے تھے کہ خطرناک طور پر پھر بیمار ہو گئے۔ قرول باغ دہلی کے ڈاکٹر سی۔ این جوشی نے آپریشن کیا اور گُردے میں سے پتھریاں نکالیں۔ خدا خدا کر کے دو ڈھائی مہینے کی مسلسل علالت و تکلیف اور آٹھ سو روپیہ کی زیر باری کے بعد آپ نے اس مصیبت سے نجات پائی تو پھر میں نے آپکو پُرانی بات یاد دلائی۔ میں نہایت ممنوں ہوں کہ شیخ صاحب محترم نے میری درخواست رد نہیں فرمائی۔ اور پانی پت پہنچ کر یکم جنوری ۱۹۳۳ء کو حالی مسلم ہائی سکول کی ہیڈ ماسٹری کا چارج لے لیا۔ خدا کرے کہ پانی پت کے طلبا ہمیشہ اُن کے تعلیمی تجربے اور وسیع معلومات سے فائدہ اُٹھاتے رہیں اور شیخ صاحب کبھی کہیں اور جانے کا خیال نہ فرمائیں۔

مضمون نگاری کا شوق آپکو شروع سے ہے اور ملک کے مختلف جرائد و رسائل میں آپکے بہت سے علمی و ادبی اور مفید و دلچسپ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ جب آپ جاپان میں تھے تو وہاں سے ادبی دُنیا۔ ہمایوں اور نیرنگ خیال وغیرہ رسائل کو آپ نے متعدد مضامین بھیجے ہیں۔ جو جاپانی علوم وفنون۔ جاپانی تہذیب و شائستگی اور وہاں کے رسم ورواج کے متعلق نہایت مفید معلومات کے حامل ہیں۔ اور ملک میں بڑی دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھے گئے۔

قیام جاپان کے زمانہ میں آپنے مجھے جتنے خطوط لکھے وہ میں باقساط رہنمائے تعلیم کی نذر کرچکا ہوں اور ناظرین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ وہ کس قدر دلچسپ اور کسقدر پُر از معلومات تھے۔

جاپان سے واپس آنے کے بعد بھی آپ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں سراغرسانی کے فسانے لکھنے میں آپکو کمال حاصل ہے۔ چنانچہ میری درخواست پر آپنے "فسانہ نمبر" کے لئے بھی ۲۳ صفحے کا ایک نہایت ہی دلچسپ اور مزیدار سراغرسانی کا فسانہ لکھا ہے۔ جو شائع کیا جارہا ہے۔ میں نہایت ہی شکر گذار ہوں شیخ صاحب کا کہ تکلیف۔ بیماری۔ عدیم الفرصتی اور پھر رمضان المبارک کے روزے غرض کوئی چیز آپکو میری درخواست کے قبول و منظور کرنے سے نہ روک سکی اور میں فخر کے ساتھ ایسا دلچسپ فسانہ آپ صاحبان کی خدمت میں پیش کرسکا۔ اس فسانہ کے متعلق ایک خاص بات بتلانے کی یہ ہے کہ یہ فسانہ شیخ صاحب نے خود نہیں لکھا بلکہ ایک صاحب لکھتے گئے اور شیخ صاحب لکھواتے گئے۔ بلاشبہ اس طرح اپنے خیالات کو مجتمع کرکے فسانہ لکھواتے رہنا انشا پردازی کی اعلیٰ درجہ کی قوت اور طاقت کو ظاہر کرتا ہے۔

ادب کی خدمت کرنے اور طلبا میں علم کا ذوق پیدا کرانے کے لئے آپنے حالی مسلم ہائی سکول سے "حیات نو" نامی ایک اعلیٰ درجہ کا ادبی رسالہ کا بھی اجراء اپریل ۱۹۳۱ء سے کیا ہے۔ رسالہ کے ڈیکلریشن داخل کرنے میں علاوہ بے انتہا خرچ کے جو تکالیف مصائب اور مشکلات ہم دونو کو پیش آئیں یقیناً وہ رستم کے راہ ہفتخواں کو طے کرنے سے زیادہ دشوار اور کٹھن تھیں۔ رسالہ نکل رہا ہے اور بڑے مفید علمی۔ ادبی اور تاریخی مضامین اب تک شائع کرچکا ہے۔ پرانے ادیبوں کے غیر مطبوعہ کلام اور اُنکے مسودوں کو بھی شائع کرتے رہنا اس کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ اور اس کوشش میں یہ اب تک نہایت کامیاب رہا ہے۔

شیخ صاحب کی تصانیف کی تفصیل یہ ہے (۱) اسلامی کہانیاں۔ اس میں چھوٹے بچوں کے لئے نہایت آسان زبان میں مسلمان بادشاہوں کے حالات کہانیوں کی طرز میں بڑے دلچسپ طریقہ سے قلمبند کئے ہیں۔ بچے پڑھ کر مختصر طور پر ساری تاریخ اسلام سے باتوں باتوں میں واقف ہوجاتے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں حالی بکڈپو پانی پت نے اسے چھاپ کر شائع کیا تھا۔

(۲) ہوائی سفر۔ ایک نہایت دلچسپ سائنٹیفک ناول تھا۔ جو اشاعت کے لئے ایجوکیشنل گزٹ جالندھر کو دیا گیا تھا مگر اُس نے سخت بدعہدی کی تین چار قسطوں میں چھاپ کر بند کردیا۔ نہ طے شدہ معاوضہ ادا کیا۔ نہ ناول واپس کیا۔

(۳) وہی سفرنامہ جاپان جسکا تذکرہ میں اوپر کرچکا ہوں اور جو دو جلدوں میں ہے۔ (۴) جاپانی کہانیوں کی کتاب۔ یہ کتاب شیخ صاحب نے چھوٹے بچوں کے لئے لکھی ہے۔ بڑی دلچسپ اور مزیدار ہے۔ (۵) نامی کو۔ ایک ناول ہے جسمیں بڑے تفصیلی طور پر جاپانیوں کے رسم رواج اور اُن کے عادات و خصائل بتائے گئے ہیں۔ یہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ (۶) سنسکرت کے عربی و فارسی تراجم کی تاریخ۔ یہ میرا ایک طول طویل اردو مضمون کا ترجمہ ہے جو شیخ صاحب نے بڑی قابلیت کے ساتھ انگریزی میں کیا ہے۔ اب تک اسکے بھی چھپنے کی نوبت نہیں آئی (۷) آجکل آپ تاریخ جاپان لکھ رہے ہیں جو تیار ہوکر اردو میں ایک نئی چیز ہوگی۔ (۸) میری درخواست پر جاپان میں آپنے البیرونی کی کتاب الہند کا بھی ترجمہ شروع کیا تھا مگر افسوس یہ نامکمل رہا۔

خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی

ساری خدائی یک طرف فضل الٰہی یک طرف

از قلم خدائے سخن عروضی کامل الفن صدر اعظم محقق علامۂ عصر رستم الشعراء مولانا محمد حبیب السبحان صاحب

المتخلص بہ حضرت صابر آلہ آبادی

ہفتہ وار اودھ اخبار پرتاب گڈھ مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۳۳ء کے صفحہ ۷ میں

آل انڈیا مشاعرہ گوالیار کے اکھاڑے میں سمجھ سوچ کر قدم رکھو

کی سرخی میں حضرت ایس۔ ایم قریشی گوالیار کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اُس کے مضامین قطعی جنگ جویانہ ہیں۔

میں حضرت ایڈیٹر صاحب اودھ اخبار اور اُنکے عملہ کا نہایت شکر گذار ہوں کہ ممدوح نے بذریعہ اخبار ایسے آنے والے خطروں سے مجھے مطلع فرمایا میں بار احسان سے دب گیا۔

اِس سے پہلے ایک ماہ کا عرصہ ہوا کسی اشاعت کے اعتبار پر میرے ایک دوست نے مجھے اطلاع دی تھی کہ اسی قسم کا کسی اخبار میں ایک مضمون اور شائع ہوچکا ہے۔ مگر وہ اخبار میری نظر سے نہیں گذرا کہ میں اُس کے متعلق اپنا خیال ظاہر کرسکتا۔ آج اِس خبر نے میرے کان کھڑے کر دیئے۔

مجھے سخت حیرت ہے کہ حضرت قریشی نے کِس نوعیت کی اہمیت پر اِس اشاعت کی تکلیف گوارا فرمائی میں قطعی لاعلم تھا۔ تاہم اِس اشاعت نے مجھے چونکا دیا اور اب میں ہوشیار ہوگیا۔

کاش مشاعرہ کے خال خال شرکا کہ جو میرے در پردہ مخالف ہوں اور میں اُنکو اپنا دوست سمجھ رہا ہوں۔ اُنکا خیال اگر ہم خیال حضرت قریشی موصوف ہے۔ اور یہ واقعہ قطعی سچا ہے تو میری ہمت مردانہ کبھی رُوبفرار نہیں ہوسکتی اور میں اِس آزمائش گاہ میں مضبوطی سے قدم جماؤنگا۔

کیونکہ اِس وقت دُنیائے شاعری کے جس قدر عروضی ماہر فن راست گو ہیں وہ میرے مقالات کو بڑی گہری اور تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں وہ قطعی میرے ہم خیال ہیں۔

مگر جو حضرات اخفش وغیرہ کے پیرو ہیں وہ قطعاً غلط راہ پر ہیں اور وہی میرے مقابل آئینگے۔ اور اپنے مُنہ کی کھائینگے اور اُن کے پاس کوئی مدلل ثبوت نہیں ہے کہ وہ میرے مقالات کی تردید کرسکیں۔

اگر کاش ایسے حضرات جو میرے مخالف بن کر اِس دعوت میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ تو اُس گروہ سے میں علمی مباحثات کے لئے

بخوشی خاطر نہایت سرگرمی سے تیار ہوں۔

بشرطیکہ وہ میرے اعلان مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کی پوری پوری پابندی کریں۔ عندالطلب اُن کو اعلانِ عام کی کاپی مُفت بھیجی جا سکتی ہے۔ اودھ اخبار کا مضمون بغرض دلچسپی و آگاہی ناظرین حسب ذیل ہے۔

آل انڈیا مشاعرہ گوالیار کے اکھاڑے میں سمجھ سوچ کر قدم رکھو

حضرات شعرا۔ حضرت خدائے سخن عروضی کامل الفن صدر اعظم محقق علامۂ دہر رستم الشعرا مولانا محمد حبیب سبحان خانصاحب التخلص حضرت صابر الہ آبادی کی عروضدانی اور اُنکے اعلان مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کہ جس میں ممدوح نے دُنیائے شاعری کے شعراء عروضیان کو دعوت دی ہے کہ مجھ سے بحث عروضی کریں اور شخص مغلوب غالب کا شاگرد بن جائے وغیرہ وغیرہ سے دُنیائے شاعری کما حقہٗ واقف ہو چکی ہے۔ کہ گوالیار میں ایک ہستی کس قدر شہ زور موجود ہے۔ تاہم اس مشاعرہ کے اکثر شرکا شکست خوردہ کا خیال ہے کہ شعرائے بیرونجات کو اس آل انڈیا مشاعرہ کے نام سے بلا جا کر حضرت صابر مدظلہ سے لڑ بھڑ کرا دو رمباحثہ کرا دیا جائے۔

پس ذریعہ ہذا جمیع شعراء و عروضیان دنیائے شاعری کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ جو حضرات آل انڈیا مشاعرہ میں شرکت کی تکلیف گوارا فرمائیں وہ ایک پُر زور ہستی سے مقابلہ کرنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ ایسا سمجھ کر گوالیار میں قدم رنجہ فرمائیں۔ اور جن جن حضرات نے خدائے سخن عروضی صابر الہ آبادی مدظلہ کے ملاقات (مقالات) عروضی نہ دیکھے ہوں وہ رہنمائے تعلیم رام گلی لاہور ماہ جولائی تا حال طلب کر کے اُنکے مقالات عروضی کا موازنہ فرمائیں اور حضرت صابر مدظلہ حسب اعلان خود رستم الشعرا کے لنگوٹ باندھے عروضی اکھاڑے میں ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کے قبل سے خم ٹھوک کر کھڑے ہیں اور مبارز طلب فرما رہے ہیں۔ عین ایام مشاعرہ میں اُنکے اعلانات تقسیم ہونگے۔

پس جو میری سماعت میں آیا ہے۔ اُس کو باعلانِ صاف شعراء بیرونجات کو بطور خیر خواہانہ اطلاع دے رہا ہوں تاکہ ناواقفیت سے کسی کی تکذیب نہ ہو اور نا واقفان واقف ہو جائیں۔ اور لوگوں کے فریب میں نہ آئیں اور فہم و ادراک سے اس مشاعرہ میں شرکت فرمائیں مگر تماشبین اصحاب کثرت سے شرکت فرمائیں۔ لہذا جمیع اخبارات و رسالہ جات سے التجا ہے کہ اطلاع ہذا کو ہر پرچہ میں اشاعت فرما کر دُنیائے شاعری پر احسان فرمائیں۔

ایس۔ ایم قریشی گوالیار

نوٹ۔ یہ مشاعرہ ماہ فروری یا اپریل ۱۹۳۴ء تک ہوگا۔

عورت

عورت مٹا تو دیتی ہے دل کی خراش کو — لیکن اسی سے ہوتی ہے دل میں خراش بھی

عورت سے ہے سکون میسر یہ سچ مگر — عورت نہ ہو تو ہو نہ سکوں کی تلاش بھی

نہایت مفید و نادر کُتب
مجموعہ مضامین
جواب مضمون نویسی کتاب مڈل۔ نارمل ٹریننگ کالج اور انٹرنس کے طلباء کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ذخیرہ مضامین ہے
علمی کہانیاں باتصویر
اس کتاب کی خوبیوں سے متاثر ہوکر پنجاب سرکار نے ہمیں یکصد روپیہ نقد انعام دیا تھا۔
قیمت فیجلد ۸ر
مخزن تشریح
لغت کی نادر کتاب۔ طلبائے مڈل نارمل ایس وی انٹرنس وغیرہ سبھی کے لئے مفید۔
قیمت فیجلد ۸ر
رہنمائے فارسی
ابتدائی جماعت کے لئے بولچال فارسی سکھانے والی کتاب
قیمت چھ آنہ (۶ر)
گلدستہ ادب
پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی سفارش سے جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب نے بموجب سرکلر نمبر ۲۰۴۳ مورخہ گلدستہ ادب نامی کتاب (جو اُردو محاورات اور ترکیب نحوی وغیرہ کا ایک نادر مجموعہ ہے۔ لائبریریوں کے لئے منظور فرمائی ہے۔ اُمید ہے کہ اب کوئی سکول لائبریری اس مفید اور نادر کتاب سے خالی نہ رہے۔
قیمت فی جلد بارہ آنے (۱۲ر)
مجموعہ پرچہ جات امتحان ایس وی کلاس
سالانہ امتحانات کے پرچوں کا مجموعہ۔ قیمت ۸ر
رعایتی ۶ر
خلاصہ باغبانی زراعت
مڈل اور نورمل اور ایس وی کے لڑکوں کے لئے مفید
قیمت ۶ر
رہنمائے ریاضی
مڈل اور نورمل اور ایس وی کے لڑکوں کے لئے مفید
قیمت ۶ر
آئینہ مسدس
مسدس حالی کی نہایت مفید شرح اور فرہنگ
گلدستہ جغرافیہ پنجاب
جغرافیہ پنجاب کا عجیب خلاصہ مع نقشہ
قیمت فی جلد ۳ر
سنہری گیت
نہایت دلچسپ اور مزیدار نظموں اور گیتوں کا مجموعہ
ملنے کا پتہ گلاب چند کپور اینڈ سنز تاجران کتب۔ انارکلی لاہور

ننھے منے بچوں کا ہفتہ وار
اخبار
گلدستہ
جو پنجاب کے مشہور تجربہ کار ہیڈ ماسٹر رائےصاحب لالہ رگھوناتھ سہائے بی۔اے کی اڈیٹری میں ہر ماہ کی ۹-۱۶-۲۳-۳۰ تاریخ کو لاہور سے نکلتا ہے۔ اس میں مفید اور دلچسپ کہانیوں کے علاوہ اخلاقی مضمون، دلچسپ معلومات، عمدہ نظمیں عجیب و غریب خبریں، معمے لطیفے وغیرہ درج ہوتے ہیں۔ قیمت سالانہ پانچ روپے پیشگی ششماہی ۱۲/۲ع۔ نمونہ مفت
ہندی گلدستہ
اسی گلدستہ کا ہندی اڈیشن بھی ایک سال سے انہی تاریخوں میں شائع ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے مضامین اردو گلدستہ سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ اس کا سالانہ چندہ بھی پانچ روپے ہے۔ رعایتی چندہ سالانہ چار روپے ہے۔ لیکن جو اردو و ہندی دونوں اخباروں کے خریدار بننا چاہیں۔ ان سے آٹھ روپے سالانہ چندہ لیا جاتا ہے۔ نمونہ مفت طلب فرمائیں ۔
المشتھر:- مینجر اخبار گلدستہ ہیرا منڈی لاہور
پنجاب کا مشہور تعلیمی علمی و ادبی ماہوار رسالہ
رفیق تعلیم
لاہور
المشتھر مینجر رسالہ رفیق تعلیم ہیرا منڈی لاہور

دُنیائے ادب کا غیر فانی شاہکار
جہانگیر لاہور
بہترین فسانے
کیف آور نظمیں!
روح پرور غزلیں!
حقیقت افروز علمی مقالے!
کا
مہتمم بالشان
عید نمبر
قیمت فی پرچہ
اپنی باصرہ نواز خصوصیات کے ساتھ دسمبر کے تیسرے ہفتہ میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جائیگا
نظام نمبر
شائع ہو چکا ہے۔ جو ہر صاحب ذوق کے کتب خانہ میں ہونا ضروری ہے۔ قیمت دو روپے
اگر
آپ یہ دو تو شاندار پرچے بلا قیمت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو آج ہی تین روپے چھ آنے سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیج کر مستقل خریداری قبول فرمادیں۔
نیازمند
منیجر رسالہ جہانگیر ریکو روڈ لاہور
شہر سیالکوٹ بازی لے گیا
کیوں؟
اس لئے کہ سامان کھیل کا مشہور و معروف کارخانہ
کے بی ناتھ برادرز سیالکوٹ
کا سامان کھیل تمام دُنیا میں شہرۂ آفاق مقبول ہو گیا ہے
ایک روپیہ کا مال صرف چودہ آنہ میں
سامان عمدہ ہونے کی گارنٹی۔ ناپسندیدگی کی صورت میں واپسی کی شرط۔ آج ہی آزمائشی آرڈر دے کر مشکور کریں۔ ذیل میں مختصر فہرست دیجاتی ہے۔ رسالہ کا حوالہ دینے پر دو آنہ فی روپیہ کمیشن دی جائیگی۔
فٹ بال
سپیشل ۱۸ ٹکڑہ بمعہ بلیڈر
ناتھ مشہور و معروف ۱۲ ٹکڑہ مکمل
پاپولر
میچ فٹ بال مکمل
تازہ بلیڈر
پچکاریاں
بڑی درمیانی چھوٹی
سلوشن ٹیوب بڑی چھوٹی
وسل درجہ اول درجہ دوم
والی بال
کروم نہایت اعلیٰ مکمل فی عدد
ناتھ
پریکٹس
والی بال
جال فاسٹل درجہ اول
ناتھ
کرکٹ بیٹ
وکٹ بیٹ کلب
میچ
پریکٹس
وکٹ فی بیٹ
ہاکیاں
یونیورسل گاف ربڑ باؤنڈ
لیدر باؤنڈ
ہاکی ڈنڈے
درجہ اول درجہ دوم درجہ سوم
چھوٹے بچوں کی ہاکیاں
ہاکی یا کرکٹ بال
سپیشل میچ پریکٹس
ٹینس ریکٹ
گورنمنٹ فی عدد
پنجابی
ونڈر
کے بی ناتھ برادرز شہر سیالکوٹ
سامان بذریعہ وی پی روانہ ہوگا

نہایت ضروری گذارشیں

(۱) "رہنمائے تعلیم" کا "افسانہ نمبر" ایک نادر، لاجواب، اور نہایت دلچسپ کتاب ثابت ہوگی "جوبلی نمبر" کی شان کو آپ ملاحظہ کر چکے اب فسانہ نمبر کی شان و عظمت بھی دیکھئے۔ یہ وہ بلند پایہ چیز ہے۔ کہ آپ اسے لازمی طور پر اپنی لائبریری اور میز کی زینت قرار دینگے۔ حجم ۴۰۰ صفحات اور قیمت صرف دو روپے (عار)

(۲) مستقل خریداران رسالہ رہنمائے تعلیم سے صرف ایک روپیہ علاوہ چندہ سالانہ کے زائد لیا جائیگا جن اصحاب کا چندہ سالانہ چار روپیہ وصول ہو چکا ہے۔ اُن سے "فسانہ نمبر" بذریعہ وی پی بھیج کر عہ زائد وصول کیا جائیگا اور جو جدید خریدار ہونگے اُن کے نام صہ کا وی پی جاری ہوگا۔ ملاحظہ ہو پوسٹر متعلقہ افسانہ نمبر۔ اور رسالہ دسمبر ۱۹۳۳ء صفحہ ۳۲ و ۱۸۴

(۳) سرکاری چندہ سے یا بوائز فنڈ سے رسالہ خریدنے والے اصحاب اپنے اپنے افسر متعلقہ سے اجازت حاصل کریں۔ یا تی اصحاب گرہ سے رقم ادا کر دیں۔ اور ہم سے بل منگوا کر پھر صدر دفتر سے اپنی رقم وصول کر لیں تا کہ افسانہ نمبر وقت پر اُنکی خدمت میں پہنچ سکے اور وہ اس سے مستفید ہو سکیں۔

(۴) مخفی نہ رہے کہ افسانہ نمبر کسی صاحب کو بھی مُفت نہیں ملیگا اور نہ اُسکی قیمت وصول ہوئے بغیر یہ آپ تک پہنچ سکیگا ہیں۔

لوگوں کی قدر دانی کے بھروسہ پر جوبلی نمبر ایسی شاندار چیز آپکی خدمت میں بھیجدی تھی۔ مگر افسوس میری محنت اکارت گئی اور سوائے چند احباب کے کسی صاحب نے میری محنت کی داد نہ دی۔ لیکن اب مجھے تسلی ہے کہ آپ لوگ میری خدمات کی قدر کرینگے۔ اور افسانہ نمبر کو دیکھ کر یہ اندازہ لگائینگے۔ کہ میں زید بکر کی طرح صرف دکھاوے کا کام کرنے والا نہیں ہوں بلکہ پورے ایثار سے کام لینے والا خادم ہوں۔ خدا آپکو خوش رکھے۔   نیاز مند۔ جگت سنگھ پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

گلِ صد رنگ
(جوبلی نمبر)
یعنی
ادبی، علمی، تاریخی، تعلیمی، صنعتی اور حفظانِ صحت کے متعلق بہترین مضامین کا بہترین مجموعہ
حیرت انگیز فسانے۔ دلچسپ ڈرامے۔ پاکیزہ نظمیں
نظم و نثر کے ۱۶۳ نادر مضامین، قدیم و موجودہ انشا پردازوں کے ایک سو نایاب فوٹو۔ متعدد سہ رنگی
تصاویر۔ مشاہیر ادب اُردو کے ہاتھ کی تحریروں کے قیمتی عکس اس مجموعہ کی زینت ہیں۔
(ملک کے قریباً ڈیڑھ سو فاضلوں اور ادیبوں نے اس کی تیاری میں حصہ لیا ہے)
سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت قریباً ۵۰۰ صفحات۔ لکھائی چھپائی بہترین متعدد صفحات رنگین۔
ہمارا پُرزور دعویٰ ہے کہ
اس سے زیادہ شاندار اور ضخیم مجموعہ مضامین اب تک اُردو زبان میں شائع نہیں ہوا۔
اس کی تیاری میں آٹھ ہزار روپیہ نقد خرچ کیا گیا ہے
اگر آپ نے
ادب اُردو کی اس انسائیکلو پیڈیا کو فوراً نہ منگوایا تو یقیناً آپ پچھتائیں گے
کسی وجہ سے بھی ناپسند ہو تو بلا تامل واپس فرماویں
قیمت باوجود اتنی بڑی ضخامت اور اس قدر فوٹوؤں کے صرف دو روپیہ آٹھ آنہ (۲/۸) مجلد ۳
ملنے کا پتہ۔ ماسٹر جگت سنگھ پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور، رام گلی نمبر ۵۵
ضرورت
پتہ۔ ماسٹر جگت سنگھ پروپرائٹر رہنمائے تعلیم لاہور رام گلی

بخدمت مینیجر صاحب رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور

تسلیم! آپ کا "فسانہ نمبر" ملاحظہ سے گذرا۔ صفحہ ۱۹-۲۰ پر آپ کی درد بھری اپیل سے متاثر ہو کر مندرجہ ذیل نئے خریدار بھیجکر عملی ہمدردی کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔
آپ ان کے نام سال بھر کے لئے رسالہ جاری کر دیں۔

کا منی آرڈر ارسال خدمت ہے
―――――――――――――
یا فسانہ نمبر بذریعہ وی۔پی بھیجکر صہ وصول کرلیں

(۱) پورا پتہ:-

(۲) پورا پتہ:-

(۳) پورا پتہ:-

(۴) پورا پتہ:-

(۵) پورا پتہ:-

راقم خریدار ـــــ

نوٹ:- اگر آپ کے دوست صرف فسانہ نمبر قیمتی عہ / جوبلی نمبر قیمتی عہ ہی خریدنا چاہیں۔ تو بھی صاف صاف لکھدیں۔ تاکہ تعمیل حکم کیجائے۔

نیازمند مینیجر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

رسالہ رہنمائے تعلیم کے جوبلی نمبر کے مطالعہ کے بعد

سررشتۂ تعلیم پنجاب کے سرتاج

آنریبل ملک فیروز خان صاحب نون وزیر تعلیم پنجاب

کی تازہ رائے گرامی

جوبلی نمبر کی رسید گی کا شکریہ۔ ملک کے نامی ادبا کے بیش بہا مضامین پڑھ کر میں بہت مسرور اور بہجت انگیز ہوا۔ میری رائے میں جوبلی نمبر مدرسین اور افسران معائن کی ذاتی واقفیت میں معتدبہ اضافہ کا موجب ہوگا۔ جنہیں صوبہ کی تعلیمی مشکلات کا مقابلہ کرنا اور ان کا حل سوچنا ہے۔

دستخط انگریزی
Firozkhan Noon

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام دیپتہ ایشور داس پرنٹر چھپا اور ماسٹر جگت سنگھ پبلشر نے دفتر رسالہ رہنمائے تعلیم رام گلی لاہور سے شائع کیا